حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

ادارۃ المعارف کراچی

اِصلاحِ انقلابِ اُمّت

جلد اوّل

مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی کوتاہیوں کی نشان دہی جیسے
عبادات، نکاح و طلاق، حقوق العباد اور دیگر شرعی معاملات سے متعلق
معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا شریعت کی روشنی میں حکیمانہ علاج

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

اِدارۃ المعارف کراچی ۱۴

"اصلاحِ انقلابِ امت" حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کی وہ بے نظیر تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے زمانے کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کی تعلیمات کی توضیح فرمائی ہے۔ مسلمانوں کی عملی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ اپنے دین کی اصل تعلیمات سے دور نہ ہٹتے چلے گئے ہوں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں عمل کی ان ہی کوتاہیوں کی انتہائی جزرسی کے ساتھ نشاندہی فرمائی ہے اور پھر انہیں دور کرنے کی موثر تدبیریں بتائی ہیں۔

یہ کتاب درحقیقت ایک سلسلۂ مضامین ہے جو دارالعلوم دیوبند کے معروف ماہنامہ "القاسم" میں قسط وار شائع ہوتا رہا، بعد میں اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔

احقر نے اپنے ماہنامہ "البلاغ" میں اس سلسلۂ مضامین کی کچھ قسطیں "القاسم" سے نقل کرکے شائع کی تھیں، اور اس بات کی آرزو تھی کہ یہ مضامین یکجا طور سے کتابی صورت میں شائع ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سینکڑوں تالیفات بار بار شائع ہوتی رہی ہیں، لیکن حیرت ہے کہ ایسی جامع مفصل اور مفید کتاب غالباً صرف ایک بار شائع ہو کر رہ گئی، اور اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے متوسلین بھی اس کے نام تک سے ناواقف ہیں۔

اسی دوران احقر کے شیخ و مربی سیدی و سندی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب دامت برکاتہم نے "اصلاح انقلاب امت" کا ایک نسخہ جناب محمد حنیف انصر لاری صاحب سے حاصل کر کے احقر کو عطا فرمایا اور حکم دیا کہ اس کی طباعت و اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

احقر نے کتاب کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ موجودہ دور میں اس کو شائع کرنے کے لئے اس پر کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب ایسے دور میں لکھی گئی تھی جب عام مسلمان بھی دینی اصطلاحات اور علمی اسلوب بیان سے پوری طرح مانوس تھے اور اس سے پورا استفادہ کر سکتے تھے، لیکن اب ہماری شامت اعمال سے عوام اس انداز بیان سے بہت نامانوس ہو گئے ہیں، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ تشریحی حواشی وغیرہ کے ذریعہ اسے زیادہ سے زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے جدید طرز کے مذاق کے مطابق کتاب میں پیراگراف قائم کرنے اور ذیلی عنوانات لگانے کی بھی ضرورت تھی۔

جہاں تک پہلے کام کا تعلق ہے، میں اس کے لئے فرصت کا متلاشی رہا، لیکن جب یہ دیکھا کہ فرصت کی تلاش میں یہ کام ٹلتا جائے گا اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ اصل کتاب کی طباعت ہی میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے، تو والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے حکم دیا کہ اب تسہیل و تشریح کے انتظار میں کتاب کی طباعت کو مؤخر نہ کیا جائے، کتاب ایک مرتبہ چھپ جائے تو ان شاء اللہ اس پر اس نوعیت کے کام ہوتے رہیں گے، چنانچہ اس کام سے صرف نظر کر کے احقر نے صرف دوسرے کام پر اکتفا کرنے کو مناسب سمجھا، اور اس کے لئے برادر عزیز مولوی محمد علی صاحب کو جو آج کل جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائلپور میں نظامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، کتاب حوالہ کر دی۔ انہوں نے پوری کتاب کو نقل کر کے اس کے بہت سے حصے پر پیراگراف قائم کئے، عنوانات لگائے اور بعض مقامات پر مختصر تشریحی حواشی کا اضافہ کیا، پھر وہ اپنی بعض مصروفیات کی بنا پر کام کی تکمیل نہ کر سکے تو میں نے برادر عزیز مولوی عبدالغفار ارکانی صاحب (فاضل دارالعلوم کراچی) سے اس کام کی تکمیل کرائی، چنانچہ کتاب کا نصف سے زائد حصہ انہوں نے ہی بنایا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں صاحبان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

برکیت! اب اس کتاب کا پہلا حصہ آپ کے سامنے ہے، ان شاء اللہ دوسرا حصہ بھی جلد از جلد پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، اگرچہ تسہیل و تشریح کا کام اس مرتبہ نہیں ہو سکا، لیکن امید ہے کہ ان شاء اللہ کتاب کے بیشتر مباحث عام اردو خواں حضرات پوری طرح سمجھ سکیں گے۔ جہاں دشواری محسوس ہو وہاں کسی اہل علم سے سمجھ لیا جائے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

احقر

محمد تقی عثمانی

مدیر: ماہنامہ البلاغ

دارالعلوم کراچی ۱۴

فہرست مضامین

مسلمان کیوں بدل گئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانی حیثیت سے واقعی کے اعتبار سے دنیوی انقلاب تو عظیم نظر نہیں آسکتا، مگر اس سے بحث کرنے کو بیکل میں بیکار نہیں سمجھتا، مگر حیثیت مذکورہ سے یہ بحث مقصود نہیں، بلکہ انقلاب دینی سے بحث مقصود ہے۔ اسی کی نسبت اس وقت عرض کرنا چاہتا ہوں۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے! کہ جس مرتبہ کا انقلاب عظیم مرآۃ امت میں واقع ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے بے اختیار یہ زبان پر آتا ہے ؎

اے بسا ابروئے یثرب بخواب

ترجمہ:- اے دوست! مدینہ میں سو خراب ہے۔

خبر کہ شد مشرق و مغرب خراب

ترجمہ:- اے شیخ!! کہ مشرق و مغرب برباد ہو گئے۔

اس انقلاب کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہاتھ میں ایک کتاب تفاصیل احکام شرعیہ کی لے لیجئے اور ایک نظر سے ایک ایک حکم جزئی کو دیکھتے جائیے، اور ایک نظر سے کسی غیر مطلع انسان

کی ایک ایک حالت کو جو اس جزو کا محل ورود متعلق ہے۔ دیکھتے جائیے اور دونوں کو ملاتے جائیے تو ایک حیرت عظیم ہوگی کہ ــــ یا اللہ! ان حالتوں کے مرتکب کو کیا ان احکام سے کچھ مس معلوم ہوتا ہے ــــ ؟

دین کے یہ اجزاء ہیں:-

(۱) عقائد ــــ (۲) دیانات (مثل نماز روزہ، طلاق، نکاح وغیرہ) ــــ (۳) معاملات (مثل بیع و شراء وغیرہ) ــــ (۴) معاشرات (مثل طعام، لباس، کلام و سلام وغیرہ) (۵) اخلاق باطنہ (مثل ریا، اخلاص، کبر، تواضع وغیرہ)

عقائد میں مسلمانوں نے غنیمت ہے۔ انکار کا انقلاب تو نہیں پیدا کیا، گو ان میں تدریج کے رنگ میں کچھ تغیر و تبدل ہوا، جس سے وہ حد بدعت میں داخل ہو گئے، اور جس نے اہل باطل کو اسی تغیری اصلاح کے سبب سے اہل حق کا مخالف بنا دیا۔ غرضکہ نصوص کا انکار نہیں کیا گیا۔ البتہ تاویل باطل کی گئی ــــ یہ حالت عام مسلمانوں کی ہے۔!!

متجددین میں انکار کا انقلاب

مگر خاص خاص جدید تعلیم یافتوں نے۔ انکار کا انقلاب بھی اختیار کیا، بلکہ انکار سے متجاوز ہو کر جمہور کے عقائد کے ساتھ استہزاء اور تمسخر سے پیش آنے لگے، جس پر حافظان حدود دین نے کفر کا فتویٰ لگایا۔ اور اس فتویٰ کی بدولت دوسری طرف سے ان کو "متعصب" کا لقب عطا ہوا، مگر جو شخص کفر کی حقیقت سمجھے گا، وہ ان علماء کو اس فتویٰ میں نہ صرف معذور بلکہ خود بھی اس میں ان کے ساتھ بالاضطرار اتفاق کرے گا ــــ یہ تو پہلے جزو کے انقلاب کی کیفیت تھی۔

(۲) دوسرا جزو ــــ دیانات ــــ اس میں عام مسلمانوں نے درجۂ بدعت کا بھی تغیر و تبدل نہیں کیا، مگر ترک و اہمال کا انقلاب البتہ اختیار کیا، کہ کسی نے نماز روزہ کو اس طرح غیر ضروری سمجھا گویا اس کے ذمہ فرض ہی نہیں، کسی نے نکاح و طلاق کے ساتھ یہی معاملہ کیا کہ عقیدہ میں تو یہی سمجھا کہ مسائل نکاح و طلاق دین میں داخل ہیں۔ ہماری رائے و اختیار پر نہیں ہیں اسی طرح جس طرح علمائے دین بتلاتے ہیں۔

اسی لئے احکام دینیہ کے منافی نہیں ــــ اور احکام محرّف نہیں کئے گئے

مگر عمل

اس کے ساتھ یہ دیکھا کہ جہاں نفس کا غلبہ ہوا، وہاں تکثّر کے لئے نکاح کا بھی اہتمام نہیں کیا، جہاں کوئی دنیوی ننگ و ناموس کے باقی رکھنے میں مصلحت دنیوی دیکھی، وہاں باوجود طلاق کے بدستور بیوی کو گھر میں رکھا، اور اس سے متمتع ہوتے اور بچے جنواتے رہے۔ اور خاص خاص جدید تعلیم یافتوں کو زبان کی انکار میں تردد نہیں ہوا۔

بہرحال عام مسلمانوں میں، جزو اول میں انقلاب تغیر ہوا تھا، اور یہاں جزو ثانی میں انقلاب ترک راہ پا گیا ہے۔

معاملات، معاشرات اور اخلاق اجزائے دین ہیں۔

اب رہ گئے بقیہ اجزائے ثلثہ۔ معاملات ـــــ معاشرات ـــــ اخلاق ـــ ان تینوں میں جب مذکورہ "انقلابوں" سے بڑھ کر انقلاب ہوا ہے، یعنی عام مسلمانوں نے بھی بے فکری سے ان کو جزو دین نہیں سمجھا، بلکہ دنیوی کارروائی سمجھ کر اس کے دستور العمل کو اپنی رائے و اختیار پر موقوف سمجھا، اور چونکہ اغراض فاسدہ تھیں اور رائے میں ہیچ تھا اس لئے اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ ہر حکم شرعی کے مقابلے ایک ایک کارروائی اور ایک ایک رسم اور ایک ایک عادت اختراع کی اور اس مجموعہ کو اپنا دستور العمل قرار دیا اور اس قرار دینے میں ذرا بھی اپنے کو قصوروار یا خطاوار نہیں سمجھا۔ بلکہ بعض امور کو باعث فخر اور فخر سمجھا۔ اس طرح سے کہ مجموعی حالت کے دیکھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے قصداً ہر ہر حکم ربانی کے مقابلے میں ایک ایک حکم نفسانی مستقل مجموعہ ایجاد کیا ہو۔

اور پاکستان کی یہ حالت ہے کہ ان امور میں احکام حقہ کے دائرے سے سخت مزاحمت کی جاتی ہے ـــ سو در حقیقت یہ انقلاب بہت ہی بڑا انقلاب ہوا ..... کیونکہ اول کے دو انقلابوں میں اجزائے دین کو دین سے خارج نہیں کیا گیا تھا اور ان اجزاء کے مقابلہ میں دوسرے امور کو من حیث الاستحسان تجویز کیا گیا تھا گو ایک جگہ تغیر بھی من حیث التدین، اور دوسری جگہ ترک، وہ باعتبار تغیر واقع ہوا تھا، اور ان تینوں میں اجزائے دین کو دین سے خارج کر دیا گیا اور بجائے ان اجزاء کے دوسرے احکام اختراع کئے گئے، اور ان مخترعات کو اصل پر ترجیح دی گئی تو ظاہر ہے کہ یہ انقلاب اجزائے ثلثہ اخیرہ کا ان انقلابین اولین سے بہت بڑھا ہوا ہے، اور واقع میں اہم اور اکثر بھی اجزائے ثلثہ اخیرہ ہیں۔

(۱) ایک قسمت علم یعنی ناواقفی و بے خبری۔

(۲) دوسرا قسمت ہمت، یعنی قصد و ارادہ کی کمی یا فقدان

سبب اول سے خود احکام ضروریہ واقفیہ ہی مخفی رہتے ہیں۔ اور سبب ثانی سے باوجود خبر اور آگاہی کے نوبت عمل کی نہیں آتی۔

امر ثالث: یعنی ان اسباب کے ازالہ کی تدبیر اور یہی بڑا امر ہے جس کے لئے توجہ تام و قوت مفقود کی سخت احتیاج ہے۔

سو دونوں سببوں میں سے ہر ایک کے ازالہ کی تدبیر جدا ہے۔ پس بے خبری کے ازالہ میں تو معلم اور متعلم یعنی خواص، علماء احکام اور عوام و طالبان احکام دونوں کو دخل ہے۔ اور ہر ایک کے لئے جداگانہ ضروری دستور العمل ہے۔

مردوں کا دستور العمل

طالبان احکام کا دستور العمل یہ ہے کہ ان میں جو زیادہ فارغ ہیں۔ جیسے اہل تنعم و اہل ثروت، وہ اپنی اولاد کو علوم دینیہ کے لئے فارغ کر دیں۔ گو ضروریات دنیوی کے لئے لسان ملک و فنون رائجہ کی بھی تحصیل کا مضائقہ نہیں، مگر یہ درجہ تبعیت سے متجاوز نہ ہونے پاوے۔ یہ اولاد تو ہوئی۔ اور خود کوئی وقت معین کر کے کسی عالم یا کامل الاستعداد طالب علم کے پاس جا کر یا اس کو بلا کر اگر علوم عربیہ سے مناسبت ہو تو وہ زیادہ بصیرت کا آلہ ہے۔ ورنہ اردو ہی کے مفید اور ضروری رسائل کو کسی محقق کے مشورہ سے تجویز کر کے سبقاً سبقاً، بہتر تو یہی ہے کہ دو تین بار، ورنہ اقل درجہ تحصیل ایک ہی بار پھر مطالعہ چند بار ان پر عبور کر لیں۔ مگر یہ رسائل ایسے ہوں جن میں سب اجزاء دین کا بیان ہو: عقائد ـــ دیانات ـــ معاملات ـــ معاشرت ـــ اخلاق باطنہ (جن کا ذکر اس سے پہلے مضمون میں بھی ہو چکا ہے)

اور جن کو معاش کی ضرورت سے زیادہ فراغ نہیں ہے اور وہ حرف شناس ہیں یا آسانی ہو سکتے ہیں وہ اپنے لئے بھی اور اپنی اولاد کے لئے بھی بجائے علوم عربیہ کے وہی رسائل دینیہ اردو کے بطور درس طالب علمانہ کے تجویز کر لیں اور پھر بطور مسودہ کے ان کا بار بار مطالعہ کیا کریں۔ اور جب تک درس کا انتظام نہ ہو سکے، بطور خود ہی دو چار ورق روزانہ بالالتزام مطالعہ کر لیا کریں اور کتب خلیہ ن

میں خود رائی سے کام نہ لیں۔ بلکہ نشان بنا کر چھوڑ دیں۔ اور عالم کے میسر ہونے کے وقت اس کی تحقیق کریں۔

اور جو لوگ حرف شناس نہیں ہیں۔ اور نہ بآسانی ہو سکتے ہیں۔ اور نہ اپنے بچوں کو کسی وجہ سے اس کام کے لئے فارغ کر سکتے ہیں۔ وہ ایسا انتظام کریں کہ ہفتہ میں، بہتر تو یہ ہے کہ روزانہ ایک ہی روز خاص مجلس علمی کے لئے بالالتزام مقرر کریں۔ اور کوئی عالم یا صحبت یافتہ اہل علم جو ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتا ہو تجویز کریں۔ اور اگر کسی عالم سے تجویز کرالیں۔ زیادہ واضح طریقہ ہے۔ اور اس روز سب لوگ کسی خاص مقام مسجد وغیرہ میں جمع ہو کر کسی خواندہ فہمیدہ شخص کو لا کر ایک معین وقت تک (مثلاً ایک گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ) ان مسائل کو سنا کریں۔ اور سمجھا کریں۔ اور اگر ایسا شخص مفت نہ ملے۔ تو اس کی کچھ مالی خدمت کریں۔ اور اس سنانے والے شخص کو جہاں شبہ رہے پنسل وغیرہ سے نشان بنا کر اس وقت اس کو رہنے دیں۔ پھر جب کوئی عالم میسر ہو۔ اس سے حل کریں۔ اور سب مجمع کو پہنچا دیں۔

اور جہاں دیہات وغیرہ میں ایسا شخص نہ ہو۔ تو آپس میں مشروع طریقہ سے چندہ کر کے، اس چندہ سے کوئی ایسا آدمی باہر سے بلا کر رکھ لیں۔ اور یہ طریقہ جاری کریں۔

اور یہ تمام طبقات مذکورین، علاوہ اس تحصیل یا مطالعہ یا سماع رسائل کے، دو امر کا اور بھی التزام رکھیں۔

(۱) ایک یہ کہ اپنے اعمال و حوائج میں جب کوئی امر جس کا حکم معلوم نہ ہو۔ پیش آوے فوراً علماء حقانی سے اس کو دریافت کریں۔ اور اگر بوجہ بعد کے زبانی نہ پوچھ سکیں۔ تو بذریعہ خط کے تحقیق کریں۔ اگر اوسطاً ایک مسئلہ روزانہ کے حساب سے تقریراً یا تحریراً پوچھ لیا کرے تو سال بھر میں ساڑھے تین سو سے زائد، اور دس سال میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مسئلے معلوم ہو سکتے ہیں۔ کہ بعض نام کے یا جدید عالموں کو بھی اتنے مسائل معلوم نہیں، اور کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔

(۲) دوسرے اس امر کا التزام رکھیں کہ علماء کی مجلس میں جایا کریں۔ خواہ خاص مجلس ہو جیسے جلسہ ملاقات و زیارت، خواہ عام مجلس ہو۔ جیسے جلسہ وعظ و نصیحت، اور جو شخص دل سے

جاری رکھیں۔ یہ تو مردوں کا انتظام ہوا۔

عورتوں کا دستور العمل

اب عورتیں رہ گئیں، سو یہ مجموعی انتظام مذکور ان کے لئے اشکال سے خالی نہیں، اس لئے سہل تر ان کے لئے یہ طریق ہے کہ اگر معمر عفیفہ دین دار مل جاوے تو آجکل لڑکیوں کو اس کے ذریعہ سے قرآن مجید اور ایسے رسائل کی تعلیم دلاویں اور ان کے لئے بہشتی زیور کے دس حصہ بالکل انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہیں بلکہ بانضمام گیارہویں حصہ مسمیٰ بہشتی گوہر کے مردوں کے لئے بھی کافی ہیں۔ اور اگر کوئی معلمہ ایسی نہ ملے یا کسی لڑکی کو فراغ یا مناسبت نہ ہو قرآن کو بھی بڑی عورتوں کے انتظام میں شامل سمجھا جائے اور وہ انتظام دو ہیں۔

ایک یہ کہ گھر کے مردوں میں سے اگر کوئی خواندہ ہو تو وہ روزانہ کچھ وقت معین کر کے سب گھر والیوں کو اس وقت جمع کر کے رسائل پڑھ کر سنایا کریں، سمجھایا کریں بلکہ کئی دورے کر دیں۔

دوسرا انتظام یہ ہے کہ گاہ گاہ کسی متورع محقق منتظم کا گھر میں وعظ بلا دیا کریں کہ یہ عجیب موثر ہے۔ یہ سب دستور العمل، طالبان احکام کے متعلق ہے۔

علماء کا دستور العمل

اب علماء احکام کا دستور العمل باقی رہا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اس میں ساعی رہیں کہ ناواقفوں تک احکام پہنچیں اور اس کی یہ صورتیں ہیں۔

(۱) درس گو بعض میں اس میں علوم مقصودہ کو مقدم اور مہتم بالشان رکھیں۔ وحتی الامکان طالب علم کو جلدی فارغ کر دیں۔ اگر طالب علم دینی مختصرات یا اردو کے رسائل بھی پڑھے۔ اور اپنے پاس وقت ہو، تو ہرگز اس کے درس کو خلاف شان نہ سمجھے۔ طالب علم کے فضول سوال پر اس کو متنبہ کرے۔ جواب نہ دے۔

(۲) دوسری صورت وعظ ہے۔ جس میں خطاب عام ہے۔ اس میں ضرورت وقت کا لحاظ رکھیں۔ جن امور میں لوگ اس زمانہ میں مبتلا ہوں۔ یا جن ضروریات میں کوتاہی کرتے ہوں۔ سادہ بیان، [illegible] دیگر مضامین اگر ہوں تو بالتبع ورنہ بقدر ضرورت ہوں۔ اور یہ ضروری مضامین جمیع ابواب کے ہوں۔ محض عقائد و دیانات پر اقتصار نہ کرے بلکہ معاملات و

معاشرت و اخلاق سے بھی اتنی بحث کرے بلکہ بوجہ متروک ہونے کے یہ دونوں جزو زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔ اور وعظ میں بات صاف کہے کہ سننے والوں کی سمجھ میں خوب آجاوے۔ مگر خفت اور اشتعال انگیز طرز سے بچے۔ اور وعظ پر عوض نہ لے۔ البتہ اگر وعظ کا ذکر ہو، وہ اور بات ہے۔

(۳) تیسری صورت جواب ہے استفتاء کا خواہ زبانی سوال ہو یا تحریری ہو۔ اس میں ان امور کا لحاظ رکھے۔

(۱) حتی الامکان جواب میں توقف نہ کرے۔

(۲) لایعنی سوال کا جواب نہ دے، بلکہ سائل کو متنبہ کر دے۔

(۳) اگر سوال محتمل دو صورتوں کو ہو تو تفصیل سے جواب نہ دے۔ کیونکہ بعض اوقات سائل دونوں شقوں کا حکم سن کر ایک شق کو اپنے مفید مطلب سمجھ کر سوال میں اسی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے سائل کا یا اس کے مقابل کا ضرر دینی یا دنیوی ہو جاتا ہے۔

(۴) عامی کو دلیل بتلانے کا التزام نہ کرے کہ اکثر اس کے فہم سے خارج ہو گی۔

(۵) ہاں! دوسرے علماء محققین کی سہولت کے لئے اگر دلیل کی طرف اشارہ کر دے یا کوئی عبارت بلا ترجمہ نقل کر دے، مستحسن ہے۔

(۶) اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سائل غائب، اس تحریری جواب کو اچھی طرح نہ سمجھے گا۔ یا سمجھنے میں غلطی کرے گا جواب بھیج کر لکھ دے کہ کسی عالم سے اس جواب کو زبانی حل کرے۔

(۷) اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سوال برائے تعنت ہے، جواب نہ دے۔ غرض اہل سے دریغ نہ کرے، نااہل کو منہ نہ لگاوے۔

(۴) چوتھی صورت تالیف و تصنیف ہے۔ خواہ اشتہار ہو، یا اخبار ہو یا رسالہ و کتاب ہو۔ اس میں بھی ضرورت وقت کا لحاظ اور عبارت میں سلاست اور کفایت کی رعایت ہو۔ اور اگر اللہ تعالیٰ معاش کی کوئی صورت اور سبیل عطا فرما دے تو اپنی تصانیف کی خود تجارت نہ کرے۔

یہاں تک بیان تھا بے فکری کے ازالہ کی تدبیروں کا، آگے بیان ہے ضعف ہمت کی ازالہ کی تدبیر کا۔

ضعف ہمت کے ازالہ کی تدبیر۔ صحبت شیوخ کاملین۔

تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ امور ذیل کو تقویت ہمت میں خاص اثر اور دخل ہے۔
ایک ان میں سے صحبت شیوخ کاملین کی ہے، جن کی یہ علامتیں ہیں،

(۱) بقدر ضرورت علم دین رکھتا ہو۔
(۲) عقائد و اعمال و اخلاق میں شرع کا پابند ہو۔
(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔
(۴) کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو، یہ بھی شعبہ دنیا ہے۔
(۵) کسی شیخ کامل کی صحبت میں چندے رہا ہو۔
(۶) اس زمانے کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔
(۷) بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم، دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔
(۸) اس سے جو لوگ بیعت ہیں، ان میں اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو۔ وہ شیخ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو، اور ان کی کوئی بری بات دیکھے یا سنے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو، کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔ اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔

(۹) خود بھی وہ ذاکر شاغل ہو۔ اس لئے کہ بدون عمل یا عزم عمل، تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ اور صدور کشف و کرامات، استجابت دعا و تصرفات لوازم شیخت سے نہیں۔

غرض ایسے حضرات کی صحبت، خاص طور پر مؤثر ہے۔ مگر اس صحبت کی تاثیر میں شرط یہ ہے کہ اس میں نیت بھی یہی ہو کہ میرے قلب میں رغبت طاعت اور نفرت معاصی پیدا ہو۔ اور اس کے ساتھ اس کا بھی التزام رہے کہ اپنی کیفیات قلبیہ کی شیخ کو اطلاع دے کر جو معالجہ تجویز فرمایا جائے اس پر کاربند ہو۔

دوسرا امر ان میں سے بوقت میسر نہ آنے صحبت کاملین کے اہل اللہ کے حالات کا مطالعہ یا استماع ہے مگر ان سے مقالات متعلقہ اسرار مسائل خاصہ تصوف ہیں۔

ان میں ہرگز مشغول نہ ہو۔ بعد علوم معاد یعنی تربیت باطن و تہذیب نفس کے بارہ میں جو کچھ ان کے اقوال ہیں۔ وہ سرتا پا عمل در آمد بنانے کے قابل ہیں۔

تیسرا امر ان میں سے مراقبہ موت و مابعد الموت ہے۔ مراد اس سے ابتدا نزع روح سے دخول جنت یا نار تک جو احوال پیش آنے والے ہیں۔ مثلاً سوال نکیرین و عذاب و تنعیم قبر و حشر و وزن اعمال و حساب و جزا و عبور صراط وغیرہ۔ سب کو کسی وقت فراغ میں بالتزام لازمہ کم از کم بیس منٹ سوچا کرے تقویت ہمت میں جن ملکات کا دخل ہے۔ اس طرح سے ان کا کمال پیدا ہو جاوے گا۔ جیسے زہد و خشیت وامثالہا۔

پس یہاں پر بیان ختم ہو گیا۔ یعنی اسباب انقلاب کے ازالہ کی تدبیر کا، پس طریقہ اصلاح مکمل طور پر مشخص ہو گیا۔ ولله الحمد۔

اور لطف یہ ہے کہ نہایت سہل اور ایسا عام دستور کہ دنیا کی ہر سے تمام امت باسہولت اپنی اصلاح کر سکتی ہے آگے نفع حاصل کرنے والوں کی توفیق ہے ؎

ما نصیحت بجائے خود کردیم	روزگارے دریں بسر بردیم
ترجمہ: ہم نے اپنی جگہ پر نصیحت کر دی	ترجمہ: کتنا عرصہ اس میں صرف کیا
گر نیاید بگوش رغبت کس	بر رسولاں بلاغ باشد و بس
ترجمہ: اگر ہماری یہ نصیحت کسی کو پسند نہ آئے	ترجمہ: تو پیغمبروں کا کام بھی صرف پہنچانا ہے اور بس

(تذییل)

علماء احکام کے دستور العمل کا تتمہ ایک اور امر بھی ہے۔ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اس میں بعض مواقع پر غیر علماء بھی شریک ہیں۔ یعنی خاص لوگ اپنے متعلقین پر احتساب کرنا جن پر قدرت ہے۔ علماء کے ساتھ مخصوص نہیں۔ البتہ عام احتساب یہ خاص ہے علماء کے ساتھ اور عوام کی تصدی اس کے لئے اکثر موجب فتنہ و عداوت ہو جاتی ہے نیز عوام اکثر احتساب کی حدود بھی نہیں جانتے۔ اس سے خونی لڑائی کی نوبت آ جاتی ہے۔ نیز اکثر عوام نفس کو مہذب کئے ہوئے نہیں ہوتے۔ اور ان کے احتساب میں اکثر سے

نشانیت ہوتی ہے۔

اس مضمون کے افادہ کے لئے بعض مفسرین نے ولتکن منکم میں من کو تبعیضیہ کہا ہے۔ اور یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہیں واجب ہوتا ہے، جہاں فاعل بے خبر ہو یا فاعل پر پوری قدرت ہو۔ یا قبول کی پوری توقع ہو ورنہ مستحب ہے۔

منجملہ اس کے آداب کے یہ ہے کہ اول خلوت میں کہے اور نرمی سے کہے اس کے بعد اگر مصلحت ہو علانیہ کہے اور سختی سے کہے ورنہ اعراض کرے اور دعا کرے۔

منجملہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کفار کی تبلیغ بھی ہے۔ خواہ بذریعہ تقریر خواہ بذریعہ تحریر اپنے ملک کے کفار کو بھی اور دوسرے ملک کے کفار کو بھی اور یہ بوجہ عموم شیوع احکام دینیہ کے تو اس وقت واجب نہیں رہا لیکن اگر کوئی ہمت کرے لیکن عزیمت ہے اور اس غرض کی تحصیل و تکمیل کے لئے اگر ان اقوام کی زبان بھی سیکھ لے تو بشرط خلوص نیت عین طاعت ہے جیسا اس وقت کوئی شخص انگریزی وغیرہ اسی غرض سے حاصل کرنا چاہے۔

تکمیل

تبلیغ احکام کے متعلقات دین میں سے ان احکام کی ایک خاص حفاظت بھی ہے۔ یعنی اصول و فروع اسلام پر جو حملے یا آمیزشیں ہیں خواہ وہ اہل کفر ہوں یا اہل بدعت، ان کو دفع کرنا...... تاکہ طالبان حق شبہات سے محفوظ رہیں۔ اور اس مقصود کے لئے اگر اہل باطل پر رد و قدح کرنے کی حاجت ہو یا ان سے مناظرہ کی مصلحت ہو، اس سے بھی پہلو تہی نہ کرے۔ اور اس زمانہ پر آشوب میں مناظرہ اگر شروع ہے تو اسی غرض سے ورنہ تعصب اس درجہ ترقی پر ہے کہ مناظرہ سے احقاق حق مقصود ہی نہیں رہا۔ اور اس رد و قدح یا مناظرہ کے لئے اگر اہل باطل کے علوم و فنون حاصل کرنا ضروری ہو۔ وہ بھی طاعت ہے۔ جیسے اس وقت سائنس وغیرہ سیکھنا۔

یہاں تک تدبیریں ہیں اصلاح کی اور اس کے بعد بھی بڑی ضرورت دعا و التجا بجناب حق کی ہے۔

ایں ہمہ گفتیم لیک اندر بسیچ
بے عنایات خدا ہیچیم ہیچ

ترجمہ: ہم نے سب کچھ کہا لیکن حقیقت یہ ہے
ترجمہ: کہ حق تعالیٰ کی عنایتوں اور رحمت بدوں حق

بے جز اشیاء حق و خاصان حق ‏— گر بمانند است در تحقیق و دقیق

ترجمہ: کی بہت سا نیوں کے بغیر اگر کوئی ‏— ترجمہ فرشتہ بھی ہوتا اس کا اعمال نامہ بھی سیاہ ہوتا

تتمۂ موانع اصلاح انقلاب

اس سے سابق انقلاب امت کی اصلاح کی تدبیر کی تعیین و تفصیل مذکور تھی چونکہ ہر تدبیر پر عمل کرنے کے لیے، ساتھ اس کے موانع تاثیر سے تحرز بھی واجب ہوتا ہے۔ جس طرح امراض جسمانی میں پرہیز کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے ان تدابیر اصلاح کے ساتھ ان امور سے بچنا بھی ضروری ہوگا جو ان کے اثر میں خلل انداز ہیں۔

بیان اس کا یہ ہے کہ ان تدابیر میں سے بعض علماء کے متعلق تھیں۔ یہاں ان کے باب میں کلام مقصود نہیں۔ کیونکہ وہ خود جانتے ہیں۔ صرف ان میں جو عوام کے متعلق ہیں۔ ان پر بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے۔ سو اس باب میں یہ امور بتلائے گئے تھے۔

(۱) کتب دینیہ کا پڑھنا یا دیکھنا یا سننا،

(۲) علماء دین سے مسئلہ پوچھنا،

(۳) وعظ سننا۔

(۴) صحبت اہل کمال

(۵) تحریروں کو خود پڑھنا یا سنانا یا کسی کے ذریعے سے پڑھوانا، سنوانا،

ان امور پنجگانہ میں سے ہر ایک میں بعض لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں جو معالجہ مطلوب میں بدپرہیزی کا حکم رکھتی ہیں۔ بالترتیب ہر ایک کے متعلق مختصراً تنبیہ ضروری ہے۔

امر اول یعنی کتب دینیہ کا پڑھنا یا دیکھنا یا سننا

اس کے متعلق آج کل بعض بکثرت یہ غلطی کرتے ہیں کہ جو کتاب دین کے نام سے دیکھی یا سنی خواہ اس کا مضمون حق ہو یا باطل خواہ اس کا مصنف ہندو ہو یا عیسائی یا دہری ہو یا مسلمان پھر مسلمان بھی گو صاحب بدعت ہی ہو —— غرض کچھ تحقیق نہیں کرتے اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔

اور اسی میں وہ مضامین آ گئے جو کسی مسئلہ کے متعلق اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ سو اس میں چند مضرتیں ہیں۔

بعض اوقات بوجہ کم علمی کے یہی امتیاز نہیں ہوتا کہ ان میں کون مضمون صحیح ہے اور کون غلط، کبھی غلط کو صحیح سمجھ کر عقیدہ یا عمل میں خرابی کر بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر غلط ہے مگر بعض مصنفین کا طرز بیان ایسا تلبیس آمیز یا دل آویز ہوتا ہے کہ دیکھنے والا فی الفور اس سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پہلے اعتقاد کو ضعیف اور بے وقعت خیال کر کے بعض دفعہ تو اس پہلے کو غلط اور اس پچھلے کو صحیح سمجھ لیتا ہے۔ اور بعض دفعہ اس کو قبول تو نہیں کرتا مگر متزلزل و مذبذب ہو کر کبھی دل میں دکھتا ہے، اور پریشان ہوتا ہے اور کبھی دوسروں سے تحقیق کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ اس میں کچھ غموض ہوتا ہے جس کے ادراک کے لئے اس کا علم و ذہن کافی نہیں ہوتا، اس لئے سمجھ میں نہیں آتا اور بے سمجھے دلچسپی سوال کر کے دوسروں کو پریشان کرتا ہے۔ اسلئے فہم کا قصور فہم میں نہیں آتا۔ اور جواب دینے والوں کو جواب سے عاجز سمجھ کر ان کے علم یا اخلاق میں تنگی کا حکم لگا کر ان سے بدگمان ہو جاتا ہے اور بھی انواع مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔

عالم دین کی ضرورت

ان سب کا انسداد یہ ہے کہ کوئی کتاب کوئی رسالہ کوئی تقریر تاوقتیکہ کسی محقق عالم کو نہ دکھلائیں۔ اور اس سے رائے نہ لیں، ہرگز نہ دیکھیں۔

اخبارات کے بعض مفاسد اس قسم کے احقر نے ایک مستقل تحریر میں لکھی ہے، اخبار بینی، جو ایک زمانہ میں لکھے تھے۔ جس پر بعض معترضین نے شور مچایا تھا مگر وہ تحریر بغور پڑھنے کے قابل ہے اس سے یا اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ کسی اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ ہر حالت میں حرام ہے!

مقصود صرف یہ ہے کہ چونکہ ان چیزوں میں بعض اوقات ایسے مفاسد ہوتے ہیں اور ان مفاسد سے بچنا ملت اسلامیہ میں واجب ہے اور بچنا بدون صورت تحصیل عالم محقق سے مشورہ لئے کے، اس کا اتباع ضروری ہوگا۔ افسوس ہے کہ باوجود وضوح اس امر کے پھر اس ممانعت کو تنگ خیالی و تعصب پر محمول فرمایا جاتا ہے۔ کیا کوئی خیرخواہ باپ اپنے بچے کو زہریلی ہری مٹھائی کے کھانے سے روکے تو کوئی عاقل اس باپ کو متعصب یا تنگ خیال کا لقب دے گا؟ یا نہایت راحت کے ساتھ اس کو شفقت

کیسے ہوگا؟ ـــــ اور اگر کوئی کہے کہ ہم خود تنہا مطالعہ کر لیں گے۔ تجربہ ایسی چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے بری چیز کو سمجھ دار
کے مضر ہونے کو دیکھتے ہیں۔

سو اس کا جواب اوپر کی تقریر سے واضح ہو گیا ہے کہ اس استفادہ کے لئے علم کامل و فہم وافی کی حاجت ہے اور کامل اس کے ناقد[1] نہیں ہے۔ اور کسی کا اپنے کو ناقد سمجھنا یہ معتبر نہیں۔ بلکہ کسی عالم ماہر کا کسی کو ناقد کہنا اس کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

تورات کے مطالعہ سے ممانعت۔

اور یہی وجہ ہے کہ جناب رسول کریم و نبی حکیم علیہ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ والتسلیم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے راسخ العلم و کامل شخص کو ـــــ تورات کے مطالعہ سے منع فرمایا۔ باوجودیکہ وہ فی نفسہٖ آسمانی کتاب تھی۔ گو اس میں تحریف بھی ہو گئی تھی، اور پھر مطالعہ میں تنہا نہ تھا بلکہ خود...... حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے تھے۔ اور اس میں جو تحریف کا مضمون ہو جاتا ظاہر تھا۔ اس کے بعد کسی ضرر کے مرتب کا احتمال بھی نہ تھا۔ پھر اس مصلحت سے کہ آئندہ کو یہ عمل ان مفاسد کے باب کے مفتوح ہونے کا سبب نہ بن جائے کس سختی سے منع فرمایا؟ اور کیسی ناخوشی ظاہر فرمائی! جیسا کہ حدیث دارمی میں مذکور ہے۔

اب دلائل عقلیہ و نقلیہ کے بعد امید ہے کہ اہل انصاف، مصلحت تدلیل کو کوئی خدشہ نہ رہا ہوگا اور جبکہ اس تقریر سے وہ کتب بھی ممنوع قرار پائیں جن میں منافع کے ساتھ بعض مفاسد بھی ہوں۔ تو جن میں صرف مفاسد ہی ہوں۔ جیسے ناول وغیرہ، جن سے اعمال و اخلاق کا بڑا حصہ نہایت گندہ ہو جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ کس طرح جائز سمجھا جائے گا؟ بالخصوص نوجوانوں اور عورتوں کو بلکہ اگر ایسی کتابیں گھر میں دیکھیں تو ان کو آگ میں جلا دینا چاہئے۔ یہی ان کا حق ادا کرنا ہے۔

مختصر نصاب

اب ذیل میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے لئے ایک مختصر نصاب، قابل مطالعہ کتب کا تجویز کر دیا جائے کہ ان میں مشغول رہ کر مفسد کتب سے محفوظ رہیں۔

---

[1] اس جگہ ناقد سے مراد وہ شخص ہے جو کامل و نیک بھی ہو ۱۲ - محمد ... عفی عنہ

(۱) بہشتی زیور گیارہ حصے (۲) تعلیم الدین (۳) فروع الایمان (۴) جزاء الاعمال (۵) تبلیغ دین (۶) قصد السبیل (۷) شوقِ وطن ۔ اگر اس سے زیادہ مطول و مفصل کی ضرورت ہو کسی عالم محقق سے دریافت کر لیا جائے۔ تمام ہوا بیان امر اول کا۔

امر دوم یعنی علماء دین سے مسئلہ پوچھنا

اس میں چند غلطیاں کی جاتی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ کیف ما اتفق کسی سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی نہیں تحقیق کرتے کہ یہ شخص دینی مذہب عالم بھی ہے یا نہیں یا کسی کا نام ــــ مولوی سن لیا اور اسی سے دین کی باتیں پوچھنے لگے اور بعض اوقات عالم ہونا معلوم ہوتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس مشرب کا ؟ کس عقیدہ کا ہے۔ ایسے شخص کے جواب سے بعض اوقات تو عقیدہ یا عمل میں خرابی ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تردد و شبہ میں پڑ کر پریشان ہوتا پھرتا ہے۔ جیسا کہ امر اول کے بیان میں گذر چکا ہے۔

(۲) دوسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ ایک مسئلہ کئی کئی جگہ پوچھتے ہیں اور بعض اوقات جواب مختلف ملتا ہے تو اس وقت یا تو خود ہی رائے میں پریشان ہو جاتے ہیں یا جس میں نفس کی مصلحت ہوتی ہے اس پر عمل کرتے ہیں اور کبھی اس کی عادت ہو جاتی ہے تو استفتاء سے یہی مقصود رہتا ہے کہ نفس موافق جواب ملے اور جب تک ایسا جواب نہیں ملتا برابر اس کی جستجو و کاوش میں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وضع تدین سے بمراحل بعید ہے سراسر اتباع ہوی و تعصب فی الدین ہے

(۳) ایک تیسری غلطی اس دوسری غلطی سے پیدا ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک مجیب کا جواب دوسرے مجیب کے سامنے نقل کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ بعض اوقات طبیعت کا رنگ خاص ہوتا ہے۔ بعض اوقات نقل کا سبب دیکھ کر کچھ منشاء اعتراض ہوتا ہے اس لئے کبھی اس مجیب کی زبان سے دوسرے مجیب کی نسبت یا اس کے جواب کی نسبت کوئی نا ملائم لفظ نکل جاتا ہے پھر یہی ناقل دوسرا اس مجیب تک اس کو پہنچا دیتا ہے پھر وہ کچھ کہہ دیتا ہے اس کی خبر اس پہلے تک پہنچتی ہے۔ اور بعض دفعہ بلکہ اکثر ان ملفوظات میں بہت کچھ لفظی یا معنوی تغیر و تبدل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس طور

پھر باہم ایک فساد عظیم ان میں برپا ہو جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ ہے کہ غیر ضروری مسئلے پوچھے جاتے ہیں۔

ایک غلطی یہ ہے کہ مسائل کے دلائل دریافت کئے جاتے ہیں جن کے سمجھنے کے لئے علوم درسیہ کی حاجت ہے اور چونکہ سائل کو وہ حاصل نہیں اس لئے دلیل کو سمجھتا نہیں اور اگر اسی خیال سے کوئی مجیب دلیل بتلانے سے انکار کرتا ہے تو اس مجیب غریب کو بد خلقی پر محمول کیا جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ کسی سے کسی مسئلہ میں مباحثہ شروع کرتے ہیں۔ پھر اپنی تائید کے لئے فتوی حاصل کرتے ہیں اور وہ فتوی اپنے مخالف کو دکھلا کر اس پر احتجاج کرتے ہیں پھر وہ اپنے موافق فتوی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح خواہ مخواہ باہم جنگ و جدل کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ عوام کو اس میں پڑنا موجب خطر ہے۔ اگر ان سے کوئی اہل باطل الجھے تو علماء کا حوالہ دیکر اس کو قطع کر دیا جائے۔ اگر غرض ہو گی آپ پوچھے گا۔

غلطیوں کی اصلاح کا طریق

ان سب غلطیوں کی اصلاح اس سے ہو سکتی ہے کہ اپنا دستور العمل اس باب میں یہ رکھیں کہ جب کوئی ضروری بات پیش آوے، اپنے عمل کرنے کے لئے نہ کہ مباحثہ کے لئے، ایسے شخص سے مسئلہ پوچھیں جس کا معتبر و محقق ہونا کسی ذریعہ سے پہلے معلوم کر لیا ہو اور اس پر اعتماد و اعتقاد بھی ہو۔ اور دلیل دریافت نہ کریں۔ اور کسی دوسرے عالم سے بلا ضرورت نہ پوچھیں۔ اور اگر باوجود ان سب رعایتوں کے اس کے جواب میں شبہ رہے۔ اور شبہ بنا ہو تو ایسے ہی صفت کے دوسرے عالم سے پوچھ لیں اور اگر جواب پہلے کے خلاف ہو تو پہلے کا جواب اس کے سامنے اور اس کا جواب پہلے کے سامنے نقل نہ کریں۔ اور جس قول پر قلب مطمئن ہو اس پر عمل کر لیں اور یہی عمل اس حالت میں کریں جبکہ بلا مراجعت دوسرے عالم کے خود بخود جواب، اول کے خلاف کوئی جواب اس باب میں گوش زد ہو جائے۔

استفتاء کے آداب

اور اگر استفتاء تحریراً ہو۔ تو ان رعایات کے علاوہ اور بھی بعض رعایتوں کا لحاظ رکھیں یعنی

- سوال کی عبارت اور خط بہت صاف ہو۔

- حتی الامکان فضول اور غیر متعلق باتیں اس میں نہ لکھیں۔
- اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں۔ اگر کئی بار ایک ہی جگہ استفتا بھیجیں تب بھی ہر خط میں ......
- اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں۔ اور جواب کے لیے ٹکٹ ضرور رکھا کریں۔ بلکہ اگر سوال دستی بھی بھیجیں تب بھی جواب کے لئے ٹکٹ رکھدیں اور پتہ بنا پورا لکھدیں۔ شاید اس وقت جواب مسئلہ کا نہ دے سکیں تو بعد میں ڈاک میں بھیج دیں گے۔ ورنہ ٹکٹ واپس آجائے گا۔
- اگر کئی سوال ہوں تو کاغذ پر نمبر ڈال کر ان کی ایک نقل اپنے پاس بھی رکھ لیں اور مکتوب الیہ کو اطلاع دیدیں کہ ہمارے پاس سوالات کی نقل نمبروار ہے۔ آپ اعادہ سوال کی تکلیف نہ کریں۔ نمبروں کی ترتیب سے صرف جواب لکھدیں۔

امر سوم یعنی وعظ سننا

جس قسم کی غلطیاں امر اول میں کی جاتی ہیں۔ اسی قسم کی غلطیاں وعظ بیان کرتے ہیں کیونکہ تحریر و تقریر دلالت و احکام و آثار میں متقارب ہیں۔ یعنی لوگ ہر قسم کے واعظوں کا وعظ سن لیتے ہیں۔ اس کے وہی مفاسد ہیں جو امر اول میں تھے اور ان کا وہی انسداد ہے جو مفاسد متعلقہ امر اول کا تھا۔

وعظ سننے کے آداب

جب کوئی واعظ جدید آوے، اپنے شہر یا قریب کے کسی عالم معتبر سے اس واعظ کی حالت پوچھ لے۔ اگر وہ اطمینان دلاوے تو وعظ سنے، ورنہ نہ سنے کیونکہ بعض واعظ جاہل ہوتے ہیں اور بعض بدمذہب اور ان میں بعض اپنے مدعا کو ذہن میں جا دینے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ اور بعض ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ اول اول تو مخاطبین کے موافق کہتے ہیں پھر بعد مناسبت و موانست اپنے مسلک کی دعوت شروع کرتے ہیں بقول مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے

زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر

پس ہر بات کا ہاتھ سے نہ جانا چاہئے

بری صحبت کے نقصانات

اسی کے ذیل میں اس صحبت کی مضرت بھی سمجھ لینا چاہئے جو مقتدا بنا کر نہ ہو۔ محض دوستی کے طور پر ہو مگر وہ دوست بددین ہو ـــ یہ بھی غلطی عظیم ہے۔ تجربہ سے ایک دوست کا اثر طبعًا دوسرے دوست پر ضرور آتا ہے اور مضر اثر جلد آتا ہے۔ اس لئے ارشاد نبوی ہے المرء علی دین خلیلہ فلینظر من یخالل ـــ یعنی انسان اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے۔ چاہئے کہ وہ دیکھ لے کہ کس سے دوستی کا تعلق کرتا ہے؟ ـــ البتہ جو ملاقات بضرورت ہو وہ مستثنیٰ ہے۔

امر پنجم یعنی گھر والوں کو خود پڑھانا

اس میں جو غلطیاں ہوتی ہیں، ان کا مجموعہ امور اربعہ مذکورہ کے بیان میں منتشر طور پر علاج آگیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ گھر والوں کے لئے جو کتابیں تجویز کی جاویں۔ یا جو راستہ بتلایا جائے ان میں رعایت امور مذکورہ بالا ملحوظ ہوں۔ اور یہ امر تصریح و تخصیص کے ساتھ اس میں قابل ذکر ہے کہ سیانی لڑکی کا معلم نامحرم جوان یا میانی عمر کا جائز نہ رکھا جائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

قرآن مجید کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح متعلقہ قرآن مجید)

اس سے سابق کے مضامین میں انقلاب و اصلاح کے باب میں جو کلام ہوا تھا۔ وہ مجمل اور کلی طریق پر تھا چونکہ جزئیات خاصہ کو ان پر منطبق کرنا، طلب صادق و فہم صائب کو مقتضی ہے اور ان دونوں کی کمی اکثر طبائع میں مشاہد ہے اس لئے مضمون مذکور کے نفع میں تام ہونے کے لئے اس کی حاجت محسوس ہوئی کہ بعض ایسی جزئیات کو جو کہ مہم و کثیر الوقوع ہیں، بطور نمونے مگر بیشتر کافی، اسی سلسلہ میں مفصلاً و متفرقاً بیان کر دیا جاوے، چنانچہ اس مضمون سے اس کا آغاز ہے اور یہ امر بھی ضروری تذکرہ ہے کہ زیادہ حصہ اس سلسلہ کا اعمال — اخلاق — معاملات — معاشرت سے متعلق ہوگا۔ اور یوں اتفاقاً کسی عقیدہ سے دو طرفہ کوئی بحث آجائے ممکن ہے۔ اب اس کا سلسلہ شروع کرتا ہوں۔

قرآن مجید کے معاملہ میں کوتاہیاں

قرآن مجید کے معاملہ میں چند کوتاہیاں کی جا رہی ہیں۔

ایک یہ کہ بعض لوگ قرآن کے پڑھنے کو قابل اہتمام نہیں سمجھتے۔ پھر ان میں بھی دو گروہ ہیں۔

ہیں بلکہ ان کا عدم اہتمام محض علامت ہے یعنی اس کا استحسان یا نافع ہونا ان کے اعتقاد میں بے منزلہ بوجہ غفلت کے اشتغال یا دوسری حاجات معاشیہ کے اس کو حاصل نہیں کرتے۔ نہ اپنی اولاد کے لئے اس کی سعی کرتے ہیں اس گروہ کی حالت ایک درجہ میں اخف ہے کیونکہ یہ لوگ ایک امر نافع کے تارک ہیں۔ کسی امر مضرت کے مباشر و مرتکب نہیں، کیونکہ لو ہے قرآن کا پڑھنا مجموع امت کے اعتبار سے بغرض اس کی حفاظت کے فرض علی الکفایہ ہے البتہ قدر ما یجوز بہ الصلوٰۃ فرض علی العین ہے۔ اور قدر زائد بما تجوز بہ واجب القرأۃ واجب علی العین ہے۔ تو یہ لوگ کسی فرض یا واجب علی العین کے تارک نہیں ہوئے۔ گو ایک برکت سے محروم ہیں اسی وجہ سے ہم نے اس کو کوتاہی کی فہرست میں شمار کیا ہے

مکاتب قرآن کی ضرورت اور چندے کے آداب

علاج: اس کا یہ ہے کہ ان لوگوں کو ادھر متوجہ کیا جائے۔ اور جتنا ان کا خرچ ضروری سمجھا جائے کسی قدر امداد مالی سے اس کا تدارک کیا جائے۔ کم از کم ان بچوں ہی کو خوراک و پوشاک کے لئے وظیفہ دیا جائے۔ اور ہر بڑے گاؤں میں ایک ایک مکتب قرآن مجید کا قائم کیا جائے اور وہاں کے گرد و نواح کے دیہات کے بچوں کو اس میں تعلیم دی جائے۔

بڑوں کو بھی جب فرصت میسر ہو تھوڑا وقت اس میں دیا جائے، یہ ممکن ہے کہ جنہوں نے شروع کیا ہے بوجہ قلت مناسبت کے یا بسبب عروض عوارض کے سب ختم نہ کر سکیں۔ لیکن تاہم ایک عدد عظیم ختم کرنے والوں کا اس سے بھی حاصل ہو جائے گا اور ایسے مکتبوں کا چونکہ خرچ زیادہ نہ ہوگا۔ اس لئے بیرونی امداد کی طرف مضطر نہ ہوں گے، ہر جگہ کے مکتب کے لئے خود وہاں کے چند صاحبوں کی امداد کافی ہو سکتی ہے مگر اس امداد سے اس کا لحاظ رہے کہ — کسی شخص پر دباؤ ڈال کر یا شرما کر اس سے وصول نہ کیا جائے کہ علاوہ خلاف دین ہونے کے اور بے برکتی کے ایسے چندوں کو ثبات بھی نہیں ہوتا۔

۲ دوسرا گروہ وہ ہے کہ ان کے سبب عدم اہتمام کا استثنار ہے۔ حق رہے یعنی تحصیل الفاظ کو ایک فضول و لایعنی حرکت بلکہ معاش مخل سمجھ کر مضر جانتے ہیں اور پڑھنے والوں کی تحقیر

نا درست یک دماغ خیال کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی تلبیس میں ڈالتے ہیں۔

کوئی صاحب سمجھتے ہیں کہ جب معنے نہ سمجھے تو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ ؟ کوئی صاحب سمجھتے ہیں کہ جب دو سال اس میں صرف ہو گئے یا حفظ کرنے میں دماغ صرف ہو گیا، پھر علوم معاش کے وقت میں گنجائش نہیں ہو گی یا اس میں دماغ کام نہ دے گا۔ کوئی صاحب سمجھتے ہیں کہ بچوں کو قرآن مجید پڑھانے میں اس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ لڑکے بے وضو ہاتھ لگاتے ہیں، سیپارے پھاڑتے ہیں انہیں بے تعظیمی سے رکھ دیتے ہیں، اس لئے ادب کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان کو پڑھایا نہ جائے۔ ۔ ۔ ۔ اس قسم کی باتیں ایسے فریب تراشتے ہیں۔

یہ حضرات غور فرمائیں تو فضول اس کو سمجھتے ہیں، جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور جو شخص خدا کو خدا، رسول کو رسول اور دونوں کے کلام کو صادق مانتا ہے وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔ کہ فائدہ منحصر نہیں ہے فائدہ دنیویہ میں، پھر معنی اس کے انتفاء سے مطلق کا انتفاء کیسے لازم آیا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ مسئلہ عقلیہ ہے۔ کہ خاص کا انتفاء مستلزم نہیں ہوتا عام کے انتفاء کو۔

ہر حرف کے بدلہ دس نیکیاں

جب مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے کلام ہدایت نظام سے ثابت ہے کہ خالی الفاظ پڑھنے سے بھی ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں اور ثابت ہے کہ خالی الفاظ کا پڑھنا بھی عظیم سبب ہے، حق تعالیٰ کی توجہ اور قرب کا ۔

ہاں ! اگر کوئی ان نیکیوں کو اور حق تعالیٰ کی توجہ اور قرب ہی کو مد فضول میں شمار کرے تو اس عالم پر اس سے گفتگو نہیں ہے۔ مخاطب خاص وہ ہی شخص ہے جو خدا اور رسول کی عظمت و صدق کا قائل ہو۔ اور جو اس کا منکر ہو۔ اس کو بتایا جائے اس وقت مخاطب بنانے کے قیامت کے روز انشاء اللہ تعالیٰ دکھا کر کہا جائے گا۔ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ تُکَذِّبُوْنَ (مطففین) یہ وہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

سے مراد قوت حافظہ کا ہے، جو کہ قویٰ دماغیہ سے ہے۔ موجد نے اس کی تصریح کی ہے کہ جس
قوت سے اعتدال کے ساتھ کام لیا جائے تو وہ اس کی ریاضت ہے اور اس ریاضت سے اس
قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ سو اس بنا پر تو حفظ قرآن سے قوت حافظہ بڑھے گی جو کہ علاوہ
معاشیہ میں کام دے گی۔ اور اس حافظہ کے بڑھ جانے سے دوسرے علوم میں دوسرا شخص
جو کام چھ ماہ میں کر سکتا ہے۔ یہ شخص اتنا کام چار ماہ میں کر سکے گا۔ سو حفظ قرآن میں اتنی
مدت بھی صرف نہ ہوگی جتنی کفایت آگے نکل آئے گی ۔۔۔۔!!

البتہ جس کو حفظ سے مناسبت ہی نہ ہو، اس کا ذکر نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لیے حفظ
کرانے کا ہم بھی مشورہ نہیں دیتے۔

یہ عذر تو سب سے زیادہ عجیب ہے کہ قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہے کیا یہ حضرات، خدا کو عالم
الضمیر پر حاضر و ناظر اعتقاد اور خیال کر کے اس پر قسم کھا سکتے ہیں کہ بچوں کو قرآن نہ پڑھانے
کی رائے اس نیت پر مبنی ہے کہ قرآن کی بے حرمتی نہ ہو کیا خدا سے بھی اپنا اس مخفی چیز کو چھپا
سکتے ہیں؟ اگر یہی نیت تھی تو چاہیے تھا کہ ہوش و عقل آنے کے بعد کچھ سمجھدار ہونے پر ان صاحبوں نے تحصیل قرآن کی
طرف توجہ کی ہوتی۔ بہرحال اس گروہ کی حالت پہلے گروہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ خود پڑھنے کا اہتمام
نہ کرنا دونوں میں مشترک ہے پس ایک گونہ ہی تو یکی جوتی ہے۔

دوسری کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ بہت لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں، مگر پڑھ کر پھر اس کا دھیان نہیں رکھتے
بلکہ ان میں بعض ــــــ حفاظ ایسے ہیں وہ فخر کرتے ہیں کہ ہم نے سال بھر تک کھول کر بھی نہیں دیکھا باوجود
اس کے ہم نے رمضان میں سنا دیا۔ اس نادانی کی بھی کوئی حد ہے کہ جو بات عیب کی تھی اس کو
ہنر سمجھ کر اس پر فخر کیا جاتا ہے ۔۔۔۔!!

جس چیز کا انسان ادب کر لیتا ہے کسی نہ کسی صورت میں اس کو برت بھی لیتا ہے۔

ان صاحبوں کو سمجھنا چاہیے کہ مقصود پڑھنے سے تو یہ تھا کہ ہمیشہ اس کی تلاوت کے برکات حاصل
کی جائیں، جب یہ نہ ہوا تو پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہو گیا۔ بلکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے۔ اور ایک حدیث
میں بھی یہی مضمون آیا ہے کہ قرآن مجید نہ پڑھنے سے اس سے ایسی بے مناسبتی ہو جاتی

ہے کہ پھر دیکھ کر بھی نہیں چلتا۔ یہ تو ناظرہ خوانوں کے بھولنے کی حد ہے اور حافظ کے بھولنے کی حد یہ ہے کہ مشکل سے پڑھ سکے، صحیح یہ ہی ہے اور نسیان قرآن پر حدیثوں میں وعید شدید آئی ہے۔ اجرت کہ کتنے دنوں تک کی کڑی محنت جو کہ پڑھنے میں برداشت کی تھی۔ اس کے ضائع کر دینے کیلئے دل کیسے گوارا کرتا ہے؟ دوام تلاوت میں بعض لوگ کم فرصتی کا عذر کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ جس چیز کا فکر انسان کو ہوتا ہے کسی نہ کسی صورت میں اس کو کر ہی لیتا ہے۔ خاص کر جبکہ کام بھی آسان ہو۔ کیا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں سے آدھا گھنٹہ کلام مجید کے ساتھ شغل کی نسبت رکھتا ہے: مثلاً کہ اس میں اگر ناظرہ خواں ہو تو ایک پارہ اور اگر حافظ ہے تو ایک یا ڈیڑھ پارہ بے تکلف پڑھ لیا کرے اور اتفاقاً ناغہ ہو جانا دوسری بات ہے اس سے زیادہ وقت تو فضولیات و خرافات میں صرف ہو جاتا ہے جس میں نہ نفع دین نہ نفع دنیا۔

کیا توبہ توبہ قرآن مجید کی ان فضولیات کی برابر بھی وقعت نہیں ہے کہ فضولیات کے لئے تو فرصت ہو جایا کرے اور قرآن مجید کے لئے نہیں ہوتی۔

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ بعض دوام بھی پڑھتے ہیں مگر اس کی تصحیح کی طرف اصلاً توجہ نہیں فرماتے نہ مخارج کی خبر نہ صفات کا اہتمام نہ وقف و وصل کی رعایت سے مناسبت۔

کوئی صاحب ض کو صاد مخرج ظا سے ادا کرتے ہیں اور کوئی صاحب مخرج دال سے، ث س ص سب ہی ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، الف کے موقع پر زبر نیچے پڑھنا اور فتح کی جگہ الف ملا دینا، بعض کی عادت ہو گئی ہے۔ نہ بے موقع وقف کر دینے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے بعض مواقع پر معنی میں فساد ہو جاتا ہے۔ اگر سانس ٹوٹنے سے اس کی طرف مضطر ہو۔ تو ایسا کرے کہ جس لفظ پر وقف کیا ہے۔ اس کا پھر آگے پڑھنے میں اعادہ کرے۔ البتہ وصل سے ایسا فساد لازم نہیں آتا۔

اہل علم کی کوتاہیاں

نہایت افسوس سے کہا جاتا ہے کہ اس کوتاہی میں اہل علم کا نمبر غیر اہل علم سے کچھ بڑھا ہوا ہے، حتیٰ کہ ایک صاحب سورۂ ناس میں۔ من الجنۃ والناس۔ کو اس طرح پڑھتے ہیں،

من الجنّات والناس - پھر جتنے ان میں سب جلد کے امام ہوتے ہیں۔ اس وقت اس غلطی کا اثر دوسروں تک بھی دو طور سے پہنچتا ہے۔

ایک یہ کہ اگر کوئی مقتدی صحیح خواں ہوا۔ تو ان کی نماز ان امام صاحب کے پیچھے نہیں ہوتی اور چونکہ غلط خواں کا حکم صحیح خواں کی نسبت سے اُمّی کا سا ہے بہ نسبت قاری کے۔ اس لئے اس خاص صورت میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہ امام کی نماز ہوتی ہے نہ دوسرے مقتدیوں کی پس کتنی بڑی تباہی کی بات ہے۔

دوسرے اس طور سے کہ یہ امام صاحب اگر زمرۂ اہل علم ہوئے تو طلباء کی عوام میں جو وقعت ہوتی ہے جس کا ترک ایک گونہ عار کے اتباع و اقتدا تک بھی سرایت کر سکتا ہے ہر چند کہ تجوید کے وجوب کے متعلق کلام موجب و مقتضی تفصیل ہے مگر اتنی قدر میں کسی کو کلام نہیں کہ جس قسم کی غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی تصحیح واجب علی الاعیان ہے جب تک کہ عدم قدرت و عدم مساعدت لسان متحقق نہ ہو جائے۔ جس کی کوئی دلیل یہ ہے کہ بدون اس قدر تصحیح کے قرآن کی عربیت باقی نہیں رہتی اور عربیت بدلالت نصوص لوازم قرآن سے ہے۔ پس اس کے نہ رہنے سے قرآن نہ رہے گا۔ پس اس کی ضرورت میں کیسے اشتباہ ہو سکتا ہے!

اس میں قرآن کی یا عربی کی کیا تخصیص ہے؟ ہر زبان کی صحت اس کے خاص طرز ادا پر موقوف ہے مثلاً لفظ 'پنکھا' اور 'رنگ' میں اخفا ہے۔ اگر نون میں اظہار کیا جاوے یقیناً لفظ غلط ہو جاوے گا اور لفظ 'گنبد' و 'دنبہ' میں قلب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یقیناً لفظ غلط ہو جائے گا۔ مگر بات یہ ہے کہ قلوب میں ادراک نہیں رہا۔ شعائر قومیت کی رغبت، نفع دنیا کے برابر بھی نہیں رہی انا للہ وانا الیہ راجعون (بقرۃ ۱۵۶) (ہم اللہ تعالیٰ ہی کا مال ہیں، اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)

تصحیح قرآن مدارسِ عربیہ میں

کل حروف انتیس ہیں۔ ان میں بعض بعض تو قریب قریب صحیح نکلتے ہیں۔ ان کو مستثنیٰ کر کے جن میں اہتمام کی ضرورت ہے تقریباً ایک درجن یعنی بارہ ہیں: جیسے ث ۔ ح ۔

د ۔ ص ۔ ض ۔ ط ۔ ظ اور ع بالکل ہیجانی ہیں۔ ان کے لئے اتنے ہی اور ہیں جیسے ث ۔ ذ ۔ ش ۔ غ ۔ خ ۔ ف ۔ ق ۔ اگر کسی ماہر کو مشق کرکے ایک گھنٹہ روزانہ مشق کے لئے نکالا جائے تو روزانہ ایک حرف کی ضروری مشق ہو سکتی ہے جس میں ایک ہفتہ اور ہیجانی کے لئے دو ہفتہ کافی ہیں۔ اگر احتیاطاً اس سے دوگنی مدت لی جائے۔ تو آدھا مہینہ اور ایک مہینہ نہایت غایت صرف ہوتا ہے تو کیا دین کی اتنی بڑی ضرورت کے لئے اپنی اتنی بڑی عمر میں سے اتنا حصہ بھی نہیں دے سکتے ہو؟ کتنا بڑا غضب اور ستم ہے؟

اسی طرح مد اور الف کی مقدار کا فرق: اگر ایک پارہ میں اس کی درستی ہو جائے تو تمام قرآن یکساں ہی تمام کے لئے کافی ہے۔ اگر ایک رکوع روزانہ درست کر لیا جائے، تو یہ کام تبھی چند روز میں روز سے زیادہ کا نہیں ہے۔ پھر بقیہ قرآن بھی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے کسی ماہر کو سنا دینا۔ جو متفرق اوقات میں نہایت سہل ہے زیادہ اطمینان اور احتیاط کی بات ہے۔

بعض لوگوں کو ماہر قراءۃ میسر نہ آنے کا بہانہ ہوتا ہے لیکن وہاں تو اتنی تھوڑی مہارت رکھنے والے اکثر جگہ ایک دو پائے جاتے ہیں اور اگر بالفرض کوئی میسر نہیں تو چند آدمی مل کر کسی ماہر کو بلا کر رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جہاں کوئی طبیب نہیں رہا۔ بستی والوں نے چندہ کر کے تنخواہ دار طبیب کو رکھا ہے۔ پس فرق وہی ضرورت اور عدم ضرورت کے اعتقاد یا استحضار نفقہ کا ہے۔ یا بستی میں سے دو چار ہونہار شخصوں کو سفر میں بھیج کر ماہر ہوا سکتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے کلام پاک میں یہ صورت بھی داخل ہے۔ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین (التوبہ ۱۲۰) سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں۔ بلکہ اگر باہر سے کسی ماہر کو بلا کر رکھا جائے یا بستی میں سے کسی کو باہر بھیج کر ماہر بنوایا جائے تو اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے کہ بچے جس وقت قرآن پڑھیں، پڑھنے کے ساتھ ہی اس تصحیح کا اہتمام رہے کیونکہ اس میں کوئی تکلیف ہے نہ غلط یاد کرکے پھر تصحیح کی جائے اگر ابتدا ہی سے صحیح پڑھایا جائے، پھر بالخصوص زمانہ صبا میں تو یہ صحت ان کے لئے شق اور طبعی کے ہو جائے اور مشقت کا ایک بڑا حصہ مختصر ہو جائے۔

امام مقرر کرنے کے آداب

اس کا بھی التزام رکھیں کہ جب کسی کو مسجد میں امام مقرر کریں۔ کسی ماہر کو اس کی متعدد مختلف سورتیں سنوادی جاویں۔ اگر وہ صحت کی تصدیق نہ کرے تو کسی ماہر کو تلاش کریں۔ اگر ارزاں نہ ملے گراں لادیں۔

کیسی ظلم کی بات ہے؟ کہ ہر دنیوی کام کے لئے ذی ہنر اور ذی لیاقت آدمی ڈھونڈا جاتا ہے مثلاً کاریگر، لوہار، معمار، سنار، پنکھا کھینچنے والا تک بھی، اور خدا کے دربار میں جو سب مخلوق سے وکیل بن کر کھڑا ہوتا ہے وہ چھانٹ کر ایسا رکھا جاتا ہے جس میں نہ کمال نہ جمال، تمام محلہ میں جو ناکارہ — اندھا، چندھا، فاتر الحواس — گنوار — بدتمیز — جاہل، ہر غرض جو کسی مصرف کا نہ ہو، اس کو امامت کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون البقرہ ۱۵۶ ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

مشائخ اور اہل مدارس کیلئے دستور العمل

اہل مدارس اس کا التزام رکھیں کہ جو طالب علم ان کے مدرسہ میں داخل ہونا چاہیں اتفاقاً حفظ کا ایک جزو دو اجزاء سے زیادہ نہیں، تو ہر ہر درجہ میں بھی صحت قرآن کو بھی شرط کر دیں — اور بدون تجربہ صحت یا بعض حالات میں کم از کم وعدہ تصحیح کے ضرور لے لیا جاوے بدون اس کے داخل نہ کریں اور وعدہ کی صورت میں جتنے سبقوں کا وہ مستحق ہے ان میں سے ایک سبق کی جگہ اس تصحیح کو رکھیں اور اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد پورے سبقوں کی اجازت دیں۔ اور جن مدارس میں گنجائش ہے ان کو ایک مدرس تجوید کا مدرسہ میں بڑھانا ضروری ہے۔ اس طریق سے یہ فن عام ہو سکتا ہے۔

اسی طرح مشائخ کو چاہیئے کہ اپنے مریدوں کو خصوصی خلفاء کو صحت قرآن پر مجبور کریں۔ کیا ظاہر یا باطن کا مقتدا بنایا جائے؟ اور بچوں سے بھی کم ہو کیا یہ معیوب نہیں؟

تجوید میں افراط وتفریط

چوتھی کوتاہی یہ ہے کہ بعضے تصحیح وتجوید کو بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر کاوش اور بحث ہی تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ جیسا اس وقت لوگ ض۔ظ میں الجھنے والے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر انشاء اللہ تعالیٰ ادا کے نام خاک بھی نہیں۔ بعضے عمل تک پہنچنے کا ارادہ کرتے ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ یعنی صرف لہجہ کا نام قرات سمجھ کر اسی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور یا تو خود کوئی طبعی لہجہ اختراع کرتے ہیں اور یا کسی مشاق کی نقل اتار لیتے ہیں اور تار چڑھاؤ وسمت وزن میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ بعضے ضروریات یا مستحسنات قرأۃ بھی فوت ہو جاتے ہیں یعنی حرف گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ یا غنہ یا مد حذف کر دیتے ہیں تاکہ وزن ٹھیک رہے!!

سو اس کی نسبت سرکار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اقرؤا القرآن بلحون العرب واصواتها وایاکم ولحون اہل العشق واہل الکتابین۔[1] (تم قرآن شریف کو عرب کے طریقے اور ان کے لہجے میں پڑھو عاشقوں اور اہل کتاب کے طریقوں سے بچو)

یعنی ایسے لحن سے منع فرمایا ہے اور اس لحن کو عرب سمجھنا خطاء عظیم ہے۔ جیسا شراح حدیث نے تصریح کی ہے بلکہ یہ لحن اہل عشق واہل کتاب میں داخل ہے جس کو منع فرمایا ہے اور اگر یہ لحن عرب ہوگا تو لحن اہل عشق کون ہوگا۔ پس خود حدیث کے الفاظ تو اس زعم کی تغلیط کر رہے ہیں۔ اور لہجہ کا اہتمام تجوید میں تفریط ہے اور بعضے حقیقت صحیح سمجھتے ہیں۔ مگر خوش آہنگی کے ایسے مخالف ہیں کہ اس کا اہتمام نہیں کرتے ہیں کہ تحسین فوت نہ ہونے پائے اور کسی کو ذرا تحسین صوت کرتا دیکھتے ہیں تو اس پر گانے کا ظن کرتے ہیں اور یہ تجوید میں افراط ہے۔ مثل تفریط مذکور کے یہ بھی نصوص کے خلاف ہے۔

حسن صوت اور گانے کا فرق

زینوا القرآن باصواتکم اور نیز وہ حدیث کہ (قرآن شریف کو اپنی آوازوں کے ساتھ زین

---

[1] مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۹۱ عن حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحوالہ بیہقی ۱۲ محمد علی غفرلہ۔

کرو : اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عرض پر کہ لوعلمت انک تستمع لقرائتی لحبرته لک تحبیرا (وغیرہ) اگر میں جانتا کہ آپ میری قرأۃ سن رہے ہیں تو میں اس کو درست کرتا۔ آپ کا انکار نہ فرمانا صریح تقریری اس تحسین صوت بالقصد کی مشروعیت و مطلوبیت میں نص صریح ہیں۔ اور یہ ہی ہے وہ تغنی جس کا امر چند حدیثوں میں مروی ہے اور اس میں اور گانے میں فرق ظاہر ہے یعنی گانے میں تو لہجہ مقصود ہوتا ہے اور قواعد تابع ہیں۔ اگر لہجہ کے بنانے میں قواعد بگڑ جاویں تو پروا نہیں کی جاتی اور تحسین صوت میں قواعد مقصود اور حسن صوت تابع ہے یعنی اگر قواعد کو محفوظ رکھ کر خوش آوازی ہو سکے تو اس کی رعایت کی جاتی ہے ورنہ اس کی پروا نہیں کی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ——————— اور بلا مقصود اگر کسی شخص کی قرأۃ کا کوئی جز کسی قاعدہ موسیقی پر بھی طبیعت کے تناسب یا موزونیت کی وجہ سے منطبق ہو جاوے تب بھی وہ گانے میں داخل نہیں، جیسا کہ خود قرآن مجید میں شعر یت کی جا بجا نفی کی گئی ہے، مگر بعض عبارت یقیناً اوزان شعر پر منطبق ہیں۔

جیسے ثم اقررتم و انتم تشھدون ثم انتم ھؤلاء تقتلون (البقرہ ۸۴-۸۵) پھر تم نے اقرار کر لیا اور تم جانتے ہو پھر تم وہ لوگ ہو کہ دیسے ہی خون کرتے ہو آپس میں، فاعلاتن فاعلن فاعلات پر منطبق ہے مگر باوجود انطباق، ہرگز اس کے پڑھنے والے کو شعر کا پڑھنے والا نہ کہا جائے گا۔

البتہ اگر بقصد تطبیق پڑھے گا شعر پڑھنے والا، اور قرآن میں ایسا کرنے سے ناجائز فعل کا ارتکاب کرنے والا کہا جائے گا۔ بس یہی حالت لہجہ کی بالقصد تطبیق کی ہے غرض اس چوتھی کوتاہی کی دو جانبیں ہیں۔ تفریط، افراط، دونوں سے بچنا وہ ہے جس کو لحون عرب و اصواتہا و عروب کا طریقہ اور ان کی آواز میں فرمایا گیا ہے۔

تجوید بلا رضائے حق؟

پانچویں کوتاہی یہ کہ بعضے تجوید پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ مجالس یا حالت امامت میں جب پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے اس پر عمل بھی کرتے ہیں مگر جب خلوت میں تلاوت یا حالت

انفرادی نماز ادا کرتے ہیں اس وقت اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتے جس سے معلوم ہو
کہ قرآن کی تصحیح سے غرض نہ رضاء حق بھی ہے نہ رضائے خالق ؟ کیا کسی فعل کے کسی ثمرہ کے ترتب
کے لئے قوت و استعداد کا مرتبہ کافی ہے ؟ یا صدور فعلیت کی ضرورت ہی کیا تجوید پر صرف
قدرت ہونے سے تجوید کے ثمرات مثل ادائے وجوب و تضعیف اجر و رضائے حق و ادائے
حق حاصل ہو سکتے ہیں ؟ یا اس کے عمل و اجراء کی بھی ضرورت ہے ؟

کیا کسی قاری کو بعض نسخے یاد کر لینے سے صحت ہوتا ہوا بھی دیکھا ہے ؟ یا اس کے استعمال
کی بھی ضرورت ہوتی ہے ؟ بالخصوص سری نمازوں میں تو غنہ اور مد و اظہار و اخفاء کا تو کیا ذکر ہے ؟
غالباً بلکہ یقیناً مخارج و صفات حروف پر بھی نظر نہیں ہوتی جو کہ لوازم حروف سے ہیں اور وہ
نہیں تو حروف نہیں ، اور جب حروف نہیں ، جو کہ بسائط ہیں تو قرآن کی عبارت نہیں
جو کہ مرکب تھی ، اور جب عبارت نہیں تو قرات نہیں ، تو نماز کہاں ؟ فلیتدبر بہ اولو الالباب
(بار بار غور و فکر کریں) مسئلہ بنا بر عام کے پیش نظر کہ اس پر فتویٰ نہ دینا یہ دوسری بات ہے
مگر ترک واجب کے گناہ سے بچنے کے لئے بھی عموم بلوی کافی ہو سکتا ہے . و من لنا بذلک (اس
کی گنجائش دیتا ہے ؟) اور گو مستحبات سے قطع نظر کی جائے مگر ضروریات کی حفاظت سے
تو چارہ نہیں !

معانیٔ قرآن سے غفلت

بعض کوتاہی یہ ہے کہ قرآن کے معنی جاننے کی رغبت جس قدر کم پائی جاتی ہے ، قریب
قریب نہ ہونے کے ہے ، سخت افسوس کی بات ہے ! کہ جو اصل جز ہے اسلام کا ، جو منبع
ہے تمام دینی علوم کا ، جو اساس ہے دارین کے فلاح کا ، جو خلاصہ ہے معاملہ و خطاب
کا ، اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کی امت کو ، تعبیر و تدبیر کا شوق ہماری
اس جمود و خمود کی کوئی انتہا بھی ہے ؟ ...... شاید بعض طالب علم یہ ذکر کریں کہ ہم کو تو شوق
تھا جب ہم نے تفسیر پڑھی سو کہنا تو زبانی بات ہے ، اور لغات سے کچھ اور بات ہے۔
اگر لغات سے غور کریں تو اس کا نام رغبت رکھنے سے خود ان کو مزید شرم آوے گی ۔ غور

کر کے بتا دیں کہ اگر تفسیر درس میں داخل نہ ہوتی، کیا اس وقت بھی پڑھتے؟ چنانچہ جو کتاب تفسیر کے درس میں داخل ہے۔ اس سے زیادہ بھی کوئی پڑھتا ہے؟ بلکہ اس سے بھی مختصر لیے پر نظر ہوتی ہے۔ جب آخر سال میں پانچ پارے جلالین کے رہ جاتے ہیں تو کیا آئندہ سال یا پھر کبھی موقع پر اس کو پڑھتے ہیں؟ یا مرادکر جلالین ہی ختم کرنی، تو کیا تمام ضروری مضامین پر اس سے عبور ہو گیا؟

کیا مدارک یا ابوالسعود یا بیضاوی[1] میں کوئی مضمون جلالین سے زائد نہیں ہے، پھر اس کو کوئی پڑھتا ہے؟ میں سچ کہتا ہوں۔ اگر جلالین بھی درس میں نہ ہوتی تو اس کو کوئی بھی نہیں پڑھتا، اور جلالین بھی پڑھی تو کیا پڑھی؟ اس کو ختم کر کے اتنی استعداد بھی تو نہ ہوئی کہ اگر جلالین کے خالی بغیر ترجمہ قرآن ان کے ہاتھ میں دیدیا جائے تو ایک رکوع کا ترجمہ اور ضروری حل کر دو، تو اسی کو حل کر سکیں؟ ہرگز نہ کر سکیں گے۔ ہاں جلالین مثلاً کر دے دو، تو کچھ حال دیکھ کر لیں گے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کے معنی مقصود حاصل کرنے نہ تھے، بلکہ جلالین مقصود تھی۔ پھر کیا اس کو شوق و رغبت قرآن کہا جا سکتا ہے؟ میری رائے میں خاص اس جزو کا کہ بدون جلالین کے مطلب قرآن نہ بیان کر سکیں گے۔

اہل مدارس کو مشورہ

مدارک یہ ہے کہ اہل مدارس طرز تعلیم میں کچھ ترمیم کریں جیسے بعض متون بدون شرح کے پڑھائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جلالین سے پہلے قرآن مجید بھی بدون کسی خاص تفسیر کے زبانی حل کے ساتھ پڑھایا جایا کرے[2]۔

یا تو پورا قرآن پہلے پڑھا دیا جائے یا ایسا کریں کہ مثلاً پہلے پارہ اوّل خالی قرآن میں پڑھا دیا پھر اسی قدر جلالین پڑھا دی اور مدرس اپنی سہولت کے لئے خواہ جلالین پاس رکھیں یا اور کوئی بسیط تفسیر تو طلباء کو اسی طرح پڑھنے میں اسی طرح یاد کرنے کی اور مطالعہ کر کے حل کرنے کی عادت

---

[1] الحمد للہ دارالعلوم کراچی میں شروع ہی سے اس مبارک طریق پر کام جاری ہے۔ محمد شفیع عفی عنہ

[2] جلالین، مدارک، ابوالسعود، بیضاوی، اتقان قرآن شریف کی مشہور تفاسیر ہیں ۱۲ محمد علی

پڑھا دی جاوے گی۔

پس اس جزو کا بہت آسانی سے تدارک ہو جاوے گا۔ چونکہ جلالین میں تتبع فنونِ تفسیر کافی نہیں، اس لیے کم از کم اتقان کو ضرور داخلِ درس کیا جاوے۔ یہ بیان تھا مدرسین کی کوتاہی کا۔

معانیِ قرآن میں رغبت کرنے والوں کی بے پروائی۔

ساتویں کوتاہی ان کی ہے، جن کو معانیِ قرآن کی کسی درجہ میں رغبت ہے ۔۔۔۔۔ مگر کوتاہی یہ ہے کہ وہ بدون اس کے، کہ کسی استاد سے یہ فن حاصل کیا ہو یا دوسرے علوم عالیہ عربیہ پڑھے ہوں اردو کا کوئی ترجمہ یا تفسیر خرید کر (گو مصنف کا معتبر ہونا بھی تحقیق نہ ہو یا اس میں احتیاط بھی کی ہو) بطور خود اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ان میں بھی دو قسم کی جماعت ہیں — ایک معتقد علماء کی — دوسرے کچھ انگریزی پڑھ کر یا انگریزی خوانوں کے پاس رہ کر خود اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے — مشترک خرابی تو یہ ہے کہ اس حالت میں فہم معانی میں بکثرت غلطیاں رہ جاتی ہیں چنانچہ اس پر واقعات کثیرہ شاہد ہیں۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ

(۱) اول تو ایک زبان جب دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر آتی ہے۔ ضرور بعض مضامین اصلی رنگ پر نہیں رہتے۔

(۲) دوسرے بہت سے مقامات میں خود اجمال ہے، جو بدون تفصیل کے وجوہ متعددہ کو محتمل ہوتا ہے، بعض وجوہ کی تعیین بلا دلیل کر لی جاتی ہیں، جس طرح قانون کی کوئی کتاب اردو کے بڑے فاضل کو دی جائے اور وہ اس کو بیان کرے مگر قانون دان اس کو سن کر بہت جگہ غلطی بتلا دے گا۔

(۳) تیسرے یقیناً فہم قرآن میں بعض دوسرے فنون نقلیہ و عقلیہ کی حاجت ہے، جو شخص اُن سے بے خبر ہے وہ قطعاً غلطی میں پڑے گا۔

دوسری جماعت میں بالخصوص یہ خرابی ہے کہ ان کی غلطی پر بھی اگر کوئی مطلع کرے تو وہ اپنے کو اس بتلانے والے سے افضل اور عاقل سمجھ کر اس کی نہیں سنتے اور عجیب نہیں بلکہ یقیناً اس غلطی پر جم جاتے ہیں پھر بعض اوقات بنا فاسد علی الفاسد کے طریق پر دوسرے اور مسئلوں کو اس پر

منزہ کر لیتے ہیں۔

طریق اصلاح

ان دونوں یعنی چھٹی اور ساتویں کوتاہی کے مجموعہ کی اصلاح یہ ہے کہ اگر کسی قدر علم یا صحبت علماء کی برکت سے فہم صحیح حرف شناسی حاصل ہو۔ تب تو کسی محقق عالم سے کوئی ترجمہ یا مختصر یا متوسط تفسیر دریافت کر کے ان ہی عالم سے سبقاً سبقاً تمام قرآن کا ترجمہ یا تفسیر خوب سمجھ کر ختم کر لیں اور جن مقامات میں باوجود سمجھانے کے سمجھ میں نہ آویں، یا کچھ شبہ رہے، اس کے درپے نہ ہوں، بس زبانی مقصد شرعی اس عالم سے دریافت کر کے اس پر اعتقاد رکھ کر تفتیش چھوڑ دیں۔ اور ایسے مقامات پر نشان بنادیں۔ پھر جب تلاوت کریں تو تھوڑا سا مطالعہ اس ترجمہ یا تفسیر کا بھی کریں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس طرح معانی قرآن سے مناسبت بڑھ جاوے گی کہ یاد و فہم دونوں میں سہولت اور ترقی ہوگی اور دونوں میں سہولت اور ترقی ہونے سے طبعاً رغبت بڑھے گی، پھر دونا آسان ہوجائیگا اور تدبر و عمل میں بھی جن کا ذکر آگے آتا ہے اس سے اعانت ہوگی۔ اور اگر اس قدر استعداد نہیں ہے تو پھر اس کے معانی پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ

معانی قرآن پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ

چند اشخاص مل کر، اگر کوئی عالم بلاتنخواہ میسر ہو جاویں تو فبہا، ورنہ تنخواہ پر رکھ کر ان سے استدعا کریں کہ روزانہ یا چوتھے پانچویں روز معین وقت پر ایک یا نصف رکوع کا خلاصہ مطلب، عام فہم زبان میں بطور وعظ فرمادیا کریں۔ اسی طرح قرآن کو ختم کردیں۔ اگر ہمت ہو تو پھر دوبارہ شروع کردیں اور جو شبہ پیدا ہو اس کو زبانی پوچھیں جو سمجھ میں نہ آوے اس کو چھوڑ دیں اور حکم شرعی پوچھ کر اس پر کاربند رہیں۔

قرآن کے الفاظ و معنی میں کوتاہیاں۔

آٹھویں کوتاہی جو الفاظ و معنی دونوں کے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ بعضے لوگ الفاظ

و معانی کو کسب دنیا کا ذریعہ بناتے ہیں مثلاً

- بعض تراویح میں اجرت پر سناتے ہیں۔
- بعضے مردوں پر پڑھ کر اجرت لیتے ہیں ـــ یہ طلب مال تھا۔
- بعضے تعریف کرانے کی غرض سے مجالس میں یا محاریب میں انداز بنا کر پڑھتے ہیں ـــ یہ طلب جاہ ہے، اور یہ سب الفاظ کے ذریعہ سے ہے۔
- بعضے واعظ کہہ کر نذرانہ لیتے ہیں۔ بلکہ پہلے ہی نذرانہ طے کر لیتے ہیں۔
- بعضے شہرت کے لئے وعظ کہتے ہیں ـــ یہ معانی کے ذریعہ مال یا جاہ کی تحصیل ہے

مسئلہ منصوصہ و اجماعیہ ہے کہ طاعت پر اجرت لینا اور اسی طرح کا ریا کرنا معصیت ہے البتہ اتفاقاً بعض تعلیم پر اجرت لینا بجواز متفق ہے اور تذکیر پر اجرت لینا مما اختلف فیہ اعمال بالنیۃ ... اسی طرح مسائل میں اگر وعظ کا ذکر ہی ہو اس وقت تنخواہ لینا بے شک ... یہ مستثنیٰ اور بعض کتب فقہیہ میں جو مذکر (واعظ) کو کچھ مال لینے کی اجازت لکھی ہے۔ اس کا محمل وہی ہے ورنہ فقہیہ کے کلیہ سے غیر مجتہدین کا کسی جزئیہ کو مستثنیٰ کرنا عجز ہے۔

اصلاح کی ضرورت

اس کی اصلاح میری رائے میں دو ہیں۔

ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو کوئی دنیا کا کام بھی سکھلایا جائے تاکہ وہ مستغنی ہو کر دین کو غرض نہ بنائیں۔ اور اس کے لئے سہل صورت یہ ہے کہ امراء چندہ کر کے عام یا صنعت و حرفت کے مدرسے کھلوا دیں اور بچپن ہی سے سب کو کوئی نہ کوئی دستکاری ضرور سکھلائی جاوے۔

دوسری یہ کہ جو کسی وجہ سے نہ سیکھیں یا سیکھنے سے معذور ہوں اور محض خدمت دین ہی کے لئے فارغ ہوں تو ذی نعمت لوگوں کو ان کی خدمت کرنی چاہئے کہ ان کی ضروری حاجات تو پوری ہوتی رہیں تاکہ ان کی نیت بگڑنے نہ پائے۔

یہ تو ہوئی الفاظ و معانی سے متعلق کوتاہی جس میں الفاظ و معانی کو بحال خود باقی رکھ کر اس سے دنیوی غرض حاصل کی گئی۔ اس سے اقبح اور اشنع وہ ہے کہ ایسی اغراض مال و جاہ کے لئے

• - جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے، وضو کرکے رو بقبلہ، اگر سہل ہو، ورنہ جیسے موقع ہو خشوع کے ساتھ بیٹھے۔

• - یہ تصور کرے کہ حق تعالیٰ مجھ سے فرمائش کرتے ہیں کہ تم کچھ پڑھ کر سناؤ۔

• - یہ تصور کرے کہ اگر کوئی مخلوق مجھ سے ایسی فرمائش کرتی تو میں کیسا پڑھتا؟ تو حق تعالیٰ کی فرمائش میں تو زیادہ رعایت چاہیئے اور اس کے بعد تلاوت شروع کرے۔

اور جب یہ تصور ضعیف ہو جائے تلاوت بند کرکے اسی مراقبہ کو پھر تازہ کرے، البتہ اگر محض تلاوت مقصود ہو اور اتنی مہلت نہ ہو کہ مقید ہو کر بیٹھ سکے تو ان آداب میں تخفیف ہو سکتی ہے۔ مگر تجوید بقدر واجب میں تخفیف جائز نہیں۔

عمل سے غفلت

دوسری کوتاہی یہ ہے کہ بعضے سب طرح کے ادب آداب کرلیتے ہیں مگر جو ان سب سے مقصود عظیم ہے، اور قرآن کا سب سے بڑا حق ہے یعنی — عمل، اس کا کچھ بھی اہتمام نہیں کرتے، چونکہ اس کے اعتقاد کی ضرورت میں کسی کو کلام نہیں اس لئے ہم اس میں تطویل نہیں کرتے۔ البتہ یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ — عمل کا طریقہ وہی معتبر ہے جو سلف نے بتایا، اور عمل کرنے میں ان سب علوم کی بھی جن کا صحیح و حجت ہونا خود قرآن نے بتایا ہے یعنی حدیث و فقہ و کلام و تفسیر اور تصوف، جو سلف کے خلاف نہ ہو۔

افسوس! بعضے لوگ اس دولت قرآن کا اتنا ہی حق سمجھتے ہیں کہ اس کی قسم کھالی، بیمار کو اس کی ہوا دے دی، اس سے فال نکال لی، بچہ کا نام نکال لیا، چوری کے شبہ میں لوٹے پر یٰسین پڑھ کر اس کو گھما دیا، کوئی مر گیا دو چار ختم پڑھوا دیئے۔ یا کہیں کہیں دستور ہے کہ ایک قرآن کے عوض میت کے سارے گناہ فروخت کر لئے، یا تعویذ بنا کر بازو پر باندھ لیا۔

افسوس! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تئیس سال تک اس کا نزول اور مخالفین کی اذیت پر تحمل بس ان ہی مقاصد کے لیے تھا؟؟

تیسری کوتاہی یہ ہے جو علوم قرآنیہ کے بیان کی کتب ہیں ان میں ایک ہے، کسی میں مشغول کسی

نعوذ باللہ من غضب اللہ وغضب رسول اللہ (یعنی ہم اللہ کے غضب سے اور اللہ کے رسول کے غضب سے پناہ پکڑتے ہیں) مگر وقت ہوگا کہ لاینفع النادم ندمہ حیث ان الندم حل وھو دار الجزاء لا دار العمل۔ اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضیٰ واجعل آخرتنا خیرا من الاولیٰ (یعنی شرمسار کو شرمندگی نفع نہ دے گی اس وجہ سے کہ ندامت ایک عمل ہے اور وہ دار الجزاء ہے نہ کہ دار عمل۔

قرآن سے نام نکلوانا ادب کے خلاف ہے

نیز بعض متفرق کوتاہیاں قرآن مجید کے معاملہ میں کہ جس کے الفاظ یا معانی یا حقوق یا جس کے مقاصد و اغراض ادب کے خلاف ہیں۔ اور بعض عنوان میں آئیں وہ بلا لحاظ کسی خاص ترتیب کے معروض ہیں۔

(۱) بعض کی عادت ہے کہ بچہ کا نام رکھنے کے لئے قرآن مجید میں کسی خاص طریقہ سے جو خود ان کا مقرر کیا ہوا یا ان کے کسی معتقد فیہ (عامل) کا ہے کہ جس اعتقاد کو بنی صحیح ہو یا غلط (منقول ہوتا ہے) غور کرتے ہیں تو اتفاق سے اس موقع پر کوئی نام لکھا ہوا مل گیا تو وہ ورنہ کوئی حرف جو شروع سطر وغیرہ میں مل گیا ہے کہ اس حرف سے جو نام شروع ہو وہ نام متعین کر دیتے ہیں۔ اور اگر جاہل ہوئے تو خود سمجھتے نہیں ورنہ دوسرے جاہل کو بلا کر بتلاتے ہیں کہ قرآن مجید سے اس نام کا نکلنا ہے جنھوں نے نام نکلوائی پر کچھ نذرانہ بھی وصول کرتے ہیں اور جاہلوں کو یہ بتلا دیتے ہیں کہ حضرت نے بڑی توجہ سے علم غیب کا راز معلوم کیا ہے ان کی خدمت ضروری ہو گئی ہے۔ —— قرآن مجید میں جس غرض کے لئے موضوع نازل ہوا ہے جس کی تصریح خود کلام مقدس میں ہے۔ کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب (ص ۲۹) یعنی یہ برکت والی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی باتوں پر اور تاکہ سمجھیں عقل والے (جس کا حاصل دین کا علم و عمل ہے) اور اگر اس پر بھی کسی شخص کو منبع ہو اور برکت کے لئے اپنی کسی مباح غرض میں بھی اس سے کچھ اقتباس کر لے تو مضائقہ نہیں۔ البتہ شرط یہ کہ اس میں کسی حدیث شرعی سے تجاوز نہ ہو لیکن قرآن مجید سے ان اغراض میں ایسے طور پر کام لینا کہ یا تو

قرآن سے فال نکالنا

(۲) بعضے کسی مقصد مباح یا غیر مباح میں اذن یا ممانعت معلوم کی تعیین کے لیے اور بعضے اس سے بڑھ کر کسی گذشتہ واقعہ کے معلوم کرنے کے لئے قرآن مجید میں فال دیکھتے ہیں اس کے کسی مضمون سے اپنے مطلب کے مناسب کوئی بات نکال لیتے ہیں، اور اس کی صحت کے معتقد ہوتے ہیں۔

افسوس! یہ آفت نیم ملا لوگوں میں ہے، کیونکہ بے علم آدمی مضمون ہی کو نہیں سمجھے گا جو ماخذ ہے۔ فال۔ کا بجز اس امر اول کے نام لکھا ہوا دیکھ لینا یا کسی حرف کا کوئی نام سوچ لینا یہ تو عامی بھی کر سکتا ہے۔

اب زبردستی کوئی بے علم یہاں بھی بین السطور ترجمہ دیکھ کر یا کسی ذی علم سے اس آیت کا ترجمہ پوچھ کر نیم ملاؤں میں داخل ہو جائیں تو اور بات ہے۔

بہرحال یہ کام وہ کریگا جو اول قرآن کو الٹا سیدھا سمجھ سکے اس لئے ان لوگوں پر زیادہ افسوس ہے، اور اس ناتمام علم سے اس کو، استخارہ، پر قیاس کیا جاتا ہے جب مقیس علیہ ثابت نہ ہو مقیس کیسے جائز!

بعض فال دیکھنے والوں کا یا اکثر ان عام لوگوں کا جو حلقۂ فال میں موجود ہوں، یہ اعتقاد ہوتا ہے، کہ گویا خدائے تعالیٰ نے قرآن سے یہ خبر دیدی ہے، تو اب اس میں احتمال تخلف کا احتمال محال ہے، اور نہایت جرأت سے کہتے ہیں کہ واہ صاحب! کیا قرآن میں غلط لکھا ہے؟ افسوس! ان حرکات پر ہنسی شروع ہو کر اخیر میں رونا آتا ہے!

خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ نمبر ایک میں جو بعض شناعتیں مذکور ہو گئی ہیں کہ ـــــ قرآن مجید کے علم و عمل کو چھوڑ کر، اس سے یہ کام لینا، یا اس کو مدلول قرآن یا ورد فرمودۂ حق سمجھنا جو کہ افراط ظلم و افترا سے ہیں۔ یہاں بھی پائی جاتی ہیں کہ دونوں جگہ مشترک ہیں، اور ان کے علاوہ اور بھی بعض خاص تنبیہات قابل عرض ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود مقیس علیہ بھی واقعاتِ گذشتہ کی تحقیق کے لئے نہیں،
مثلاً کسی کے یہاں چوری ہو جاوے، تو استخارہ اس غرض کے لئے نہ جائز، اور نہ مفید کہ
چور معلوم ہو جاوے، جیسا فال والے، اس قسم کی حکایتوں کو نہ بطور ظرافت کے بلکہ بطور اعتقاد
کے بیان کیا کرتے ہیں۔

استخارے کے ساتھ اعتقادِ باطل کا ہونا

کسی بادشاہ کا موتیوں کا ہار گم ہو گیا تھا، اس نے دیوانِ حافظ میں فال دیکھی، رات کا
وقت تھا، چراغ ایک کنیز کے ہاتھ میں تھا، یہ مصرعہ نکلا ؎

چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد

یعنی چور کتنا بہادر ہے جس کے ہاتھ میں چراغ ہے

پس بادشاہ نے فوراً اسی کنیز کو پکڑ لیا، اور تلاشی لینے سے اس کے پاس برآمد ہوا۔ اوّل
تو ان قصوں کی کوئی سند صحیح نہیں، ثانیاً اگر ایسا واقعہ ہوا ہو تو اتفاق پر محمول ہوگا، کیونکہ لازمت کی
کوئی دلیل نہیں، اور اگر تجربہ سے لازمت پر استدلال کیا جائے، تو ہم بطور معارضہ کہتے ہیں کہ
اگر ایسا ہوا ہے، تو جس بار اس کے خلاف ہوا کہ فال میں کچھ نکلا اور واقعہ کچھ اور تھا، تو تجربہ
یعنی تکرارِ مشاہدہ سے لازمت ثابت ہوئی یا عدمِ لازمت؟
غرض فال کا مقیس علیہ یعنی استخارہ، واقعۂ گذشتہ کے علم کیلئے نہ مفید اور نہ جائز،

فالقیاس باطل چہ دستہ

اور اگر کوئی استخارہ کو اس غرض کے لئے سمجھے ہوئے ہے تو وہ اپنے غلط خیال کی اصلاح
کرے کہ بالکل اعتقاد باطل ہے۔

اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح اس سے واقعۂ گذشتہ نہیں معلوم ہوتا، اسی طرح واقعۂ
آئندہ بھی کہ فلاں بات یوں ہوگی، معلوم نہیں کیا جا سکتا،

بس استخارہ[1] کا صرف ...... اتنا اثر ہے، کہ جس کام میں تردد ہو، کہ یوں کرنا بہتر ہے، یا یوں؟ یا یہ کہ کرنا بہتر ہے؟ یا نہ کرنا؟ تو اس عمل مسنون سے (کہ حاصل اس کا دعا ہے اس امر کی کہ جو میرے لئے مصلحت ہو میرا قلب اس پر مطمئن ہو جائے اور ویسا ہی سامان غیب سے ہو جائے)، دو اثر ہوتے ہیں۔

- قلب کا اس شق پر مجتمع ہو جانا،
- اور اس مصلحت کے اسباب میسر ہو جانا، بلکہ خواب نظر آنا بھی ضروری نہیں۔

من قال سوی ذالک فقد قال محالا۔ یعنی (جس نے اس کے علاوہ کہا بیجا کہا)

اور بعض بزرگان دین سے جو بعض استخارے، اس قسم کے منقول ہیں جس سے واقعہ صراحۃً یا اشارۃً خواب میں نظر آجائے، سو وہ استخارہ نہیں ہے، بلکہ خواب نظر آنے کا عمل ہے۔

پھر یہ اثر بھی اس کا لازمی نہیں، خواب کبھی نظر آتا ہے کبھی نہیں۔

اور خواب بھی اگر نظر آیا تو وہ محتاج تعبیر ہے، اگر چہ صراحت سے نظر آئے، پھر تعبیر کی جو کچھ ہو گی وہ ظنی ہے یقینی نہیں، اس میں اتنے شبہات تو ہو رہیں پس اس کو استخارہ کہنا یا مجاز ہے اگر ان بزرگوں سے یہ تسمیہ منقول ہو، ورنہ اغلاط عامہ سے ہے۔

اسی لئے محققین ایسے امور اپنے خاص ہی لوگوں کو بتلاتے ہیں کہ ان کے قلوب بھی متدین ہوتے ہیں اور عقائد بھی صحیح رکھتے ہیں، جن کی بدولت غلو فی الدین (دین میں حد سے زیادہ بڑھنا) سے محفوظ ہوتے ہیں اور قوت نیت کے تعلق کے سبب ان کا انکشاف و منام راجح الصدق ہوتا ہے جو حقیقت ہے کشف کی، ورنہ عوام پر تو اضغاث احلام (پراگندہ خواب) ہی غالب ہوتے ہیں مثلاً ایسے فال وغیرہ کی بنا اور اعتقاد پر کسی مسلمان سے بدگمان ہو جانا اور کسی قول یا فعل یا خیال غیر مشروع کا مرتکب ہو جانا یہ خاص خرابیاں اس عمل فال میں ہیں اور یہی حکم ہے شاعرین کے کلام سے فال لینے کا غرض یہ عمل مروجہ طریق پر بالیقین مذموم ہے۔

---

[1] اگر ایک شب بعد ذیل دعا۔ ہر مرتبہ بعد نماز تحریمہ پڑھ لیا کرے اور اپنے جائز مقصد کے لئے دعا کرے ان شاء اللہ حاجت پوری ہو گی۔

یا حی یا قیوم لا الہ الا انت برحمتک استغیث اصلح لی شانی کلہ ولا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین، مرتی

اس کا بھی اس تقریر سے جو نمبر ۱ دل میں مذکور ہے غیر مفید ہونا ثابت ہے اور اگر وہ اغراض بھی ناجائز ہوں جیسے :۔

(۱) یٰسین پڑھ کر چور کا نام نکالنا۔

(۲) ناجائز موقع پر محبت کی تدبیر یا زوجین میں یا باہم اقارب میں تفریق کی یا بلا وجہ شرعی مطلق دو شخصوں میں تفریق کی تدبیر کرنا۔

(۳) کسی کو ہلاک کر دینا۔

(۴) دستِ غیب کے ایسے عمل کرنا کہ روپے رکھے ہوئے مل جایا کریں۔

(۵) جنات کو تابع کر کے ان سے کام لینا گو جائز ہی کام ہو۔ اور ناجائز کا تو کیا پوچھنا۔۔۔؟

پس اگر ایسے ناجائز اغراض ہوں تو ناجائز کام کے قصد و اہتمام کا معمولی گناہ تو ہے ہی جو سب جانتے ہیں، یہاں وہ گناہ اس لئے اور بھی شدید ہو جاتا ہے کہ اس شخص نے کلام پاک کو ناپاک غرض کا آلہ بنایا۔

پس اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے نعوذ باللہ کوئی قرآن کو بازاری عورت کی خرچی میں دیکر منہ کالا کرے کوئی مسلمان جس میں ذرا بھی دین کی عظمت ہو اس کو جائز سمجھ سکتا ہے؟

اور اگر ان اغراض کے ناجائز ہونے میں خفاء ہو تو مفصلاً اہل فتویٰ سے تسلی کر لیجئے۔
مختصراً اتنا یہاں بھی لکھے دیتا ہوں کہ اول تو چور کا نام نکالنا اس عمل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا، یہ عامل کے یا کسی صاحب مجلس کے خیال کا تصرف ہے۔ اس کا سمجھنا مسمریزم جاننے پر موقوف ہے اور حاضرات وغیرہ جو عامل لوگ کرتے ہیں وہ اگر سب نہیں تو اکثر تو اسی قبیل سے ہیں تو اس صورت میں قرآن پڑھنا نرا دھوکہ دینا ہے!

پھر یہ کہ جو نام نکلتا ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے جب چاہے آزما لیا جائے کہ ایک عامل کے عمل سے ایک شخص کا نام نکل آیا، دوسرے کے عمل سے دوسرے شخص کا، بلکہ جو شخص پہلے کو چور سمجھتا ہو وہ اس دوسرے عامل کے پاس سے اس وقت بالکل علیحدہ ہو جانا چاہئے جب یہ ایسی بدیہی ہے — بتائیے تو کسی شخص کو محض اس بنا پر چور سمجھ لینا یقیناً یا ظناً کہاں جائز ہوگا؟ پھر اگر اس پر تشدد کیا یا زبان سے اور ہاتھ سے

اور پھر جو اس کا نام لیا تو یہ گناہ اور بڑھنے شروع ہوئے۔

دست غیب کی آمدنی اور تسخیر جنات ناجائز ہے

اور دست غیب بمعنی مذکور میں اور ایسا ہی کا ناجائز ہونا تو محتاج بیان نہیں۔ شاید دست غیب بمعنی المذکور یا تسخیر جنات بغرض مباح میں شبہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ دست غیب میں یہ ہوتا ہے کہ جنات اس کام پر مسلط ہو جاتے ہیں کہ بعضے عمل میں تو وہی روپیہ جس کو یہ خرچ کر چکا ہے وہ جہاں کہیں ہو وہاں سے اٹھا لاتے ہیں اور بعض عمل میں دوسرا روپیہ جس جگہ سے ان کے ہاتھ آوے نکال لاتے ہیں۔

سو اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص خاص اس کام کے لئے آدمیوں کو نوکر رکھے کہ چوری کر کر کے مجھ کو دیا کرو، اس نے یہی کام جنات سے لیا۔ اور چوری کے ناجائز ہونے کا کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اور اگر شبہ ہو کہ ممکن ہے کہ وہ جن اپنے پاس سے لے آتے ہوں چوری کہاں ہوئی؟ سو اول تو امکان سے دوسرے احتمالات کی نفی نہیں ہو سکتی، دوسرے اگر اپنے ہی پاس سے لاویں تب بھی ظاہر ہے کہ خوشی سے نہیں لاتے۔ ورنہ لوگ روپوں کو لا کر کیوں نہیں دیتے؟ محض جبر عمل سے لاتے ہیں تو کسی کو مجبور کر کے اس کا مال لے کر کھا جانا کب جائز ہوگا اور اس تقریر سے تسخیر جنات کا ناجائز ہونا سمجھ میں آ جاوے گا۔

یعنی کسی آدمی سے جو تمہارا غلام شرعی نہ ہو اور نوکر بھی نہ ہو اس کے زیر تربیت ہو کوئی کام جبراً لیا جائے گو وہ کام گناہ کا نہ ہو تو یہ ظلم اور تعدی ہے۔ اس عامل نے بھی اسی طرح اس جن سے کام لیا ہے جو عمل سے مجبور ہو چکا ہے اور یہ دوسری تو ظاہر جانا ہے کہ خلاف رضامندی اس سے عمل چلانا کیسے گناہ ہو گیا؟

دیکھئے اگر کوئی شخص بڑا مجلد قرآن زور سے کسی کے سر پر اس طرح مار دے کہ وہ مر جاوے تو کیا یہ قتل اس وجہ سے کہ بواسطہ قرآن مقدس کے ہوا ہے، جائز ہو جاوے گا؟ اور کیا عدالت اس پر دارو گیر نہ کرے گی؟ کہ اس نے تو قرآن سے مارا ہے، اس لئے مجرم نہیں۔ بس اسی طرح اس کو بھی سمجھ لیجئے البتہ اگر قرآن مجید کے علم و اتباع کو اصل کام سمجھ کر اس پر کاربند ہو اور کسی کی [illegible]

پر کسی جائز کام کے لئے کوئی آیت پڑھ لے تو ناجائز نہیں۔

قرآن مجید کو آلۂ کسب بنانا

(۱) بعض لوگوں نے قرآن مجید کو آلۂ کسب دنیا و جلب مال کا بنا رکھا ہے، مختلف طور سے۔

بعض تو تراویح میں اجرت پر سناتے پھرتے ہیں، بعضے مردوں پر تیجے میں یا چالیسویں تک یا اس کے بعد بھی پڑھنے کا پیشہ کر لیتے ہیں، ان کا ناجائز ہونا منکرات رسومات عماد کے فتاوی میں سے ہو چکا ہے۔

بعض تو اور بھی غضب کرتے ہیں یعنی یہ بھی نہیں کہ صرف عقد اجارہ کے بعد ہی پڑھا کریں بلکہ پہلا جو پڑھا ہوا ہے، اس کو کچھ لے کر بخشتے ہیں یہ تو اچھا خاصا سودا بیع ہے، جو اس اجارہ سے بھی بدتر ہے کہ اجارہ میں بعض اہل علم تاویل تو چلاتے ہیں مگر چلتی نہیں یہاں تو اس کی بھی گنجائش نہیں۔

بعض اس کے مطالب کے بیان یعنی وعظ پر نذرانہ لیتے ہیں اور فی نفسہ اس کے جائز و ناجائز ہونے میں تو سردست اس لئے کلام نہیں کرتا کہ اس میں طول ہے، لیکن جو حیثیت اس کی شائع ہے کہ اس کو پیشہ مستقل بنا لیا ہے، اسی لئے سفر کرتے ہیں، زبان سے مانگتے ہیں، جس امر حق سے نذرانہ میں کمی آنے کا اندیشہ ہو اس کو بیان نہیں کرتے اور راس جگہ میں سہولت دیکھ کر سینکڑوں جاتے ہیں ...... واعظین نے حق تعالیٰ کو گوارا کر رکھا ہے تو کیا ان مفاسد پر نظر کر کے بھی اس کو جائز کہا جا سکتا ہے؟

البتہ تعلیم قرآن کی نوکری اور اسی طرح واعظ کی نوکری۔ اس میں اگر اور کوئی خرابی نہ ملے تو مضائقہ نہیں۔

قرآن میں تحریف

(۲) قرآن مجید کی آیات کو بعض اوقات غیر معنی مقصودہ میں لفظاً یا معناً بدلا جاتا ہے۔

(۶) بعض لوگ قرآن کو بے وضو چھوتے ہیں یا لکھتے ہیں، اس میں کاپی نویس اور تعویذ
لکھنے والے بہت مبتلا ہیں، اسی طرح ورق گردان، مجلد جمانے والے یا پریس مین ان سب
کو باوضو رہنا چاہئے۔ ورنہ پاک کپڑے سے چھوئیں۔

(۷) بعض لوگ قرآن مجید کو پشت کی طرف یا اپنی نشست کی جگہ سے نیچے یا مبتذل جگہ پر
رکھ دیتے ہیں، یا قرآن کے اوپر کوئی کتاب یا قلم دوات وغیرہ رکھ دیتے ہیں یا قرآن میں ردی
کاغذات یا غلاف میں قرآن کے اوپر عینک وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ یہ سب خلاف ادب ہے۔
نیز سفر میں اگر اسباب، صندوق وغیرہ میں مستور ہو تو مجبوری بعض آداب میں
تخفیف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس پر بہت مبتذل سینے کے کپڑے کا غلاف۔ رجلد درست
ہونے کے یک گونہ قرب ادب ہے، مگر وجہ حرمت تک نہیں۔

(۸) قرآن مجید جب ایسا کہنہ ہو جائے کہ اس سے انتفاع ممکن نہ ہو، تو اس کو پاک
جگہ دفن کر دینا چاہیے۔ مگر اس پر مٹی نہ ڈالے بلکہ جس طرح مسلمان میت کی قبر میں تختے
وغیرہ رکھ کر مٹی دیتے ہیں اسی طرح کرنا چاہیے۔
ایسے ہی اگر کوئی قرآن بے انتہا غلط لکھا ہو کہ صحیح دشوار ہو تو اس کو بھی دفن کر دینا چاہیے
اس میں اکثر لوگ جو سستی کرتے ہیں وہ دیمک زدہ ہو کر منتشر ہو جاتا ہے اور افسوس ہے!
کہ وہ ردی میں جا کر دکانوں کی پڑیوں میں یا بچوں کے بعض کھلونوں میں استعمال کیا جاتا ہے
ایسا کرنا ہم لوگوں کی سخت بے غیرتی ہے۔۔۔۔!

(۹) جس روشنائی میں کسی نجس چیز کا میل ہو اس سے قرآن لکھنا یا جس کپڑے میں
یہ قوی شبہ ہو اس کا غلاف بنانا یا جس دفتی میں ایسی چیز ہو اس کو جلد میں لگانا یہ سب
گناہ ہے: چنانچہ ظاہر ہے۔

(۱۰) قرآن کی کتابت یا طباعت میں تصحیح کا اہتمام نہ کرنا ایسی بلا کی بات ہے جس
کا ضرر دور تک اور دیر تک رہتا چلا جائے گا، جتنے لوگ پڑھیں گے اور جب تک
(خواہ دو سو برس کیوں نہ ہوں) یہ مصاحف رہیں گے؛ اس بانی سبب کو اس گناہ کا
حصہ ملتا رہے گا۔

اس وقت ذہن میں ہیں۔ امور عشرہ تو مقرر ہوئے لیکن تذکرہ میں مزید بھی کچھ بڑھیگا توانشاء اللہ تعالیٰ ان میں جو اصول کی جامع التقریر ہوئی ہے وہ امر بھی ان ہی میں داخل ہوگا۔

واللہ الموفق لکل ما یرضیٰ منہم و یقربنا الیٰ ما یحب و یرضیٰ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ متعلق بحضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم)

آپ کے جو احسانات وعنایات امت کے حال پر متوجہ ومبذول ہیں، ان کی کمیت وکیفیت پر نظر کر کے یہ علم یقینی ہے، آپ کے حقوق امت کی گردن پر اس قدر کثیر ہیں کہ قیامت تک ان سے سبکدوشی قریب بہ محال ہے، لیکن باوجود کثرت کے وہ سب حقوق تین کلی کے احاطہ میں آئے ہوئے ہیں۔

(۱) محبت!

(۲) متابعت۔

(۳) عظمت۔

اور ہر چند کہ ان تینوں میں اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے باہم ایسا تعلق اور تلازم ہے کہ ایک کا وجود بغیر دوسرے کے ممکن ہی نہیں، لیکن بلا خیال معنی اگر صرف صورت کے درجہ کا لحاظ کیا جائے تو یہ تینوں کہیں کہیں علیحدہ علیحدہ بھی خیال میں آ سکتے ہیں۔

اس وقت چونکہ اکثر طبیعتیں محض صورت پر قناعت کئے ہوئے ہیں، اس لئے ان امور کا جُدا جُدا موجود ہونا بکثرت واقع ہو رہا ہے اور اس معاملہ میں بھی بڑا جدید انقلاب ہے جس سے سلف صالح مُبرّا تھے، چنانچہ ان حضرات کے زندگی واقعات کو جو کہ مشہور اور کتب

احادیث میں مذکور ہیں۔

اس وقت کے اکثر مسلمانوں کے معاملات کے ساتھ احادیث کچھ پیش نظر رکھ کے ذہن نشین بعنوان کتابی مرقوم ہوتا ہے۔ مولانا ذکر شدہ سے اس کم فہمی کی حالت بخوبی معلوم ہو سکتی ہے اور اسی طرح سے اس انقلاب پر تنبیہ اور اس کی اصلاح کی طرف ترغیب توجہ مقصود ہے۔

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متجددین کا معاملہ

حاصل اس کا اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ جس طرح زمانہ کے اور بہت رنگ بدل گئے ہیں ان میں تو یہ کوتاہی مشاہد ہے کہ وہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں کہ دوسری اقوام یا مذاہب سے مقابلہ کی گفتگو کے موقع پر آپ کی مدح گری میں سے یا آپ کے بعض اقوال و افعال کی تحسین میں سے، خواہ ان کی حقیقت تک ان کے ذہن کی رسائی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، صرف وہ حصہ جس کو تمدن سے تعلق ہے محض اس غرض سے بیان کر دیتے ہیں کہ آپ کی عظمت اور آپ کے خاندان کی عزت ظاہر ہو جاوے، اور یہی کو اسلام کی خدمت اور آپ کے ذاتی حقوق کے ادا کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ باقی نہ اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں، نہ محبت کا کوئی اثر پایا جاتا ہے۔

بلکہ اتباع کو تعصب اور محبت کو وحشت سمجھتے ہیں اور سبب مخفی اس کا یہ ہے کہ اس زمانہ میں سب سے بڑا مقصد ـــــ یہ ہی عزت کو قرار دیا گیا ہے، جس کے مطلوب ہونے کا ہم کو بھی انکار نہیں، مگر کلام اس میں ہے کہ آیا وہ مطلوب بالعرض ہے یا خود مطلوب بالذات ہے؟

بہرحال چونکہ اس کو کمال بالذات سمجھا جاتا ہے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی فضائل و کمالات حقیقیہ عظیمۃ الشان میں سے ان کی نظر اسی کا انتخاب کرتی ہے اور دیگر کمالات کا مثل محبت الٰہی و خشیت و زہد و صبر و تربیت روحانی، دعوت و توکل، تقویٰ و دیگر فضائل علمیہ و عملیہ کا کبھی ان کی زبان پر نام بھی نہیں آتا۔

جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ گویا آپ خاص اسی غرض کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے کہ ایک

جماعت کو قوم بنا کر اس کو دنیاوی ترقی کے وسائل کی تعلیم فرما دیں، تاکہ وہ دوسری قوموں کے مقابل دفاق رہ کر، دنیا میں شوکت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

کیا قرآن مجید و حدیث میں گہری نظر کرنے والا آپ کی تعلیم کا یہ خلاصہ نکال سکتا ہے؟

اہل اللہ کی صحبت و ملازمت کا التزام ضروری ہے

ان صاحبوں کو اپنی اصلاح کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ علماء متقین و عرفاء محققین اہل دل کی صحبت و ملازمت کا التزام کریں اور ان کی خدمت میں کچھ عرصہ تک بالکل سکوت اختیار کرکے رہیں، خود ان کے اقوال متفرقہ و ارشادات مختلفہ سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک بڑی فہرست خیالات کی درست ہو جاوے گی، اس کے بعد جو شبہات رہ جاویں ان کو ادب کے ساتھ ان کے حضور میں پیش کریں اور توجہ و انصاف کے ساتھ جواب سنیں۔

ان کو اس زمانۂ سکوت میں جو اصول و قواعد سننے اور ذہن نشین کرنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اصول ان جوابوں کے سمجھنے میں نہایت معین ہوں گے، اور اطمینان و شفاء کلی میسر ہوگی۔

اس طریق اصلاح کو جو عملی تجربہ ہے، میری خیال نذر فرماویں اور نیز حدیث میں کتاب الرقاق والابواب الزهد، کا بار بار مطالعہ فرماویں یہ کلام تو ان لوگوں کے مذاق پر تھا جو نئی روشنی کے تابع ہو رہے ہیں۔

اہل محبت کی کوتاہیاں

اب دوسرے باقی حضرات کی کیفیت معروض ہے کہ ان میں سے بعض میں محبت کے ظاہری آثار بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اشعار مدحیہ پڑھنا یا شوق سے سننا اور ان سے متاثر ہونا، کیفیت طاری ہو جانا، کبھی نعرہ لگانا، کثرت سے آپ کے ذکر مبارک کی مجالس منعقد کرنا، وغیر ذالک

لیکن ان میں یہ کوتاہی دیکھی جاتی ہے کہ اس کو کافی سمجھ کر حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرمودہ احکام کی بجا آوری اور متابعت کے اہتمام کو ضروری نہیں جانتے، اول تو

فوراً ان اعمال مذکورہ میں کسی دینی گروہ کو محبت کے عنوان سے اختیار کرتے ہیں لیکن اوقات حدود شرعیہ کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ پھر دیگر اعمال و معاملات میں تو نہ عنوان محبت درج ہے ، نہ حق محبت۔

- کسی کو نماز کا یا جماعت کا اہتمام نہیں
- کسی کو غیبت، ظلم سے باک نہیں
- کوئی مسکرات اور حرام لذات میں مبتلا ہے۔
- کوئی شرکیات و بدعیات کو دین سمجھ کر رہا ہے ، سبب اس کا بے علمی یا کم علمی ہے یا غلط فہمی !!

اس کی اصلاح یہ ہے کہ کتب حدیث میں سے * ابواب زہد و رقاق * و ابواب الفتن * و باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ * ابواب صفۃ الجنۃ و ابواب صفۃ جہنم و احوال قیامہ کو مدت تک مطالعہ میں رکھیں اور ان ابواب کے مطالعے علماء محققین سنت سے مجلس اور ان کی مشاورت ہو جاوے گی اس وقت ایسے حضرات کی صحبت اختیار کرنا ، اس اصلاح اور علاج کی تحصیل اور تکمیل ہوگی۔

اپنے کو متقی اور دوسروں کو جہنمی سمجھنے والوں کی کوتاہیاں

اب صرف ایک جماعت اور رہ گئی ان میں جو احکام کی متابعت کا ضروری ہونا پیش نظر ہے اور گو وہ بہت اس کا اہتمام بھی ہے ، مگر تاہم کمی یہ ہے کہ ان میں کیفیت خشوع اور یقین کی نہیں آئی جو غلبۂ محبت کو لازم ہے ، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان پر تبلیغ کی علامت جو کہ محبت خاصہ کا اثر ہے پیدا نہیں ہوئی۔

چونکہ ان کا طرزِ عمل بالکل ایسا ہے ، جیسے کسی نوکر کو اپنے آقا سے صرف ضابطہ کا تعلق ہو کر خدمات مفوضہ میں تو فروگذاشت نہیں کرتا ۔۔۔ ——— مگر وقت پورا کر دینے کے بعد ایک منٹ ٹھہرتا نہیں ، نہ کبھی کوئی زائد خدمت کرتا ہے ، نہ آقا کا کبھی ذکر خیر کرتے ہوئے دیکھا گیا ، نہ آقا کے اہل و عیال کا ادب و احترام کرتا ہے نہ اپنے خدمت گزار نوکروں سے زیادہ ایک آقا کے نوکر رہنے سے کوئی واسطہ سلام و کلام کا رکھتا ہے بلکہ خشکی ہی خشکی ، اس سے بڑھ کر

پڑتا ہے کہ مجھ پر یہ سب خواجہ تاشوں کو فرمان اور حقیر کہہ کر ان سے روٹھا پھرتا ہے۔ دوسری بجا آوری خدمت پر ہمیشہ نازاں اور فخر کرتا ہے اور اسی وجہ سے سب سے الجھتا ہے اور جیسی فہمائش کرنے کا آقا نے نرمی کے ساتھ حکم دیا ہے، ان سے بے تمیزی کرتا ہے اور جب کوئی اپنی سے آقا درگزر کر دیتا ہے، یہ ان پر ہتک سمجھ کر کسی کو مارتا ہے اور کسی کو گالی دیتا ہے ظاہر ہے اس صورت میں یہ نوکر آقا کی نظر سے گر جائے گا، اور ان بد تمیزیوں کی بدولت، جو کہ آقا کی مرضی کے بھی خلاف ہیں، اس کی خدمت کا ثمرہ اور اثر بھی ضعیف ہو جائے گا۔

بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو کچھ تھوڑی نماز، روزہ اور بعض معاملات بھی درست کر کے اپنے کو مقدس اور متبع اور تمام دنیا کو فاسق، بدعتی، کافر، جہنمی سمجھ بیٹھے ہیں اور خفیف خفیف امور میں بھی ان سے الجھتے ہیں اور ہر شخص سے نفرت و نفور کرتے ہیں۔

بعضے ان عوام سے گزر کر علماء اور بعض ائمہ یا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں بدگمانی کر کے بدزبانی کرنے لگتے ہیں، اور اسی کو دین کی بڑی حمایت اور خدمت سمجھتے ہیں۔۔۔!!

جس ذاتِ مقدسہ کے اتباع کا دعویٰ ہے، خود آپ کے ساتھ یہ برتاؤ ہے کہ آپ کا نام مبارک ادب سے لیتے ہیں، نہ کبھی آپ کا ذکر مبارک شوق سے کرتے ہیں، نہ کبھی ذکر مبارک سن کر گداختہ ہوتے ہیں، نہ درود کا کوئی معمول انہوں نے ٹھہرایا ہے، نہ آپ کے متعلقین یعنی علماء دین و اہل بیت سے ان کو کوئی تعلق، محبت و احترام کا معلوم ہوتا ہے!

ان امور میں بعض تو موجب خسران و عصیان ہیں اور بعض سبب حرمان ہیں کیونکہ مثلاً ظاہر و باطن کی اصلاح فرض ہے، جس میں خلل اندازی عصیان ہے، اسی طرح آپ کے وارثان علوم سے عظمت و احترام کا تعلق اور آپ کی امت سے شفقت و رحمت کا تعلق بھی واجب ہے، جس کا ترک یقینی خسران ہے۔

باقی جو امور مستحبہ خاصہ و حقوق مخصوص عبادات نافلہ کے درجہ میں ہیں، ان کی کمی بھی خاص برکات سے محرومی تو ضروری ہے۔

اس کوتاہی کی اصلاح کا معین اہل اللہ کی صحبت و درکتب سیر نبویہ و حقوق مصطفویہ جیسے شفاء، توضیح عیاض و رحمۃ اللہ وغیرہ اور کتب اخلاق و سلوک کا مطالعہ اور ان پر عمل کرنے کا اہتمام ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چند تعلقات ؟

ہر امتی کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے چند تعلقات ہیں۔

- ایک تعلق یہ کہ آپ نبی اور ہم .... امتی!
- آپ حاکم اور ہم محکوم؛
- آپ دارین میں محسن؛ ہم زیر بار احسان
- آپ محبوب اور ہم ...... محب

اور ان میں سے ہر تعلق جب کسی کے ساتھ ہوتا ہے تو اس پر خاص خاص حقوق و آداب کا مرتب ہونا معلوم اور مسلّم، دو معنی یہ ہیں جب آپ کی ...... ذات بابرکات میں سب تعلقات مجتمع ہوں اور پھر سب اعلیٰ اور اکمل درجے کے تو آپ کے حقوق بھی ظاہر ہیں کہ کس قدر اور کس درجے کے ہوں گے، ان سب کے ادا کرنے کا دل سے اور التزام سے ایسا اہتمام کرنا چاہیئے کہ وہ کثرت عادت اور استحضار الفت سے خود بخود طبعی ہو جاویں اور پھر بھی آپ کے حقوق کے مقابلہ میں اپنی اس خدمت کو در حقیقت اس کا نفع اپنی ہی طرف عائد ہے، ناتمام سمجھے۔

یہ مختصر مضمون ختم ہوا اور اس کے ختم ہونے کے وقت یاد آیا کہ احقر نے ایک رسالہ نشر الطیب متوسط حجم کا سیرت نبویہ میں لکھا ہے، میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس مختصر کی شرح کے لئے کافی اور بقصد اعتقاد و عمل اس کا مطالعہ میں رکھنا، ان سب اصلاحات کے لئے انشاء اللہ کافی ہو سکتا ہے۔ دعا کے ساتھ اشاعت فرمایئے والسلام۔

ے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور کتب مکتبہ دارالعلوم سے طلب فرمایئے۔

تتمۂ سابقہ

یہ تتمہ پہلے مضمون سے الگ کوئی مضمون نہیں ہے بلکہ ایک درجہ میں گویا اسی کی تفصیل اور شرح ہے، مضمون سابق میں ان دکانداروں کے قبول کرنے والی طبائع کی خصوصیت جس قوت سے کی گئی کا بیان ہوا ہے اس کا تتمہ یہ ہے کہ ایسے لوگ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق میں تقصیر کئے ہوئے ہیں، متابعت و محبت کا وجود تو یہی تو ظاہر ہے، اور پچھلے مضمون میں اس کو صراحتاً بیان کر دیا ہے البتہ ان سکتہ اس عمل سے کہ ان کی زبان یا قلم سے بعض ایسے مضامین صادر ہوتے ہیں کہ ان سے آپ کی عظمت یا آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہوتی ہے، یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ آپ کا حق عظمت ادا کرتے ہیں، لیکن اگر ذرا نظر کو عمیق کیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ احتمال بھی واقعیت نہیں رکھتا۔

جناب محمد مصطفیٰ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بحیثیت حامل وحی ہونے کے

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جس عظمت میں گفتگو ہو رہی ہے وہ عظمت ہے جس کے ساتھ آپ حامل وحی ہونے کی حیثیت سے متصف تھے اور ان لوگوں کی تحریر و تقریر میں نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک آپ کی جو عظمت ہے وہ اس حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حکیم متمدن ہونے کی حیثیت سے ہے۔

کیونکہ ان دو عظمتوں کے آثار کا موجود نہ ہونا ہمارے دعوے کی دلیل ہے۔ چنانچہ اعتقاد عظمت نبوی کے آثار یہ ہیں کہ آپ کے احکام محض یہی معلوم ہو کر کہ یا حق تعالیٰ نے یا آپ نے خود فرمایا ہے، دل سے اس حکم کے قبول کرنے میں حکمت و مصلحت سمجھنے کا ہرگز انتظار نہ ہو۔

بلکہ اگر بادی النظر میں کسی حکمت کے خلاف بھی معلوم ہو، تب بھی ایسی خوشی سے قبول کرے جیسے حکمت معلوم ہونے کے وقت کرتا، ورنہ بدون حکمت سمجھے اس حکم کی وقعت میں کچھ کمی

ہو بلکہ جس طرح اہل محبت کا رسیا بھی حکم سن کر مغلوب وَالِہ[1] ہو کر دیوانہ وار اس کی بجا آوری کے لئے دوڑتا ہے اسی طرح اس کی کیفیت ہو جائے اور یہ کہ اس حکم کے خلاف کا مستحسن ہونا خیال میں بھی نہ آئے۔

بلکہ اجمالاً یوں سمجھئے کہ بس تمام خیر و برکت اور حکمت و مصلحت اور فلاح و صلاح اسی میں منحصر ہے خواہ ہمارا ذہن کوتاہ اس کی تفصیل تک پہنچے یا نہ پہنچے، بقول حضرت عارف گنجوی رحمۃ اللہ ـــ

زبان تازہ کردن بإقرار تو   نینگیختن علت از کار تو

(آپ کے اقرار کے ساتھ زبان کو تازہ کرنا ہے نہ کہ آپ کے کام میں کوئی علت نکالنا)

سب سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال

صرف حکیم مطلق ہونے کے لحاظ سے جو اعتقاد عظمت ہوتا ہے اس کے آثار یہ ہیں کہ حکم سن کر اتنا ہی اثر ہو جو ایک مخلوق ذی رائے کی رائے کو سن کر ہوتا ہے اور پھر اس کے قبول کرنے میں یا اس کو بنظر وقعت دیکھنے میں اس کا بھی انتظار ہو کہ اس میں عقلی اور عقلی میں بھی دنیوی مصلحت کیا ہے؟ جب تک مصلحت نہ معلوم ہو اس میں سخت تردد و خلجان رہے اور ہرگز اس پر عمل کرنے میں شرح صدر نہ ہو۔

خود بھی ایک قسم کی تنگی اور مجبوری و تحکم کا سا اثر رہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک گونہ خجالت اور بے لطفی کی سی کیفیت رہے۔ اور بار بار اس حکم کی جانب مخالف کی ترجیح کا حکم اور اس کی تمنا کا قلب پر غلبہ رہے اور ہرگز اس کے صحیح ہونے کا دل قبول کر کے حکم نہ کر سکے۔

بلکہ اس میں منتظر رہے کہ کسی طرح اس کا شرعی ہونا ثابت نہ ہو اور جب اور کچھ نہ ہو سکے تو بعض نادر روایات سے اس حکم کے شرعی ہونے کا انکار کر دے، کبھی اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے میں شبہات پیدا کرے، بلکہ اس کو راویوں کی نقل کی غلطی

---

[1] واله باب سمع سے آتا ہے وَلِہٌ اسم فاعل کا صیغہ ہے حیران ہونا ۱۲

پانی کا یا نمک کی آمیزش کا اثر پیدا ہوسکتا ہے۔

تسلیم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو تسلیم کرکے خود آپ کی نسبت کسی ضرورت و مصلحت وقت کے اتباع کا دعویٰ کرے اور چونکہ وہ مصلحت باقی نہیں رہی اس لئے اس حکم کو کالموجود نہ سمجھے، غرض ہزاروں حیلے نکالے، مگر اس حکم کو نہ مانے یا اگر مانے تو اعتقاد سے نہ مانے۔ بلکہ بڑائی سے بچنے کو یا قومی تمیز نہ کے منتشر ہونے کی ضرورت سے مانے یا اعتقاد ہی سے مانے، مگر نشاطِ خاطر کے ساتھ نہ مانے، بلکہ بہت ہی مجبوری سمجھ کر مانے۔ اور یہ ان سب میں سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال ہے۔

یہ وہ مراتب ہیں جو کم و بیش سب کفر سے ملے ہوئے ہیں، کوئی صریح کفر ہے کوئی خفی کفر ہے، کوئی کفر جیسے کو ہے، کما لا یخفی علی المتفطن السلیم۔

جب دونوں اعتقادوں کے آثار جدا جدا معلوم ہوگئے، آگے ہر شخص کو ذرا ہو سکے اپنے اندر بھی ان آثار کا وجود و عدم معلوم ہو سکتا ہے اور ان سے ہمارے دعویٰ سابقہ کا صدق بخوبی واضح ہو جائے گا (اس مضمون کو قدرے زیادہ تحقیق کے ساتھ مطلوب ہو تو مضمون عظمت وحی، مؤلفہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دامت فیوضہم جزاہ اللہ ہم، کے مجموعہ میں شائع ہوا ہے ملاحظہ فرما لیا جائے، ہماری اس تقریر سے یہ معنی نہ سمجھیں جائیں کہ احکام شرعیہ حکمت سے خالی اور ہماری [illegible] ______ بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کا اتباع اور ان کی خاص عظمت کا اعتقاد فہم حکمت پر موقوف نہ ہونا چاہیے۔ ہاں وہ خود ایک مستقل علم ہے کہ اس کو اسرار شریعت کا لقب دیا جاتا ہے مگر اس کے اہل خواص ذہین ہیں عوام الناس کو اس سے بچانے کی ضرورت کا احتمال غالب ہے کئی وجہ سے۔

ایک اس لئے کہ ان میں سب تو منصوص ہیں نہیں اجتہادی بکثرت ہیں جن میں احتمال خطا کا بھی ہے سو اگر کبھی اس کا غیر صحیح ہونا ظاہر ہو گیا اور عامی کے خیال میں اس حکم کی وہی حکمت یقینی تھی تو اس کے صحیح نہ ہونے سے اس حکم کو غیر صحیح سمجھ بیٹھے گا (بخلاف خواص کے کہ وہ اس کو بعض یعنی علت اور حقیقی حکم کا نہ سمجھیں گے۔ اس لئے ضرر سے ان کو کبھی کوئی خدشہ نہ ہوگا۔

دوم اس لئے کہ کبھی کوئی حِسّی اور حکمت صحیح معلوم ہوگی لیکن بعض اوقات وہ وجہ اور حقیقت اس عامی کی نظر میں بارونق نہیں ہوگی تو اس حکم کو بھی بے رونق سمجھنے لگے گا۔

ہر حکمت نہ علت ہے اور نہ مقصود بالذات

سوم اس لئے کہ ہر حکمت علت نہیں ہوتی بعض اوقات عامی اس کو علت اور اصلی سبب سمجھکر کسی موقع میں اس کے موجود نہ ہونے سے حکم ہی کے غیر موجود ہونے کا حکم لگا دے گا۔

چہارم یہ کہ ہر حکمت مقصود بالذات نہیں ہوتی بعض اوقات عامی اس کو مقصود بالذات سمجھ کر کسی محل و موقع میں حکمت کے حاصل ہو جانے کو کافی سمجھکر تحصیل حکم کی ضرورت نہ سمجھیگا اور ان دونوں صورتوں میں (سوم و چہارم) میں اجتہاد باطل کا باب وسیع ہو جائے گا۔ مثلاً سفر میں مشقت پر نظر کر کے قصر کا حکم دیا گیا ہے لیکن یہ علت نہیں حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت بھی نہ ہو تب بھی قصر ہے اور اسی طرح وضو شروع ہوا ہے۔ حکمت نظافت و طہارت ہے، لیکن اگر طہارت و نظافت حاصل ہو تب بھی وضو سے استغناء نہ ہوگا۔

کتا پالنے کی ممانعت کی حکمت؟

پنجم یہ کہ عامی جب مخالفین دین کے مناظرہ میں اس کو بیان کرے گا اور وہ اگر وہ یقینی نہیں تو اس میں مخالف نے اگر خدشہ نکال دیا تو یہ مضطرب ہو جائے گا۔ اور اس میں اسلام کو اور اہل حق کو صدمہ پہنچے گا، مثلاً کسی نے کتا پالنے کی ممانعت کی یہ حکمت بیان کی کہ اس میں صفت سبعیت و درندگی کی ہوتی ہے تو اگر کسی نے اس میں یہ خدشہ پیدا کیا کہ تعلیم کے بعد سبعیت نہیں رہتی پھر کیوں ممنوع ہے؟ تو یہ شخص بزبان حال اس حکم کو بے بنیاد کہے گا بخلاف راسخ فی العلم کے کہ وہ بجائے اس حکمت کے یہ کہے گا کہ ہمارے آقائے عظیم الشان کا یہ حکم ہے ہم نہیں جانتے کیا مصلحت ہے؟ تو اس شخص پر کوئی خدشہ ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ شرح تھی مضمون متعلق حضرات حکماء[۱] امت کی۔ اس کے بعد اس مضمون سابق میں ان لوگو

۱؎ حکمت پسند لوگ حضرات مراد ہیں ۱۲

لو کان حبک صادقاً لاطعتہٗ — اِنّ المحبّ لمن یحبّ مطیع

اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا، بیشک عاشق، محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے۔

البتہ ادنیٰ درجہ کی محبت و اعتقادِ عظمت کا انکار نہیں کیا جاتا، لیکن جو شرعاً مطلوب ہے، ان دونوں کا ظہور اور ثبوت جیسا کہ اس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا ہے

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے بیٹے، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں؛ اور ان لوگوں کا دیگر امورِ شرعیہ میں متابعت نہ کرنا تو ظاہر ہے۔

حضراتِ انبیاء و ملائکہ علیہم السلام کی شان میں گستاخی

چنانچہ مضمون مذکورہ میں کچھ اس کی تفصیل بھی ہے لیکن خاص ان امور میں جن کو وہ بزعمِ محبت اختیار کرتے ہیں، اس متابعت کا معدوم ہونا اس مضمون میں مجملاً بیان کیا گیا ہے کہ ان میں بھی یہ لوگ حدودِ شرعیہ کو محفوظ نہیں رکھتے۔ اس کی تفصیل ان لوگوں کے ان طریقوں کے دیکھنے سے ہو سکتی ہے مثلاً

■ — یہ کہ آپ کی مدائح میں اس قدر غلو اور مبالغہ کرتے ہیں کہ اس میں دوسرے حضرات انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام کی شان میں گستاخی ہو جاتی، مثلاً ؎

بر آسمانِ چہارم مسیح بیمار است — تبسمِ تو برائے علاج درکار است

(حضرت مسیح علیہ السلام جو چوتھے آسمان پر بیمار ہیں اور آپ کی مسکراہٹ علاج کے لئے درکار ہے)

اور مثلاً ؎

شب و روز ان کے صاحبزادوں کا گہوارہ جنبانؔ[1] تھا۔

---

[1] یعنی ملک

" عجب ڈھب یاد تھا روح الامین کو بھی خوشامد کا "

نصوص قرآنیہ و حدیثیہ میں ان حضرات مقربین کی تعظیم و ادب کا حکم وارد ہے پس ایسے طریقہ میں ترک متابعت ظاہر ہے۔

(۲) ● — یہ کہ بعض اوقات خود حق جل و علیٰ شانہ کے حضور میں گستاخی ہوتی ہے مثلاً یہ

پئے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف — محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا نور کا

اور مثلاً یہ

طواف کعبہ شانی زیارت و بہانہ ہے — کوئی ڈھب چاہئے آخر رقیبوں کی خوشامد کا

نعوذ باللہ منہا اس کو ترک متابعت کی سب سے بڑی مثال سمجھنے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

(۳) ● — بعض اوقات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں گستاخی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس مصرع سے حضور پرنور کو مخاطب بنانا۔

لہ نرگس شہلا ہے تو اور وہ رسم کافری ہے

بلکہ یہ اس کو ترک متابعت کہہ کر ترک تعظیم کی دلیل بنانے کی کچھ ضرورت نہیں اس کا ترک تعظیم ہونا خود ظاہر ہے۔

(۴) ● — یہ کہ روایات موضوعہ ، فضائل ، میں بیان کرتے ہیں جس پر حدیث نبوی میں سخت وعید وارد ہے ، ظاہر ہے کہ حدیث کے خلاف کرنا ترک متابعت ہے ۔

(۵) ● — ان تداعی و تفاعل کے بیان میں بہت سے منکرات اعتقادیہ و عملیہ کو منضم کر لیا ہے۔ (۱) ایک ممنوع شرعی کو خود ان چیزوں کو ضم کر لینا اور ملا لینا ہے (۲) پھر ان ناپسندیدہ چیزوں کو مستحسن اور پسندیدہ سمجھنا اور ان پر اصرار کرنا دوسری خرابی ہے (۳) پھر جو ان منکرات کی اصلاح کرے اس سے عناد و بغض رکھنا یہ تیسری خرابی ہے ۔

غرض ان کا یہ طریقہ ہمارے اس دعوے کی پوری دلیل ہے کہ ان میں متابعت نہیں ہے

۱،

لہ

یہ شرح تھی مضمون متعلق حضرات مُدعیانِ محبت کی۔

اس کے بعد اس مضمون سابق کے اخیر میں ان لوگوں کی کوتاہی کا بیان ہے جو متابعت ظاہری کا اوروں سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں، مگر ان میں تعظیم و ادب اور شوق و محبت کی شان کم ہے۔

اس بیان کی شرح یہ ہے کہ ان میں غلبۂ ادب اور غلبۂ محبت کی کمی تو ظاہر ہے ہی، لیکن نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں متابعت بھی کامل نہیں، کیونکہ حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ قولیہ و عاداتِ فعلیہ کو دیکھنے سے بداہۃً بلکہ حساً ثابت ہوتا ہے کہ یہ طرز خاص:۔

(۱) خشونت ــــ (۲) تقشف ــــ (۳) تعسیر ــــ (۴) تنفیر[1]

کا آپ کو سخت ناپسند ہے اور جب یہ امور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں اور برخلاف اس کے قرآن و حدیث میں، خود حضور کی توقیر و ادب اور محبت میں اپنی جان پر بھی آپ کی ترجیح اور رأفت کے ساتھ تبشیر و تیسیر کے احکام وارد ہیں۔ تو ان میں غفلت اختیار کرنا متابعت کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتا ہے؟

اور اس میں مراتب مختلف ہیں۔

بعض تو حدِ خسران تک پہونچ گئے ہیں، ادب یا محبت کے حقوقِ واجبہ اعتقادیہ یا عملیہ کو کھو بیٹھے ہیں، معتزلہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرئیل علیہ السلام کو اور اسی طرح جمیع انبیاء علیہم السلام سے تمام ملائکہ علیہم السلام کو افضل بتلاتے ہیں، جس کا جواب کتب کلامیہ میں مفصل و مدلل مذکور ہے، یہاں صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت جبرئیل علیہ السلام پر مختصر طور پر سمجھ لینا چاہئے۔

---

[1] خشونت: درشتی، کھردرا پن / تقشف: موٹے جھوٹے کپڑے پہننا اور تھوڑی روزی پر صبر کرنا / تعسیر: تنگی میں ڈالنا / تنفیر: نفرت دلانا۔

اور ملتان میں نے ایک مقام پر بچشم خود دیکھا ہے کہ ایک صاحب نے ایک حدیث ڈھونڈنے کے لئے موطا امام مالک کا نسخہ الماری میں سے نکالا اور اس کو کھڑے کھڑے فرش پر زور سے پٹک کر مارا۔ اہل مجلس میں سے ایک شخص نے کہا کہ:۔

میاں حدیث کی یہ بے ادبی؟

تو وہ جواب میں فرماتے ہیں۔ میں نے بے ادبی کیا کی ہے، اس کی گرد جھاڑی ہے"

جب قیامت میں خاک گرد جھڑے گی تب حقیقت معلوم ہوگی، سو یہ اس خشک دماغی کا اضلال ہے عقل و ادب میں۔ اسی مضمون کو حضرت مولانا روم فرماتے ہیں

از خدا جوئیم توفیق ادب — بے ادب محروم ماند از فضل رب

(ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں اس لئے کہ بے ادب اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم رہتا ہے)

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد — بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(بے ادب نے تنہا اپنے آپ کو ذلیل نہیں کیا ہے، بلکہ ساری دنیا میں آگ لگا دی)

از ادب پر نور گشت است ایں فلک — از ادب معصوم و پاک آمد ملک

ادب کی وجہ سے آسمان پر نور ہو گیا ہے اور فرشتے ادب کی وجہ معصوم اور پاک ہو گئے ہیں!

چند گستاخی کسوف آفتاب — شد عزازیلے ز جرأت رد باب

(آفتاب کا کسوف گستاخی کی وجہ سے ہو گیا۔ عزازیل (شیطان) بے ادبی کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہو گیا)

حدیث میں ایک گستاخ کا قصہ آیا ہے کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے کھانے کو فرمایا۔ اس نے بوجہ بے ادبی کہا کہ میں دائیں ہاتھ سے کھا نہیں سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کرے تو اس سے کھا ہی نہ سکے بس وہ شل ہو گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ادب

حضرت صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ کی طرف بھرپور نہ دیکھنا اور ایک بزرگ کا اس سوال کے جواب میں کہ تم بڑے ہو؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ یہ کہنا کہ بڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر عمر میری زیادہ ہے۔ کیا قولی ادب کا کافی نمونہ نہیں؟ ایک بزرگ کا اس سننے کے بعد کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے ہاتھ میں لی تھی، تمام عمر بلا وضو کان کو مس نہ کرنا، کیا قابل التفات و تقلید نہیں ہے؟

اسی طرح حضرت صحابہؓ کی عادت تھی کہ جب بیٹھتے ایک دوسرے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک، و شمائل و طرز عمل پوچھتے۔ چنانچہ شمائل ترمذی کی روایتیں اس میں صریح ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خاص آستانہ مبارک پر سلام پہنچانے کے لئے قاصدوں کی ڈاک کا انتظام کرتے تھے، جمہور امت مدینہ طیبہ کی حاضری کا اہتمام کرتے رہے۔ اکثر سلف درود شریف کی کثرت رکھا کرتے تھے، خود حدیث میں ہے کہ جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور درود شریف نہ ہو وہ مجلس اہل مجلس کے حق میں موجب حسرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گویا معمولہ نہ ہونا گناہ کی بھی موجب حسرت ہوتی ہے اور جیسے کمی سے حرمان ہوتا ہے اسی طرح ان کے اہتمام و احترام سے خوب برکت و فیضان ہوتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دنیا میں دنیوی بھی اور اخروی بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحابیؓ کو جب کہ انہوں نے کئی بار سوال و جواب کے بعد یہ عرض کیا کہ بس اب میں تمام وظائف کی جگہ درود ہی پڑھا کروں گا یہ ارشاد فرمانا کہ، تو پھر تمہارے سب گناہ معاف ہوتے رہیں گے، اور سب فکروں کی کفایت

سلہ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ھ آخر عمر میں کثرت بکا کی وجہ سے نابینا ہوگئے تھے۔ بہت بڑے محدث تھے۔ آپ کی جلالت قدر، ثقاہت، ذکاوت، قوت، استدلال، حفظ و رسوخ اور وسعت علم کا اعتراف آپ کے اساتذہ نے بھی کیا ہے۔ ترمذی حدیث کی ایک مشہور کتاب، اور ترمذ ایک شہر کا نام ہے ۱۲ محمد علی

ہوتی رہے گی۔ اس کی کافی دلیل ہے۔

عجیب و غریب واقعہ

اس وقت ایک عجیب الشان عظیم المکان فیضان حکایت یاد آئی ہے اسی پر اپنے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں، جس سے ثابت ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق بڑھانے سے خود آپ کی دعنائیں کیسی بدل جاتی ہیں، اس حکایت کو امام جلال الدین سیوطی[1] رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "شرف محتم" میں مسلسل وار سند سے لکھا ہے کہ وہ روایت کرتے ہیں شیخ کمال الدین سے اور وہ شیخ شمس الدین جزری سے اور وہ شیخ زین الدین مراغی سے اور وہ شیخ عزالدین احمد فاروقی کے واسطے اپنے والد شیخ ابو اسحٰق ابراہیم سے، وہ اپنے باپ شیخ عزالدین عمر سے رحمہم اللہ تعالیٰ، ۵۵۵ھ (۱۱۶۰ء) ہجری میں حضرت سید احمد رفاعی[2] رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سفر حج میں تھا، جب وہ مدینہ طیبہ پہنچے اور روضہ شریف پر حاضر ہوئے تو انہوں نے ان الفاظ سے سلام عرض کیا۔ السلام علیکم یا جدّی! وہاں سے جواب عطا ہوا وعلیکم السلام یا ولدی! کہ اس کو تمام اہل مسجد نے سنا، حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ پر وجد شدید نے غلبہ کیا۔ وہ بڑی دیر تک روتے رہے اور شدت شوق میں عرض کیا یا جدّاہ!

---

[1] حضرت علامہ جلال الدین سیوطی بن عبد الرحمٰن مصری رحمۃ اللہ علیہ چار سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ تمام علوم میں ماہر اور حاذق تھے۔ آپ نے ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء میں وفات پائی۔ ۱۲۔ عبد الرؤف

[2] حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵ رجب ۵۱۲ھ / اکتوبر ۱۱۱۸ء کو مقام حسن (عراق) میں پیدا ہوئے۔ اولیاء کرام کے سردار ہیں۔ بہت بڑے عالم باعمل متورع بزرگ تھے۔ حالت شیر خوارگی میں رمضان میں صرف بعد مغرب دودھ پیتے تھے۔ ۲۰ سال کی عمر میں تمام فنون مروجہ کی تکمیل کر لی۔ آپ کا خانقاہ میں بسا اوقات ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ان ایک لاکھ کے طعام قیام کا انتظام حضرت سید احمد کبیر صاحب کی جانب تھا۔ آپ کے خلفاء کی تعداد اسی ہزار ایک سو تھی۔ آپ کی نماز جنازہ کے وقت نو لاکھ مرد و عورت کا مجمع تھا۔ ایک شعر میں آپ کی ولادت، وفات کی تاریخ اور عمر کی مقدار کہی گئی ہے۔ ———— (شعر ملاحظہ فرمائیں حاشیہ میں)

فی حالة البعد روحی کنت ارسلها
تقبل الارض عنی وهی نائبتی

وهذه دولة الاشباح قد حضرت
فامدد یمینک کی تحظی بها شفتی

(یعنی نانا جان! حالت بُعد میں اپنی روح کو حضور میں بھیجا کرتا تھا۔ وہ نائب بن کر زمین بوس ہو جاتی تھی، اب جسم کی حاضری کی نوبت آئی ہے، سو ذرا اپنا دایاں دست مبارک بڑھا دیجئے تاکہ میرے لب اس کے بوسے سے مشرف ہو جائیں) پس فوراً آپ کا ـــ دست مبارک چمک اور دمک کے ساتھ قبر شریف سے ظاہر ہوا۔ اور ہزارہا آدمیوں نے زیارت کی اور سید رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بوسہ لیا۔

اس کے بعد یا سید دوسرا قصہ ان ہی کا لکھا ہے کہ جب سال آئندہ پھر حاضر ہوئے تو نہایت انکسار و مسکنت کے ساتھ عرض کیا ؎

ان قیل زرتم بما رجعتم
یا اکرم الرسل ما نقول

(یعنی اگر لوگ ہم سے پوچھیں کہ تم زیارت کرکے آئے تو کیا لے کر آئے ہو تو ہم جواب میں کیا کہیں؟) قبر شریف سے آواز آئی جس کو تمام حاضرین مسجد نے سنا ؎

قولوا رجعنا بکل خیر
واجتمع الفرع والاصول

(یعنی تم یوں کہنا کہ ہم ہر طرح کی خیر لے کر آئے اور فروع و اصول جمع ہو گئے)

کیا یہ نقل قابل رشک نہیں؟ سوچنے کی تو یہ بات ہے کہ بجز کمال اتباع و کمال محبت و کمال اعتصام و اعتدال کے اس دولت کا سبب اور بھی کوئی امر ہے؟ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون (المطففین [۲۶]) اور یہی ہے کہ جس کو کہنے والے نے کہا: لمثل هذا فلیعمل العاملون [۶۱] (ایسی چیزوں کے واسطے چاہئے کہ محنت کریں محنت کرنے والے)

یہ معاملات تو براہ راست آپ کے ساتھ عمل میں آئے ہیں، باقی آپ کے اہل تعلق اہل

محبت اہلِ قرابت، اہلِ ملت (یعنی خواص و عوامِ امت) کے ساتھ ادب و محبت، شفقت و
رحمت و خدمت کرنا علیٰ حسبِ تفاوتِ مراتبہم یہ سب بھی متمم ہیں۔ آپ کے ساتھ معاملہ رکھنے کے
جن میں سے بعض واجب ہیں کہ ان میں خلل اندازی سے خسران و معصیت ہوتی ہے اور بعض
مستحب ہیں جن سے اعراض کرنا مفلسی اور محرومی کا باعث ہے۔

یہ بیان تھا ان لوگوں کا جو شرع میں کمی اور ادب میں خلل کرنے والے ہیں، لیکن تحقیق وہ
ہے کہ ـــــ سب مراتب ہر جزئیہ و کلیہ و جملہ مستحب کا جامع ہو کما قیل ؎

برکفے جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق — ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن
گرد و درد دل مست از گرد و دید و جا — ہم وجانے نیست پا بدرالدجیٰ

مگر بمقتضائے آیت لاتغلوا فی دینکم (النساء [۱۷۰]) مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات
میں) و آیت تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا (البقرۃ [۲۲۹]) یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں
ہیں سو ان سے آگے مت بڑھو)

مندوبات میں کمی کرنے والے مستحقِ ملامت نہیں

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ان میں جو لوگ مندوبات (مستحبات) میں کمی کرنے والے ہیں
ان پر ملامت یا ان کی تحقیر یا ان پر تشدد یا ان سے نفرت رکھنا یہ خود موجبِ تجاوز عن الشریعۃ الکبریٰ
کے احداث فی الدین اور موجبِ ناخوشی سرکار ہے و ملامت ترکِ اتباع و خلافِ ادب و رضائی
تعظیم دربارِ مصطفوی ہے۔

مسند احمد میں ایک حدیث اس باب میں صریح ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نوافل کو
چھوڑتے ہوئے تھے، نماز میں بھی، روزے میں بھی، صدقہ خیرات میں بھی، دوسرے صحابی ان سے
نفرت رکھتے تھے، حضور پرنور کے دربار میں یہ مقدمہ پیش ہوا آپ نے ان نفرت کرنے والے
صحابی کے انکار کو ناپسند فرمایا۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے رسالہ حقیقۃ الطریقۃ میں یہ حدیث پوری نقل
کی ہے ونعم ما قیل ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا

ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ

زہد و تقویٰ اور صدق و صفا میں کوشش کرو مگر مصطفےٰ سے آگے مت بڑھو۔

البتہ ایسے لوگوں کو اگر زجر و ترغیب سے تکمیلِ مراتبِ مستحبہ کی طرف متوجہ کیا جاوے تو عین خیرخواہی و مطلوب فی الدین ہے۔

ضروری تنبیہ

اور ایک ضروری امر قابلِ تنبیہ یہ ہے کہ بعض اوقات تحقق و محبتِ نبویہ کی کمی کا غلط شبہ ہو جاتا ہے اور یہ شبہ توفیر و توجہ الی الطاعات کے غلبہ کے محل میں غیر عارف کو ہو جاتا ہے۔ لیکن فی الواقع وہ بھی محبتِ نبویہ ہی کا ایک لون ہے۔ شرح اس کی رسالہ نشر الطیب[1] میں بضمن مبحث درود شریف کی گئی ہے۔

پس بشرح ضروری سب حجابات کی ظلمت کی ختم ہوئی اور طریقِ اصلاح سب کا بقدر کافی اصل مضمون میں مذکور ہو چکا ہے۔ اس میں شرح کی حاجت نہ تھی، اصل مضمون کو دیکھ کر سب اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب واللہ رفیق قریب مجیب۔

---

[1] - نشر الطیب نام حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کا ایک رسالہ ہے جو سیرت نبویہ پر ہے۔ محمد علی

نماز کے متعلق کوتاہیاں

(از مستدرج معاملہ برکات)

بعد بیان اعمال میں نماز کا جو درجہ ہے وہ کسی عمل کا نہیں اور اس کا مقتضی یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کا ایسا خاص اہتمام ہوتا کہ اس میں کوئی نقص نہ رہتا مگر ہماری کم توجہی و غفلت نے اس کو بھی کوتاہیوں سے خالی نہ چھوڑا جن میں سے بعض کا بیان اس موقع پر کیا جاتا ہے اور اس کے قبل یہ امر بھی قابل عرض کر دینے کے ہے کہ نماز میں اختلال کا جو وبال ہے وہ اس حیثیت کے اعتبار سے بہ نسبت دوسرے اعمال کے اختلال کے زیادہ ہے کہ نماز فرض ہے اور ہر روز رات دن میں پانچ بار فرض ہے اس میں کوتاہی کرنا حق تعالیٰ کو دن بھر پانچ بار ناخوش کرنا ہے۔

بخلاف دوسرے اعمال کے کہ بعض فرض نہیں اور جو فرض ہیں تو روزانہ فرض نہیں، جیسے روزہ کہ سال بھر میں فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ کہ وہ بھی سال بھر میں فرض ہوتی ہے اور حج کہ عمر بھر میں ایک بار فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ اور حج تو سب پر فرض بھی نہیں ہوتا۔ یہ تفاوت تو نماز کو اور اعمال سے ہے۔

ترک غیبت ہر وقت فرض

اب یہ سمجھئے کہ تروک جو فرض ہیں یعنی معاصی کا ترک کرنا کہ وہ بھی روزانہ بلکہ ہر وقت فرض ہیں مثلاً غیبت کو ترک کرنا ہر وقت فرض ہے اور اس امر میں یہ تروک بھی مثل نماز کے فرض دائمی ہیں، مگر اس پر بھی ان کا اختلال نماز کے اختلال سے دو وجہ سے کم ہے۔

ایک یہ کہ یہ تروک ارکان اسلام سے نہیں، کیونکہ فرض بعض سب ارکان نہیں، تو ان کے اختلال سے ارکان کی تفویت لازم نہیں آتی گو معصیت اس سے بھی ہوتی اور نماز رکن اسلام ہے تو اس کے اختلال سے ایک رکن کی تفویت لازم آئی اور رکن کو نظر شارع علیہ السلام میں ایک خاص مقصودیت وابستہ ہے، اس لئے رکن کا فوت ہونا شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زیادہ ناگوار ہوگا۔

دوسری وجہ یہ باشہادت حس ترک سہل ہوتا ہے فعل سے، کیونکہ ترک میں اکثر ہمت یا اہتمام نہیں اور فعل میں اہتمام کی حاجت ہے اور جو چیز سہل ہوتی ہے اس کا وقوع اکثری ہوتا ہے اس لئے جو تروک فرض ہیں ان کا وقوع اکثر ہوگا اور اختلال کم اور جو افعال فرض ہیں اگر پورا اہتمام نہ کیا جاوے تو ان کا اختلال اکثر ہوگا اور وقوع کم۔ پس نماز میں اختلال کا احتمال زیادہ ہوا اور ان تروک مفروضہ میں کم اور یہی مدعا تھا۔ پس ثابت ہوگیا کہ تمام اعمال میں خواہ وہ وجودی ہوں یا عدمی صرف نماز میں کوتاہی کرنے کا ضرر اکثر اور اشد ہوگا، اس لئے اس کی اصلاح نہایت مہتم بالشان ہوئی۔

اس کے بعد بطور نمونہ کے بعض ان کوتاہیوں کا ذکر ہوتا ہے جو کثیر الوقوع ہیں، تاکہ ان پر تنبیہ اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ ہو۔

نماز پڑھنے والوں کی کوتاہیاں

سو ایک کوتاہی جس کے کوتاہی ہونے میں کوئی خفا ہی نہیں یہ ہے کہ بہت لوگ خود نماز ہی کے مطلقاً پابند نہیں ہیں، اس کے معصیت ہونے میں تو کلام کرنے کی اس سے ضرورت

نہیں نہ متفق علیہ ہے، البتہ یہ حضرات جو اس میں عذر پیش کیا کرتے ہیں ان کی نسبت مختصراً کچھ کہا جاتا ہے۔

بعضے یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو دنیا کی فرصت سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض بہانہ بازی و سخن سازی ہے، سبب اصل بے پروائی و لااُبالی پن ہے، کم فرصتی مانع نہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس روز یا جس وقت ان کو فرصت ہوتی ہے تب بھی ان کو نماز کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اگر یہ امر مانع تھا تو اس حالت میں تو یہ مانع مرتفع تھا، پھر ترک کی کیا وجہ؟ اس سے معلوم ہوا کہ اصلی مانع بے پروائی ہے، جو اس حالت میں بھی مشترک ہے۔

دوسرے اگر یہ مانع ہوتا تو اگر وقت پر فرصت نہ تھی اور اس لئے ادا نہ پڑھ سکے تھے، تو قضا کے لئے تو کوئی وقت خاص نہیں اور کبھی نہ کبھی وقت تو فرصت ہوتی ہے، اس وقت میں قضا پڑھ لیتے، جیسے نمازی پابندی والوں کی عادت ہے کہ اگر کبھی ان کا وقت نکل جاتا ہے تو اہتمام کر کے قضا پڑھتے ہیں۔

تیسرے اگر یہ بے پروائی سبب نہ ہوتا تو اس کوتاہی پر قلق ہوتا، جیسا مطالب دنیویہ کے فوت ہونے پر مدتوں حسرت ہوتی ہے، اس کی فکر لگ جاتی ہے، اس کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں، تدبیریں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، کیا ان بے نمازیوں کو اس فکر و کوشش اور قلق و سوزش میں دیکھا جاتا ہے؟ ان قرائن سے سبب اصلی وہی ایک طرح تشخیص ہو گئی، اس کے علاج کے لئے دو امر کی ضرورت ہے۔

نمازوں میں بے پروائی سے بچنے کا طریقہ

ایک یہ کہ ترک نماز کی وعیدوں میں غور کیا کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو کافر فرمایا ہے، خواہ شادی بیاہ کی سے فرمایا ہو اور ایسے شخص کا دوزخ میں جانا، پھر فرعون، ہامان، قارون کے ساتھ جانا ارشاد فرمایا ہے، اور قیامت میں سب سے اول پرسش نماز ہی کی ہوگی اور ان وعیدوں کی تقویت کے لئے دوزخ کے حالات پڑھا اور سنا کریں

سابق پر شریعت میں روزے کے ساتھ کفارہ مشروع ہونا اور خود ترکِ صلوٰۃ پر لقمانہ کا تعذیر کو جائز رکھنا اس مشقت عادیہ کا ماخذ ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ حالتِ صحت و حضر و فراغ میں تو پابند ہوتے ہیں، مگر مرض و سفر و شغل میں پابند نہیں رہتے، اس کا سبب بھی بجز ضعفِ ہمت و بیفکری کے کچھ نہیں، اگر آدمی کسی کام کا ارادہ و فکر کرتا ہے، کچھ نہ کچھ صورت اس کی بن ہی جاتی ہے۔ دلی بات ہے کہ اگر ان حالات میں پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو تو کیا اس کی ضرورت سے تھوڑی دیر کے لئے سفر یا شغل کو منقطع کرنا نہیں پڑتا؟ یا مرض کی حالت میں اٹھنا نہیں؟ اور کیا اٹھتا نہیں؟ پھر فرق بجز اس کے کیا ہے؟ کہ اس کو ضروری سمجھکر اس کا ارادہ کرتا ہے۔ اور یہ احوال مانع نہیں ہوتے اور نماز کو غیر ضروری سمجھکر اس کا ارادہ نہیں کرتا اور وہ مانع ہو جاتے ہیں اور اس سے زیادہ کوئی حالت افسوسناک ہوگی؟ کہ پیشاب پاخانہ کی ضرورت سے تو عین جوانی میں وقت نکل آتا ہے اور نماز کی ضرورت سے وقت نہیں نکلتا! پھر خاص کر سفر و مرض میں تو رعایتیں و تخفیفیں بھی بہت سی دی گئی ہیں مثلاً

(۱) پانی پر قدرت نہ ہو تو تیمم جائز ہے (۲) قیام پر قدرت نہ ہو تو قعود جائز ہے۔
(۳) ارکان پر قدرت نہ ہو اشارہ جائز ہے (۴) قبلہ معلوم نہ ہو تحری[1] جائز ہے۔

جن کے احکام کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے، یہاں سے ریل میں سوار ہو کر نمازیں چھوڑنے والوں کے عذر کا اور گھر کے کاروبار میں مشغول ہونے والوں کے عذر کا بارد ہونا معلوم ہو گیا ہوگا بالخصوص بیماری میں نماز چھوڑنا اور بھی محل افسوس ہے!

کیونکہ ہر بیماری پیغام موت ہے گو اس سے صحت ہی ہو جاوے، مگر وہ حالت تو اس کی محتمل ہے کہ شاید موت کا سبب ہو جاوے، سو اس حالت میں تو نماز و انابت الی اللہ و رجوع الی اللہ کا اور زیادہ اہتمام چاہیئے، تاکہ اگر مرے تو خاتمہ بالخیر ہو، اس میں غفلت سخت تعجب انگیز ہے۔۔۔!

بعضے بیمار اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کا کپڑا اور بدن پاک نہیں ہوتا، خواہ بیماری

---

[1] تحری غور و فکر کر کے قبلے کے بارے میں کسی نتیجہ پر قائم کرنا ۱۲ فیض محمد ابدال

چند روز ہوئے الفتاویٰ میں سلس البول وغیرہ عذر پر تحریر عجیب ہے! اس لئے کہ وہ دو حال سے خالی نہیں۔
یا تو وہ ان کے پاک کرنے پر بلا ضرر قادر ہیں یا نہیں، اگر قادر ہیں تو معذور کیسے؟
اور اگر قادر نہیں، تو وہ معذور ہیں، ان کو ایسی حالت میں نماز کا حکم ہے اور وہ نماز ان کی صحیح و درکار ہے، دوسروں کو ایسی نماز اور طبیعت سے اس کو ناجائز یا بیکار و ناقص سمجھنے کا کیا منصب ہے؟

عورتوں کی بے پروائی

ایک حالت خاص عورتوں کو بھی اللہ دائم پیش آتی ہے جس کے احکام نہ جاننے سے یا جان کر بے پروائی کرنے سے، بڑی بڑی پابند اور دین دار عورتوں کی نمازیں غارت ہو جاتی ہیں۔ اور وہ حالت انقطاع حیض کی ہے، حکم تو یہ ہے کہ اگر انقطاع حیض کے وقت نماز کا آخر وقت ہو اور اتنی مہلت باقی ہو کہ جلدی جلدی بدن سر سے سر یعنی پورا غسل ڈال کر ہو سکے یعنی بدن کا سیلان تک سے تمام بدن پر پانی بہا کر کپڑے پہن کر ایک بار "اللہ اکبر" کہہ سکے تو اس وقت کی نماز اس کے ذمے فرض ہو جاتی ہے، اگرچہ اس وقت تکمیل کی گنجائش نہیں مگر ثمرہ اس فرض ہونے کا قضا میں ظاہر ہوگا، یعنی اس نماز کو دوسرے وقت قضا کرنا پڑے گا اور جتنی نمازوں کا پورا وقت انقطاع کے بعد ملا ہے، ان نمازوں کا تو ادا پڑھنا فرض ہوگا۔

اب عموماً عورتوں میں بے پروائی دیکھی جاتی ہے کہ اول تو اس کا خیال نہیں رکھتیں کہ حیض کس وقت منقطع ہوا ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی نماز کے ایسے آخر وقت میں منقطع ہوا ہو جس میں غسل ضروری ہے و تکبیر تحریمہ کی گنجائش ہو اور اس لئے وہ نماز ان پر فرض ہو گئی ہو، لہٰذا ان کے ذمہ یہ ضرور ہے کہ ہر نماز کے آخر وقت میں ضرور پاکی و ناپاکی کو دیکھ لیا کریں، تاکہ ان کو معلوم ہو سکے کہ فلاں وقت کی نماز بھی ہمارے ذمہ فرض ہو گئی۔

دوسرے بعد علم انقطاع کے بھی پورے پورے کئی کئی وقت غسل میں دیر کر کے ٹال دیتی ہیں اور پھر ـــ غضب یہ ہے کہ وہ اس کا گناہ تو اپنے سر لیا ہی تھا ان اوقات

؎ ایسے ہی مکتوب جس میں بیان ہے حضرت مفتی ہو کر آتا ہے۔ واقفی محمد مرادی

کی نمازوں کی قضا بھی نہیں پڑھتیں! اور اس طرح سے ہر مہینے ان کے ذمہ کئی کئی نمازیں چڑھتی چلی جاتی ہیں جن کا مجموعہ عمر بھر میں ایک بڑی مقدار کو پہنچتا ہے، اگر ہر مہینے تین ہی تین نمازیں جمع ہوتی رہیں تو سال بھر میں چھتیس اور تیس برس میں ایک ہزار سے زیادہ ہوتی ہیں، پھر ان کی زندگی میں قضا ہے، نہ مرتے وقت ان کے فدیہ کی وصیت ہے، آخر انہوں نے قیامت کے لیے کیا جواب تیار کر رکھا ہے؟ اور پھر اس پر یہ گمان کہ ہم نماز کے پابند ہیں جب قیامت میں یہ غفلت ظاہر ہوگی اس وقت کیا حال ہوگا؟

بے پروائی کا علاج

ان سب کا علاج بھی وہی دو امر ہیں جو اوپر مذکور ہوئے یعنی
(۱) وعیدوں میں غور کرنا، نفس پر جبر کرنا، اور جو غلطی احکام نہ جاننے
سے ہے اس کے لئے احکام کا سیکھنا پوچھنا۔

چونکہ عورتوں کو غالب احوال میں پوچھنے کا سامان کم میسر ہوتا ہے، اس لئے مردوں پر واجب ہے کہ اپنے متعلقین کو احکام شرعیہ بتلاتے رہیں جو نہ معلوم ہوں علماء سے تحقیق کر کے بتلا دیں اور عورتوں پر واجب ہے کہ جو صورت پیش آوے گھر کے مردوں کو فرمائش کریں کہ وہ علماء سے پوچھ کر ان کو بتلا دیں، اور اگر گھر کے مرد غفلت کریں، دوسرے شخص کے واسطے سے تحقیق کریں، اگر کوئی توجہ نہ کرے تو خود علماء کے گھر جا کر ان کے محارم یا بیبیوں کے ذریعہ سے دریافت کریں، ورنہ گناہگار ہوں گی۔

اور ضروری احکام پوچھنے کے لئے جب جانے کی ضرورت ہو اگر شوہر جانے سے منع کرے تو اس کی اطاعت واجب، بلکہ جائز بھی نہیں، اور اگر لکھنا آتا ہو تو جانے کی ضرورت نہیں بذریعہ خط کے دریافت کرتی رہیں، اور یہ سب جب ہے جب کہ کوئی مرد خاندان کا ان کے کہنے سے علماء سے مسئلہ پوچھ کر ان کو نہ بتلا دے، ورنہ کسی کو خط لکھنا یا کہیں جانا اپنے شوہر کی خلاف مرضی جائز نہیں۔

بعض عورتوں کے پابند نہ ہونے کا ایک سبب اور ہے، وہ یہ کہ ایسی مبالغہ کی زیادہ

بعض خدمت کے خوف سے بجا آوری احکام کا اہتمام کرتی ہوں، زیادہ سبب مذمت کا عادت ہے
سو چونکہ عورتوں کو ہر مہینہ بوجہ ایام معمولی کے کئی کئی روز تک نماز پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوتا اس
کا اثر بعد پاک ہونے کے بھی یہ رہتا ہے کہ بعض اوقات نماز میں سستی ہو جاتی ہے، سو
اس کا اصلی علاج تو یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کیا جاوے۔ مگر سبب ظاہری
کا علاج کردہ بھی ایک درجہ میں کافی ہے اور وہ یہ ہے جس کو فقہاء نے ذکر فرمایا ہے۔
کہ عورت کو حالتِ حیض میں بھی مستحسن ہے کہ نمازوں کے اوقات میں وضو کر کے مصلے
پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر تسبیح و تہلیل میں مشغول رہے، اس سے وہ عادت محفوظ رہتی
ہے اور جو سستی ترکِ عادت کے سبب ہو سکتی ہے وہ نہیں ہوتی۔

بے نمازیوں کا بہانہ

بعضے بے نمازوں کا عذر ایسا شرعی پیرایہ لئے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں کہ نماز بدون حضورِ
قلب کے ہوتی ہی نہیں اور حضورِ قلب ہم سے ہو نہیں سکتا، اس لئے نماز ہی چھوڑ دی۔
در حقیقت اس استدلال میں انہوں نے مغالطہ و تلبیس سے کام لیا ہے، کیونکہ جس حضورِ قلب
پر نماز کی صحت بالکمال موقوف ہے وہ اور ہے اور جو ہمارے امکان سے خارج ہے وہ اور
ہے۔ تو دونوں مقدموں میں حدِ اوسط (علم منطق کی ایک اصطلاح) مکرر نہیں، لہٰذا یہ قیاس
غلط ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضورِ قلب کے مراتب مختلف ہیں۔

ایک مرتبہ وہ ہے جس کو فقہاء نیت[1] کہتے ہیں اور وہ موقوف علیہ ہے صحتِ صلوٰۃ
کا یعنی بدون اس کے نماز ادا ہی نہیں ہوتی۔

اور دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کو خشوع کہتے ہیں جس کی حقیقت ان شاء اللہ تعالیٰ
عنقریب مذکور ہوگی اور وہ موقوف علیہ ہے کمالِ صلوٰۃ کا یعنی اس کے نہ ہونے سے نماز
تو صحیح ہو جاتی ہے مگر کامل نہیں ہوتی۔

---

[1] نیت دل سے ارادہ کرنے کو کہتے ہیں زبان سے کہنا ضروری نہیں ۱۲ محمد علی

ایک معقولی استدلال

تیسرا مرتبہ وہ ہے جس کو تعطیل دماغ سے تعبیر کرنا مناسب ہے، یعنی اس نفس قسم کا خطرہ نہ آوے اور یہ ایک قسم کا استغراق اور حال ہے اس درجہ میں صحت صلوٰۃ کی موقوف علیہ ہے، اور نہ کمال صلوٰۃ کا، البتہ فی نفسہ ایک محمود حالت ہے، گو مقصود نہیں۔

اوّل اور دوسرا مرتبہ اختیاری اور مقدور اور شرعاً مامور بھی ہے اور اول مقدمہ میں یہی مراد ہے اور تیسرا مرتبہ غیر اختیاری اور غیر مقدور اور شرعاً غیر مامور بہ ہے اور دوسرے مقدمہ میں یہی مراد ہے،

جب حد اوسط مشترک نہیں تو نتیجہ کیسے نکلے گا؟ اور اگر دونوں مقدموں میں ایک ہی مراد ہو تو پھر ایک مقدمہ باعتبار مادہ کے غلط ہوگا، مثلاً دونوں جگہ مرتبہ اول وثانیہ مقصود ہے، جیسا ابھی بیان ہوا اور مقدور کو غیر مقدور کہنا غلط ہوگا، اور اگر دونوں جگہ مرتبہ ثالثہ مراد لیا جاوے تو دوسرا مقدمہ صحیح ہوگا مگر پہلا مقدمہ غلط ہوگا کیونکہ مرتبہ ثالثہ شرعاً غیر مامور بہ ہے، جیسا ابھی بیان ہوا اور غیر مامور بہ کو مامور بہ کہنا غلط ہوگا، جیسا مقدمہ اولیٰ میں لازم آتا ہے۔

کیونکہ کسی امر کا صلوٰۃ کے لئے صحتاً یا کمالاً موقوف علیہ ہونا مستلزم ہے اس امر کے مامور بہ ہونے کو، جیسا کہ ظاہر ہے، جب ایک مقدمہ غلط ہوا تب بھی نتائج صحیح نہ ہوا۔

غرض خواہ ہیئت قیاس کی غلط ہو یا مادہ، نتیجہ دونوں حال میں غلط ہوگا، پھر علاوہ فی نفسہ غلط ہونے کے ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ان کے اس استدلال سے نص قطعی لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔ البقرہ [صد ۲۰۰ ـ ۲۸۶] ترجمہ: اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے، کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ جو مرتبہ حضور کا ایسا ہے کہ بدون اس کے نماز نہیں ہوتی، خواہ مرتبہ صحت میں یا مرتبہ کمال میں، لامحالہ شریعت میں اس کے حاصل کرنے کا حکم ہوگا، اور جس امر کا حکم ہوتا ہے اس کا داخل وسعت ہونا نص بالا لازم ہے، پھر اس کو وسعت سے خارج کہنا نص کی تکذیب ہے یا نہیں۔۔۔؟

عقل کے پتلوں سے سوال اور جہل کا علاج

پھر ان عقل کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ نماز میں جتنے فرائض موقوف علیہ صلوٰۃ کے ہیں اگر وہ کبھی وسعت سے خارج ہو جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت سے ان کا کوئی بدل اس کے قائم مقام کر کے اس کی اجازت دیتی ہے مثلاً قیام فرض ہے اگر قدرت نہ رہے، قعود اس کے قائم مقام ہوتا ہے، علیٰ ہذا پس اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ حضورِ قلب کا مرتبہ جو رہے وسعت سے خارج ہے، تو ضرور ہے کہ شریعت میں کوئی اس کا بدل ہوگا؟ سو اس بدل کے ساتھ نماز پڑھنا ضرور ہوا پھر ترک کی کیسے گنجائش نکلی.....؟

یہ اس وقت ہے جبکہ حضورِ قلب اس کا رکن ہو اور اگر رکن نہ ہو، تو اس صورت میں سوچنا چاہئے کہ نماز بلا حضور پڑھنے میں تو نماز کے ایک تابع متعلق کا فوت ہے اور نماز نہ پڑھنے میں خود اصل متبوع ہی کا فوت ہے، تو متبوع کا فوت کر دینا اشد ہے یا تابع کا؟ پھر چونکہ تابع کا وجود بدون متبوع کے نہیں پایا جاتا اور متبوع کو فوت کر دیا ہے، تو لامحالہ تابع بھی فوت ہوگا، تو نماز پڑھنے میں تو صرف حضورِ قلب ہی فوت ہوتا اور نہ پڑھنے میں وہ حضور بھی گیا، اور نماز بھی گئی؛ تو صرف تابع کا فوت ہونا اہون ہے یا متبوع و تابع ہر دو کا؟

خوب سمجھ لو! چونکہ سبب ان کی غلطی کا جہل ہے، ہماری اس تقریر میں غور کرنا اس جہل کا علاج ہے۔

بعض لوگوں کے نماز نہ پڑھنے کا یہ مبنیٰ ہے کہ وہ باوجود دعویٰ اسلام کے نماز کو فرض نہیں سمجھتے پھر ان میں دو قسم کے لوگ ہیں، (۱) بعض فلسفیت کے رنگ میں ہیں (۲) بعض تصوف کے رنگ میں،

اہلِ فلسفہ کا دعویٰ اور اس کا رد

قسم اول کی تقریر یہ ہے کہ اصل مقصود شارع کا تہذیب اخلاق ہے زمانۂ نزول حکم صلوٰۃ میں لوگوں میں صفات ذمیمہ کبر و ظلم وغیرہ کا غلبہ تھا، نماز کی ہیئات و اوضاع والا تواضع و لین

کی تعلیم دیتے ہیں، اس لئے ان کو نماز کا حکم کیا گیا، ہم چونکہ مہذب ہو چکے ہیں لہٰذا ہم کو نماز کی ضرورت نہیں ...... الخ

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سب اس پر مبنی ہے کہ احکام شرعیہ کو مقصود بذات نہ کہا جاوے مقصود بالغیر کہا جاوے اور پھر وہ غیر بھی وہ ہی امور ہوں جو تم دعویٰ کرتے ہو، سو اس میں دو دعوے تمہاری طرف سے ہوتے ہیں جن کا ثابت کرنا تمہارے ذمہ ہے، جس پر تم قیامت تک بھی قادر نہ ہو سکو گے، بلکہ یہ احکام خود بھی مقصود بالذات معلوم ہوتے ہیں، اور ایسے بے سر و پا شبہات سے یہ قطعی و یقینی دلائل نہیں ہو سکتے۔

غرض عقلاً و سمعاً ایسا اعتقاد یقیناً الحاد و زندقہ ہے اور ایسا شخص ہرگز مسلمان نہیں اس کو نماز کے ساتھ تجدید ایمان کا فکر کرنا ضروری ہے، یہ جواب جب ہے کہ ہم اس کو مان لیں کہ واقعی یہ لوگ اپنی تہذیب نفس سے فارغ ہو چکے ہیں، حالانکہ صنو! اس میں کلام ہے ترفع و تجبر و تعلّی و تکبر و ظلم و شہوت و قساوت و غفلت جس درجہ ان مدعیوں میں پائی ہوتی ہے، اس زمانہ میں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ اگر مشروعیت صلوٰۃ کی ان ہی مصالح کے لئے ہوتی تب بھی یہ لوگ بہ نسبت اس زمانے والوں کے نماز کے زیادہ محتاج ہوتے۔ اس مرض کا نہ جیسا ہے ...... نیز علاج ہماری اس تقریر کا یہ ہے کہ خود کرنا۔ اور یہ اگر فی نہ ہو، تو محققین سے اپنے مشتبہات کو رفع کر لینا ہے۔

اہل تصوف کی تقریر اور اس کا جواب

قسم ثانی کی یعنی جو تصوف کے رنگ میں ہیں ان کی تقریر یہ ہے کہ اصل مقصود قرب الٰہی ہے اور نماز و دیگر عبادات محض اس کا واسطہ ہے اور واسطہ بھی بالضرورت نہیں بلکہ بالحقیقت اور وہ حقیقت ذکر ہے، پس اگر کسی کو ذکر دوام میسر ہو جائے، اس کو نماز کی حاجت نہیں، یا نماز ہی پڑھ پڑھ کر مقام قرب میسر ہو جاوے، پھر بھی نماز کی حاجت نہیں، اگر پڑھتے بھی ہیں تو اس پر فرض نہیں رہی، فرائض ان کے حق میں نوافل ہو گئے۔

اس کے جواب میں بھی یہی تقریر بالا بوجہ منع کے مقابلہ میں بھی کافی ہے۔
اور اس پر بھی دیکھو فتوحی اور یہی علاج عرض کیا جاتا تھا۔

اور دونوں کے خطاب میں اس مثال کا پیش کرنا مفید ہو سکتا ہے مثلاً
کہ جس طرح بعض ادویہ طبیہ میں باوجود بعض ... کا حصہ ہونے کے اپنے اثر میں
بالخاصیہ ہوتے ہیں اور ان کی تعیین اسباب ظاہرہ کے علم سے ہوتی ہے ... اسی طرح اگر
سب عبادات شرعیہ کو محض اپنی صورت نوعیہ و خاصہ کے اعتبار سے خاص ثمرات، مثل اطلاق
مرضیہ حق و نجات و قرب و رضا میں فاعل اور موثر کہا جائے تو اس کی نفی کی کیا دلیل ہے ... ؟
اور اس بات کی دلیل نصوص کا سیاق و اطلاق ہے کہ کہیں ان کا اعمال پر واسطہ ہونا نہیں
جتلایا گیا اور جو کہیں بعض طاعات کی حکمت بتائی گئی ہے تو غایت ما فی الباب اس حکمت کا ترتب
علی الاحکام ہونا ثابت ہوتا ہے مگر ترتب علیہ الاحکام ہونا اور علت ... کا موقوف ہے
ثبوت امر زائد پر۔ یہ سب صورتیں تھیں ایک کوتاہی کی یعنی نماز نہ پڑھنے کی؛

بعض مشائخ میں تاخیر صلوٰۃ کی عادت اور اس کا علاج

ایک کوتاہی نماز کے متعلق یہ ہے کہ بعضے آدمی گو ان کا نماز تو فوت نہیں ہونے
دیتے مگر وقت کا اہتمام نہیں کرتے اکثر تنگ وقت میں نماز پڑھتے ہیں بعض دفعہ قضا بھی
ہو جاتی ہے گو کم سہی اور گو پھر فوراً قضا پڑھ بھی لیتے ہیں۔ پھر بعض کو تو کوئی مجبوری ظاہری
ہوتی ہے گو وہ مجبوری اس لئے معتبر نہیں کہ اگر اس میں سعی و توجہ کرتے تو ضرور کوئی صورت
انتظام کی نکل آتی مگر بعض تو محض بیکار گپوں میں مشغول رہ کر وقت کو اخیر کر دیتے ہیں اور
نہایت افسوس سے ساتھ کہا جاتا ہے کہ بعض ان میں مشائخ ہیں اور محض تلبیس شیطانی یا تسویل
نفسانی سے تاخیر صلوٰۃ کے خوگر ہو گئے ہیں، چنانچہ ہر ایک کے متعلق مختصر کلام کیا جاتا ہے۔

جو لوگ ظاہراً کوئی مجبوری رکھتے ہیں ان میں بعض کو تو کسی درجہ میں بھی مجبوری نہیں
جیسے تاجر و محرر و ملازم اجلاس و اہل حرفہ و امثالہم کہ یہ لوگ بالکل آزاد ہیں، تھوڑی دیر کے
کام چھوڑ سکتے ہیں، سو ان کے عذر کے متعلق تو کسی جواب کی ضرورت نہیں۔

بعض کو البتہ کسی درجہ میں مجبوری ہے، جیسے نوکر لوگ انگریزوں کے سامنے ایسی

جانے سے کچھ نہیں کر سکتا۔ سو اس کے متعلق یہ ہے کہ اول تو اوقاتِ نماز میں اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور دیکھا گیا اکثر یہی ہے کہ باستثناء شاذ و نادر کوئی افسر نماز سے منع نہیں کرتا۔ اور اگر کسی طرح اجازت حاصل نہ ہو، نہ خود ان سے، نہ اس کے بالا افسر سے تو اس صورت میں ایسی نوکری ہی جائز نہیں، خدا تعالیٰ دوسرا سامان رزق کا کر دے گا، ایسی نوکری چھوڑ دینی چاہیے۔

البتہ جس شخص کے پاس بظاہر سردست کوئی سبیل ضروری معاش کی بھی نہ ہو، نوکری میں نہ سرمایہ ہو کہ تجارت کرے، نہ مزدوری کی عادت ہو اور بدون عادت چلنا دشوار ہوتا ہے تو ایسی حالت میں نوکری چھوڑنے میں تعجیل نہ کرے اس فکر میں لگا رہے، اور دیگر خیرخواہوں سے بھی سعی کراوے اور تا حصول کسی سبیل کے جیسے اس بلائے اختلالِ وقتِ صلوٰۃ سے استغفار اور دعائے استخلاص، اور دوسری سبیل کے استعمال کیا کرتا رہے۔

اور جن کو برائے نام بھی مجبوری نہیں محض بیکار وقت ضائع کرتے ہیں، ان کو اپنی حالت پر خصوصیت سے نظر کرنا چاہیے اور نفس سے محاسبہ کرنا چاہیے کہ جب پانچوں وقت نماز پڑھنا ہی ہے، تو تاخیرِ اوقات سے کون سی آسانی و تخفیف ہوگی اور مجبوری کچھ نہیں ہے تو نہ کوئی مصلحت تھی کہ تاخیر کے اختیار کرنے کا مرجح ہو، نہ کوئی مجبوری تھی کہ تاخیر بالاضطرار کا سبب ہو، پھر وبال لینے سے کیا حاصل ہوا؟

اگر نفس یہ کہے کہ تاخیر کرنے سے مشغلہ تفریح کا وقت زیادہ مل سکتا ہے، تو اس کو جواب دینا کہ اگر دونوں نمازیں اول وقت میں پڑھی جاویں تب بھی ان کے مابین اتنی ہی گنجائش ہوگی جتنی ان دونوں نمازوں کو آخر وقت پر پڑھنے سے ملتی ہے۔

مثلاً اگر کسی نے ظہر چار بجے پڑھی اور عصر سات بجے تو درمیان میں تین گھنٹے ملے، سو اگر ظہر دو بجے پڑھتا اور عصر پانچ بجے تب بھی درمیان میں تین گھنٹے ملتے۔ تو جتنا کام درمیان میں تاخیر کی صورت میں کر سکتا ہے اتنا ہی تعجیل کی صورت میں کر سکتا ہے پھر تاخیر میں بجز معصیت کے کون سی مصلحت ہوئی ...؟

تضلیلِ شیطانی

اور ایسے مشائخ کو زیادہ تضلیلِ شیطانی اور نیز تسویلِ نفسانی اس تاخیر کا سبب ہوتی ہے۔
تضلیلِ شیطانی اس طرح کہ انہوں نے اپنی تجویز سے یا پیرِ شیخ کی تعلیم سے کوئی معمول یا ورد ایک خاص مقدار سے مقرر و ملتزم کر لیا اور اس میں وقت کی تعیین محض کسی مصلحتِ زائدہ غیر ضروریہ کے سبب سے تھی، مگر بوجہ غلو کے عازم ملتزم نے اس کو ایسا ضروری سمجھا کہ اس کی حفاظت کے لئے نہایت ضروری کی بھی پروا نہ رہی، مثلاً بعض اوراد ما بین سنت و فرضِ فجر کے پڑھے جاتے ہیں۔

میں نے بعض متشددین و معمرین کو دیکھا ہے۔ جماعت کھڑی ہو گئی، مگر وہ اپنے ورد میں مشغول ہیں حتیٰ کہ جماعت فوت کر دی، اور بعض اوقات خود وقت بھی تنگ ہو گیا، مگر اس ورد کی ترتیب میں تغیر و تبدیل کو ہرگز جائز نہیں رکھیں گے، حالانکہ یہ تغیر فی نفسہ جائز تھا۔ اور جب عدمِ تغیر سے جماعت فوت ہو گئی یا بعضاً وقت تنگ ہو جا وے، اس وقت تغیر واجب تھا، مگر ان کو ترکِ واجب کی ذرا پروا نہیں! پھر اپنے اس التزام پر اس قدر شاد و نازاں ہیں کہ اپنے کو صاحبِ استقامت سمجھتے ہیں کہ کبھی کوئی معمول میں تغیر نہیں ہوتا . . . !

میں نے ایک شخص کو یہ فخر کرتے سنا ہے کہ صاحب میری فرض نماز کرنا غہ ہو جاتی ہے، مگر پیر صاحب نے جو کچھ بتلا دیا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ خلوف الدین اور اتخاذ احبار و رہبان کی یہ اقبح افراد میں سے ہے، سبب اس کا جہل ہے علوم شرعیہ سے کہ حدودِ اعمال کی معلوم نہیں خواہ یہ جہل غلطی کی بسیط ہو یا مرکب ہو، علیٰ اختلاف الاحوال۔ یہ تضلیلِ شیطانی تھی۔

تسویلِ نفسانی

اور تسویلِ نفسانی اس طرح سے ہے کہ از راہِ شفقت علی الخلق کے سبب یہ خیال ہوتا ہے کہ جلدی پڑھ لینے سے بہت لوگ جماعت سے رہ جائیں گے، اس لئے انتظار کرنا چاہیے، تاکہ

سب جماعت میں مل جاویں، اور کوئی محروم نہ رہے، اس کا نام تسویل اس لئے رکھا گیا
کہ صورۃً یہ خیال نہایت محمود ہے اور فی نفسہ بھی ہے کہا گیا کہ منشاء اس کا ایک صفت ہے
صفاتِ نفسانیہ سے کہ وہ شفقت ہے اور گو وہ فی نفسہ صفت محمودہ ہے اور اس لئے
جو خیال اس سے ناشی ہے کہ وہ خیرخواہی ہے آنے والے نمازیوں کی کہ کوئی محروم نہ رہ جاوے
وہ بھی نیک ہے، مگر یہ محمود اسی وقت تک محمود ہے جب تک وہ کسی امر مذموم کو متضمن نہ ہو اور
یہاں یہ شفقت اور یہ خیرخواہی سبب ہو گئی تفویتِ وقت کی حدِ غیر مشروع تک اور یہ مذموم ہے
اس لئے وہ منشاء اور ناشی سب مذموم ہو گیا۔

اور ان سب نمازوں میں سب سے زیادہ قابلِ نظر ایسے حضرات کے لئے جمعہ کی نماز ہے،
کیونکہ اور نمازوں کا اگر وقت نکل گیا اور علم نہ ہوا تو وہ قضا کی تو ہو سکتی ہیں گو بعض فقہاء
کے نزدیک یہی اور جمعہ کا وقت اگر نکل گیا تو اس کی قضاء ظہر سے ہو سکتی تھی نہ کہ جمعہ سے،
پس جب جمعہ پڑھا تو وہ ادا ہوا کیونکہ وقت نہ تھا اور نہ قضاء کیونکہ قضاء میں جمعہ نہیں پڑھا
جاتا، تو پس یہ نماز ان سب کے ذمہ واجب رہی، وہ رہی یہ مصلحت کہ کوئی رہ نہ جاوے اول
تو جب اس میں اتنا بڑا مفسدہ لازم ہے تو اس مصلحت کا کیا اعتبار؟

پھر وہ مصلحت بھی کچھ تاخیر کے ساتھ خاص نہیں، تجربہ سے یہ امر یقینی ہے کہ اس
باب میں جس جگہ جیسی عادت کا التزام کر لیا جاتا ہے تمام لوگ اسی کے تابع ہو جاتے ہیں
جہاں سویرے نماز ہوتی ہیں سب کو تقاضا رہتا ہے کہ جلدی چلو، چنانچہ سب فوراً جمع ہو جاتے ہیں۔
اور کوئی بھی متخلف نہیں رہتا، اور دیر سے پڑھنے والے ہیں وہ مشاہدہ سے دیکھا جاتا ہے کہ سست
تاخیر میں بھی رہ جاتے ہیں، بلکہ اکثر رہتے ہیں، ان کو بے فکری رہتی ہے کہ میاں ابھی کیا جلدی
ہے وہاں تو بہت دیر میں جماعت ہوا کرتی ہے، بس اسی میں رہ جاتے ہیں، تو تاخیر کی وہ بھی
غرض حاصل نہ ہوئی اور اگر حاصل بھی ہوتی تب بھی وہ لا حاصل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔

عیدین میں بھی تاخیرِ صلوٰۃ!

بہرحال وقت کا اس قدر مؤخر کرنا نماز کا بالکل تباہ کرنا ہے، چنانچہ احادیث میں اس پر
سخت زجر آیا ہے اور ایسی نماز کو منافقوں کی نماز فرمایا ہے اور لگاوٹ اہلِ علم میں سے بھی

بعض دفعہ اس میں بھی ابتلا ہوتا ہے جس کا اکثر موقع یہ ہوتا ہے کہ مدرس کو کوئی کتاب ختم کرانا ہے یا سبق کسی خاص مقام تک پہنچانا ہے یا مہتمم کو کسی جماعت کو امتحان سے فارغ کرنا ہے — یا مصنف کو کسی مضمون کو پورا کرنا ہے۔

تو ان مقاصد کو رعایت وقت پر بسا اوقات ترجیح دی جاتی ہے اس کا وقوع علماء سے بہ نسبت مشائخ کے اور بھی زیادہ عجیب ہے، کیونکہ یہ اصل وضع میں مقتدائے دین ہیں جب مقتدا ایسا کرے گا پھر مقتدی کا کیا پوچھنا ہے؟

(۴) ایک کوتاہی (گو ایسا شاذ ہوتا ہے مگر ہوتا ہے) اس کوتاہی مذکورہ کے مقابل کوتاہی ہے یعنی نماز میں اس قدر تعجیل کرنا کہ وقت بھی آنا یقینی نہ ہو۔

بعض لوگ فجر کی نماز صبح صادق سے پہلے شروع کرتے ہوئے دیکھے سنے گئے، بعض اہل افراد جمعہ کے روز دن بھی نہیں ڈھلنے دیتے اور کھڑے ہو جاتے ہیں، بعضے مریضوں کو دیکھا گیا کہ مغرب کی تھوڑی ہی دیر بعد آسانی کے لئے عشا پڑھ لیتے ہیں وقت بھی نہیں آتا اور جس کے مسلک پر مثلین کا قول بھی قوت رکھتا ہو اس کے لئے عصر کی نماز مثلین کے قبل پڑھ لینا احتیاط کے خلاف ضرور ہے۔

بہرحال وقت میں افراط و تفریط کرنا دونوں واجب الاحتراز ہیں، اگر اجلاس پر حاضری کا معین وقت پر حکم ہو تو قبل از وقت آکر بیٹھ رہنا یا وقت ختم کر کے آنا دونوں بیکار ہیں۔ تو شریعت کی تعیین کی وقعت و عظمت کیوں نہ کی جائے؟

عورتوں میں نماز کا اہتمام نہ ہونا

(۵) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ مستورات زنان میں ذرا سے عذر موہوم سے ایسی رخصت پر عمل کرنے لگتے ہیں جو کہ عذر قوی سے متعلق ہے، مثلاً ذرا حرارت کا شبہ ہوا یا ذرا ہوا میں خنکی ہوئی بجائے وضو و غسل کے تیمم کر لیا، ذرا طبیعت میں کسل ہوا بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے، ریل میں ذرا جگہ کی تنگی ہوئی جس کا آسانی سے انتظام ہو سکتا تھا بیٹھ کر اور بعض دفعہ بے رخ، بعض دفعہ اشارہ سے نماز پڑھنا شروع کر دی، بلکہ ریل میں تو بالکل نماز ہی

ڈالی جاتی ہے، بالخصوص عورتیں تو ریل میں شاذ و نادر ہی نماز پڑھتی ہوں گی، اپنے دل کو سمجھا لیتی ہیں کہ یہاں نہ تو پانی کا انتظام ہے نہ وضو کی گنجائش ہے۔ نہ تختہ پاک ہے۔ نہ رخ معلوم ہے یا رخ کی طرف پڑھنا دشوار ہے نہ پردہ کا پورا انتظام ہے اور ان عذروں سے مستورات کی نماز ریل گاڑی کے سفر میں بھی اکثر برباد ہوتی ہے۔

حجاج کی نمازوں میں کاہلی و سستی

اور ان سے زیادہ ان لوگوں کی حالت قابل حسرت ہے جو حج کو جاتے ہیں اور ریل یا جہاز میں بیہودہ عذروں سے یا کاہلی سے نماز نہیں پڑھتے، ایک عبادت ادا کرنے چلے اور پانچ فرض روزانہ برباد کر گئے، اگر جہاز ہی کی ضائع شدہ نمازیں شمار کی جائیں اور ایک جہاز میں پندرہ دن کی رفتار فرض کی جائے تو پانچ نمازوں کے حساب سے پچھتر نمازیں ہوتی ہیں، اسی طرح اگر واپسی کا پھیر رکھا جائے تو اتنی ہی اس میں ہو کر ڈیڑھ سو ہوئیں، کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک فرض ادا کیا اور ڈیڑھ سو فرض برباد کر گئے!! کیا ایسے شخص کے حج کو کہا جا سکتا ہے کہ عمر کا فرض سمجھ لیا گیا ہے؟ اگر یہ تھا تو ڈیڑھ سو فرض کیا فضول ہی کے تھے ان کو کس دل سے ضائع کرنا گوارا کیا؟ سچ ہے کہ .... ہم لوگوں کو باعث عبادت کا بھی اکثر امور نفسانیہ امتیاز یا دفع ملامت وغیرہ ہوتا ہے یا اگر محض نہیں ہوتا تو آمیزش زیادہ ضرور ہوتی ہے۔

پھر جانا اگر ان بہانوں پر نماز ترک کر دی تب بھی اور اگر اس میں بلا ضرورت شرعی رخصت پر عمل کر لیا وہ بھی ترک ہی کے حکم میں ہے تب بھی نہایت بد دلی کی دلیل ہے۔ ایسی نماز پر تو صادق ہوتا ہے کہ محض دکھلاوے کے لئے نام کرنے کو پڑھتے ہیں۔ ایسے نمازیوں کی شان میں فرمایا گیا ہے وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا (النساء ۱۴۲) اور جب کھڑے ہوں نماز کو تو کھڑے ہوں ہارے جی سے لوگوں کو دکھانے اور یاد نہ کریں اللہ کو مگر تھوڑا سا۔

بڑی وجہ اس کی دو امر ہیں۔

(۱) مسائل کی ناواقفی

(۲) نماز کی عظمت دل میں نہ ہونا۔

اول کا علاج، علم و واقفیت ہے۔ جس کا طریق سہل یہ ہے کہ نماز کے متعلق جو صورتیں پیش آجاویں یا جو جو احتمال ذہن میں آتے ہیں ان سب کو حافظہ میں یا کتابت میں مقید و محفوظ کر کے زبانی یا بذریعہ خط علماء دین سے پوچھتے رہیں۔

دوسرے کا علاج یہ ہے کہ دل میں وعید یں مخالفت احکام کی سوچیں تاکہ ان احکام کی عظمت پیدا ہو، جب عظمت پیدا ہوگی تو ضرور اس کی کوشش و ارادہ کرے گا، جب کوشش و ارادہ کرے گا خود ان عذروں کا لغو ہونا سمجھ میں آجاوے گا، کیا کسی تقریب میں جانے کے وقت یا کسی معزز مہمان کے آنے کے وقت جبکہ بدن اور کپڑے میلے ہوں یہی شخص جو ادنیٰ بہانہ سے تیمم کرتا ہے، غسل کر کے کپڑے بدلتا ہوا نہیں دیکھا جاتا...؟ کیا ایسے ہی موقع پر اگر دیر تک کھڑا ہونا پڑے، بلکہ چلنے کی ضرورت ہو تو کیا اس کو تکان نہیں ہو جاتا؟ مگر نماز میں کھڑا نہیں ہوا جاتا! کیا ریل میں اپنی آسائش کی ضرورت سے یا اپنے کسی مریض رشتہ دار کے آرام دینے کے لئے مسافروں سے جگہ دینے کی اس نے کبھی درخواست نہیں کی؟ تو نماز کے لئے عجب سکوت منہ پر کیوں لگائی جاتی ہے۔

نماز کا اثر اور برکت

بلکہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نماز میں وہ اثر اور برکت ہے کہ جب نماز کے لئے جگہ دینے کی درخواست کی جاتی ہے تو اکثر تو ہر جگہ مستثنیٰ ہو جاتے ہیں اور شاید ہی نہیں آیا کرتے، باقی ہمیں نہیں دیکھا کہ کسی نے ذرا بھی عذر کیا ہو، مخالف مذہب والے تک رعایت کرتے ہیں، مگر خود ہی کوئی کچا اور کم ہمت ہو تو کیا علاج؟ ورنہ ریل میں اچھے خاصے کھڑے ہو کر رکوع و سجدہ کے ساتھ اور رخ کی طرف نماز ہو سکتی ہے اور اگر کسی موقع پر واقعی عذر ہو تو وہاں شریعت نے تنگ نہیں کیا۔ رخصت پر عمل جائز ہے۔

اور بعض عذر بالخصوص مستورات کے جو عذر مذکور ہوئے مسائل جاننے سے رفع ہو سکتے

ان ہی میں سے ایک عذر بے پردگی کا ہے کہ ریل سے اتر کر نماز پڑھنے میں بے پردگی ہے تو اس کے
متعلق حکم شرعی سمجھ لینا چاہئے کہ ایسے وقت میں صرف برقعہ کا پردہ کافی ہے۔ ریل کے احاطہ میں رہنا
ضروری نہیں اور حجاج کا نماز ترک کرنا بوجہ احکام کی عظمت نہ ہونے کے ہے تو اس کا علاج
ابھی مذکور ہو چکا کہ وعیدیں مخالفت احکام کی سوچے اور اگر جہاز میں پاکی کا اہتمام نہ ہونا اس کا سبب
ہے تو اس کے متعلق اول کی کوتاہی کے ضمن میں جہاں بیماروں کا نماز چھوڑ دینا بخیال نجاست
بدن یا کپڑے کے مذکور ہے بیان کیا گیا ہے۔

اور اگر یہ حج نفل ہے اور کسی سبب سے اہتمام نماز کا نہ ہو سکے تو اس شخص کو اس حج
کے لئے سفر کرنا ہی جائز نہیں وہ اپنے گھر رہ کر کام میں لگے دلیل مثل ما قال العارف
مسعود بک رحمۃ اللہ علیہ ع

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید ۔۔۔ معشوق درینجاست بیائید بیائید

تعدیل ارکان نہ کرنا

(۵) ایک کوتاہی یہ کہ بعض لوگ تعدیل ارکان و اتیان سنن کا اہتمام نہیں کرتے نہ قومہ
ہے نہ جلسہ ہے رکوع بھی ہیئت مسنونہ پر نہیں قیام بھی قدر قراءۃ مسنونہ سے کم ہے قراءت میں
بھی غلط صحیح کی خبر نہیں، نماز کیا پڑھتے ہیں بیگار ٹالتے ہیں۔ ایک حدیث میں ایسے شخص کو نماز کی
چوری کرنے والا فرمایا ہے اور ایک حدیث میں ایک ایسے شخص کو نماز کے اعادہ کا حکم اس
ارشاد کے بعد دیا کہ جا پھر نماز پڑھ تو نے نماز نہیں پڑھی یعنی یہ نماز تیری نہیں ہوئی۔

یہ مسئلہ تنبیہ تو الگ رہا کہ اس کی نماز ہوئی یا نہیں؟ لیکن اگر ہوئی بھی تو وہ بھی
ایسی ہی ہوئی جیسے ایک گنجا، لنگڑا، لولا، اندھا، بہرا، گونگا، اپاہج، بیمار ہو اور وہ ایک
درجہ میں آدمی تو ہے مگر قابل اس کے نہیں کہ کسی صاحب کمال، صاحب جلال بادشاہ کی
نظر میں پیش کیا جا سکے اور وہ اس کو قبول کرے۔ اسی طرح یہ نماز ایک درجہ میں نماز کہلائی
جاوے گی مگر جب اس کے ارکان جو بمنزلہ اعضاء کے ہیں ناقص ہیں تو وہ قابل اس کے
نہیں کہ حق تعالیٰ کے حضور میں قبول ہو سکے، یا اعضاء درست ہوں مگر ہیئت مسنونہ پر نہ

ہونے سے ایسی ہوگئی جیسے تندرست کی زلف خال و خط، ناز و ادا سے خالی ہو، جو باوجود کہ مطبوعِ خاطر ہے پس درجۂ کمال میں مقبول نہ ہوگی یعنی محبوب نہ ہوگی گو بے قدر وہ بھی نہیں۔ لئے اس کی تعدیل اور تکمیل ضروری ہے۔

بلکہ دیکھو دیگر اوراد کی درستی کے لئے تو محض ارادہ کافی ہے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں، البتہ تمام بلند پڑھنے والوں کے لئے کچھ صورتیں خاص سیکھنا ضروری ہوں گی جس کے لئے عمر کا بیشتر حصہ حفظ ہونا کافی ہے کہ اس میں سورۂ بروج تک طوالِ مفصل ہے اور لم یکن تک اوساط، ان میں سے سورتیں منتخب کر کے ترتیل کے ساتھ یاد کرنے سے مختلف نمازوں میں سنت ادا ہو سکتی ہے اور تصحیح قرآن کے لئے کچھ توجہ کرنا پڑے گی جس کے متعلق میں نے قبل عنوان "مسائل متعلقہ قرآن مجید" کے ذیل میں عرض کر چکا ہوں اس کا ملاحظہ فرمانا اس باب میں کافی ہوگا۔

اور جس طرح اپنا قرآن صحیح کرنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے گھر والوں کی نماز اور قرآن جس قدر نماز میں پڑھا جاتا ہے اہتمام کر کے درست کرا دیں، اگر دس منٹ روزانہ بھی اس کام کے لئے تجویز کریں تو بہت کافی ہے اس میں کامیابی ہو سکتی ہے تو فی ہر طرح سے نمازوں کی تکمیل و تعدیل بہتر ہو جاوے گی۔

بعض بار ایسے امور بھی نظر پڑے جو درجہ میں تعدیل کی مشق کرنے کے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس کے متعلق خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جاوے گا۔

نمازی امراء کی کوتاہیاں

(۶) ایک کوتاہی گروہ نمازی امراء میں بالخصوص کثرت سے یہ ہے کہ جماعت کا ترک کرنا ہے، نصوص سے اس کا حد درجہ اہتمام ثابت ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں ان پر نظر کر کے بہت علماء نے اس کو واجب کہا ہے اور بعض محققین فقہاء حنفیہ نے سنت اس کو اختیار کیا ہے اور وہ جب عمل میں اور ترک کے گناہ اور سزا میں برابر فرض کے ہے تو پس ایک فرض کو ادا کرنا اور اس کے مقدمہ کو ترک کرنا کس درجہ کی غلطی ہے اور قبیح ہے

جہاں تک دیکھا گیا سبب ترک جماعت کا اکثر دو امر ہیں۔

(۱) سستی کہ آتی دور کون جاوے دھوپ میں کون جائے؟

(۲) تکبر کہ ذلیل لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا یا ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا پڑے گی۔

اور کبھی اس کا سبب مسجد میں ان لوگوں کی شان و عادت کے موافق سامان آسائش کا مفقود ہونا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک صاحب کو یہ عذر کرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں وضو کا موقع ایسا ہے کہ وہاں چھینٹیں تو کپڑوں کو کالی لگ جاتی ہے، چٹائیاں خراب ہوئی جن میں گرد و غبار بھرا ہوا رکھی ہیں، جن سے کپڑے میلے ہو جاتے ہیں ہوا کا گذر نہیں دل پریشان ہوتا ہے۔

سستی کے متعلق تو اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ اگر ایسی دقت میں کوئی دنیا کا کام جس میں مال و جاہ کا نفع ہو نکل آوے یہی حضرات اس کی طرف اس طرح دوڑیں کہ ذرا بھی سستی نہ ہو نہ گرانی ہو۔ افسوس! کیا آخرت کی ضرورت اس درجہ پر بھی نہیں۔

میں نے ایک صاحب کو دیکھا ہے کہ ان کے دروازہ پر مسجد تھی مگر وہاں کبھی تشریف نہ لاتے تھے۔ ایک بار ان کے یہاں بچہ کی تقریب بسم اللہ کی تھی اور ان کے ایک غریب بھائی کسی بات پر خفا ہو گئے تھے، عین جلسہ بسم اللہ کی دوپہر میں ایک بچہ کی خبر تھی کہ وہ ذرا دیر بھی نہ رکتی تھی لنگا کر ان کے پاس ایک دو گھنٹے میں گئے اور ان کو منا کر لائے یا اللہ دنیا کی مصلحت کے وقت وہ سستی کہاں چلی جاتی ہے؟؟ علاج اس کا وہی وعیدوں کا یاد کرنا ہے۔

اور تکبر کے باب میں یہ معروض ہے کہ اول تو آپ کی شان ہی کیا ہے؟ شاید وہ مساکین خدا تعالیٰ کے نزدیک تم سے زیادہ محبوب و مقبول و ذی جاہ ہوں، اس کے سامنے دنیوی عزت گرد ہے، بلکہ عجب نہیں کہ قیامت میں تم کو ان ہی مساکین کی التجا کرنی پڑے اور ان کی استدعا محتاجی درباری ہو تو باوجود قیام احتمال کے تم کو ان کے حقیر سمجھنے کا کیا حق حاصل ہے....؟

دوسرے اگر تمہاری شان ان مساکین سے زیادہ بھی مان لی جاوے تو تم مساجد میں ان مساکین کی تعظیم کے لئے تو نہیں بھیجے جاتے کہ خلاف شان ہو بلکہ تم اور وہ سب ایک ایسے عظیم الشان کی تعظیم

کے لیے تیار ہوئے ہو جس کی تعظیم سے تمہاری شان بڑھتی ہے۔ کیا کبھی بادشاہ کے دربار میں کسی
موقع پر کوئی شخص محض اس بنا پر حاضر ہو کر سلام کرنے سے اعراض یا اغماض کرنے کی ہمت کر سکتا ہے
کہ وہاں تو غربا بھی جا کر سلام کرتے ہیں؟ اور اس سلام کے لیے جانا اہانت ہے، کیا سچ مچ ایسے
دربار کے موقع پر سلام کو جانا اہانت ہے؟ ہرگز نہیں ——— ہرگز نہیں۔ کیا کوئی ایسا کر
کے نہ جاوے تو وہ سرکش اور گستاخ نہ سمجھا جاوے گا؟ ضرور، ضرور، تو تعجب ہے کہ دربار شاہی
کے ساتھ تو یہ برتاؤ اور دربار الٰہی کے ساتھ یہ برتاؤ ...... صدق اللہ تعالیٰ ما قدروا
اللہ حق قدرہ ان اللہ لقوی عزیز۔ الحج [۲۲-۷۴] (اللہ کی قدر نہیں سمجھی جیسی کہ اس
کی قدر ہے بیشک اللہ زوردار اور زبردست ہے)

اور اگر کسی مسکین کے امام ہونے سے عار آتی ہے تو دل تو وہ عار کی بات نہیں، کیا
حکام کے درباروں میں حاضر ہونے کے وقت اردلی خاص کر تبہ اور ریاست میں تمہارے برابر
نہیں، پیشی کرنے کے وقت تمہارا پیش رو نہیں ہوتا؟ پھر اس وقت عار کیوں نہیں آتی؟
یہ ساری عار خدا ہی کے معاملہ میں کیوں ہے؟ اصل یہ ہے کہ وہاں تو خوشنودی مقصود ہے
وہ جس طریق سے بھی حاصل ہو اور یہاں یہ مقصود نہیں ورنہ کسی طریق سے بھی عار نہیں آتی،
ولنعم ما قال العارف الرومی[1] رحمۃ اللہ علیہ حیث یقول ۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما

دوسرے اگر پھر بھی عار ہے تو آپ لیاقت علمی و عملی ان مساکین سے زیادہ حاصل کیجئے پھر آپ
کے ہوتے ہوئے وہ غریب خود ہی امام نہ بنے گا، آپ امام بنئے! اس مسکین کو عار نہ آوے
گی، وہ اقتدا کرے گا اور جماعت صحیح ہو جاوے گی، افسوس خود تو الحمد اور قل ھو اللہ بھی صحیح

---

[1] حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ بلخ میں ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ، ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے
مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی شریف کی تصنیف ۶۶۲ھ میں شروع کی، جس کے سات دفتر ہیں جو چھ جلدوں میں
زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ مثنوی شریف کی شروحات لکھی گئی ہیں۔ آپ نے ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ، ۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء
کو وفات پائی۔ [illegible]

ان تارکانِ جماعت میں بعض مشائخ دیکھے جاتے ہیں، ان کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ جماعت میں اختلاطِ خلق ہوتا ہے اور اختلاطِ خلق ذاکر و سالک کو مضر ہے۔

اور بعض نے تنہا پڑھنا اس لیے اختیار کیا کہ اس میں وساوس و خطرات کم آتے ہیں، اور جو نماز حضورِ قلب کے ساتھ ہو وہ افضل ہوتی ہے عدمِ حضور والی نماز سے، اور جماعت میں یہ حضور میسر نہیں ہوتا۔ اس دھوکہ کا منشا یہ ہے کہ یہ حضرات مواجید و کیفیاتِ ذوقیہ کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اور وہ بعض اوقات خلوت میں زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت جلوت کے، لیکن واقع میں مقصود بالذات رضائے حق ہے جس کا ذریعہ بجا آوریٔ احکام ہے کہ منجملہ ان کے جماعت کی نماز ہے۔ اگرچہ اس میں ذوقیات و وجدانیات کی قلت ہو، پھر تجربہ یہ ہے کہ بعض افعالِ شرعیہ گو سردست کسی کیفیتِ خاص کی قلت کا سبب معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی مداومت سے دوسری کوئی کیفیت بتدریج ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کیفیتِ فائتہ سے اعلیٰ و اقویٰ و انفع ہو، اس وقت اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

خشوع کا فقدان

(۵) ایک کوتاہی جس کو عوام تو عوام بعض خواص بھی کوتاہی شمار نہیں کرتے اور اس حیثیت سے وہ خاص طور پر اہتمام کے قابل ہے، نماز میں خشوع و حضورِ قلب کا نہ ہونا ہے جس کے مطلوب ہونے کے لیے یہ آیت قد افلح المؤمنون الذین هم فی صلاتهم خاشعون۔ (المؤمنون ع ۱) (یعنی کام نکال لے گئے ایمان والے جو اپنی نماز میں گڑگڑانے والے ہیں)۔

اور اس میں تقصیر کرنے کی مذمت کے لیے آیت الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبهم الخ (الحدید ع ۲) (کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں ان کے دل)

کافی ہے اور سبب اس کا بالاستقراء دو امر ہیں۔

(۱) بعض کو تو اہتمام ہی نہیں ان کے لیے تو یہ بے التفاتی،

(۲) بعض کو اہتمام ہے مگر اس کی حقیقت نہ جاننے سے اس کو غیر اختیاری اور قدرت سے باہر سمجھتے ہیں اس لیے اس کی تحصیل کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔

پہلے سبب کا علاج تو آیات بالا کے مضمون میں غور کرنا ہے ،
اور دوسرے سبب کا علاج اس کی حقیقت سمجھنا ہے جس کو مختصراً بیان کرتا ہوں جس کا
وعدہ اس کوتاہی کے ضمن میں کیا گیا ہے کہ بعضے ترک نماز کا یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم سے حضورِ
قلب نہیں ہو سکتا اور نماز بدون اس کے ہوتی نہیں۔

خشوع کی حقیقت

سو حقیقت لغویہ خشوع کی، سکون ہے اور حقیقت شرعیہ اس کی، سکون ارادی
ہے قلب اور جوارح کا۔ اور سکون مقابل ہوتا ہے حرکت کے۔ سو جیسی حرکت ویسا سکون
تو جوارح کی حرکت اختیاریہ یعنی مکانیہ ہوتی ہے ان کا سکون یہی ہے کہ جس حرکت کا منشا امر
نہیں وہ حرکت نہ کرے یعنی ارادہ سے ہاتھ پاؤں عبث نہ ہلاوے۔ ادھر ادھر گردن یا نظر سے
التفات نہ کرے، سر اوپر کو نہ اٹھاوے، بالوں کو اور کپڑوں کو بار بار نہ سنوارے، بدون ضرورت
نہ کھجلاوے، نہ کھنکارے وغیرہ ذالک
اور قلب کی حرکت فکریہ ہے اس کا سکون عدم انتقال ہے یعنی اپنے ارادہ سے کسی بات
کو نہ سوچے، سو جیسی حرکت جوارح کی اگر بلا قصد ہو مثلاً رعشہ سے کسی کی گردن ہلتی ہو تو
وہ منافی خشوع کے نہیں کیونکہ اختیار سے خارج ہے اور اضطراریات امر و نہی کے تحت
میں نہیں ہیں، اسی طرح اگر حرکت قلب کی بلا قصد ہو یعنی کوئی خیال خود بخود آجاوے تو وہ اسی
دلیل سے منافی خشوع کے نہیں پس غلطی لوگوں کی یہ ہے کہ خشوع کے معنی یہ ہیں کہ بالکل خیال نہ آئے
اور اسی بنا پر اس کو محال عادی سمجھتے ہیں حالانکہ اس بنا کا فاسد ہونا ہماری تقریر سے معلوم
ہو چکا ہے، جس سے ظاہر ہو گیا کہ خشوع اختیاری فعل ہے اور ہر شخص اس پر قادر ہے
اور بہت آسان ہے البتہ ارادہ و توجہ کی ضرورت ہے۔

حصول خشوع کا طریقہ

پس جیسے سب افعال ارادیہ کی شان ہے کہ ارادہ کرو تو آسان ہے ارادہ نہ کرو تو مشکل
حتی کہ اگر منہ میں لقمہ رکھ کر بیٹھ جاوے اور نگلنے کا ارادہ نہ کرے تو وہ بھی آسان نہ

نہیں پس اگر لقمہ نگلنا آسان ہے تو خشوع بھی اتنا ہی آسان ہے اور اگر خشوع محال ہے تو لقمہ نگلنا بھی اتنا ہی محال ہے، دونوں کے تیسر اور عسر میں کچھ فرق نہیں اور سہل طریقہ اس کا یہ ہے۔

کہ نماز میں جو کچھ بھی منہ سے نکلے محض یاد سے نہ پڑھے بلکہ ہر ہر لفظ پر مستقل ارادہ کرکے اس کو منہ سے نکالے کہ اب سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ کہوں گا۔ اب وبحمدک کہہ رہا ہوں اب وتبارک اسمک منہ سے نکل رہا ہے وعلیٰ ہذا۔

پس جب ہر لفظ پر نفس کی توجہ رہے گی لامحالہ حسب قاعدہ عقلیہ کہ النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد دوسرے خیالات بند ہو جاویں گے، ترجمہ: نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

اس مراقبہ کو اوّل سے آخر تک بالالتزام کرے انشاء اللہ تعالیٰ دل تو بلا قصد بھی کوئی خیال نہ آوے گا اور اگر قصداً آجاوے تو پھر اس سوچ میں نہ پڑے کہ ارے یہ تو پھر خطرات آنے لگے، یہ سوچ بھی خیال غیر ہے، بلکہ اسی عمل کی تجدید تعلق ارادہ و توجہ کی بطریق مذکور آئندہ کے لیے پھر تازہ کر دے پھر وہ خطرات دفع ہو جاویں گے۔ وھذا من افادات استاذی استاذ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب علیہ رحمۃ اللہ علام الغیوب[1]

اور اس احقر کا ایک وعظ خشوع کے ہر پہلو پر مفصل بحث میں شائع ہو چکا ہے جس کا نام "مواعظ اشرفیہ" ہے اس کے ملاحظہ سے انشاء اللہ تعالیٰ اس باب میں کسی قسم کا اختفاء باقی نہ رہے گا۔

متفرق کوتاہیاں

ایک کوتاہی کہ ذی شعب مختلفہ ہے اور اسی پر اپنی تحریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں یہ ہے

[1] حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ولد مولانا مملوک علی صاحبؒ ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ بروز [illegible] میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام منظور احمد ہے۔ حدیث شریف آپ نے شاہ عبد الغنی رح سے پڑھی (حاشیہ جدید)

کہ نماز اتنی بڑی ضروری چیز روزمرہ پنجگانہ پانچ بار — واقع ہونے والی اور اس کے شرائط وارکان کے ہر جزو اور ہر موقع پر بے شمار صورتیں پیش آتی ہیں، جن کے احکام بہت لوگوں کو معلوم نہیں، مگر باوجود اس کے بہت کم دیکھا جاتا ہے کہ ان احکام ومسائل کو لوگ دریافت کرتے ہوں؛

(۱) بہت لوگ ناواقفی سے بلا اضطرار اس طرح جمائی لیتے ہیں یا بلا عذر کھنکارتے ہیں کہ حروف ظاہر ہو کر نماز جاتی رہتی ہے،

(۲) بہت لوگ ایسے لباس غیر مشروع سے نماز پڑھتے ہیں کہ نماز ان کی قبول نہیں ہوتی بالخصوص بعض اقسام ریشم وزعفران کے استعمال میں تو خواص تک بے احتیاطی کرتے ہیں۔

(۳) بعض لوگ ہجوم میں امام سے پہلے نیت باندھ لیتے ہیں کہ وہ نماز ان کی نہیں ہوتی۔

(۴) بعض لوگ امام کے ساتھ رکوع میں اس طرح شامل ہوتے ہیں کہ اللہ اکبر کہتے ہی رکوع میں پہنچ جاتے ہیں اور اول قیام نہیں کرتے ان کی نماز بھی نہیں ہوتی۔

(۵) بعض لوگ قعدۂ اخیرہ میں امام کے ساتھ شریک ہونا چاہتے ہیں مگر ان کی تکبیر تحریمہ ختم کرنے سے پہلے امام سلام پھیر دیتا ہے تو وہ اقتدا صحیح نہیں ہوتی اور نیت اقتدا موجب انفراد میں مفسدۂ صلوٰۃ ہے ان کی نماز بھی نہیں ہوتی از سر نو نماز شروع کرنا چاہیے۔

(۶) اسی طرح بعض اوقات امام سہواً بعد قعدۂ اخیرہ کے کھڑا ہو جاتا ہے تو مسبوق بھی متابعت کی نیت سے ساتھ کھڑا ہوتا ہے حالانکہ اس وقت مسبوق کو اقتدا جائز نہیں تو اس کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے

(۷) علیٰ ہذا اگر امام مسافر بعد دو رکعت کے سہواً کھڑا ہو جاوے مقتدی مقیم کو اس کے ساتھ مقتدی رہنا بھی مفسد صلوٰۃ فرض ہے۔

---

(۱) [illegible] معقولات منقولات [illegible] تمام علوم [illegible] شاعری میں کسی کی شاگردی نہ کی۔ مگر کبھی جب طبیعت حاضر ہوتی تو اردو فارسی عربی میں [illegible] شعر کہتے تھے [illegible] بالکل [illegible] تخلص فرماتے تھے [illegible]

اس قسم پر مسائل کا استیعاب مقصود نہیں اور نہ ممکن ہے، مقصود بعض خرابیوں پر تنبیہ کرنا ہے کہ ایسی صورتیں کس کثرت سے واقع ہوتی ہیں جن سے نماز نہیں ہوتی اور لوگ اس سے بے خبر ہیں!

اسی طرح شرائط میں بھی بے پروائیاں کی جاتی ہیں:۔

(۱) بعضے آدمیوں کو دیکھا گیا ہے کہ کپڑے پر کہیں اگرچہ نجاست ہو تیمم کر لیتے ہیں۔

(۲) بعض کو دیکھا ہے کہ اگر وضو و غسل میں کہیں پاؤں وغیرہ خشک رہ جاتا ہے ویسے ہی تر ہاتھ پھیر لیتے ہیں جو کہ مسح ہے، پانی ڈال کر نہیں دھوتے۔

(۳) بعض آدمی باوجود اندیشہ قطرہ کے فوراً صرف پانی سے استنجا کر لیتے ہیں اور پھر قطرہ آ جاتا ہے، اگر خبر بھی ہو گئی اور وضو بھی دہرا لیا مگر پاجامہ پاک نہیں کرتے اور اسی طرح کئی بار میں مقدار معفو سے بڑھ جاتا ہے اور اسی کپڑے سے نماز پڑھتے رہتے ہیں اور اگر علم نہ ہوا تو نہ وضو ہی نہ نماز ہی جاتی رہے گی اور اگر شبہ ہو کہ بے خبری میں معذور ہے! جواب یہ ہے کہ معذور اس وقت ہے کہ جب نقض وضو کا احتمال غالب نہ ہو ورنہ اس احتمال کا انسداد واجب ہو گا اور جب تری کا ضعف مشاہدہ ہو تو قطرہ کا قطع کرنا ضروری ہو گا اور تجربہ سے اس باب میں کلوخ سے بہتر کوئی چیز ثابت نہیں ہوئی۔

نااہل کو امام بنا لینا

اسی طرح بہت جگہ امام ایسے ہیں کہ نماز لوگوں کی فاسد یا مکروہ ہوتی ہے، پھر بعض جگہ تو مقتدی ہی اس خرابی کا سبب ہوتے ہیں، یعنی امام تجویز کرنے کے وقت اس کی صحت و اہلیت کو نہیں دیکھتے بلکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ محلہ بھر میں جو شخص سب سے نکما ہوتا ہے اس کو ارزاں سمجھ کر امامت کے لئے تجویز کیا جاتا ہے، وہ چاہے اس کو قرآن پڑھنا بھی نہ آتا ہو، خواہ اس کو مسائل بھی یاد نہ ہوں اور بعض جگہ مقتدیوں کا کچھ دخل ہی نہیں ہوتا خود ہی بزور تکبر بعضے اہل وجاہت امام بن بیٹھتے ہیں اور قصبات میں جمعہ و عیدین کے اکثر امام اسی شان کے ہیں اور اس خرابی کی ابتدا امامت کا موروثی ہونا ہے جس کی بنا

روزے کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ صیام)

ارکانِ اسلام میں سے ایک روزۂ رمضان شریف کا ہے جو مثل نماز کے عبادت بدنیہ ہے اس میں جو انقلاب ہوا ہے نماز کے بعد اس کا بیان بقدرِ ضرورت مع اصلاح ضروری کے ہوتا ہے اور بعض اعمال رمضان المبارک کے متعلق ایسے بھی ہیں روزے کے ساتھ ان کا بیان بھی مناسب ہے مجموعہ ان اعمال کا یہ ہے:

(۱) رویت ہلال (۲) صوم (۳) سحور (۴) افطار (۵) قیام رمضان یعنی تراویح
اور دو عمل جو عید کے متعلق ہیں ان کو بھی اس کے ملحقات سے کہہ سکتے ہیں یعنی
(۱) صدقۂ فطر (۲) نماز عید
یہ کل سات ہوتے ہیں ان سب کے متعلق مختصر مختصر مضامین مذکور ہوتے ہیں

رویت ہلال

اس میں (یہاں اسلامی ریاست نہیں ہے) ایک بے اعتنائی عظیم ہو گئی ہے وہ یہ کہ قریب قریب ہر شخص گو وہ علم دین بھی نہ رکھتا ہو اس میں بلا مراجعت علماء کے اپنی تحقیق پر

وہ کسی ایسی شرط پر جو شرعی نہ ہو اعتبار کرتا ہے، جس روایت کو چاہا قبول کر لیا، گو وجہ قبول
قبول نہ ہو اور جس کو چاہا رد کر دیا اگرچہ وہ قابل رد نہ ہو۔

اور ظاہراً رمضان کے چاند کی نسبت قبول کرنے میں زیادہ احتیاط معلوم ہوتی ہے
اور لوگوں کو اکثر یہی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ روزہ ہی تو رکھواتے ہیں اس میں کیا برائی ہے، لیکن
ایک بے احتیاطی تو یہی لازم ہو جاتی ہے کہ بدون ثبوت رمضان نیت یا اعتقاد رمضان یعنی
بہ نیت فرض روزہ رکھا جاتا ہے اور غیر رمضان روزہ رکھنا ممنوع آیا ہے چنانچہ حدیث
نہی عن صوم یوم الشک کا یہی حاصل ہے جس کی لم اور راز — یہ ہے کہ حدود شرعیہ کی اس
میں توہین اور ہتک لازم آتی ہے گویا شارع علیہ السلام کے نزدیک تو رمضان مثلاً ہفتہ
کے دن سے شروع ہوگا، مگر اس شخص کے نزدیک جمعہ ہی سے شروع ہو گیا، حدود
کی مزاحمت کے جرم ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

ایک اور بے احتیاطی جو اس سے شدید ہے بعض اوقات فی الحال ہو جاتی ہے وہ یہ
کہ مثلاً ایسی خبر غیر صحیح پر روزہ شروع کیا اور ختم رمضان پر اتفاق سے ابر یا غبار ہو گیا تو یہ
شخص اکمال ثلاثین کے قاعدہ پر یعنی تیس پورے کر کے عید کرے گا اور ممکن ہے کہ
وہ عین تیس تاریخ رمضان کی ہو تو کس قدر سخت بات ہے اور اس شخص کے قول سے
جتنوں نے عید کی اور ایک ایک فرض ان کا برباد ہوا سب کا وبال اس کی گردن پر رہا
اور جو کہ اپنے نزدیک رمضان پورا کر چکے ہیں، اس لئے اس روزہ کی قضا بھی کوئی نہ کرے گا
تو سب کے ذمہ ایک ایک فرض چڑھا رہا اور اسی پر موت آ گئی...!

پس جب ایسی بے احتیاطیاں اس قبول کرنے میں ہوتی ہیں تو اس قبول کرنے کو
احتیاط نہیں کہا جا سکتا اور بلاوجہ شرعی رد کرنے میں تو بے احتیاطی کا لزوم ظاہر ہے،
فرض روزہ کا ضائع کرنا لازم آتا ہے اور یہی خود رائی بعض اوقات ہلال عید میں ہوتی
ہے تو وہاں دونوں شقوں میں صریح خرابی ہے یعنی اگر قابل قبول کو رد کر دیا تو عید کا روزہ
رکھوایا جو حرام ہے اور ناقابل رد کو قبول کر لیا تو رمضان کا روزہ تڑوا دیا جو اس سے بڑھ کر
حرام ہے۔

تار برائے شہادت کیوں معتبر نہیں ؟

میں نے بے علموں کو دیکھا ہے کہ محض افواہی خبریں کر قبول کر لیتے ہیں ، نہ کہ یہ خبر نہیں کہ خبر کی حجت ہونے کی کیا شرائط ہیں ؟ کبھی کہیں سے تار آجانے پر اعتبار کر لیتے ہیں اور ان کو اس کے احکام فقہیہ کی اطلاع نہیں جو کہ مخصوص ہے علماء محققین و متقین کے ساتھ ، ان بڑا مدار استدلال اس کے قبول پر ان کے نزدیک یہ ہے کہ صاحب لاکھوں روپے کی تجارت تار پر چلتی ہے پھر اس کے اعتبار نہ کرنے کا کیا سبب ... ؟

لیکن اگر ان سے کوئی پوچھے کہ گواہ کے پاس سمن آنے کے بعد اگر تار پر شہادت ادا کرے تو قانوناً کیوں معتبر نہیں ؟ اور معاملات تجارت اور اس شہادت میں کیوں فرق ہے ؟ اور اس شہادت میں اور رویت ہلال کی شہادت میں کیا فرق ہے ؟ تو اس کا معقول جواب نہیں دے سکتے ۔ اسی طرح میں نے بعض بے علموں کو محض اس بنا پر شہادت کو رد کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ شہادت ادا کرنے والا گو نہ ہے کوئی معزز آدمی نہیں ، اگرچہ وہ تقویٰ اور دین میں ان معززین سے ہزار درجہ افضل ہو مگر ان کے نزدیک وہ آدمی ہی نہیں ! پھر اسی قسم کے لوگوں کو یہاں تک تنزل کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ کہتے ہیں میرے چچا زاد نے دیکھا ہے ، ہمارے محلے کے فلاں فلاں نابالغ بچے نے دیکھا ہے ، بس یا آن شور شوری یا آمی بچہ تکی اور اس تمام خرابی کا منشا صرف یہی ایک امر ہے کہ علماء سے اپنے کو مستغنی سمجھتے ہیں بلکہ افسوس ہے کہ بعض اوقات ان کا فتویٰ سن کر ان سے مزاحمت کرتے ہیں اور ان پر جرح نکالتے ہیں ، انا للہ وانا الیہ راجعون ..... [1]

طریق علاج

سوال کی اصلاح یہ ہے کہ ہر شخص اس میں دخل دینا ترک کرے ، اور علماء کی رویت پر حکم لگانا تو بڑی بات ہے مصلحت یہ ہے کہ خود اپنی رویت یعنی دیکھنے کو بھی ہر ایک سے ...

[1] رویت ہلال کے مسائل پر دیکھئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ رویت ہلال ...

بیان کرتا نہ پھرے کہ اور لوگ فکر میں لگ جاویں گے۔ البتہ حاضرین مجلس رویت یا عقلاء کے روبرو ظاہر کرنا مضائقہ نہیں، بلکہ سب خبروں اور شہادات کو جمع کر کے کوئی عالم معتبر متدین قریب ہوں تو ان کے پاس جا کر اور اگر فاصلے ہوں اور موجود نہ جا سکے تو دو تین عاقل دیندار آدمیوں کو ان کی خدمت میں حاضر کر کے پوری صورت حال واقعہ کی عرض کر کے وہ جو فتویٰ دیں اس پر عمل کریں اور اگر اس فتوے میں کوئی شبہ خیال میں آوے تو عوام کے روبرو اس کو ظاہر نہ کریں کہ انتظام دین میں خلل پڑے گا بلکہ بواسطہ یا بلاواسطہ اس کو بھی ان ہی عالم سے یا اور کوئی صحبت یافتہ علماء کا قریب ہو اس سے پیش کر کے حل کر لے۔

علماء کو مشورہ

بلکہ میں تو بروئے تجربہ و اتفاقات یہاں تک ضروری سمجھتا ہوں کہ جس جگہ متعدد علماء ہوں وہاں ایک عالم بھی بدون مشورہ دوسرے علماء کے اس باب میں اپنی تحقیق و رائے عوام کے روبرو ظاہر نہ کرے کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرے عالم کی رائے میں کچھ اختلاف ہو اور اقوال مختلفہ کے شیوع سے عوام میں تشویش پھیل جائے بلکہ سب مشورہ کر کے اور اگر اختلاف ہو تو باہم طے کر کے ایک قول منقح کر کے وہی قول منقح عوام تک پہنچے اور جس عالم سے استفسار کیا جائے ایک ہی جواب سب جگہ سے ملے اور اگر رائے میں اتفاق نہ ہو تو جو شخص زیادہ مرجع خلائق ہو یہ فتویٰ اس کے سپرد کر دیں باقی سکوت کریں، اگر ان سے کوئی پوچھے تو اسی مرجع موصوف کی طرف حوالہ کریں، خود خاموش رہیں اس میں انشاء اللہ تعالیٰ بدنظمی نہیں ہو سکتی۔ میں نے تو ایسی تشویشات کو دیکھ کر ایک مقام پر یہ انتظام کیا تھا کہ سب علماء کو متفق کر کے خاص ایک عالم کو اس باب خاص میں معین تجویز کر دیا کہ ہر شہر کی خبر ہلال کے متعلق جس عالم کے پاس آوے، وہ ان کی خدمت میں بھیج دی جاوے اور جو شخص جس سے فتویٰ پوچھنے آوے وہ سائل کو ان ہی کے پاس بھیج دے اور جس کو کوئی اختلاف کرنا ہو انہیں سے ظاہر کرے، غرض عوام کو اختلاف کی اطلاع نہ ہو اور حکم پر عمل کرنے میں ان کو تشویش نہ ہو اور اس قرارداد کے بعد عام لوگوں میں اس کا اشتہار دے دیا گیا

یہ سب فیصلہ اور سے عجانہ بہ ہوگی تھی ۔ اگر سب جگہ ایسا انتظام کر لیا جاوے تو بتوفیقہ تعالیٰ انشاء اللہ بعض الوقوعات بچیں ۔

ضروری احتیاط

اور ایک انتظام یہ ضروری ہے کہ چاند دیکھنے پر یا اس کی خبر سننے پر بلا ضرورت دیگر مقامات پر تار نہ دوڑایا کریں ، بلکہ کسی عالم کے پوچھنے پر بھی جواب نہ دیا کریں کہ دوسری جگہ عوام کی ہاتھوں میں ایسی خبریں پہنچ جانے کے بعد چونکہ اس وقت خود رائی کا غلبہ ہے ضرور مفاسد پیش آتے ہیں کہ ان کا انسداد دشوار ہے ، اور شرعاً کوئی ضروری امر ہے نہیں کہ از خود دوسری جگہ خبر بھیجا کرو ۔

البتہ کوئی عالم دریافت کرے تو جواب دے دو ، پھر وہ خود حکم شرعی کے موافق عمل کریں گے اور کسی مفسدہ کا احتمال نہ ہوگا اور جب ایسے استدلالات کو کسی درجہ میں صلاحیت استدلال ہونے کی دیکھتے ہیں ، بدون حکم علماء کے قابلِ اطمینان نہیں ، تو جو استدلال اپنی ذات میں بھی صلاحیت استدلال ہونے کی نہیں رکھتے ان سے دلیل پکڑنا تو کس قدر مذموم اور اختراع فی الدین ہوگا ۔

مثلاً رجب کی چوتھی کا لا محالہ غرہ رمضان کے موافق ہونا چاند کا بڑا ہونا یا دیر تک ٹھہرنا اونچا ہونا یا بدر کامل ہونا ، بیٹھ کر اٹھنا و شب تک غائب رہنا ، فلاں جنتری میں ۲۹ یا ۳۰ کا ستھا دینا و مثل ذالک یہ سب شرعاً غیر معتبر ہیں ۔

اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اکثر ایسے امور حسابی اور مطابق واقع کے ہیں تو شریعت نے جو واقعیہ کی نفی کیسے کی اس میں تو اس کی طرف نسبت کذب کی لازم آتی ہے ؟ وجہ اس شبہ کے وارد نہ ہونے کی یہ ہے کہ شریعت نے ان امور کے وقوع کی نفی نہیں کی کہ یہ محذور لازم آئے بلکہ ان امور کے اعتبار کی نفی کی ہے یعنی ہم ان امور کے وقوع پر نتیجے احکام کا مدار نہیں رکھتے اور یہ حق ہر صاحب قانون کو حاصل ہے ۔

مثلاً کوئی نوکری مشروط ہو بی اے کے ساتھ تو وہ تقرر بننے والے کو نہ ملے گی تو اس لئے ہے

معنی نہیں کہ اس شخص کے امر یقینی ہونے کی نفی کی گئی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ امر یقینی ہوتا
معتبر ورنہ استحقاق ڈگری کا اس صورت پر نہیں ہے تو اگر غرہ شہر میں غرہ مقابل نہ ہو تو اس
کو یقین کہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ واقع میں یقینی ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ خواہ وہ واقع میں کسی درجہ
حساب سے معلوم ہو مگر بروئے قواعد فلاں فلاں روزہ اسی سے شروع کرنے کا حکم دیا جاتا
اور روزہ شروع کرنے کی تاریخ کو ہماری اصطلاح میں یقین کہا جاوے گا اور لغت و
اصطلاح کا تطابق ضروری نہیں۔
جیسے اہل حساب تاریخ کو طلوع سے شروع کرتے ہیں اور اس کو کوئی محل اعتراض
نہیں سمجھتا۔ یہاں تک رویت ہلال کے متعلق کلام ہو چکا۔

صوم

روزہ میں تفریط کرنے والوں کا ذکر

اس میں چند کوتاہیاں کی جاتی ہیں:
(۱) ایک یہ کہ بعض لوگ بلا کسی وجہ قوی یا ضعیف کے روزہ نہیں رکھتے، میں نے ایک
شخص کو دیکھا تھا جس نے عمر بھر کبھی روزہ نہیں رکھا تھا، پھر شاید بعض لوگ بہت ایسا
وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سے روزہ پورا نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ وہ شخص اسی بلا میں مبتلا تھا۔ میں
نے کہا کہ تم بطور امتحان ہی رکھ کر دیکھو۔ چنانچہ رکھا اور پورا ہو گیا اور پھر اس کی ہمت بندھ
گئی اور رکھنے لگا۔
کیسے افسوس کی بات ہے کہ رکھ کر بھی نہ دیکھا تھا اور پہلے یقین کر بیٹھا تھا کہ اگر بھی رکھا
تو نہ رہا جاوے گا ......!!
یہ لوگ سوچیں کہ اگر طبیب کہہ دے کہ آٹھ دن بھر کچھ کھاؤ گے پیو گے ورنہ
فلاں مرض مہلک پیدا ہو جاوے گا، تو اس کے لئے ایک ہی دن سے ہمت کرے یہ شخص دو دن
نہ کھاوے گا کہ احتیاط اسی میں ہے، افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ اور رسول کا کہنا بھی بھاری

اور کھانے پینے سے عذاب مہلک کے وعید فرمادیں اور قول طبیب کے برابر بھی اس کی وقعت نہ ہوا ناللہ وانا الیہ راجعون ۔۔۔۔ !!

(۲) اور بعض ان سے بھی بدتر بدعقیدت ہیں کہ روزہ کی مشروعیت ہی میں ان کو کلام ہے، پھر بعضے تو ان میں مہذب ہیں، کہتے ہیں کہ روزہ جس غرض سے مشروع ہوا تھا کہ قوت بہیمیہ منکسر ہو جاوے، وہ غرض ہم کو بدولت علم و تہذیب کے حاصل ہے، اس لئے اب روزہ کی ضرورت نہیں،

ان کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم کو اس غرض کا حاصل ہونا مشاہدہ کے خلاف ہے، قوت بہیمیہ کے آثار تکبر و نخوت و ظلم و شرارت جس قدر تم میں ہیں دوسروں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں، دوسرے اگر غرض حاصل بھی ہو جاوے تب بھی یہ مسلّم نہیں کہ روزہ بس اسی غرض کے لئے مشروع ہے، بلکہ خود اس کی صورت خاصہ بھی مطلوب ہے، تفصیل اس جواب کی نماز کے مضمون میں بیان ہو چکی وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو!

(۳) اور بعضے تہذیب سے بھی گذر کر گستاخی اور تمسخر کے کلمات کہتے ہیں۔ مثلاً روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو، یا یہ کہ بھائی ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا، یا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب کو ملاحظہ رمضان میں کھاتے ہوتے ہوئے ایک دیندار نے ٹوکا کہ رمضان میں دن کو کھاتے ہو، تو وہ فرماتے ہیں کہ۔ رمضان۔ کیا چیز؟ اس دیندار نے کہا کہ صاحب رمضان مہینہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ جنوری فروری، الخ اس میں رمضان تو کہیں نہیں آیا۔ اور امثال ان اقوال کے !!

سو یہ دونوں فریق بوجہ انکار فرضیت روزہ کے زمرۂ کفار میں داخل ہیں اور پہلے فریق کا قول محض ایمان شکن ہے اور دوسرے کا ایمان شکن بھی اور دل شکن بھی۔ اور فریق اول اس تاویل سے کفر سے نہیں بچ سکتا، کیونکہ یہ تاویل ہے ضروریات دین میں اور ایسی تاویل دافع کفر نہیں ہوتی کما تقرر فی محلہ اور یہ مہذب فریق ظاہراً اس غیر مہذب سے

عادت وعزم سے مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے

میں نے ریلوے کے ایک ڈرائیور کو دیکھا ہے کہ ہر وقت انجن میں رہتا تھا اور سخت گرمی کی فصل تھی اور روزے کا وقت تھا، بہت سے کھیتی کاٹنے والے دیکھے گئے ہیں کہ جیٹھ بیساکھ کے دنوں میں دھوپ میں جھک کر کھیتی کاٹتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں، تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ قدرے عادت اور زیادہ ہمت یعنی پختہ ارادہ ان دونوں کے جمع ہونے سے مشکل سے مشکل کام بھی سہل ہو جاتا ہے۔ اور ذوق وجدان سے کام لیا جاوے تو روزہ میں تسہیل و تائید خداوندی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا ہے۔ پھر ہمت ہار دینا اور بہانہ ڈھونڈنا سخت محرومی ہے!

عذر اختیاری کا حکم

(۱) بعض لوگ عذر کی حد کو سمجھتے ہیں لیکن عذر اپنے اختیار سے قصداً پیدا کر لیتے ہیں مثلاً شرعی سفر واقعی میں عذر ہے مگر اس شخص کو درحقیقت سفر کی ضرورت نہیں تھی، صرف اس نیت سے بلا ضرورت سفر کیا ہے کہ روزہ نہ رکھنا پڑے، رہا قضا، تو وہ چونکہ شرعاً موسع ہے اس لئے اس کے واسطے خاص فروری کو انتخاب کر لیا جاتا ہے،

نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ تھوڑے دنوں سے ایک نئے اجتہاد کی بدولت قضاء کے عوض فدیہ کے کافی ہونے کے اعتقاد سے نفع اٹھایا جا رہا ہے جس پر ہم نے مجمل کلام اپنے بعض[1] رسائل میں بزبان اردو اور نیز رسالہ کے حاشیہ ملحقہ بالآخر میں بعبارت عربیہ کیا ہے۔

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اس باب میں نہ رائے محض معتبر ہے، اور نہ کسی آیت یا حدیث کے ظاہری مفہوم پر غیر مجتہد کو عمل درست ہے اور نہ عامی کو محض معنی لغوی کا کافی ہے، بوجہ انقراض زمانہ اجتہاد کے عالم کو کتب فقہیہ کا اتباع، اور عامی کو علماء سے استفسار

[1] اصلاح تجدد میں پوری تفصیل

کے بعد ہی تمام احکام شروع ہوں تو اس پر ایک بار گراں پڑ جاوے گا ، اس لیے شریعت کی رحمت ہے کہ پہلے ہی سے مشہدہ شدہ سب اعمال کا خوگر بنانے کا قانون مقرر کیا تاکہ مکلف ہونے کے وقت دشواری نہ ہو ، پس اس قانون کی تنفیذ سرپرستوں کے ذمہ مقرر کی گئی اس اگر سرپرستوں پر یہ واجب نہ ہو تو اس قانون کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا ، کیونکہ واجب نہ ہونے کی صورت میں ان کو ترک بھی جائز ہوگا ، تو اگر اس جائز سے یہ منتفع ہوئے تو بلوغ کے بعد اس نئے نئے مکلف کو اسی مصیبت کا سامنا ہوگا ، تو قانون کا عدم وجود برابر ہے اور اس حالت اولیاء پر اس کا وجوب ہوگا ، تو ان لوگوں کی دو غلطیاں ہیں ، ایک اس کو ضروری نہ سمجھنا ،

دوسرا اس ضروری کو سختی سمجھنا جس میں شرع پر دھبہ لگتا ہے ، کیونکہ نصوص میں جتلایا گیا ہے کہ شریعت میں سختی نہیں ہے ، قال اللہ تعالیٰ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ، (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے ، مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا) اور وما جعل علیکم فی الدین من حرج (تمہارے لئے اللہ نے دین میں تنگی نہیں کی) وفی الحدیث الدین یسر (دین آسان ہے)

اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ تو مسلم بالغ تو دفعۃً جمیع احکام کا مکلف ہو جاتا ہے ، کیونکہ شرع نے تو اس کے لئے بھی وہی قانونِ تسہیل مقرر کیا تھا ، مگر یہ خود اس کی اور اس کے خاندان والوں کی غلطی ہے کہ اسلام میں دیر لگانے سے وہ سہولت ضائع کر دی ، اسی لئے مراہق قبل بلوغ جبکہ وہ عاقل ہو ایک درجہ میں مخاطب بالایمان ہے جیسا اصولیوں نے تصریح کی ہے۔

پس مخاطب ہونے کے بعد توقف کرنا اپنے ہاتھوں سے اس سہولت میں کمی کرنا ہے اور کمی اس لئے کہا کہ دفعۃً واحدۃً بھی جمیع احکام کا بجا لانا دو وجہ اس سے کہ وہ احکام قلیل اور فی نفسہ سہل ہیں چنداں دشوار نہیں ، لیکن شرع نے اور زیادہ سہولت کر دی تھی اور جس طرح یہاں تک مقدمہ میں تفریط کرنے والوں کا ذکر تھا۔

روزہ میں افراط کرنے والوں کا بیان

اسی طرح بعض لوگ اس میں افراط کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ظاہر میں تو یہ لوگ اقرب الی الدین ہیں؛ لیکن چونکہ شریعت میں افراط بھی پسند نہیں اس لئے ان کی حالت کو بھی دین سے موافق نہ کہا جاوے گا مثلاً

بعضے لوگ سفر و مرض میں جان کو آفت میں گرد بنا رکھی جتلانے کو یا افطار پر صوم کی ترجیح دینے کو افطار نہیں کرتے اور یہ...... سخت غلطی ہے۔ اگر اول نیت ہے تو بہت ہی برا ہے اور اگر ثانی ہے تو اس لئے جہل ہے کہ صوم کو مطلقاً افطار پر ترجیح نہیں ہے بلکہ ایسی شدت کی حالت میں امر بالعکس ہے۔ ورنہ حدیث لیس من البر الصیام فی السفر (سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے) کے کوئی معنی نہ ہوں گے بلکہ یہ جہل بوجہ اس کے کہ اس کا اثر عقیدہ تک پہونچتا ہے اول سے بھی اشد ہے کیونکہ عملی غلطی عملی غلطی سے اقبح و اشنع ہے اور عقیدہ تک اثر اس طرح ہے کہ شرع نے جس کو راجح قرار دیا یہ شخص اس کو مرجوح سمجھتا ہے اور جس کو مرجوح قرار دیا اس کو راجح اعتقاد کر رہا ہے اور رخصت شرعیہ میں جس کا ارتکاب کرنا ہے تو گویا اس کو ناقص سمجھتا ہے؛ اور شرع کی طرف تجویز نقص کی نسبت کرنا کتنا برا عقیدہ ہے۔ حدیث اولئک العصاۃ (یہ لوگ نافرمان ہیں) اور حدیث ما بال اقوام یتنزہون الخ ایسے ہی موقع میں ہے۔

یہ ہی حکم ہے ان عورتوں کا کہ باوجود تیقن اس امر کے کہ روزہ رکھنا دودھ پیتے بچے کو مضر کرے گا۔ اپنی ہٹ دھرمی اور جہالت سے باز نہیں آتیں بلکہ ان کی حالت پہلے شخص سے بھی زیادہ منکر ہے کیونکہ اس نے تو صرف اپنا ہی نقصان کیا تھا۔ اس نے ایک بے گناہ بچہ کو بھی ضرر پہنچایا سو کسی کو ضرر پہنچانا پھر وہ بھی بچہ یہ حقوق العباد کی کس درجہ کی فرد ہے۔

اور ان سب صورتوں سے بڑھ کر افراط یہ ہے کہ بعضوں کو بہت چھوٹے کم سمجھ ناتواں بچہ کو روزہ رکھانے کا شوق ہوتا ہے کچھ تو خود اس روزہ رکھانے کا فخر ہوتا ہے اور کچھ روزہ کشائی میں حوصلہ نکالنے کا ارمان ہوتا ہے سو اول تو یہ نیت ہی اس کا فاسد ہے پھر

ولا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔ البقرۃ [۔۔۔۔۔] اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن مخالفت پھر اس پر بعض عوارض ایسے مرتب ہو جاتے ہیں کہ معصیت میں تضاعف ہو جاتا ہے۔

حسرت ناک ماجرا

مجھکو ایک جگہ کا قصہ معلوم ہے کہ اسی طرح سے ایک بچہ کو روزہ رکھوایا اور اپنی عادت اچھالنے کے لئے روزہ کشائی کا بہت زیادہ اہتمام کیا، گرمی کے بڑے بڑے دن تھے، عصر کے وقت تک جوں توں کر کے بسر کیے بیچین آخر وقت باقی رہ گئی اور صبر و توان نے جواب دیدیا، ٹھنڈے پانی کے مٹکے بھرے رکھے تھے ان پر تر کپڑا لپٹا تھا، بہت کھانے کا سامان پڑا تھا اس سارے سامان نے بچے کی نگاہ کو ایک ایک گھونٹ پانی کے لئے ترسا دیا، لیکن اگر پانی دیتے تھے تو روزہ کشائی کو سادات کی بات جاتی تھی اپنا سامان بچانے کے لئے پانی کو جواب دیدیا آخر سخت بیتاب ہو کر دوڑ کر ایک مٹکے کو جا لپٹا اور محبوب سے وصل ہوتے ہی روح نے قالب کو چھوڑ دیا۔ اس کی نعش زبان حال سے یوں گویا تھی کہ:

توبھی! تم کو تمہارا سامان مبارک ہو، ہم اپنی جان تمہارے سامان پر صدقہ کرتے ہیں۔

کس قدر حسرتناک ماجرا ہے، یہ نتیجہ ہے غلو اور افراط کا، آخر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بے معنی تو نہیں؟ ولا تغلوا فی دینکم (تم دین میں غلو نہ کرو) کیا اس ہلاکت و قتل کی نسبت کو تسبیباً بھی ان ظالموں کی طرف نہ ہوگی ۔۔۔۔۔؟

غرض تفریط اور افراط دونوں مذموم ہیں، شریعت نے دونوں سے روکا ہے اور ان حدود کا علم بدون صحبت و استفسار و صحبت علماء کے نہیں ہوتا، پس ان سب کا علاج یہی ہے۔

روزہ محض شام کا

(۱) بعض لوگ نفس روزہ میں تو افراط و تفریط نہیں کرتے لیکن روزہ محض صورت کا نام سمجھ کر صبح سے شام تک اجوفین یعنی فم و فرج کو بند رکھنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اور اس میں علاوہ مقصود بہ صورت توجیہ کے کہ وہ بھی ثابت ہے اور حکمتیں موجود ہیں جن کی طرف قرآن مجید میں اشارہ بلکہ صراحت ہے لعلکم تتقون یعنی شاید تم متقی ہو جاؤ۔ ان سب کو نظر انداز کر کے اپنے صوم کو جسد بلا روح بنا لیتے ہیں، خلاصہ ان حکمتوں کا معاصی و منہیات سے بچنا ہے، سو ظاہر ہے کہ اکثر لوگ روزہ میں بھی اکثر معاصی سے نہیں بچتے، جو حالت ان کی معصیت میں قبل رمضان ہوتی ہے رمضان کے آنے سے اس میں کچھ تفاوت نہیں ہوتا۔

اگر غیبت کی عادت تھی وہ بدستور رہتی ہے، اگر نگاہ بد کے خوگر تھے، وہ نہیں چھوڑتے، اگر حقوق العباد میں مبتلا تھے ان کی معافی نہیں کی، بلکہ بعضوں کے معاصی تو زیادہ بڑھ جاتے ہیں کیونکہ پہلے تو کسی کاروبار میں لگے رہتے تھے اب روزہ میں چلنے پھرنے محنت مشقت کا کام تو ہوتا نہیں دوستوں میں جا بیٹھ کر روزہ بہلایا۔ پھر دوستوں میں کوئی شغل تفریح کا بھی ضروری ہے یا تو باتیں شروع کر دیں جن میں زیادہ حصہ غیبت کا ہوگا اور یا چوسر گنجفہ، تاش یا بازوسیم یا باجا یا گراموفون لے بیٹھے اور دن پورا کر دیا! بھلا اس روزہ کا کوئی مقصد حاصل کیا؟ اتنی بات عقل سے سمجھ میں نہیں آتی کہ کھانا پینا جو کہ فی نفسہ مباحات ہے، جب روزہ میں وہ حرام ہو گیا تو غیبت اور دوسرے معاصی تو فی نفسہ بھی حرام ہیں وہ روزہ میں کس قدر حرام ہو گئے!

تو مباح اصلی سے بچنا اور غیر مباح میں مبتلا ہونا یہ روزہ کس قسم کا ہے؟ حدیث میں ہے کہ جو شخص بد گفتاری اور بد کرداری نہ چھوڑے خدا تعالیٰ کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے، اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بالکل روزہ ہی نہ ہوگا، کیونکہ یہ سمجھ کر جب روزہ نہ ہوگا تو پھر رکھنے سے کیا فائدہ؟ سو روزہ تو ہو جاوے گا مگر نہایت ادنیٰ درجہ کا، جیسا اندھا، لنگڑا، کانا، گنجا، اپاہج آدمی ہوتا ہے، مگر ناقص روح

کا اور بالکل روزہ نہ رکھنا تو اس سے بھی اشد ہے کیونکہ ذات کا سلب صفت کے سلب سے سخت تر ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب غیبت چونکہ مباح فی نفسہ نہیں لہٰذا زیادہ شدید ہے اور اکل و شرب چونکہ فی نفسہ مباح ہیں وہ اس سے خفیف ہیں پس غیبت سے روزہ افطار نہ ہونا اور خورد و نوش سے افطار ہو جانا کیا معنی ... ؟

جواب یہ ہے کہ روزہ جن خصوصیات کے لئے مشروع کیا گیا ہے ان کے اعتبار سے اس کی ایک خاص ماہیت مشخصہ ہے یعنی الامساک عن المفطرات بالنیۃ (نیت کرکے افطار کرنے والی چیزوں سے رکنا) سو اکل و شرب وغیرہ گو اہون ہوں مگر اس ماہیت کے منافی ہیں اور دوسری معاصی گو اشد ہوں مگر اس ماہیت کے منافی نہیں، گو اس ماہیت کی اغراض کے منافی ہوں، سو غیبت وغیرہ معاصی سے روزہ کی اغراض فوت ہو جاویں گے سو اس کو ہم بھی مانتے ہیں، چنانچہ اوپر کہا گیا ہے کہ بھلا اس روزہ کا کوئی معتد بہ حاصل؟ اور اصل حقیقت صوم کے منتفی ہو جانے سے یہ اثر ہوگا کہ قیامت میں باز پرس نہ ہوگی کہ روزہ کیوں نہیں رکھا؟ بلکہ یوں پوچھا جاوے گا کہ روزہ کو خراب کیوں کیا؟ سو بڑا فرق ہے۔ اس میں کہ حاکم کے حکم کے بعد سلام کا مقدمہ ہی نہ بنایا اور اس میں کہ بنایا مگر کہیں کہیں غلطیاں رہ گئیں، اور یہ جو کہا گیا کہ ایسے روزہ سے مقصود فوت ہو گیا نہیں، یہ کہہ کر اس لئے بالکل بے سود بھی نہیں اور دو فائدے ایک تو ظاہر ہے کہ کسی قدر تو تعمیل ارشاد ہے اور دوسرا ہر عمل میں ایک خاص برکت ہے، جب صبح سے شام تک لذات مخصوصہ سے نفس کو روکا تو اس سے نفس مزور منفعل و منصبغ و متاثر و قبول کنندہ و رنگ پذیرندہ ہو گیا۔ جس کا اثر یا تو آئندہ ظاہر ہو کہ کسی معصیت سے رکنے کی توفیق ہو جائے یا اسی روزہ میں یہ اثر ہوا ہو کہ اگر یہ صورت صوم بھی نہ ہوتی تو کوئی خاص معصیت سرزد ہوتی اور روزہ کی برکت سے سرزد نہ ہوئی ہو تو اس وجہ سے بالکل بے سود اور لا حاصل نہیں کہہ سکتے اور تدبیر

ان معاصی سے بچنے کی تین امر کا مجموعہ ہے۔

- ــــ خلق سے بلا ضرورت تنہا دور یکسو رہنا،
- ــــ کسی اچھے شغل میں لگے رہنا مثلاً تلاوت قرآن مجید وغیرہ،
- ــــ نفس کو سمجھانا اور وقتاً فوقتاً دھیان کرتے رہنا کہ ذرا سی لذت کے واسطے صبح و شام تک کی مشقت کو کیوں ضائع کیا؟ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ نفس سمجھانے سے بہت کام کرتا ہے، سو نفس کو یوں بہلا دے کہ

ایک مہینہ کے لئے تو اس دستور العمل کی مجموعہ تین امور مذکورہ کا یہ پابندی کرے پھر دیکھا جاوے گا، یہ ایک مہینہ تو وہ سمجھانے میں آ کر مرضی کے موافق کرلے گا پھر یہ بھی تجربہ ہے کہ جس طرز پر آدمی ایک مدت تک رہ چکا ہو وہ آسان ہو جاتا ہے۔ بالخصوص اہل باطن کو رمضان میں یہ حالت زیادہ مدرک (معلوم) ہوتی ہے کہ اس مہینہ میں جو اعمال صالحہ کئے ہوتے ہیں سال بھر تک ان کی توفیق رہتی ہے۔

شیاطین کے رمضان میں قید ہونے کا مطلب

پس اس طریق سے بعد رمضان بھی وہی عادت ترک معاصی کی تھوڑی توجہ سے انشاء اللہ محفوظ رہے گی۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ پھر معصیت کی طرف میلان ہی نہ ہوگا، بلکہ دعوی یہ ہے کہ اس میلان کا جس قدر پہلے تقاضا ہوتا تھا اب اس قدر تقاضا نہ ہوگا۔ بہت تھوڑی توجہ اور ضبط سے وہ میلان دفعتاً مغلوب ہو جاوے گا اور میرے نزدیک یہی اثر ہے شیاطین کے مقید ہو جانے کا رمضان میں کہ قبل رمضان جو نفسانی خواہشیں پیدا ہوتی تھیں ان کی اعانت شیاطین بھی کرتے تھے اس لئے تقاضا شدید ہوتا تھا ضبط میں زیادہ مشقت ہوتی تھی رمضان میں گو ایسی خواہشیں پیدا تو ہوتی ہیں کیونکہ نفس و طبیعت قید نہیں ہوتے مگر شیاطین چونکہ قید ہو گئے اس لئے ان کی اب اعانت نہیں ہوتی، تو تقاضا اس شدت سے نہ ہوگا اور روکنا آسان و غیر دشوار ہوگا۔ چنانچہ یہ امر تجربہ اور مشاہدہ سے دیکھا جا سکتا ہے اور اس تقریر سے بعض اشکالات بھی حل ہو گئے اور اسی کا ثمرہ یہ بھی ہے کہ حتی الوسع رمضان کے ختم ہونے کے بعد کا زیادہ اہتمام رکھے، شرم کی بات ہے کہ حلال سے تو دن بھر رکا رہے اور حرام سے احتراز نہ کرے!!

سحور یعنی سحری

اس میں غالباً دو کوتاہیاں ہوتی ہیں، ایک تعجیل کے متعلق دوسری تاخیر کے متعلق

① اول کا بیان یہ ہے کہ اکثر لوگ آدھی رات سے سحری کھا کر بیٹھ رہتے ہیں، سو اول تو خود اس قدر تعجیل ہی امر شارع و غرض مشروعیتِ سحر کے خلاف ہے اور وہ غرض یہ ہے کہ مسلمین و اہل کتاب میں فرق رہے اور روزہ میں قوت و طاقت رہے۔ اور دوسرے اکثر عوام کا اس کے ساتھ یہ اعتقاد منضم ہو جاتا ہے کہ جب سحر کھا کر روزہ کی نیت کر لی یا سو گئے تو اس کے بعد گو رات باقی ہی ہو مگر اب کھانا پینا جائز نہیں، سو یہ اعتقاد ایک اختراع فی الدین ہے جس سے توبہ واجب ہے۔

② ثانی کا بیان یہ ہے کہ بعضے لوگ خصوص جن کے پاس نقشے اور گھڑیاں بھی ہیں اس قدر تاخیر کرتے ہیں کہ بعض اوقات پر اشتباہ قوی ہو جاتا ہے کہ کہیں صبح صادق کے بعد تو نہیں کھایا گیا، اس قدر مبالغہ فرد بے احتیاطی ہے، حدیث متفق علیہ کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یرتع فیه، اس سے صاف روک رہی ہے، اسی طرح گھڑیوں پر اتنا اعتماد کہ اسی کی بنا پر اتنے بڑے فرض یعنی کو خطرہ میں ڈالنے پر اقدام کر بیٹھے جیسا بے ظلم ہے، اور تجربہ کے بھی خلاف، کیونکہ ہزاروں واقعات بڑی بڑی قیمتی گھڑیوں کی غلطی نکلنے پر شاہد ہیں۔

اسی طرح اس کے مقابل بعض کا تشدد کہ گھڑی ہی کو بدعت کہتے ہیں اور نماز روزہ میں اس کے حساب کو کسی درجہ میں معتبر رکھنے کو بھی حرام سمجھتے ہیں، یہ بھی تعدی حدود ہے اس میں قول فیصل یہ ہے کہ اصل مدار معرفت اوقات میں علامات خاصہ ہیں، اور ان علامات کی تحقیق میں جیسا مشاہدہ اور حس معتبر ہے اسی طرح اس مشاہدہ و حس کی معاونت پر کوئی اصطلاح یا آلہ جس کا کثرت تکرار مشاہدہ سے صحیح و مطابق ہونا معلوم ہوا ہو مقرر کر لیں یا اور کوئی قدرتی چیز مطابق معلوم ہو تو اس کا اعتبار بھی جائز ہے۔ نہ من حیث الخصوصیت بلکہ من حیث انها مطابقة لتلک العلامات المعتبرة شرعاً یعنی یہ کوئی خصوصیت کی

آلہ اور مسالے کی نہیں، بلکہ یہ آلہ چونکہ ایسی علامتوں کے مطابق ہوگیا ہے جو شرعاً معتبر ہیں تو اس کا بھی اعتبار ہوگیا، یہی گھڑی کی تقویم سے ہے، نظیر اس کی قبلہ نما ہے، جس کے جواز اعتبار کو فقہاء متاخرین نے تصنیفاً فرمایا ہے، (یعنی صبح صادق کے لئے جو نقشہ بنایا جائے اس پر اعتبار کر لینے کی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے:

لیکن بدل کسی طرح اصل کے برابر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اصل میں تو غلطی کا احتمال ہی نہیں (مثلاً غروب کا آنکھوں سے دیکھ لینا) ہاں شاید کبھی حس میں غلطی ہو جائے، اور بدل میں احتمال ہے (جیسے گھڑی) اور یہیں سے سحر میں مرغ کی اذان کا اور افطار کے وقت تیر کے نکلنے کا وقت بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ بدون تجربہ کامل کے اس پر اعتماد نہ چاہئے۔

- بعض لوگ سحر مناسب وقت کرتے ہیں مگر فضول قصہ و پان میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ روزہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔
- بعضے پان منہ میں دبا کر سو رہتے ہیں یہ سب بے عنوانیاں ہیں۔

سحری میں کوتاہی

- ایک بے عنوانی سحری کے متعلق بعض مقامات پر یہ دیکھی جاتی ہے کہ صبح کی اذان قبل از وقت کہتے ہیں، تاکہ سحری کھانے والے سحری چھوڑ دیں، مگر جن کے نزدیک اذان فجر قبل از وقت کافی نہیں (جیسے امام ابو حنیفہؒ وغیرہ) ان کے نزدیک اس اذان کا اعادہ ضروری ہے اور اعادہ نہیں کیا جاتا تو صبح کی نماز بدون اذان ہوتی ہے، دوسرے اگر لوگوں کو اس کی عادت ہو گئی اور ظاہر ہے کہ مؤذن نہ ایسے پابند نہ ایسے واقف کار اوقات ہیں تو اگر کسی روز غلطی سے خلاف معمول بعد صبح صادق اذان ہوئی، تو تمام لوگوں کے روزے اس اذان کے بھروسہ برباد ہو گئے، اس لئے مصلحت یہ ہے کہ اذان ایسے وقت ہی ہوا کرے کہ اس اذان کے اعتماد پر کوئی شخص سحری نہ کھاوے، پھر خود ہی ہر شخص اپنے طور پر تحقیق کر کے اس پر عمل درآمد کرے گا۔

افطار

اس وقت ذہن میں اس کے متعلق بڑی کوتاہی ایک ہی آتی ہے وہ یہ کہ اکثر جگہ دیکھا جاتا ہے کہ افطار کے سامان میں جس کو عرف میں "افطاری" کہتے ہیں اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ اس کے کھانے کھلانے میں مغرب کی جماعت بالکل یا کسی قدر فوت ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات قصداً اور اکثر ہوتی ہے، جس میں سفر یا معذوری بھی نہیں ہوسکتی، جماعت کی جو کچھ تاکید آئی ہے اس کے اعتبار سے یہ عادت نہایت منکر ہے، اول تو اس قدر اہتمام ہی کیا ضرور ہے؟ دوسرے یہ بھی تو ممکن ہے کہ نماز کے بعد یہ شغل ہو اور افطار کسی مختصر چیز پر ہو کر نماز میں حاضر ہو جاوے،

اس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ افطار خواہ معمولی ہو خواہ مختصر ہو مسجد میں ہونا چاہئے، مکان پر روزہ کھولنے سے اکثر جماعت برباد ہوتی ہے، پھر جب جماعت ملنے سے مایوسی ہو جاتی ہے اکثر لوگ گھر ہی پر نماز پڑھ لیتے ہیں، تو روز روز مسجد کی برکات سے بھی محروم رہتے ہیں اگر دعوت ہو تو وہ سب بھی مسجد میں جا سکتے ہیں کیا بندہ کے گھر پر جانا فخر اور خدا کے در پر حاضر ہونا عار ہے ..... ؟ اگر یہی خیال ہے تو یہ تمام افطار بیکار ہی بیکار ہے۔

تراویح

اس عمل میں دو جزو ہیں "قرآن پڑھنا" اور "نماز" اور ایک ان دونوں کا مجموعہ ہے، اور دونوں جزو میں جو جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں اس سے پہلے مفصل بیان کر چکا ہوں اس سے ایک بڑی فہرست تراویح کی کوتاہیوں کی بھی معلوم ہو سکتی ہے، اس وقت صرف ان بعض کوتاہیوں کا مختصراً ذکر کرتا ہوں جو مجموعہ میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) اکثر لوگ فارغ ہونے کی جلدی میں وقت کے آنے سے پہلے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۱) اگر غلطی سے کبھی وقت پر نہ ہو سکے جیسے تو اذان ہی وقت سے پہلے کہہ دیتے ہیں۔

(۲) قرآن مجید اس قدر تیز پڑھتے ہیں کہ تجوید یا تصحیح حروف بھی نہیں ہوتی بعض وقت معین کو سمجھنا تو یہ بات تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ کیا پڑھا جا رہا ہے۔

(۴) اکثر ثنا و تسبیحات رکوع و سجود و تشہد مقتدی پورا نہیں پڑھنے پاتا کہ امام صاحب قراۃ یا قومہ یا جلسہ یا قیام یا سلام کی طرف چل دیتے ہیں۔

(۵) ترویحہ میں بھی بعض جگہ نہیں ٹھہرتے۔

(۶) بعضے لوگ ایک ہی رات میں دو دو جگہ پوری تراویح پڑھ دیتے ہیں۔

(۷) بہت لوگ اجرت پر قرآن سناتے ہیں۔

(۸) بعضے حفاظ اپنا پڑھ کر یا کسی روز ناغہ کر کے دوسرے حافظ کا اس نیت سے سننے جاتے ہیں کہ اس کی غلطیاں پکڑیں گے یا اس کو غلطی میں ڈالیں گے، خواہ شبہ ڈال کر یا اس کے قلب کو منتشر ذاتی حرکات سے پریشان کر کے، کہیں لاٹھی کھڑکھڑاتے ہیں کہیں پاؤں زور زور سے زمین پر مارتے ہیں، کہیں کھنکارتے ہیں، کہیں آستین کو الٹ پلٹ کر کے دکھاتے ہیں، کہیں کھڑے ہو کر زور سے باتیں کرتے ہیں، اور غلط گیری کا تجسس اور غلط اندازی کی فضیلت جتا یہ اسی کا نام ہے، عبادت میں دوسری طرف مشغول کر کے خلل ڈالنا۔

(۹) بعض ایسے بچوں کو امام بنا دینا جن کو طہارت و نماز کے مسائل ضروریہ بھی معلوم نہیں، بلکہ ان پر یہ بھی اطمینان نہیں کہ ان کے کپڑے بھی پاک رہتے ہیں یا ان کو وضو بھی ہوگا اور نابالغ کے پیچھے تراویح کے جائز ہونے میں جو اختلاف ہے وہ اس سبب سے علاوہ ہے دل تو نماز کے بارہ میں احتیاط پر عمل مطلوب ہے، پھر جواز کی صورت میں بھی ان عوارض بالا کا کیسے انکار ہو سکتا ہے، ایسے بچے نوافل میں پڑھ لیا کریں کافی ہے۔

(۱۰) بعض دفعہ شبینہ اس طرح پڑھنا کہ نماز اور قرآن دونوں کے احترام و تعظیم کا بالکل ضائع ہونا لازم آتا ہے، یہاں تک کہ ایک مقام پر ایک حافظ صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے سب حفاظ کو سنا گئے اور سہواً و قصداً بھی بتلاتے رہے؛ دوسری نمازیں شب بھر کی

برباد کرتے رہے اور بہت سی خرابیاں اس کے متعلق رہتی ہیں۔ اصلاح الرسوم میں کچھ دی ہیں اس کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے، چونکہ ان مذکورہ دس امور کا حکم کچھ مخفی نہیں نیز مراجعت علماء سے بآسانی ہو سکتا ہے اس لئے بخیال تطویل مختصر کر دیا۔

(۱۱) بعض امور متفرقہ منکرات میں سے ہیں، جیسے جھگڑے روزہ کے لئے خاص طور پر اہتمام کرنا۔

(۱۲) آخری جمعہ کو خطبۃ الوداع کا التزام

(۱۳) ختم قرآن کے وقت شیرینی کو لازم و ضروری کرنا۔

(۱۴) بعض جگہ اچھوں خب کو بھی ختم تراویح پر تقسیم شیرینی کا انتظام۔

(۱۵) نامحرم حافظوں کو گھر میں بلا کر عورتوں کا قرآن سننے کے لئے جمع ہونا وغیرہ ذلک، ان میں بعض کا حکم اصلاح الرسوم میں ہے، بعض کا اہل علم سے معلوم کر لیا جائے، یہ سب رمضان المبارک کے متعلق بیان ہوا، اب دو امر اس کے متعلقات سے رہے جو عید کے متعلق ہیں، ان کے بارہ میں بھی مختصر ذکر ہی ہے۔

صدقۂ فطر

بہت لوگوں کو اس کے مامور بہ ہونے کی خبر نہیں یعنی یہ بھی نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا اور واجب کیا ہے۔ بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ ان ہی کی طرف سے دیا جاتا ہے جنھوں نے روزے رکھے ہیں، سو وہ بچوں کی طرف سے ادا نہیں کرتے بہت لوگ خاص کر دیہات والے صدقۂ فطر جمع کر کے مسجد کے مؤذن یا امام کو یا کچھ مسجد کے سقہ کو دے دیتے ہیں اور یہ نہیں کہ ان کی حق الخدمت و اجرت کے علاوہ مسکین سمجھ کر دیدیتے ہوں بلکہ ان لوگوں کو ایسی ہی شرائط مقرر کرتے ہیں کہ تم یہ کام کرو تم کو یہ دیں گے، ان میں صدقۂ فطر بھی شمار کیا جاتا ہے، تو اس طور پر وہ ان کے عمل کا عوض ہوا جو کہ اجرت ہے اور اجرت دینے سے وہ ادا نہیں ہوا اس لئے ان دینے والوں کے ذمہ مکرر ادا کرنا ضروری ہوگا۔

البتہ اگر مقرر کرتے وقت تصریح کردیں کہ صدقۂ فطر سے تمہارا کچھ واسطہ نہ ہوگا اور پھر

مسکین سمجھ کر دیدیں وہ جائز ہے۔ بشرطیکہ واقع میں مستحقین میں ہوں ورنہ اگر وہ غنی ہو جیسا کہ بعض جگہ نہ مستحق کو اس کی پرواہ ہے نہ آخذ کو۔ نہ دینے والوں کو نہ لینے والوں کو تو اس دینے سے صدقہ فطر ادا نہ ہوگا مکرر دینا پڑیگا۔ لیکن اس غنی سے جبراً واپس بھی نہ لے سکے گا۔ رہا یہ کہ اس غنی کے لئے بھی وہ حلال ہوگا یا نہیں، اور اگر حلال نہیں تو آیا دینے والے کو واپس کر دینا واجب ہے یا صدقہ کرنا، ان مسئلوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ کما فی ردّ المحتار باب المصرف تحت قوله وليس دفع بلا تحرٍ (چنانچہ شامی میں مستحقین صدقہ وزکوٰۃ کے بیان میں لو دفع بلا تحرٍ کے ذیل میں ذکر کیا ہے)

تنبیہ: اگر ناواقفیت مسائل یا بے پروائی سے گذشتہ زمانہ میں بچوں کا صدقہ فطر نہ دیا ہو یا مؤذن وغیرہ کو اجرت میں دے دیا ہو یا غنی کو دیدیا ہو، تو یاد کر کے اور حساب لگا کر اب مساکین کو اس مقدار کے موافق دیدیں تاکہ ذمہ فارغ ہو جاوے اور صدقۃ الفطر کے مسائل علماء سے دریافت کر کے یا بہشتی زیور میں مطالعہ کر کے خود بھی عمل کرنا اور دوسروں کو آگاہ کرنا چاہیے۔

نمازِ عید

اس میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔

(۱) ——— ایک یہ بعض لوگ اس نماز کا طریقہ ہی نہیں جانتے اور غضب یہ کہ اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ آٹھ دس دن پہلے یاد ہی کرلیں اس سے زیادہ کیا بے پروائی ہوگی۔!!

(۲) ——— ایک یہ کہ اکثر جگہ یہ نماز بہت ہی دیر میں پڑھتے ہیں، حالانکہ صریح سنت اس کے خلاف آئی ہے۔

(۳) ——— ایک یہ بہت جگہ امام اور خطیب جاہل ہیں، جو محض برادری استحقاق آبائی نماز پڑھانے آتے ہیں، جن میں اکثر تو ایسے جاہل ہیں کہ خطبہ اور سورۃ تک صحیح نہیں پڑھ سکتے اور اگر نماز میں کوئی سانحہ پیش آجائے جس میں مسائل جاننے کی ضرورت ہو تو کچھ

نہیں کر سکتے، یہ تقدم انہوں نے اختیاراً ترکی تھا ترقی کے لیے لیکن اس جہل کی بدولت ان کی اس قدر فضیحتی اور رسوائی ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ اور اگر اس درجہ کے جاہل نہ ہوئے تب بھی مدعی مرائی متفاخر متصنع کے پیچھے نماز پڑھنے کو فقہاء نے خود مکروہ کہا ہے۔

اس کا انسداد بسہل بجز اس کے کچھ نہیں کہ اہل حل و عقد یعنی بستی کے عمائد اس امام کو معزول کر کے کسی اہل کو مقرر کریں، اور آئندہ اس رسم کو موقوف کریں کہ امام کا بیٹا ہی امام ہو، بلکہ اس کی وفات کے بعد پھر جو سب میں زیادہ اہل ہو اس کو مقرر کریں وعلیٰ ہٰذا (اسی طرح آگے تک)

(۴) ــــــ ایک کوتاہی یہ کہ بعضے جو بزعم خود مقتدا ہیں متبوع مستقل بننے کی غرض سے عیدگاہ کو چھوڑ کر اپنے محلہ کی مسجد میں عید کی نماز پڑھتے ہیں، جب مسجد کی یہ فضیلت ہو کہ وہاں ایک نماز برابر پچاس ہزار نماز کے ہو (یعنی مسجد نبوی) جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تو چھوڑ کر عمر بھر عیدگاہ میں تشریف لے جاویں جس سے یہ بھی مستنبط ہو کہ وہ تضاعف مکتوبات کے ساتھ خاص ہے اور یہ مفتخے چند مدعی اپنی مسجد کو عیدگاہ پر ترجیح دیں ......!!

البتہ معذورین کے لیے اگر کسی شخص کو شہر میں نماز پڑھانے کے لیے چھوڑ دیں مضائقہ نہیں مگر مقتدا لوگ خود معذور ہیں ایسے کسی متعلق قابل امامت چھوڑ دیں یا یہ کہ اتفاقاً کوئی عذر خود مقتدا کو یا عام لوگوں کو پیش آجاوے تو دوسری بات ہے، چنانچہ ایک بار خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعذر مطر (بارش) مسجد میں نماز ادا فرمائی ...

(۵) ــــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بہت لوگ عید میں غیر مشروع لباس پہن کر جانے سمجھوں کو پہنا کر جاتے ہیں اور لے جاتے ہیں حالانکہ ایسے لباس سے علاوہ فی نفسہٖ حرام ہونے کے نماز کا مقبول نہ ہونا بھی وارد ہے۔

(۶) ــــــ ایک کوتاہی یہ ہے صفیں نہایت بے ترتیب ہوتی ہیں، صفوں کے استوار (یعنی برابر کرنے) کی سخت تاکید آئی ہے

(۷) ــــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ خطبہ سننے کو بالکل امر فضول سمجھتے ہیں اگر سب

حاضرین ایسا ہی کریں تو خطیب خطبہ کس کے سامنے پڑھے ؟

اور بعضے بیٹھے ہیں مگر باتیں کرتے رہتے ہیں یہ اور بھی گناہ ہے اور بعضے منکرات عید کے متعلق ۔ اصلاح الرسوم میں مذکور ہو چکے ہیں ۔ اب اس مضمون کو ختم کرتا ہوں ۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

زکوٰۃ کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ زکوٰۃ)

جس طرح عبادات بدنیہ میں نماز سب سے اہم ہے اسی طرح عبادات مالیہ میں زکوٰۃ سب سے اہم ہے، قرآن مجید میں جگہ جگہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے ساتھ آتُوا الزَّکٰوۃَ آنا اس اہمیت میں شریک ہونے کی تائید کرتا ہے، اس لئے اس کے متعلق کوتاہیوں پر مطلع ہونا بھی نہایت اہم ہوگا، پس مختصراً ان کو لکھا جاتا ہے۔

(۱) — ایک کوتاہی تو سب سے بڑی ہے یہ ہے کہ بہت سے لوگ زکوٰۃ ہی نہیں دیتے، اس کی اصلاح یہ ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ کی تاکید و فرضیت کے نصوص اور اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں ان کو دیکھیں سنیں غور کریں اور اس کا جو اصلی سبب بخل ہے اس کا علاج کریں، اس علاج کا حاصل مال کی محبت کو گھٹانا ہے جس کی سب سے اچھی تدبیر موت کا بکثرت یاد کرنا اور یاد رکھنا ہے۔

اور اگر اس کوتاہی کا سبب فرضیت کا اعتقاد نہ ہونا ہے گو آج کل ایسا شخص سنا نہیں گیا۔ لیکن اگر نادراً ایسا ہو تو اس کی اصلاح اپنے شبہات کا کسی محقق عالم سے رفع کرنا ہے اور اگر رفع نہ کیا اور منکر فرضیت رہا تو وہ کافر ہے۔

(۲) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے زکوٰۃ دیتے ہیں مگر حساب سے نہیں دیتے جو کچھ جی چاہا دیدیا، سو یہ بھی نہ دینے ہی میں داخل ہے کیونکہ ایک ہزار کے مال میں پچیس روپے واجب تھے اور اس نے دس روپے دیئے تو چار سو کی زکوٰۃ ادا ہوگئی اور چھ سو کی رہ گئی، تو

ایسا ہو گیا جیسے کسی کے پاس چھ ہی سو روپے ہوں اور بالکل زکوٰۃ نہ دے، پس اس میں بھی وہی معروض ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

کون سے مال پر زکوٰۃ واجب ہے؟

(۳) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ بعض اموال کی زکوٰۃ دیتے ہیں اور بعض اموال کی نہیں دیتے، اس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ ان کو یہ خبر نہیں کہ کس کس مال میں زکوٰۃ ہوا کرتی ہے، اس لئے ان اموال کو مختصر بتلایا جاتا ہے۔

ایک چاندی، سونا، خواہ سکہ کی صورت میں ہو، خواہ زیور کی صورت میں ہو، خواہ گوٹہ ٹھپہ ہو، خواہ ویسے ہی ٹکڑے رکھے ہوں، اور خواہ پاس موجود ہوں، اور خواہ موجود نہ ہوں، مگر اس کا وصول کرنا اپنے سے ممکن ہو، جیسے نوٹ سے لئے ہوں یا بینک میں جمع ہو یا کسی کے ذمہ قرض آتا ہو خواہ نقد دیا ہو یا کوئی چیز فروخت کی ہو اور وصول سے ناامیدی نہ ہو، لیکن قرض میں یہ اختیار ہے کہ خواہ اور اموال کے زکوٰۃ کے ساتھ دیدے، خواہ جب وصول ہوتا رہے دیتا رہے، لیکن اگر وصول کے وقت دے گا تو تمام گذشتہ کی دینی پڑے گی۔ مثلاً دو سال میں سو روپے وصول ہوئے تو ان کی زکوٰۃ اڑھائی روپیہ سال کے حساب سے دو سال کی پانچ روپے دینا پڑے گی۔

★ دوسرا مال تجارت، اور مال تجارت وہی ہے جس کے خریدنے کے وقت یہ نیت ہو کہ ہم اس کو بیچیں گے، خواہ وہ منقولات میں سے ہو، خواہ غیر منقولات میں سے ہو، مثلاً ایک شخص کی یہ عادت ہے کہ مکانات واراضی موقع کی خرید لیتا ہے اور پھر موقع پر بیچ ڈالتا ہے، یہ بھی مال تجارت ہو جاوے گا اور زکوٰۃ اس میں واجب ہوگی اور جس کے خریدنے کے وقت بیچنے کی نیت نہ ہو گو بعد خریدنے کے نیت ہو جاوے وہ مال تجارت نہیں اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور اسی طرح اگر خریدنے کے وقت تجارت کی نیت تھی مگر حولان حول سے پہلے یعنی جس وقت ختم سال پر اس پر زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے، ختم سال سے پہلے وہ نیت تجارت کی فسخ ہو گئی ہو وہ بھی مال تجارت نہیں رہا اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں، اسی طرح اگر وہ مال خریدا ہوا نہیں بلکہ میراث میں آ پہنچا ہے اور مالک ہوتے ہی تجارت کی نیت کر لی یا گھر کا غلہ پیدا ہوا ہے اور تیاری کے وقت نیت تجارت کی کر لی وہ بھی مال تجارت نہیں اور اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

• تیسرا مال وہ مویشی ہیں جن کو نسل بڑھانے کے لئے پالا ہو جیسے لوگ بکریاں یا گائیں یا گھوڑیاں پالتے ہیں، ان کے احکام و شرائط میں بہت تفصیل ہے۔ فقہ کی اردو کی کتابوں میں دیکھ لیا جاوے۔

• چوتھا مال عشری زمین کی حقیقت کا حاصل یہ ہے کہ جو زمین اس وقت مسلمان کی ملک میں ہو اور اس سے قبل اس کا کسی کافر کی ملک میں آنا معلوم نہ ہو، خواہ واقع میں وہ جب سے اہل اسلام کی مفتوحات میں داخل ہوئی ہے کسی کافر کے ہاتھ میں نہ پہنچی ہو، خواہ درمیان میں کوئی کافر بھی بطنے چند سے اس کا مالک ہو گیا ہو۔ مگر کسی کو معلوم نہ ہو تو ایسی زمین عشری ہے، اس میں جو کچھ پیدا ہو خواہ غلہ خواہ بینگن وچری وغیرہ، خواہ خشخاش یا خواہ تمباکو یا اور ادویہ یا پھول جو بغرض نفع بوئے گئے ہوں، یا اس میں باغ کسی قسم کے پھل کا ہو ان سب میں بھی زکوٰۃ واجب ہے، اس زکوٰۃ کو عشر کہتے ہیں اور ہندوستان میں اس سے بڑی غفلت ہے، ان کی دو قسموں کے مال میں چالیسواں حصہ واجب ہوتا ہے اور تیسری قسم میں بہت تفصیل ہے جو فقہ کی اردو کی کتابوں میں ملے گی اور چوتھی قسم میں بارانی زمین میں دسواں حصہ کل پیداوار کا ہے اور چاہی اور نہری میں بیسواں حصہ کل پیداوار کا ہے۔

زکوٰۃ کے حساب میں غلطیاں

(۴) ایک کوتاہی یہ ہے کہ اپنے نزدیک حساب دیتے ہیں مگر واقع میں وہ حساب غلط ہوتا ہے مثلاً مال تجارت میں اپنی خرید یا لاگت کا حساب لگا لیتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک شخص نے کچھ کتابیں تاجرانہ نرخ سے خریدیں بلا اپنے پریس میں چھاپیں اور ہزار روپیہ میں اس کو پڑتیں مگر بازار میں وہ دو ہزار کی ہیں تو زکوٰۃ دو ہزار کی دینا چاہیے اور اگر دو ہزار کی زکوٰۃ تو زکوٰۃ پچاس روپے دیتے ہوئے دل دکھے تو سہل یہ ہے کہ خود کتابوں کا چالیسواں حصہ دیدے مثلاً چالیس جلد میں سے ایک جلد دے دے یا ایسی کتاب دیدے جس کی جلد کی برابر قیمت پڑ جاتی ہوتی ہو۔

اور اس حساب غلط لگانے کی ایک اور باریک مثال ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک

شخص کے پاس سو روپے کی برابر وزن میں چاندی کا زیور ہے اور قیمت اتنی چاندی کی بوجہ دستکاری اسی روپیہ ہے، تو اکثر لوگ اس اسی روپیہ کا چالیسواں حصہ یعنی دو روپے دیدیتے ہیں، حالانکہ ہم جنس سے زکوٰۃ ادا کرنے میں صنعت اور سکہ کی قیمت کا اعتبار نہیں ہوتا پس اس کے ذمہ ڈھائی روپیہ بھر چاندی واجب ہے، اگر روپیہ دیا تو وہ چاندی کے حساب میں شمار ہوگا اس لئے اڑھائی روپیہ دینے میں زکوٰۃ ادا ہوگی دو روپیہ دینے سے آٹھ آنہ بھر چاندی اس کے ذمہ اور رہی اور اگر اڑھائی روپیہ دینے میں خسارہ سمجھے تو اس کی دو صورتیں اور ہیں۔ ایک یہ کہ روپیہ نہ دے خود چاندی اڑھائی روپیہ بھر دیدے اور وہ مسکین اس کو بیچ کر کارروائی کرے گا۔ دوسرا اس سے بھی سہل یہ ہے کہ دو روپے کے بالکل پیسے ہی پیسے کہ جس میں چاندی کی رونق تک نہ ہو مساکین کو دیدے کیونکہ ان پیسوں کی چاندی اڑھائی روپے بھر آسکتی ہے اور خلاف جنس اس لئے ان پیسوں کی قیمت اڑھائی روپے بھر چاندی کی برابر سمجھی جاوے گی اور زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی۔

ایک مثال حساب غلط ہونے کی بہت ہی باریک ہے وہ یہ کہ اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بوجہ اس کے کہ رمضان ہی تک میں ایک ذخیرہ ثواب برابر ستر فرض کے ہے۔ رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اور پھر رمضان ہی سے سلسلہ حساب کا رکھتے ہیں پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ نصاب کے مالک ہونے کی تاریخ سے جو سال شروع ہوا ہے وہ رمضان کے تین چار ماہ پہلے مثلاً ختم ہو گیا تھا تو اسی شخص نے رمضان شریف سے حساب رکھنے کے لئے ان تین چار ماہ کی زکوٰۃ بھی دیدی پھر آئندہ کے لئے رمضان سے رمضان تک حساب جاری رکھا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رمضان سے تین چار ماہ بعد سال ختم ہوتا ہے، تو پیر رمضان میں زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے کو جلدی سبکدوش سمجھ لیتا ہے، مگر غلطی اس میں یہ ہوتی ہے کہ جب رمضان میں یہ شخص زکوٰۃ نکالتا ہے تو جتنا مال رمضان شریف میں اس کی ملک میں ہے یہ اسی کی زکوٰۃ نکالتا ہے، حالانکہ احتمال ہے کہ جو ختم سال

جس کا واقعی یہ ہے اس میں نصاب اس وقت سے زیادہ ہو اور زکوٰۃ واقع میں اسی زیادہ کے حساب سے واجب ہوگی تو اس طور پر حساب سے کچھ زیادہ زکوٰۃ اس کے ذمہ رہ جائیگی اور اس طرح سے یہ حساب غلط ہو جائے گا مثلاً اس کا سال رجب میں ختم ہوتا تھا اور اس وقت اس کے پاس ایک ہزار روپیہ تھا جس کی زکوٰۃ پچیس روپیہ ہوتی ہے اور رمضان شریف میں اس کے پاس آٹھ سو روپیہ رہ گئے جس کی زکوٰۃ بیس روپیہ ہوتی ہے، تو اب اگر اس شخص نے اسی وقت کا نصاب دیکھ کر بیس روپیہ نکالے تو پانچ روپیہ اس کے ذمہ رہ گئے۔ اسی طرح اگر اس کا سال ذی الحجہ میں ختم ہوتا ہے اور رمضان میں اس کے پاس آٹھ سو روپیہ تھے مگر ذی الحجہ میں ہزار ہو گئے تب بھی بعینہ یہی غلطی ہوئی اسی طرح ہر ختم سال پر یہی احتمال ہے۔

سو فرض کیجئے اگر تدریج سے پانچ سال تک یہی قصہ رہا کہ ختم سال پر تو ہزار روپے ہوتے ہیں اور رمضان میں آٹھ سو روپے تو پانچ روپے سال تک ہوئے پانچ سال میں پچیس روپیہ اس کے ذمہ واجب الادا رہا، تو ایسا ہوگیا جیسے پانچ سال میں چار سال کی زکوٰۃ دی اور ایک سال کی نہ دی، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ختم سال پر نصاب کو ضرور دیکھا جاوے اور اس کی زکوٰۃ کی مقدار کو یاد رکھے۔ پھر اگر سال رمضان سے پہلے ختم ہوتا ہے، تو رمضان شریف میں اسی مقدار کے برابر خیال کر کے زکوٰۃ دے اور اگر رمضان کے بعد سال ختم ہوتا ہے تو رمضان میں جتنا اندازے سے دیا ہے اس کو یاد رکھیں، پھر ختم سال پر جتنی مقدار زکوٰۃ کی ہے اس ادا کی ہوئی کو اس سے ملا دے، اگر کچھ ادا کرنے سے رہ گیا ہو تو پورا کرے اور اگر زیادہ دے دیا ہو تو اگلے سال میں لگا لینا جائز ہے۔

زکوٰۃ کو صحیح مصرف پر نہ دینا

⑤ — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی زکوٰۃ نکال کر اس کے مصرف شرعی میں صرف نہیں کرتے مثلاً بعضے اپنے پیروں کو دیتے ہیں گو وہ صاحب نصاب ہوں بعضے مساجد کے ائمہ و مؤذنین کو ان کی تنخواہ کے حساب میں دیتے ہیں، بعضے چندہ مدارس میں

دیتے ہیں اور مہتمم کو اطلاع نہیں کرتے اور وہ اس کو تعمیر وغیرہ یا تنخواہ مدرسین یا خرید
کتب میں صرف کر دیتا ہے۔ بعضے مردہ کے کفن میں خرچ کر دیتے ہیں، ان سب صورتوں
میں زکوٰۃ سر پر رہتی ہے ادا نہیں ہوتی، اسی طرح سادات و بنی ہاشم، بلکہ ان کے غلاموں
کے مصرف نہیں ہیں اور جن کو دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ان کو اگر دینے کے وقت اطلاع
ہو جاوے کہ یہ زکوٰۃ ہے تو شامی نے بعض فقہاء سے نقل کیا ہے کہ ان کو لینا بھی حرام ہے
اور اگر ان قرائن سے معلوم ہو کہ دینے والے کو ان کا غیر مصرف ہونا معلوم نہیں تو اطلاع
کرنا واجب ہے، بلا اطلاع سکوت بالاتفاق حرام ہے اور اگر لے لیا تو صاحب نصاب
کو مکرر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

البتہ کفن میت میں اس طرح صرف ہو سکتا ہے کہ اس میت کے کسی غریب قریب
کو دے دیا جاوے پھر وہ اپنے اختیار اور رائے سے بلا اس کے کہ اس کو کوئی کسی طرح مجبور
کرے اس کو کفن لا کر اپنی طرف سے ڈال دے، اسی طرح امام و مؤذن کو ان کے مقرر کئے
ہوئے حق کے علاوہ اگر وہ مسکین ہوں تو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

اسی طرح مدرسہ میں دینے کے لئے شرط یہ ہے کہ مہتمم کو اطلاع کر دے ورنہ اگر
اس پر اطمینان ہو کہ یہ غیر مصرف میں صرف نہ کرے گا تو وہ مصرف میں صرف کر سکے
اور کر دے، مثلاً مستحق طلبہ کو دیدے کہ وہ اپنی خوراک پوشاک وغیرہ میں صرف کریں
ورنہ اگر اطلاع نہ ہوگی یا جیسا کہ وہ مسائل نہیں جانتا یا جانتا ہے مگر محتاط نہیں، تو ان
صورتوں میں چونکہ اطمینان نہیں کہ وہ مصرف میں صرف کرے گا، اس لئے ایسے شخص
کو دینا ہی جائز نہیں۔

غرض جس جگہ صرف کرنے سے کسی خاص شخص کی ملک نہ ہو وہ زکوٰۃ صحیح نہیں
جیسے عمارت یا فرش مسجد میں صرف کرنا یا کفن لے کر مردہ پر ڈال دینا، یا ملک تو ہو جاوے
مگر وہ شخص مصرف نہ ہو جیسے غنی یا بنی ہاشم، یا اس کی خدمت کی اجرت میں دیا جاوے
جیسا مدرسین کی تنخواہوں میں دینا، سب غیر مصرف ہیں زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اور دوبارہ دینا
پڑے گی، مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے چندۂ حجاز ریلوے میں زکوٰۃ دے دی ہے مگر

سوال کو رد زکوٰۃ در زبردہ دینا چاہیے۔

اور ملک و اتنی کے چندہ لگانے سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ بعض لوگ جو مدارس یا مساجد کے مصارف عامہ میں صرف کرنے کے لئے ایک حیلہ کیا کرتے ہیں کہ قبل کسی مسکین مصرفِ زکوٰۃ کو سمجھا دیا کہ ہم تم کو سو روپیہ دیں گے پھر تم مسجد یا مدرسہ میں دے دینا۔ اور پھر اس کو دیتے ہیں اور وہ مسجد وغیرہ میں دے دیتا ہے اور اس کو حیلۂ تملیک کہا جاتا ہے چونکہ یقینی بات ہے اس میں دینے والا حقیقۃً اس مسکین کو مالک نہیں بناتا محض صورت تملیک کی ہے اس لئے اس طور سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم مشکل ہے۔

اور ایک خرابی اس میں یہ ہے کہ وہ مجبور ہو کر پھر واپس کر دیتا ہے، تو وہ دینا اس کا بہ طیبِ خاطر نہیں ہوتا جو کہ حلتِ مال کی شرط ہے، غرض لینا دینا دونوں قواعد کے خلاف ہیں، بعضوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شرع تو ظاہر پر ہے تو خوب سمجھ لو کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باطن کی تفتیش مت کرو، لیکن اگر بلا تفتیش باطن کی اطلاع ہو کہ یہاں تملیک کی نیت نہیں اور طیب خاطر نہیں تو شرع نے یہ کب کہا ہے کہ اب بھی باطن کا اعتبار مت کرو؟ اگر یہ نہ ہوتا تو بعض حدیث جو حلت مال کے لئے طیبِ نفس شرط کیا گیا ہے جو کہ امرِ باطن ہے یہ بے معنی ہو جاتی۔

اگر کہیں ایسے ہی موقع پر زکوٰۃ سے امداد کرنے کی ضرورت ہو اس کی ایک اور تدبیر جو کہ بالکل قواعد کے مطابق ہے یہ ہے کہ کسی مسکین کو مشورہ دیا جاوے کہ تم دس روپیہ مثلاً کسی سے قرض لے کر فلاں سید کو دے دو، یا فلاں مسجد و مدرسہ میں دے دو، ہم تمہاری اعانت ادائے قرض میں کر دیں گے جب وہ مسکین وہاں دے دے تم اس مسکین کو دس روپے زکوٰۃ میں دے دو پھر اس سے اس کا قرض خود وصول کر لے گا اس میں مسکین کو دینا بھی حقیقۃً ہوا۔ اور اس مسکین پر صدقہ دینے میں جبر بھی نہ ہوا۔ کیوں کہ وہ آزاد ہے خواہ قبول کرے یا نہ کرے بخلاف حیلۂ تملیک کے کہ اگر وہ مسکین موافق تعلیم کے نہ دے تو کدورت بلکہ نزاع واقع ہو جاوے اور ہر چند کہ بعد مل جانے اس روپیہ کے قرض خواہ اس سے جبراً لے سکتا ہے مگر قرض تو حق واجب عبد کا ہے اور

اس میں جبر جائز ہے اور چونکہ وہ روپیہ حقیقۃً اس مستحق کا ہو گیا اس لئے اس کو جبراً اپنے قبضہ میں لے لینا سہل ہے۔ جیسے اس مسکین کے پاس خاص اس کا مملوک ہوتا اور اس کو جبراً لینا جائز تھا۔

زکوٰۃ سے دنیوی مقاصد کا حصول

(۶) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض آدمی زکوٰۃ سے دنیوی اغراض نکالنا چاہتے ہیں جو کہ خلوص کے خلاف ہے۔ مثلاً اپنے نوکروں کو زکوٰۃ اس خیال سے دیتے ہیں کہ یہ ہم سے زیادہ دبیں گے۔ اور کام خوب کریں گے اور اس میں کمی ہونے سے ان کو شکایت ہوتی ہے کہ دیکھو لوگ کیسے ہیں کہ اس کا تو ذرا نہیں مانا۔ بلکہ بعض تو زبان سے بھی جتلانے لگتے ہیں کہ نمک حرام تجھ کو تنخواہ دیتے ہیں اور زکوٰۃ سے بھی تیرا خیال رکھتے ہیں مگر تو ایسا احسان فراموش ہے وغیرہ ذلک گو ضابطہ سے یہ زکوٰۃ ذمہ سے ساقط ہو جاتی ہے لیکن حدیث لا یقبل اللہ الا الطیب کی رو سے یہ زکوٰۃ مقبول نہیں ہوتی، پھر ادائے زکوٰۃ دوسری کوتاہی والے بعض عذر بھی پیش کرتے ہیں۔

مثلاً یہ عذر کہ اگر ہر سال زکوٰۃ دیتے رہیں تو بعض مال تو تقریباً ختم ہو جاویں۔ مثلاً جس روپیہ سے ہم تجارت نہیں کرتے ویسے ہی رکھا ہے، یا زیور کہ تجارت کے کام ہی کا نہیں تو نشو ونما تو کچھ ہوگا نہیں اور ہر سال ایک جزو زکوٰۃ کا نکلا کرے گا تو یوں ہی فنا ہو جاوے گا جواب یہ ہے کہ روپیہ سے تجارت کرنے کو کس نے منع کیا ہے اب اگر خود نہ کرو تو شریعت اس کی ذمہ دار نہیں۔

اسی طرح چاندی، سونا، زیور کے لئے اصل میں موضوع نہیں ہے بلکہ اصل صنعت میں وہ ثمن ہے جو تجارت کے لئے مخلوق ہوا ہے، سو زیور تم نے خود اپنی خوشی سے بنایا ہے شریعت اس کی ذمہ دار نہیں ہے، جب تم چاہو اس سے سکہ بدل کر تجارت کر سکتے ہو اور بڑھا سکتے ہو جس سے وہ اپنی زکوٰۃ کا خود کفیل و متحمل ہو سکتا ہے۔

اور مثلاً یہ عذر کہ دوکان میں جب مختلف قسم کا مختلف قیمتوں کا مال موجود ہے

اس کا حساب کیسے ہو سکتا ہے؟ ..... اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تمہاری دوکان میں خرید و فروخت کا حساب لکھا جاتا ہے تو کاغذات سے حساب تیار ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو تخمینی تخمینہ کافی ہے، جو تخمینہ قرار پاوے احتیاط کے لئے کچھ اور بڑھا لو۔ مثلاً آٹھ سو روپے کا تخمینہ ہوا تو ہزار سمجھ لو، اتنے میں اتنا بڑھا لینے سے احتمال غلطی کا ہرگز نہ رہے گا اور زکوٰۃ میں کل پانچ روپیہ بڑھتے ہیں جو کچھ گراں نہیں اور اسی طرح گوٹہ ٹھپہ کا اور اسی طرح زیور کا جس میں دوسری چیز بھی مرکب ہے تخمینہ کافی ہے۔

اور مثلاً یہ عذر کہ صاحب ہمارا مال تو حلال نہیں ہے، حرام مال میں زکوٰۃ ہی نہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ مسئلہ غلط ہے حرام مال جب اپنے مال میں مل گیا وہ ملک میں داخل ہو گیا، گو ملک خبیث ہی ہو، اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ہونا شرط ہے طیب ہونا شرط نہیں، طیب ہونا مقبولیت کی شرط ہے سو زکوٰۃ واجب ہوگی، گو مقبول نہ ہوگی، پھر دینے سے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ نہ دینے سے جو عذاب ہوتا ہے اس سے محفوظ رہے اور قبول نہ ہونے سے عذاب نہیں ہوتا بلکہ ثواب سے محرومی رہتی ہے، تو کیا عذاب ہونا اور ثواب نہ ہونا دونوں ایک بات ہیں؟ البتہ خود کسب حرام کا جو عذاب ہے وہ الگ ہے اس کی نفی نہیں کی جاتی، لیکن نہ دینے سے دو عذاب کا مستحق ہوگا، کسب حرام کا الگ اور زکوٰۃ نہ دینے کا الگ اور اب ایک ہی ہوگا۔ تو کیا یہ دونوں بھی یکساں ہیں؟ ہرگز نہیں!

ردی چیزیں زکوٰۃ میں دینا

(۷) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ میں ایسی چیز دیتے ہیں جو ردی اور ناکارہ ہو مثلاً تاجر کتب ایسی کتاب دے جس کی نکاسی نہ ہوتی ہو اسی طرح تاجر پارچہ پرانے تھان نکالے اور تاجر غلہ کرم خوردہ غلہ نکالے وعلیٰ ہذا سو جس حساب میں اس نے یہ چیزیں لگائی ہیں اگر بازار میں اتنے کو نہ نکل سکے تب تو زکوٰۃ ہی ادا نہیں ہوئی۔ بقدر کمی قیمت اس کے ذمہ رہ گئی اور اگر اتنی قیمت کی ہے تو زکوٰۃ تو ادا ہو گئی مگر بقدر کمی خلوص کے مقبولیت میں کمی رہی۔

دعوت کے ذریعہ زکوٰۃ کا حکم

(۸) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ کے روپیہ یا غلہ کا کھانا پکوا کر مساکین کو دعوت میں کھلا دیتے ہیں سو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کھانا پکا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا جاوے کہ ان کو اختیار ہو لے جانے کا، یا بیٹھ کر کھا لینے کا اور ساتھ ہی ان کو اطلاع کر دی جاوے اور وہ کھانا قیمت میں اس قدر ہو تب تو زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی ورنہ اگر لے جانے کا اختیار نہ ہو بلکہ بٹھلا کر کھلا دیا جاوے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر پکا ہوا کھانا اس قیمت کا ہو جتنی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب تھی تب بھی پوری زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ مثلاً ایک شخص کو بیس روپے زکوٰۃ کے دینے ہیں اس نے جنس خرید کر پکوائی، کچھ خرچ میں صرف ہو، کچھ باورچی کو مزدوری دے دی۔ غرض بیس روپے صرف ہو گئے۔ مگر کسی وجہ سے خواہ جنس خریدنے میں پیسہ کم لگ گیا، مزدوری زیادہ دیدی یا کھانا بگڑ گیا۔ غرض کسی طور پر تیار کھانا بیس روپیہ کا نہ ہوا بلکہ سترہ اٹھارہ کا ہوا تو یوں نہ سمجھے کہ اس نے تو بیس ہی روپے خرچ کئے اس لئے زکوٰۃ ادا ہو جانا چاہیے، بلکہ یوں سمجھے کہ مساکین کو سترہ، اٹھارہ ہی روپیہ کی چیز پہنچی اس لئے اتنی ہی زکوٰۃ ادا ہوئی، دو یا تین روپے اور اس کے ذمے باقی رہے جن کا ادا کرنا واجب ہے، اسی طرح زکوٰۃ کی رقم کا کپڑا خرید اور سلوایا اگر بعد تیاری کے اتنی رقم کا ہے تب تو اس کے دینے سے زکوٰۃ ادا ہوگی اور اگر کسی وجہ سے قیمت اس کی گھٹ گئی مثلاً کپڑا ناواقفی سے گراں ملا، سلوانے میں بگڑ گیا تو بقدر گھٹنے کے اور زکوٰۃ دینی پڑے گی ...۔

(۹) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی دیکھتے ہیں کہ ہم کو پانچ روپیہ زکوٰۃ کے دینے ہیں اور فلاں غریب آدمی کے ذمہ کسی سبب سے ہمارا قرضہ بھی پانچ روپیہ ہے لاؤ اس کو زکوٰۃ کی نیت سے معاف کر دیں، سو یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی کیونکہ زکوٰۃ میں تملیک کا شرط ہے اور ابراء میں وجہ اسقاط اور ہبہ میں وجہ تملیک ہے اس لئے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

البتہ ایک تدبیر ضرور جائز ہے وہ یہ کہ اول یہ پانچ روپیہ اس شخص کو بہ نیت زکوٰۃ دیدے جب وہ اس روپیہ کا مالک و قابض ہو جاوے اس سے اپنا قرضہ مانگے اور اگر وہ نہ دے تو جبراً چھین لینا بھی جائز ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔

احتیاط

(۱) — اگر کوئی پہلے زکوٰۃ دینے کا فکر نہ ہوا اور اب توفیق ہو تو گذشتہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، البتہ اگر درمیان میں بدون تلف کئے ہوئے مال خود تلف ہو کر نصاب سے کم رہ گیا ہو تو اس وقت کی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔

(۲) — اگر زکوٰۃ کی نیت سے مال نکال رکھا ہو اور وہ ضائع ہو جاوے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، اور بعد زکوٰۃ نکال کر رکھنے سے صرف اتنا فائدہ ہے کہ پھر دینے کے وقت نیت ضروری نہیں ہوتی۔

الحاق

صدقہ فطر اور چرم قربانی

چونکہ صدقہ فطر کا ادا کرنا اور قیمت چرم قربانی کا بعد فروخت کر ڈالنے چرم قربانی کے تصدق کرنا بھی واجب ہے، اس لئے وہ بھی اس حیثیت سے ملحق بالزکوٰۃ ہے اس لئے اس کے متعلق بھی بعض کوتاہیاں زکوٰۃ کے ساتھ بیان کرنا مناسب معلوم ہوا۔

● ایک کوتاہی صدقہ فطر کے متعلق بعض دیہات میں یہ ہے کہ اس کو جانتے ہی نہیں اس لئے ادا نہیں کرتے۔ اہل علم و واعظین کو چاہئے کہ جمعہ کے خطبہ میں یا کسی موقع پر خود دیہات میں جا کر اس جگہ پر آگاہ کریں۔

● ایک کوتاہی اس کے متعلق یہ ہے کہ غیر مصرف میں صرف کر دیتے ہیں اس کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے جن مصارف میں صرف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ جن کا اوپر بیان

کیا گیا ہے ان میں صرف کرنے سے صدقۂ فطر بھی ادا نہیں ہوتا۔

ایک غلطی بنا بر قول حنفیہ کے اس میں یہ ہے کہ یہ مشہور ہو گیا ہے کہ صدقۂ فطر اگر گیہوں کے اور کسی غلہ سے ادا کرے تو گیہوں کے مضاعف وزن میں دیوے۔ اس میں دو غلطیاں ہیں ایک یہ کہ بہت چیزوں میں گیہوں کا مضاعف نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ جو چیزیں منصوص ہیں جیسے جو، تمر مثلاً اس میں تو گیہوں کا مضاعف ہے اور جو چیزیں منصوص نہیں جیسے چنا، چاول اس میں یہ حکم ہے کہ کسی منصوص چیز کی برابر قیمت میں ہو مثلاً گیہوں نصف صاع یعنی احتیاطاً دو سیر دیئے جاتے ہیں اور یہ دو سیر کے نرخ سے ڈھائی آنہ کے ہوتے۔ تو اگر چنا دینا چاہے تو ڈھائی آنے کے جس قدر چنے آتے ہوں اتنے چنے دینے چاہئیں۔ اسی طرح چاول بھی۔ اور مطلقاً مضاعف دینے میں تو کبھی تو واجب سے زیادہ دیئے جاویں گے تو مضائقہ نہیں، لیکن اگر کبھی کم کر دیئے گئے تو واجب کا ایک جزو اس کے ذمہ رہ جاوے گا۔ مثلاً اگر کبھی گیہوں آٹھ سیر کے اور چنے چوبیس سیر تو مسئلہ مذکور کی بنا پر چھ سیر چنے واجب ہوں گے اور مشہور خیال کے حساب سے یہ شخص چار سیر دے گا تو ایک ثلث واجب اس کے ذمہ رہا۔

اور قیمت چرم قربانی کے متعلق بھی ایک عام غلطی وہی غیر مصرف میں صرف کرنا ہے (الفاظ سابق بیان کی ہے) یعنی جس قدر صدقہ نیز یا قیمت چرم غلطی سے ادا نہیں ہوئی اس کا اعادہ ضروری ہے اور اگر الگ کر رکھنے کے بعد ضائع ہو جاوے پھر ادا کرنا ہوگا۔

حج کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ حج)

منجملہ ارکان اسلام کے ایک فریضہ حج ہے جو بہ نسبت دوسرے ارکان کے اپنی ایک خاص شان کی وجہ سے زیادہ اہتمام کے قابل ہے وہ شان خاص ...... یہ ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے جس قدر سامان درکار ہے اس کا ہر وقت میسر و مجتمع ہونا، گو پورا اختیاری نہیں اور اس میں موانع کا پیش آجانا اچانک مستبعد نہیں، نیز مال بھی زیادہ چاہئے اور بہت وقت بھی زیادہ چاہئے وقت و فراغ بھی زیادہ چاہئے۔

اگر ایک سال تساہل کیا آئندہ سال تک اور پھر مذکورہ میں کوئی یا بعض تغیر ہو جانا زیادہ بعید نہیں، یہ مجموعی شان دوسرے ارکان میں نہیں اسی واسطے احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی حج کرنا چاہے وہ بہت جلدی کرے اور عجب نہیں کہ اسی شان خاص کے سبب یہ عمر بھر میں ایک ہی بار فرض کیا گیا ہے، ورنہ گو اہل مکہ اور اس کے قریب وجوار والوں کے لئے یہ اشکال نہیں۔ مگر بمقابلہ آفاقیوں کے ان کی مقدار ہی کیا ہے؟ قواعد انتظامیہ میں اکثر حالات پر مبنی ہوا کرتے ہیں اور چونکہ اس میں افعال بھی کثیر و متعدد و مختلف ہیں اور متعلق

ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کے ساتھ اور اس اعتبار سے بھی یہ دوسرے ارکان سے مختلف ہے اس لئے اس کے احکام و مسائل بھی لوگوں کو کم معلوم ہیں اور ان کا چرچا بھی کم ہے امر اول کے سبب اس میں عملی کوتاہی زیادہ واقع ہوتی ہے اور امر ثانی کے سبب علمی کوتاہی زیادہ ہوتی ہے۔

عملی کوتاہی تو یہ ہے کہ اس کے ادا میں لوگ سستی بہت کرتے ہیں کبھی ضروریات و خیالی تعلقات سے فارغ ہونے کے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام سے فارغ ہو کر چلیں گے، پھر اس کام کے بعد دوسرے کام کا اسی طرح انتظار رہتا ہے۔ حالانکہ یہ سلسلہ عمر بھر منقطع نہیں ہوتا۔ بقول شاعر ؎

لا یستحو الارب الا الی ارب

و بقول شاعر ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

اس کا علاج یہی ہے کہ بیچ ہی میں سارے کام چھوڑ کر اور ظاہراً سرسری طور پر ان کا انتظام کر کے اور باطناً خدا کے حوالے کر کے چل کھڑا ہو، اور اس علاج کی ہمت باندھنے کے لئے ان وعیدوں کو یاد کرے جو باوجود فرضیت کے اس کے ترک پر آئی ہیں یا قرآن مجید میں ایسے ترک حج کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے، اور حدیث شریف میں یہودیت و نصرانیت کی حالت پر موت آجانے کی برابر بتلایا ہے اس سے زیادہ کیا وعید ہوگی ؟ ؟

اگر فکر تعلقات زیادہ مشوش کرے تو یوں سوچے کہ اگر میں ابھی مر جاؤں تو اس تمام کارخانہ کا کیا انتظام ہو ؟ تو سفر کرنا موت سے تو بڑھ کر نہیں، اس وقت ہمیشہ کے لئے ان سب کو چھوڑ دینا اب تھوڑے روز کے لئے چھوڑنے پر دل کو سمجھا لے اپنے دل کو سمجھا لینا بھی کیا مشکل ہے ؟ اور وہ بھی بہتم بالشان ضرورت کے لئے !

اور علمی کوتاہیاں بکثرت ہیں مگر بعض تو معین موقع کے متعلق ہیں ان کا تو نام کر پہلے سے سمجھنا اور یاد رکھنا دونوں تکلف سے خالی نہیں، ان کی تدبیر بجز اس کے کچھ نہیں کہ داب

پہنچ کر معلوم ہو ایسے شخص کو مقرر کیا جاوے جو احکامِ حج سے پورا آگاہ ہو اور اپنے تدین کی وجہ سے اپنے عمل سے افعالِ حج کو پورا بتلا دے اور مطلع کر دیوے ۔ بہت سے لوگ مطوفین کو بھی دنیوی آسائش کے لئے مقرر کرتے ہیں ، دنیوی حوائج تو کسی نہ کسی طرح پورے ہو ہی جاتے ہیں ۔ زیادہ ضرورت تو دینی حاجت کے انتظام کی ہے ۔ سو جب حج کو جانے لگے جو عوام حج کر آتے ہیں اول ان سے دو چار ضروری معلومات مشورہ کرے ورنہ ناواقفی سے بعض ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں کہ حج بھی فاسد یا کالفاسد ہو جاتا ہے ۔

اور چونکہ عوام کو کسی ہر وقت مسائلِ حج کے مستحضر نہیں رہتے اس لئے ان کے لئے بھی مناسب ہے کہ مناسک کے معتبر رسالے خواہ کسی زبان میں ہوں سفر میں ہمراہ رکھے اور ان کا مطالعہ کرتے رہیں ۔ اور پھر بھی جہاں اشتباہ واقع ہو وہاں کے علماءِ دین سے پوچھ لیں کہ ان کو یہ احکام زیادہ مستحضر رہتے ہیں اور پوچھنے میں عار نہ کریں اور دوسروں کو اس وقت تک دین جب پورا اطمینان ہو اور خود وہاں کے علماء سے نہ پوچھ سکیں اور جو ان کی زبان نہ سمجھے وہ بذریعہ معتمد یا اپنے ہم وطن بھائی کے جو وہاں مدت سے مقیم ہو اور ترجمہ کر سکے دریافت کرلے یہ تو بیان متعلق علمی کوتاہیوں کے تھا جن کا عین موقع پر صدور ہوتا ہے ۔ بعض علمی کوتاہیاں وہ ہیں جن کا صدور قبل سفر ہوتا ہے اور بعض ان میں باوجود مشروع اس سفر سے مانع ہو جاتی ہیں اور بعضے باوجود غیر مشروع اس سفر کے باعث ہو جاتے ہیں چنانچہ ہر ایک میں غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے ۔

حج کے لئے سفرِ مدینہ ضروری نہیں

❊ —— سو ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ سفرِ حج کا اس وقت فرض سمجھتے ہیں جب مدینہ منورہ کے سفر کے لئے بھی وسعت ہو ، اور اگر یہ حیثیت ہو کہ صرف حج کر سکتے ہیں مدینہ طیبہ نہیں جا سکتے ، تو یہ لوگ اس حالت میں حج کو فرض نہیں سمجھتے ۔

سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سخت غلطی ہے ، مدینہ طیبہ کا سفر ایک مستقل طاعت ہے ، واجب ہو یا مستحب علی اختلاف الاقوال ، خواہ روضۂ منورہ کے قصد سے جیسا کہ جمہور کا

قول منصور ہے یا صرف مسجد نبوی کے قصد سے جیسا کہ بعض قائل ہوئے ہیں ، اور یہ مقام اس مسئلہ کی تحقیق کا نہیں ہے ، "نشر الطیب" کی ستائیسویں فصل کے آخر میں بقدر ضرورت اس کو لکھ دیا گیا ہے)

پھر وہاں سفر مدینہ کی استطاعت پر فرضیت حج کی موقوف نہیں ہے ، اگر صرف سفر حج کی استطاعت رکھتا ہوا ور سفر مدینہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کے ذمہ حج فرض ہے اگر نہ کرے گا تو تمام ان وعیدوں کا مورد ہوگا جو ترک حج پر آئی ہیں ، باقی حج کے بعد اگر کچھ سامان سفر مدینہ کا ہو جاوے گا یا پیادہ چلنے کی ہمت ہو جاوے جیسا شوق کے غلبہ میں ایسا ہو جاتا ہے ، تو اس شرف کو بھی حاصل کرے ، ورنہ مجبوری سے واپس آجائے اور عزم رکھے کہ خدا تعالیٰ توفیق دے گا تو مستقل سفر مدینہ کا کرلوں گا اور جب سامان ہو جاوے ایسا کرے بھی ۔ اور اگر عمر بھر بھی سامان نہ ہوا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس تمنا وعزم کا اجر بھی اس سفر مبارک کے اجر کے قریب قریب ہی ہوگا ، جیسا کہ چند حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فعل خیر کی نیت بھی اجر میں مثل نفس اس خیر ہی کے ہے ۔

ــــ اور ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض اوقات اس شخص کے پاس مال حرام اس مقدار میں جمع ہو جاتا ہے کہ حج کو کافی ہو ، مگر یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو مال حرام ہے اس کا حج میں صرف کرنا اور بھی زیادہ برا ہے اور مال حلال میرے پاس اس قدر ہے نہیں اس لئے میرے ذمہ حج فرض نہیں ، اور یہی خیال بعض لوگوں کا زکوٰۃ میں بھی ہے پس یہ لوگ نہ حج کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں ،

سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مدار فرضیت حج وزکوٰۃ کا خاص مقدار مال کا مالک ہونا ہے اس کے حلال ہونے کو فرضیت میں دخل نہیں ، اس لئے ایسے شخص کے ذمہ حج اور زکوٰۃ دونوں فرض ہیں ، البتہ حرام مال سے جو حج ہوگا وہ مقبول نہ ہوگا ، لیکن فرض ادا ہو جاوے گا ۔ یعنی اس شخص پر مواخذہ نہ ہوگا کہ حج کیوں نہیں کیا ، گو یہ مواخذہ ہوگا کہ مال حرام کیوں جمع کیا ؟ اور اس سے کیوں منتفع ہوئے ؟ سو ادا ہو جانا اور چیز ہے اور قبول ہونا دوسری چیز ، گو قبول ہونا بھی چاہیئے ہے اور بجز اس مال حرام کے اس کے پاس اور کچھ

نہ ہو تو ایسا کرے کہ کسی کافر سے قرض لے کر اس کو حج کے لئے الگ رکھے، پھر خواہ وہ قرضہ لگتے ہی دن خواہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس مالِ حرام سے ادا کر دے۔ تو یہ روپیہ قرض لیا ہوا اس کی نسبت غنیمت ہوگا، اور بعضے جو کہا کرتے ہیں کہ دوسرے کے روپیہ سے بدل لے سو اگر ہاتھوں ہاتھ بدلا تو وہ بدلے کا روپیہ بھی ایسا ہی حرام ہو جاوے گا جیسا اصل کے پاس کا روپیہ تھا، دست بدست لینے کا اور حکم ہے اور قرض لے کر پھر ادا کرنے کا اور حکم ہے۔ اور اس تدبیر کا بتلانے کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ مال حرام جمع کرنے کی اجازت دی جاتی ہے یا ایسا کرنے کے بعد مالِ حرام جمع کرنے کا گناہ اتر گیا یا اس کے تدارک کی شرعاً ضرورت نہ رہی، حاشا وکلا ہرگز یہ مطلب نہیں حرام مال لینے کا جو گناہ ہے وہ اب بھی باقی ہے اور اس کا تدارک اب بھی واجب ہے یعنی جن لوگوں کا وہ حق ہے ان کو واپس کرنا جس کا حق تھا اس کے ورثہ کو دینا اور جہاں معلوم نہ ہو اس قدر مال ان مستحقین کی طرف سے مساکین کو دے دینا اور سب کے ساتھ توبہ و استغفار کرنا اور اگر بالفعل تدارک پر قادر نہ ہو تو اس کی فکر میں رہنا اور جتنی جتنی گنجائش ہوتی جائے تھوڑا تھوڑا ادا کرتے رہنا یہ سب واجب ہے۔

غرض اس حیلے سے حرام و حلال کے احکام نہیں بدل گئے یا نفع نہیں ہو گئے مقصود اس سے اس امر پر متنبہ کرنا ہے کہ یہ لوگ جو حج وزکوٰۃ اپنے ذمہ فرض نہیں سمجھتے یہ ان کی غلطی ہے۔

یہ دو علمی غلطیاں تو وہ ہیں جن میں حج کے امر فرض کی ممانعت کی جاتی ہے۔

بھیک مانگ کر حج کرنا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ جن کے پاس نہ تو حج کا سامان ہے اور نہ قلب میں غنا اور قوت توکل ہے مگر لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر ان کو پریشان کر کے حج کو جاتے ہیں سو اس طرح حج کو جانا حرام ہے۔

بغیر محرم کے حج کرنا

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی یہ ہے کہ باوجود شوہر یا محرم کے ہمراہ نہ ہونے کے پھر حج کو جاتی ہیں اور گو بعض ائمہ کی قول پر بعض خاص قیود و شروط کے ساتھ اس کی گنجائش ہے لیکن اوّل تو عوام کو ایسی بے قیدی کی اجازت نہیں کہ جس وقت جس کا قول دل چاہا لے لیا دوسرے جانے والیاں ان قیود و شرائط کو نہ جانتی ہیں، نہ ان کی پرواہ کرتی ہیں۔ ہر حال میں چلی جاتی ہیں جو کہ ان ائمہ کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

تیسرے اس وقت اتنا فساد نہ تھا اور عورتوں کے ساتھ امن غالب تھا اور اس زمانہ میں فساد اس قدر غالب ہے کہ عورتوں کے ہوتے ہوئے بھی شریر طبیعتیں شرارت سے نہیں چوکتیں پھر تعاون و ہمدردی کم ہوتی جاتی ہے اگر بیماری وغیرہ پیش آ گئی تو کم عورتوں سے امید ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر ان کی امداد کریں اکثر لوگوں کو خصوصاً ضعفاء و نسوان کو نفسی نفسی میں مشغول دیکھا ہے تو بوجہ مجبوری مرد ہی امداد کریں گے تو لامحالہ اثر دھے میں پڑ جانے میں اجنبی مرد اس کا ہاتھ بھی پکڑیں گے کمر بھی تھامیں گے تو ایسے وقت فتن سے محفوظ رہنا جانبین کا یا ایک ہی جانب کا مشکل ہے خاص کر قلب اور عین کا فتنہ سے تو ایسے حج کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب شریعت اس کو حاضر ہونے کا حکم نہیں کرتی بلکہ روکتی ہے تو پھر یہ کیوں معصیت میں پڑتی ہے؟ اگر اس عورت کو مالی استطاعت ہو اور محرم و شوہر موجود نہ ہو یا جانے پر آمادہ نہ ہو کیوں کہ اس کو شرعاً اس کا اختیار حاصل ہے تو اس میں مذہب مختلف ہیں کہ آیا استطاعت مال سے نفس وجوب حج کا اس کے ذمہ ہو گیا ہے یا نفس وجوب بھی نہیں ہوا پہلے قول پر اس عورت کے ذمہ حج بدل کی وصیت کرنا واجب ہو گا۔ اور دوسرے قول پر نہیں لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ وصیت کی جائے اگر یہ وسوسہ ہو کہ اگر وصیت نافذ نہ کی گئی تو حج سے کیسے ذمہ رہے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ لیکن گناہ گار نہ ہوگی کیونکہ اس نے اپنے ذمہ کے واجب کو یعنی وصیت کو ادا کر دیا اب نفاذ اس کا جبکہ مال چھوڑ جائے ورثہ کی ذمہ واجب ہے اگر وہ کوتاہی کریں گے اس کا مواخذہ ان سے ہوگا۔

یہ کوتاہیاں علمی وہ ہیں جن پر نظر التفات سے بھی شرعی کی ممانعت کی جاتی ہے۔ دو
ستیجے اور ہر ایک عملی کوتاہی تھی یہ سب پانچ کوتاہیاں ہوئیں، جو نفس الحج کے متعلق ہیں علاوہ ان غلطیوں کے جو
نفس حج میں ہوتی ہیں جن پر مطلع ہونا بالتحقیق مطالعہ کرنے کا یا علماء کو کتب مناسک مطالعہ کر دینے گی۔ دو
کوتاہیاں حج سے خارج مگر اسی سفر سے متعلق یاد آگئیں جن پر پانچ مل کر یہ سب سات ہو جاویں گی۔

ایک کوتاہی یہ کہ بعض لوگ حج کو جاتے ہیں اور ریل میں یا جہاز میں یا اونٹ پر فرض نمازیں برباد کرتے ہیں سو انہوں نے ایک فرض تو ادا کیا اور راستے میں کثیر فرض فوت کیے اور اگر حج فرض نہیں تھا نفل تھا تو اور بھی غضب ہوگا ایک نفل کے لیے اتنے فرض گنوا دیے سو ایسے شخص کو حج کرنا جائز بھی نہیں۔

ایک کوتاہی جو باعتبار تعدیہ ضرر کے سب سے اشنع و اقبح ہے یہ کہ بعض لوگ حج کرکے آتے ہیں اور وہاں کے مصائب اور مصائب اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا حج کو جانے سے ڈر جاتا ہے ایسے شخص کے یصدون عن سبیل اللہ (یہ لوگ اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں) کے مصداق ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اور اگر وہ شکایات غیر واقعی ہوں چنانچہ اکثر یوں ہی ہوتا ہے کہ بات بہت بڑھا کر کہا جاتا ہے ورنہ اس مصیبت کی بنا اور کو ضروری ہی غلط ظاہر کیا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر ایسے واقعات کا سبب اپنی حماقت ہوتی ہے تو اپنی حماقت کون بیان کرتا ہے؟ تو اس طور پر وہ شکایات یا ان کے بعض اجزاء غیر واقعی ہوتے ہیں تو اگر ایسا ہو تو یہ لوگ یصدون عن سبیل اللہ کے ساتھ ویبغونہا عوجا کے بھی مصداق ہوں گے اور چونکہ باوجود علم واقعہ کے غصہ میں ایسا کرتے ہیں اس لیے جملہ وانتم شہداء کے بھی یہ مخاطب ہوں گے اور اس کے جواب میں ان کو بھی وہی کہا جاوے گا۔ وما اللہ بغافل عما تعملون۔

اور عجیب لطیفہ یہ ہے کہ یہ آیت جس کے جملے اس حالت آخرہ کی تقریر میں جا بجا نقل کیے گئے ہیں قرآن مجید میں بھی بعد ذکر حج کے متصل وارد ہے اور مجھ کو بھی حج ہی کے اس خاص مضمون کے ساتھ یاد آئی تو قرآن مجید میں یہ اتصال میرے اس استدلال کا ایک خاص لطافت کے ساتھ مؤید ہو گیا اگر مصائب واقعی بھی ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ

یہ سفر عشق۔ جب محبوب کے دربار میں حاضری دینے کے لئے تو سفر عشق میں خار بھی گل اور زاغ و زغن بھی بلبل معلوم ہونا چاہیئے و نعم ما قیل ؎

ای دل آن بہ کہ خراب از مے گلگون باشی
بی زر و گنج بصد حشمت قارون باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان
شرط اول قدم آن است کہ مجنون باشی

وصلی اللّٰہ علیٰ سید المرسلین الذی
جاء بدین الحق لدار الآخرت

قربانی سے متعلق کوتاہیاں

(متعلق معاملہ قربانی)

جس طرح ملحقات زکوٰۃ میں سے صدقۂ فطر ہے جس کے متعلق پہلے بقدر ضرورت عرض کیا جا چکا ہے، اسی طرح اس کے ملحقات میں سے قربانی کی بھی ہے انتخاب کے اثر میں شامل مگر اعمال دینیہ کے یہ بھی شریک اور اس حیثیت سے واجب الاصلاح ہے۔

اس باب میں ایک کوتاہی جو اس متعلقات سے پیدا ہوتی ہے کہ بعض لوگ باوجود وسعت اور وجوب کے قربانی نہیں کرتے بلکہ بعض خاندانوں میں کئی پشت سے قربانی نہیں ہوئی، بلکہ بعض دیہات کے لوگ اس کو جانتے تک بھی نہیں۔ بعضے سستی و بے پروائی کے سبب نہیں کرتے۔ بعض بخل کے سبب کوتاہی کرتے ہیں۔

پس اگر سبب اس کا ناواقفی و بے خبری ہے تو اس کی اصلاح یہ ہے کہ ان کو اس کے وجوب سے اور ترک پر جو وعید ہے جیسا ابن ماجہ میں حدیث مرفوع ہے من وجد سعة ولم یضح فلا یقربن مصلانا (یعنی جس کے شخص کے پاس قربانی کرنے کی گنجائش ہو اور پھر بھی وہ قربانی نہ کرے تو ایسا شخص ہرگز ہماری عیدگاہ میں نہ آئے) اس

پر ان کو اطلاع دی جائے بالخصوص واعظین وخطباء یا ان اہل علم کو جو دیہات میں وعظ و تبلیغ کی غرض سے جاتے ہیں، ضرورت ہے کہ وہ دیہات کے لوگوں کو جب کہ وہ جمعہ میں حاضر یا خود دیہات میں جاتے ہیں اس کے وجوب پر بلکہ اس کے متعلق ــــ احکام پر بھی آگاہ کر دیں۔

بعض باوجود اس قدر وسعت کے جس پر قربانی واجب ہوتی ہے اپنے ذہن میں اسے اس لئے سبکدوش سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کو اس وسعت کی مقدار معلوم نہیں، تو ان کو اس سے آگاہ کیا جائے کہ جس کے پاس حوائج ضروریہ سے زائد تخمیناً پچاس روپیہ نقد یا مال تجارت یا زیور یا جائیداد ومکانات علاوہ مکان سکونت وکفایت معاش مثلاً ہو کے موجود ہو، بس اتنی وسعت پر قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت البتہ بچوں پر یا بچوں کی طرف سے واجب نہیں۔

اور اگر بے پروائی اس کا سبب ہے تو ان لوگوں کو غور کرنا چاہئے کہ دنیا کی جلب منافع ودفع مضار کے لئے اگرچہ وہ درجہ ضرورت میں نہ ہوں اور اگرچہ وہ موہوم بھی ہوں، کس قدر روپیہ موقع بے موقع بلکہ ہر روز ہی خرچ کیا کرتے ہیں اور پھر وہ فانی تو کیا آخرت کے اتنے بڑے ثواب کی تحصیل کے لئے کہ اس سے زیادہ کوئی منفعت نہیں اور اتنے بڑے گناہ و عذاب سے بچنے کے لئے کہ اس سے بڑھ کر کوئی مضرت نہیں اور پھر دونوں یقینی اور باقی اور ضروری ان رعایت بے پروائی اور سستی کی جائے کتنی بڑی نادانی ہے۔

اور اگر سبب اس کا بخل ہے تو فوری علاج تو اس کا ان ہی منافع و مضار کا استحضار ہے جس کا ابھی بیان ہوا اور باقاعدہ علاج اس کا یہ ہے کہ مادہ بخل کا استیصال کیا جائے جس کی تدبیریں کتب فن میں ملیں گے۔

قربانی کے عبادت ہونے میں شبہ

بعض لوگوں کو اس سے بڑھ کر ایک سبب ترک کا ہو گیا ہے کہ وہ اس کے عبادت ہونے میں شبہ کرتے ہیں بالخصوص حج کی قربانی کو بوجہ کثرت ذبائح محض اضاعت مال ہی سمجھتے ہیں ان کی صلاح یہ ہے کہ وہ علماء محققین سے اپنی تسلی مفصل شبہات

پیش کر کے کریں۔

مجمل یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت امتثال امر الٰہی ہے جب اس کا مامور بہ ہونا ثابت ہے پھر عبادت ہونے میں کیا شک ہے۔

رہا یہ سوال کہ امر الٰہی کس حکمت سے ہوا گو ایسے سوالات کے جوابات میں اس وقت خاص دلچسپی سے کام لیا جاتا ہے، مگر سچا جواب یہ ہے کہ یہ سوال ہم سے پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہم بانی قانون نہیں جو قانون کی لم جاننے کے مدعی ہوں ہم ناقل و حاکی قانون ہیں جب واضع قانون کے روبرو کھڑے کئے جائیں گے اگر ہمت ہوئی پوچھ لینا پھر جو جواب ان کے نزدیک مصلحت ہوگا عنایت کر دیں گے خواہ تقریر و مقال سے، خواہ تعذیر و نکال سے۔

دفعات قوانین کی علل وکلاء یا مجسٹریٹ و جج سے پوچھنا سخت نادانی ہے۔ اگر کوئی پوچھے بھی ان کو یہ جواب دینے کا حق ہے کہ واضعان قانون سے پوچھو ہم اس کے ذمہ دار نہیں تو علماء ایسے سائلوں کو ایسا جواب کیوں نہیں دے سکتے اور جب دے سکتے ہیں تو کیوں نہیں دیتے؟ کیوں سائل کی بے محل فرمائش کا اتباع کرتے ہیں؟

اسی طرح اضاعت مال کے شبہ کا جواب ہے کہ اضاعت اس وقت ہوتی ہے جب اس میں کوئی فائدہ نہ ہوتا اور جب فائدہ اس میں رضائے حق ہے جس کا مقابلہ کوئی فائدہ نہیں کر سکتا تو اضاعت کیسے ہوئی؟

سستی قربانی کی تلاش

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض وسعت والے قربانی تو کرتے ہیں لیکن بڑی کوشش اس کی ہوتی ہے کہ کوئی حصہ سستا مل جائے گو اس میں کچھ عیب بھی ہو مگر ایسا نہ ہو جو مانع جواز قربانی ہو اور وجہ اس کی دو ہیں۔ ایک بخل جس کا علاج اوپر گذر چکا ہے اور دوسرے یہ خیال غیر واقعی کہ قیمت کے بڑھنے سے یا مال کے عمدہ ہونے سے ثواب میں زیادتی نہ ہوگی جبکہ ایک حصہ میں جس قدر ثواب ہوتا ہے وہ قانون حال میں برابر ہوگا اگر زیادتی بھی ہوئی

تو ہم زیادتی کو کیا کریں گے؟ پس اتنا ہی کافی ہے کہ برأت ذمہ حاصل ہو جاتی ہے اس کی اصلاح یہ ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس قدر مال عمدہ ہو گا یا قیمت زیادہ ہوگی ثواب زیادہ ملے گا لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنے محبوب اموال میں سے خرچ نہ کرو)

یعنی :-

اور وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۔ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت خراب مال دینے کا قصد نہ کرو کہ اس سے خرچ کرو اور جب کبھی لینے کا موقع ہو تو تم اسے لینے والے نہیں ہو الّا یہ کہ چشم پوشی سے کام لو) اور حدیث عظموا ضحایاکم (اپنے قربانی کے جانوروں کو فربہ کرو) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ ایک بختی ذبح کی تھی جس کے تین سو دینار ان کو ملتے تھے (رواہ فی التفسیر المظہری) یہ سب دلائل واضح ہیں اس دعویٰ کے ۔

اور یہ خیال کہ ہم زیادتی کو کیا کریں گے؟ صرف برأت ذمہ کافی ہے ، اس کا محل وہاں ہو سکتا ہے جہاں صرف مواخذہ سے بچنا ہو اور اس حاکم سے کوئی خاص تعلق نہ ہو خاص تعلق پیدا کرنا مقصود ہو ، کیا حق جل و علا شانہ کے متعلقات کے وجود یا مطلوبیت حصول کا کسی کو انکار ہو سکتا ہے ، اگر نہیں ہو سکتا تو اس خیال کی گنجائش کہاں رہی ؟

حقوق العباد چھوڑ کر قربانی کرنا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ محض نادہندہ ہیں یا وغیرہ سے زیادہ ان کے ذمہ حقوق العباد ہیں جن کا ادا کرنا فرض مقدم ہے مگر یہ لوگ ان سب حقوق کو نظر انداز اور پشت انداز کر کے محض فخر اور رسم قدیم نبھانے کے لئے قربانی کی پابندی کرتے ہیں اور پاس نہیں ہوتا تو ادھار کرتے ہیں ۔

بعض کو دیکھا ہے کہ متعدد حصص مردوں تک کے کرتے ہیں اور زندوں کے واجب حقوق کو مردہ کرتے ہیں حالانکہ یقینی بات ہے کہ دس روپیہ قرض میں ادا کرنا اس سے بہتر

مثل زکوٰۃ ہوتا ہے، یا کہیں منی آرڈر کرنے بھیجنے کی صورت میں اسی میں سے فیس ادا کرنا وغیرہ
تو الغرض ان سب کی اصلاح مسائل فقہیہ کی تحقیق کرکے ان کے موافق عمل کرنا چاہیے۔

بعض دوسری مالی عبادتوں میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بعض طاعات مالیہ)

مثل وقف کفارہ یمین، نذر، فدیہ صوم، نماز، روزہ، صدقہ نافلہ وغیرہ، جس طرح زکوٰۃ
کے متعلقات میں سے صدقہ فطر و قربانی ہے جن کے متعلق اس کے قبل بیان ہو چکا ہے اسی
طرح اس کے متعلقات میں سے دوسری بعض طاعات مالیہ بھی حقوق اللہ میں سے ہیں جن کی
بعض کا نام سرخی بالا کے ضمن میں ہے ترمذی کی حدیث مرفوع ان فی المال لحقا سوی
الزکوٰۃ۔ یعنی بلاشبہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کچھ حق ہے، کے عموم میں یہ سب داخل
ہیں اور چونکہ ایسی طاعات میں زکوٰۃ راس و رئیس ہے اور اسی وجہ سے ان سب میں اسی کی
مثل نماز کے ارکان اسلام سے ہے، اور باقی سب اس کے بعد کے درجہ میں اسی بنا پر ان سب
کو اس کے متعلقات میں سے کہہ دیا گیا، ورنہ یہ مقصود نہیں ہے، اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ زکوٰۃ
فرض ہے اور دوسرے تطوع، یا یہ کہ جس کے ذمہ زکوٰۃ نہ ہو اس کے ذمہ دوسرے حقوق مذکورہ
میں سے کچھ نہ ہوگا، یہ دونوں سمجھ غلط ہیں۔ واقفان احکام جانتے ہیں کہ صدقہ فطر، قربانی، کفارہ
یمین، ایفاء نذر، فدیہ، صوم وصلوٰۃ کا بھی واجب ہے، گو وقف صدقہ نافلہ واجب نہیں

اور اسی طرح بعض کے ذمہ زکوٰۃ نہیں ہوتی مگر دوسرے حقوق مالیہ واجبہ اس کے ذمہ ہوتے ہیں۔
مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ میں تو زکوٰۃ کے بعد بھی مگر پھر بھی شرعاً مطلوب ہیں جن میں
بعض واجب اور بعض مندوب ہیں چونکہ ان میں بھی غفلت کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں اس
لئے ان پر مختصراً بقدر ضرورت متنبہ کرنا ضروری ہے چنانچہ تھوڑا تھوڑا عرض کرتا ہوں اور
حقوق اللہ اس لئے قید لگائی کہ جو حقوق مالیہ منجملہ حقوق العباد ہیں وہ از قبیل معاملات
ہیں ان کا بیان ذکر نہیں ہے اس وقت صرف دیانات کا بیان ہے۔

اس میں بعض کوتاہیاں وقف کرنے والے کی طرف سے ہوتی ہیں اور بعض منتظم
اور متولی کی طرف سے اور بعض واقف کی اولاد سے بعض دوسرے اجنبی لوگوں کی طرف سے۔
چنانچہ واقف کی طرف سے ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وقف کیا ہے اس میں
یہ بھی رعایت نہیں کی جاتی کہ حلال سے حاصل ہوئی ہے یا حرام سے بعض لوگ زیادہ شہرت کیلئے اس کے
کو یہ عمل کرتے ہیں حدیث میں صاف ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا
يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلُ مِنْهُ وَلَا يُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكُ لَهُ
فِيْهِ وَلَا يَتْرُكُهُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ اِلَّا كَانَ زَادَهٗ اِلَى النَّارِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُوا السَّيِّئَ
بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُوا السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ اِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمْحُوا الْخَبِيْثَ رواه احمد
وكذا فى شرح السنة۔

"حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بندہ ایسا نہیں جو مال حرام کما کر اس میں سے صدقہ
کرے اور اس کا صدقہ قبول ہو جائے، اور کوئی بندہ ایسا نہیں کہ ایسے
مال سے راہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اس میں برکت ہو اور کوئی بندہ
ایسا نہیں جو اپنے پیچھے مال حرام چھوڑ کر جائے مگر وہ جہنم تک جانے کے
لئے اس کو توشہ بن جاتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بری چیز کو بری چیز سے نہیں
مٹاتا، لیکن بری چیز کو اچھی چیز سے مٹاتا ہے، گندی چیز گندی چیز کو نہیں مٹاتی

بلکہ اگر حلال بھی ہو مگر ہو تفاخر کے لئے وہ بھی غیر نافع و غیر مقبول ہے، ریاء کی مذمت
معلوم اور ظاہر ہے، خصوص مساجد بنانے والے اس بلا میں بکثرت مبتلا ہیں، یہی وجہ
ہے کہ اگر کسی جگہ مسجد قدیم موجود ہو مگر محتاج مرمت ہو لیکن اس کی مرمت نہ کریں گے۔ اور
اس کو منہدم ہونے دیں گے اور اپنے نام کے لئے ایک مسجد بنا دیں گے اور یہی راز ہے
اس کا اکثر بستیوں میں بکثرت مسجدیں ویران ہیں۔

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ خود وقف ہی مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ نیت صرف
جائداد کی حفاظت ہوتی ہے اور اسی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں اور وقف کو اس
کا ذریعہ بناتے ہیں۔

پس دین تو مقصود بالعرض ہے اور دنیا مقصود بالذات ہوگئی جس کی نسبت
ارشاد نبوی ہے۔

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ
إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى
دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ۔ رواہ الشیخان۔

بلاشبہ تمام اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور بیشک ہر انسان کو وہی
ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے، پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے
رسول کی طرف ہو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف شمار ہوگی
جس کی اس نے نیت کی۔

دیکھئے اس مہاجر نے ہجرت کی مگر نیت اس میں غرض دنیوی کی تھی اس لئے ثواب سے
محروم رہا اور اسی قبیل سے ہے بعض اوقات وقف علی الاولاد کرنا۔

اس سے یہ مقصود نہیں کہ وقف علی الاولاد صحیح نہیں یا کسی حالت میں موجب ثواب
نہیں، صحیح تو ہر حال میں ہے خواہ نیت کچھ ہی ہو، جیسا کہ نماز کو اگر کوئی تمام شرائط و ارکان
کے ساتھ ادا کرے مگر نیت یہ ہو کہ لوگ ہم کو نمازی سمجھیں باجماع اہل علم نماز اس کی صحیح
ہو جائے گی مگر ثواب سے محروم رہے گا، اسی طرح سے یہ وقف صحیح تو ہو ہی جائے گا۔ ثواب

بعض احوال میں نہ ہو اسی طرح بعض حالات میں ثواب بھی ملے گا جب مقصود اعانت اولاد کی دین کے لئے ہو۔

یعنی یہ غرض ہو کہ معاش سے مطمئن رہیں گے تو دین میں مشغول رہیں گے۔ اور کسی کے حق کا ضائع کرنا بھی مقصود نہ ہو اور اگر مقصود اولاد کی اعانت کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ یہ ہمیشہ صاحب ثروت وجاہ رہیں گے یا یہ کہ کسی سے قرض لے کر خدشہ ہو کہ اب جائداد نیلام ہو جائے گی۔ اس وقت وقف کی بنا یہ کہ صاحب حق کا حق ضائع کیا، تو نیکی برباد گناہ لازم ہوگا۔ اور اس سے بڑھ کر ایک درجہ منتہیٰ قبیح غرض ہے کہ اس کا ذریعہ الحاد تک پہنچتا ہے وہ یہ کہ اصل میں مسئلہ میراث کو خلاف مصلحت وخلاف حکمت اور موجب مضرت اور نامناسب اعتقاد کرتا ہے اور صریح اعتراض کرنے کو بدنامی سمجھ کر ایک شرعی عمل کی پناہ ڈھونڈتا ہے یعنی وقف علی الاولاد کو ترجیح دیتا ہے۔ اور قواعد میراث کو موجب تجزیہ وتقسیم جائداد خیال کرتا ہے پس جبکہ اس کی اس تجویز کا ایک حکم شرعی یعنی میراث کو نامناسب اعتقاد کرنا ہی تو اس کا بددینی ہونا ظاہر ہے اور شیطان کے کافر ہونے کا اصل سبب یہی ہے کہ اس نے ایک حکم منصوص کو خلاف حکمت قرار دیا۔ ورنہ صرف ترک سجود بلکہ معصیت تھا نہ کہ کفر۔ پس اس وقت بھی ایسے عقیدہ والوں کا تکفیر کرنے والے کو متعصب کہنا خود تعصب ہے۔ جس کے معنی باطل کی حمایت کرنا ہے نہ کہ دین کی پختگی اور تمسک شریعت کے ساتھ ..... اس وقت تصلب کا نام ناسمجھی سے تعصب رکھ لیا گیا ہے۔

وقف کا غلط مصرف میں استعمال

ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ اس کے مصارف میں بعض بدعات ومعاصی کو بھی تجویز کرتے ہیں کہ اس کی آمدنی سے فلاں مزار پر عرس کیا جاوے، جس کا مشتمل بر بدعات کثیرہ ہونا ظاہر ہے۔ یا یہ کہ اس کی آمدنی کا ایک حصہ متعارف انگریزی تعلیم میں صرف کیا جاوے جس کا مشتمل ومورث قبائح ومفاسد عظیمہ ہونا مشاہد ہے اور بعض کوتاہیاں متولی ومنتظم کی طرف سے ہوتی ہے مثلاً بعض وقف کی آمدنی کو اس کے مصارف میں نہیں صرف کرتے۔

بلکہ بجائے اسکے کہ موافق جائز و ناجائز سے قطع نظر کرکے جو چاہیں تصرف کرتے ہیں بعض اوقات میں
کی شرائط کی مخالفت کی جاتی ہے۔ مثلاً اس میں واقف نے ایک جماعت کو مقرر کر دیا۔ مگر
جس کا زور ہوا وہی قابض ہو کر مستقل و مستبد بالرائے بن بیٹھا۔ اور دوسروں کو کوئی حصہ بھی
نہیں۔ اور اگر واقف نے حساب داخل کرنے کی شرط مقرر کی اور کوئی زیادہ بھی نہ تو فرضی حساب
تصنیف کر لیا۔ بعض اوقات بعض دنیوی اغراض کے لئے وقف کی مصلحتیں برباد کی جاتی ہیں
مثلاً کوئی خوش معاملہ نہ تھا۔ اس متولی نے دوسری مملوکہ زمین اس شرط پر رکھ دی ہے کہ وقف
زمین کا ارزاں ٹھیکہ اس کو دیا جاوے اور دوسرا جس کا ٹھیکہ گراں کرایہ پر دیتا ہے۔ اور وہ
بھی خوش معاملہ ہے۔ مگر اس کو دیتے ہیں جس کی مملوکہ زمین چھوٹتی ہے۔ تو یہ شخص محض اپنے
مصلحت کے لئے وقف کو نقصان کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ متولی تمام آمدنی اس کی خود ہی
کھا جاتا ہے۔ پھر کبھی تو اول ہی سے نیت اس کی ادا کی نہیں ہوتی۔ اور کبھی اول میں نیت
اچھی ہوتی ہے۔ مگر پھر خرچ کرتے کرتے تساہل ہو کر بے فکری ہو جاتی ہے اور وہ رقم ضائع
ہو جاتی ہے .... بعض متولی منافع سے حق و زیادہ ہو کر خود رقبہ
وقف میں تصرف باطل کرتے ہیں۔ کبھی قرض لینے سے مگر جس سے حکام کے سبب اور کبھی بلا حق
سے اور اس طور سے مثلاً اس وقف کے پیچھے لگ رہتے ہیں اور اس کی نیت یہ ہے کہ
کسی دعوے سے وہ بھی زمین لے کر اس کو وقف کر دیں گے۔ پھر کبھی وہ روپیہ کہیں
خرچ ہو جاتا ہے۔ اور وہ وقف صفت میں برباد ہوتا ہے یا اس کے عوض اس سے بھی
زمین خریدی جاتی ہے تو اگر وقف کا مد نظر باطل ہے البتہ جہاں اس کا امکان ہی نہ تھا تو بالکل
چھوڑ دینے سے بہتر ہی لے لینا کافی ہے۔ اور اس طرح سے کہ اس پر مالکانہ تصرف کرنے لگے۔
حتی کہ کبھی اس کو رہن کیا بیع بھی کر دی۔ غرض ان اوقاف میں خرابیوں کے بدولت بہت سا حصہ
بے نشان ہو گیا اگر معلوم بھی ہے تو ان کا استخلاص بوجہ تسلط غیر وقت کثیرہ صرف
پر موقوف ہونے کے دشوار ہو گیا ہے۔

افسوس ہے بعض مسلمانوں نے مسجدوں کے ساتھ استہزاء بھی شروع کیا ہے مساجد
کر لیا ہے اور بعض جگہ ویران اولاد و وقف کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ کوتاہیاں وہ سب

ہیں۔ جو ابھی مستقلم کی کوتاہیوں کی فہرست میں مذکور ہوئیں۔ اور بعض ان سے زائد بھی ہیں۔ اور ہ زمانہ پر فساد رہونے کا سبب یہ ہو جاتا ہے کہ ورثا اولاد واقف کو عام لوگ بہ نسبت اجنبی متولی کے وقف میں تصرف کرنے کا زیادہ مستحق سمجھتے ہیں مثلاً لوگوں کو ایسے قبرستان میں دفن کرنے سے روکنا یا کسی کو اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی مسجد میں نہ آنے دینا یا اس کی شکستگی کی حالت میں خود تو بوجہ عدم استطاعت کے اس کی مرمت نہ کر سکنا۔ یا بے پروائی کے سبب نہ کرنا۔ اور اوروں کو بوجہ عار اور بے کی اجازت نہ دینا حتیٰ کہ وہ اسی طرح اول منہدم ہو جاتی ہے پھر یہی لوگ اس کا ملبہ بیچ کھاتے ہیں حتیٰ کہ وہ منہدم ہو جاتی ہے پھر اس کی زمین بیچ لیتے ہیں خواہ اس میں مجالس فسق ہونے یا کوئی غیر مسلم اس میں گھر بنا کر یا خانہ تک پھرا کرے جو عار اس فضیحت کا سبب ہوئی ہے۔ اسی کے حق میں کہا جا سکتا ہے

اختيار الغار على العار

عار کے مقابلہ میں آگ کو اختیار کر لیا

بعض کوتاہیاں عام اجنبی لوگوں کی طرف سے ہوتی ہیں مثلاً ایک یہ کہ مسجد میں کسی ظالم کا تصرف دیکھ کر یہ رائے گھڑ لینا اور اپنی طرف سے فتویٰ دے لینا کہ اب یہ مسجد ہی نہیں رہی، اس میں ویسا ثواب نہیں ہوگا یا یہ کہ اس میں اذن عام شرط اس لئے یہاں جمعہ درست نہیں، اور یہ تجویز تراش کر دوسری مسجد کے بنانے کا سامان شروع کر دینا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو دوسری مسجد آباد نہیں ہوتی، یا پہلی ویران ہو جاتی ہے اور آئے دن کے جھگڑے رہتے ہیں وہ الگ، خود یہ مسئلہ ہی سمجھنا غلط ہے۔ کہ ظالم کے تصرف سے وہ مسجد نہیں رہی یا اذن عام باطل ہو گیا۔ مسجد مسجد ہی ہے اور وہ ظلم اس کا مخل باذن عام نہیں ہے۔ اذن عام کا شرط ہونا ارض مملوکہ میں ہے نہ کہ ارض موقوفہ میں، وہاں شریعت کا اذن عام ہے جس کو کسی کا ظلم زائل نہیں کر سکتا، بجائے اس مسئلہ تراشنے کے اس ظلم کو بشرط قدرت روکنا چاہیئے۔ اور وقف کی حفاظت چاہیئے اور مثلاً ایک یہ کہ وقف کو برباد ہوتے ہوئے . . . . دیکھتے ہیں۔ اور وجود قدرت کا التفات نہیں کرتے، کہتے ہیں کہ ہم کو کیا غرض پڑی ہے صاحبو! کیا دین بھی ایسی چیز ہے کہ جس کی نسبت

بلا غرض کا دعویٰ کیا جاوے ۔ بہر کیف جب تک غرض ہو وقف ثواب کی چیز ہے - وہاں قدرت نہ ہو تو خیر مجبوری ہے اور مثلاً ایک یہ کہ بعض لوگ جو مصرف اس وقف کے نہیں ہیں وہ بھی اس سے منتفع ہوتے ہیں ۔ مثلاً ایک مسافر خانہ مساکین کے لئے بنایا گیا مگر اس میں اغنیاء امراء بھی بوجہ مفت کے قیام کرتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں یہ مدرسہ کی طبقات ذکر ہیں سے اور بعض کوتاہیاں ہیں مگر نمونہ کے لئے انشاءاللہ اس قدر بھی کافی ہے ان ہی محذورات کو دیکھ کر بعض دانشمندوں کی رائے یہ ہو گئی ہے کہ اکثر اوقات ایسے اوقاف سے تو یہی بہتر ہے کہ بجائے وقف کرنے کے اس جائیداد وغیرہ کو بیچ کر اس کے دام اپنے ہاتھ سے کسی نیک کام میں صرف کر دے لیکن یہ ایک رائے ہے جس کا منشاء ایک تعمق طبعی ہے کوئی حکم شرعی نہیں خرابیوں کی خوف وقف سے مرغوب نہ ہونے میں مخل نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ بوجہ نیت کے بقاء ذات وقف تک باقیات صالحات کا ثواب ملتا رہے گا ۔ سے استغناء منقطع ہو جائے ۔

ساری جائیداد وقف کر دینا

ایک کوتاہی اور ہے کہ وقف اس کا عبادت ہے ۔ مگر تمام کے آثار پر نظر کر کے شریعت نے اس کو پسند نہیں کیا ، یہ کہ کوئی شخص جس کا قلب متحمل تنگی و تنگدستی کا نہ ہو اپنی تمام جائیداد یا مستطیع کو وقف کر دے ۔ بعض صحابہؓ نے جوش محبت میں ایسا ارادہ کیا بھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا چنانچہ حدیث میں ہے امسک علیک بعض مالک یعنی اپنے پاس اپنا کچھ مال روک رکھو۔ مصرح ہے ، اور راز اس میں یہ ہے کہ بعض اوقات ناداری میں وساوس پریشان کرتے ہیں کہ تو نے سب دیدیا اگر کوئی حاجت پیش آئی اور آمدنی کی کوئی سبیل نہیں ، تو کہاں سے کام چلے گا ۔ ان وساوس کا بعض اوقات اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ نماز وغیرہ میں خرابی پڑنے لگتی ہے بعض اوقات نیت ڈانواڈول ہو کر غیروں کے مال پر نظر پڑنے لگتی ہے ۔ بعض اوقات حرام ذرائع کا قصد کرنے لگتا ہے ۔ چوری کا جھوٹے مقدمے جھوٹی گواہی کا ، کسی سے قرض لے کر مار لینے کا ۔ نعوذ باللہ
اور اگر ان وساوس کے بعد اتفاق سے کوئی کلفت و تنگی بھی پیش آگئی تو وہ وساوس

اس وقت عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں، اور معاصی کا صدور ہونا شروع ہوتا ہے۔ جن سے کہ غیرت کا خسارہ تو ظاہر ہی ہے۔ بعض اوقات کسی جرم قانونی کا مرتکب ہو کر گرفتار بلا بھی ہوتا ہے۔ دنیا کی منفعت ہوئی تو دفعتاً کرنے سے اتنی تو نصیب نہ ہوئی تھی جس قدر اس سے ضرر پہنچا۔ تو شریعت مطہرہ نے جو اس سے روکا ہے تو واقع میں خیر سے نہیں روکا۔ بلکہ ان شرور سے کہ جن پر شریعت کی نظر تھی، وہ ہماری نظر سے مستور ہے۔ روکا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد اپنے عموم سے ان صورتوں کو بھی شامل ہے۔ عسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون۔

تجربہ سے معلوم ہوا کہ اصلی مفلس کو افلاس سے اس قدر پریشانی نہیں ہوتی جس قدر فقیر بعد الغنی کو کیوں کہ وہ پہلے سے اس کا خوگر ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے وَارْحَمُوا ثَلٰثَةً وعزیز قوم ذل وغنی قوم افتقر۔ تین آدمیوں پر رحم کرو، اور ان میں سے ایک اس شخص کو بھی شمار کیا جو کسی قوم میں مالدار آدمی تھا، بعد میں فقیر ہو گیا۔

ہمارے حضرت مرشد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک سالک نے اپنی جائیداد کی نسبت ایسی ہی رائے ظاہر کر کے مشورہ طلب کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا۔ بھائی ایسا مت کرنا، آدمی کو اپنے نفس کی تسلی کے لئے بھی کچھ رکھنا ضروری ہے۔ اور اسی نکتہ کے سبب حضرتؒ ضعیف القلوب و الوقت بالاسباب لوگوں کے لئے اسباب و تعلقات مثل تجارت و نوکری وغیرہ کے ترک کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ بعض اوقات یہ مفاسد مذکورہ اس درجہ پر نہیں پہنچتے، مگر اتنا ہوتا ہے وقف کر کے پچھتاتا ہے کہ میں نے یہ غلطی و ناعاقبت اندیشی کی، تو اس خیر کا کیا ثواب مل سکتا ہے جس کو کر کے پچھتا دے اور افسوس کرے؟ البتہ جو خود بھی قلب قوی رکھتا ہو اور اس کے اہل و عیال یا تو ہوں ہی نہیں۔ یا اگر ہوں تو وہ بھی اس شخص کے ساتھ اس میں متفق اور راضی ہوں اور اس کو بھی قرآن سے شہادت قلب مطمئن ہو کر پھر بھی پریشان نہ ہوں گے اور پریشان نہ کریں گے۔ ایسی حالات میں تمام سرمایہ کا وقف کر دینے کا بھی کوئی مضائقہ نہیں بلکہ عزیمت اور ہمت کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب صدیق اکبرؓ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں تمام نقد و نظیر جو کچھ ان کی

تک پہنچ رہا تھا، سب لے آئے۔ اور آپ نے ان کو بطیب خاطر جائز رکھا۔ اور اسی عمل پر صحیح میں وحی نازل ہوئی وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى الآیۃ۔ (جہنم سے بچا لیا جائے گا اس متقی ترین شخص کو جو اپنا مال دیتا ہے پاک صاف ہونے کو) ورنہ جس کو قوت نہ ہو اس کے لئے یہ مشورہ وارد ہے۔ افضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى او كما قال (افضل صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے مالداری چھوڑ جائے) اور ورثہ کے لئے یہ وارد ہے ان تصدق وانت صحيح شحيح تخشى الفقر وتأمل الغنى او مثل ذلك (تم اس حالت میں صدقہ کرو کہ تندرست ہو، مال کی رغبت کرنے والے ہو، فقر سے ڈرتے ہو اور مالداری کی امید رکھتے ہو)

سبحان اللہ! شریعت مطہرہ کیا عادل ملت ہے؟ فضل اللہ تعالیٰ من جاء بها بيضاء نقية وغراء سوية زكية

ایک کوتاہی یہ ہے کہ کئی آدمی رنج وغیرہ کے سبب وارثوں کو محروم کرنا چاہتے ہیں اور اسی غرض سے اپنا ترکہ وقف کر دیتے ہیں تاکہ وارثوں کو نہ ملے۔ سو سمجھ لینا چاہئے کہ ورثہ کو نہ دینا جو کہ اس شخص سے مقصود ہو، خود معصیت ہے۔ قرآن مجید میں غَیْرَ مُضَآرٍّ[1] کی قید موجود ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔

اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّیْنَ سَنَةً ثُمَّ یَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَیُضَارَّانِ فِی الْوَصِیَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ رواه فی المشكوٰة۔

بعض مرتبہ مرد و عورت اللہ کی ساٹھ سال تک بندگی عبادت کرتے ہیں، پھر ان کی موت قریب آتی ہے اور وہ وصیت میں اپنے وارثوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان پر دوزخ کی آگ لازم ہو جاتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے

مَنْ قَطَعَ مِیْرَاثَ وَارِثِهٖ قَطَعَ اللّٰهُ مِیْرَاثَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔

جو شخص اپنے وارث کی میراث قطع کرے، اللہ قیامت کے دن جنت سے اس

---

[1] یہ الفاظ قرآن مجید میں اس قید کے ساتھ وصیت کے احکام میں ہیں، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وصیت تو جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس وصیت سے وارثوں کو محروم کرنا یا انہیں نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو۔ محمد تقی عثمانی۔

کی میراث قطع کردے گا۔

بعض آدمی ضرر پہنچانا تو نہیں چاہتے مگر یہ سمجھتے ہیں کہ وقف کرنے میں تو ثواب ہوگا۔ اور وارثوں کے لئے چھوڑ جانے میں کیا ثواب ہے؟ سو ایسا سمجھنا خود غلط ہے، ثواب صرف وقف میں منحصر نہیں، بلکہ وارثوں کے لئے ترکہ چھوڑ جانے میں بھی اجر اور فضیلت میں ہے۔

"انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرھم عالۃ یتکففون الناس"

کذا فی المشکوٰۃ

"بلاشبہ اگر تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ تو یہ بہتر ہے اس سے کہ تم انہیں محتاج چھوڑ کر جاؤ، جو لوگوں کے دست نگر ہوں۔"

غرض بجائے خود وقف بھی موجب ثواب ہے، اور وارثوں کے لئے چھوڑ جانا بھی موجب ثواب ہے۔ اب ایک دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی خاص نسبت سے دونوں پر جائیداد کو تقسیم کر دینا یہ محتاج ہے رجوع کا قواعد شرعیہ اور ماہران شریعت سے استفسار کرنے کی طرف۔

وقف کو استعمال کرنے والوں کی کوتاہیاں

ایک کوتاہی غیر وقف کرنے والوں کی اور یہ بہت عام ہے۔ یہ ہے کہ وقف میں ہر قسم کے تصرفات کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور کوئی منع کرتا ہے تو کہتا ہے کہ کیا تمہاری ملک ہے؟۔ یہاں تک کہ اکثر دیندار لوگ تک اس میں مبتلا ہیں کہ مسجد کے لوٹے بدھنے میں مریض کے لئے پانی پڑھوا کر لے جاتے ہیں۔ پھر بعض دفعہ وہ کئی کئی روز تک گھر ہی میں رکھا رہتا ہے۔ اور اگر فوراً بھی واپس آجاوے تب بھی خود لیجانا ہی جائز نہیں کیونکہ جس نے مسجد میں رکھا ہی اس کی نیت صرف مسجد میں کام لینے کی ہے۔ نہ کہ گھر لیجانے کی اور خلاف شرط معطی کے جو کہ اس کی نیت سے متعین ہے اور وہ نیت قرائن سے معلوم ہے اس سے کام لینا جائز نہیں اور مانع سے یہ کہنا کہ کیا تمہاری ملک ہے؟ بالکل لغو عذر ہے کیا منع کرنا اسی پر موقوف ہے کہ وہ دوسرے کی ملک ہو۔ تو جو شریعت نے جس طرح ملک غیر

ہونے کو سبب منع قرار دیا ہے۔ اسی طرح ما فیہ الاشتغال بغیر ما وقف لہ ہونا بھی شرعاً سبب
منع ٹھیرا گیا ہے۔ کیونکہ اصل حق منع شرع کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک غیر ہونا بھی وہاں سبب
منع ہے۔ جہاں اس کو شرع نے سبب منع قرار دیا ہے ورنہ نہیں۔ کما قال الفقہاء فی المضطر
حیث یصلح بل یفرض تناول مال الغیر و لم یجعل غیر و ذی صمتہ   اسی میں داخل ہے
وہ بے احتیاطی بعض صلحاء کی مسجد کے لوٹے چٹائی اٹھا اٹھا کر حجروں میں رکھ لیتے ہیں۔ یا
بعض آدمی مسجد کے لوٹے استنجے کے لئے یا گرم پانی مسجد کے سقاوہ سے وضو کے لئے گھر لے
جاتے ہیں۔ یا بعض آدمی مسجد کا فرش یا شامیانہ یا کسی دوسرے مدرسہ و انجمن و مسجد کی ضرورت میں
خلاف نیت معطی کچھ اینٹ چونہ دوسری مسجد میں یہ سمجھ کر کہ مسجد مسجد سب ایک ہے۔ لگا دیتے
ہیں یہ سب اسی فہرست میں داخل ہے۔ اسی طرح مدارس میں جو اشیاء خاص غرباء کے
لئے آتی ہیں۔ اس میں سے اغنیاء کو لینا یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

کفارۂ مالیہ یمین

اس میں ایک بڑی کوتاہی تو یہ ہے کہ بہت لوگوں کا یہ گمان ہے کہ جب قسم ٹوٹ جاوے
کفارہ میں تین روزہ رکھ لینا کافی ہے۔ ان کو یہ خبر ہی نہیں کہ بعض حالتوں میں روزے۔۔۔۔
کافی نہیں ہوتے۔ کسی دوسرے طریقے کی ضرورت ہے۔ سو اس میں تفصیل یہ ہے کہ جب قسم
ٹوٹنے کے بعد ارادہ ہو اس کے کفارہ کرنے کا اس وقت دیکھنا چاہئے کہ اس شخص کے پاس
قدر کفاف کو مستثنیٰ کر کے آیا اتنی گنجائش ہے یا نہیں کہ دس مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا
کھلا سکے یا ان دس مسکینوں کو فی مسکین بقدر ایک صدقہ فطر کے حسب نرخ بازار گیہوں
یا نقد غلہ یا اس کی قیمت دے سکے۔ یا دس مسکینوں کو اس درجہ کا کپڑا دے سکے کہ کوئی مسکین متوسط قسم
کا کپڑا القدر ایک جوڑے کے دے سکے۔ جس کی تفصیل جزئیات کتب فقہ میں مذکور ہے۔

بس اگر اس قدر گنجائش رکھتا ہو تو اس کا کفارہ میں روزہ رکھنا کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان طریقوں
میں سے ایک طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوگا۔ تب کفارہ ادا ہوگا۔ اور اگر گنجائش نہیں ہے تب
البتہ تین روزے رکھ لینا درست ہوگا۔ اور اس میں قدر کفاف سے زائد ہونا کفارۂ مالیہ کے

وجوب کے لئے کافی ہے۔ صاحب زکوٰۃ ہونا شرط نہیں۔ وہ قدر کفایت یہ ہے۔ رہنے کا گھر پہننے کا کپڑا اور ایک دن کی خوراک (کذا فی الحاشیۃ الشامیۃ عن الحلوانی)

اور حنفی مذہب میں اس گنجائش کو عزم اور کفارہ کے وقت دیکھا جاوے گا۔ قسم ٹوٹنے کے وقت نہ دیکھا جاوے گا۔ پس اگر حنث کے وقت گنجائش ہو اور ادا کے وقت گنجائش نہ ہو تو روزہ سے کفارہ ادا ہو جاوے گا۔ اور اگر حنث کے وقت گنجائش نہ ہو اور ادا کے وقت گنجائش ہو تو کفارہ مالیہ دینا پڑے گا۔ کذا فی الشامیۃ عن البدائع۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جن کے لئے روزہ کافی ہو گا کیونکہ غرباء میں اسی کثرت سے ہیں جن کے پاس کفایت باتفسیر مذکور سے زائد بقدر خوراک و پوشاک دس مسکینوں کے موجود ہے پس کتنی بڑی کوتاہی ہے کہ ایک طرف سے سب نے روزہ ہی کو کافی سمجھ لیا ہے

کفارہ کے احکام وشرائط کی تحقیق نہ کرنا

(۱) ایک کوتاہی یہ ہے کہ جو لوگ کفارہ مالیہ ادا بھی کرتے ہیں وہ بھی اس کے احکام وشرائط کی تحقیق و رعایت نہیں کرتے چنانچہ بعض مطلق مسکین کو اس کا مصرف سمجھتے ہیں حالانکہ اس کا مصرف زکوٰۃ ہونا شرط ہے۔ (کذا فی الدر المختار)

بعضے ایک مسکین کو دس حصے ایک تاریخ میں دے دیتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔ اگر ایسا کیا تو ایک ہی حصہ ادا ہو گا (کذا فی الشامیہ)

لیکن اس غلطی کے معلوم ہونے کے وقت اس مسکین سے زائد کا واپس کر لینا جائز نہ ہو گا اس کو جو کچھ دے دیا وہ اس کی ملک ہو گیا (کذا فی الشامیہ عن الفتح)

اگر ایک ہی مسکین کو زیادہ نفع پہنچانا مقصود ہو۔ تو اس کو مختلف تاریخوں میں ایک ایک حصہ ہر روز دیوے۔ یہ درست ہے (کذا فی الشامیہ)

اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تاریخ غروب آفتاب سے بدل جاتی ہے پس اگر ایک مسکین کو دو حصوں کا غلہ یا قیمت دینا ہو اور ایک حصہ دن میں دیا اور ایک حصہ بعد غروب آفتاب کے تو یوں سمجھا جاوے گا کہ دو تاریخوں میں دیا۔ اور کافی ہو جاوے گا۔ اور اگر ایک حصہ

غروب آفتاب کے بعد دیا اور دوسرا حصہ اس شب کے بعد دن میں دیدیا۔ تو یوں سمجھا جاوے گا
کہ ایک ہی تاریخ میں دونوں حصے دیئے اس لئے ایک ہی حصہ ادا ہوگا۔
بعضے بے خبری سے ایک حصہ دو مسکینوں میں آدھا آدھا تقسیم کردیتے ہیں۔ اور صدقہ
فطر پر قیاس کرتے ہیں۔ سو جان لینا چاہیئے کہ وہ حصہ جائز ہوگا (کذا فی الشامیۃ عن الجوہرۃ)

بے خبری میں جو کوتاہیاں ہوئیں ان کا تدارک ضروری ہے

(۴) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بے خبری کے زمانہ میں جو کوتاہیاں ہوگئیں ان کو بلا تدارک معاف
سمجھ جاتے ہیں۔ یا صرف توبہ کو موجب تدارک سمجھتے ہیں۔ سو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بدون ادا کئے ہرگز
ساقط نہ ہوگا حتیٰ کہ موت سے بھی ساقط نہیں ہوتا (کذا فی الشامیۃ عن القہستانی)
پس اس بنا پر جب ان کوتاہیوں کی اطلاع ہو ان کا تدارک کرے اور جس قدر تاخیر کرے گا
گنہگار ہوگا (کذا فی الشامیۃ عن القہستانی ایضاً)
اور اگر قبل تدارک کے موت آجاوے تو مرنے کے وقت اس کے متعلق وصیت کریں۔

متعدد قسموں کے لئے ایک کفارہ کافی نہیں

(۵) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے کئی کئی قسموں کے بعد ایک کفارہ کو کافی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ
ہر قسم کا جدا کفارہ ہے۔ بلکہ محققین کے نزدیک متعدد یمین میں یہ تعدد کفارہ کا ایسا قوی ہے کہ ایک
تاریخ میں ایک مسکین کو دو قسموں کی طرف سے دو حصہ دینا بھی درست نہیں وہ ایک ہی حصہ
سمجھا جاوے گا (کذا فی الشامیۃ عن کافی الحاکم)
پس اس بنا پر اگر دو قسمیں اس کی ٹوٹی ہوں تو اگر ایک تاریخ میں دونوں کفارے ادا کرنا
چاہیئے۔ تو ایک کفارہ کے لئے جدا دس مسکین تجویز کرے۔ اور دوسرے کفارے کے لئے جدا دس
مسکین اور اگر بیس مسکینوں سے کم کو زیادہ نفع پہنچانا چاہے۔ تو تاریخیں متفرق کردے جیسا
کہ اوپر بیان ہوا۔

مدرسہ یا انجمن میں کفارہ ادا ہونے کا طریقہ

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ کفارہ یمین عہ کا دام ان سے حساب کرکے یا حساب کرا کے کسی مدرسہ اسلامیہ میں اہل مدرسہ کو سپرد کر دیتے ہیں۔ اور اطلاع نہیں کرتے کہ یہ کفارہ یمین ہے۔ جب ان لوگوں کو اس کی خبر ہی نہ ہو تو وہ کسی طرح رعایت اس کے احکام کی نہیں کر سکتے۔ اور اس لئے نہیں کرتے اور اس صورت میں وہ کفارہ ادا نہیں ہوتا۔ اور حق واجب اس شخص کے ذمہ رہتا ہے۔ تو دیا بھی اور ادا نہ ہوا اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اصل مدرسہ کو تصریحاً اس کی اطلاع دے دیا کریں۔

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ کسی انجمن وغیرہ میں ایسے کارکن کے سپرد کرتے ہیں۔ جو بیچارہ خود ہی ان احکام سے بے خبر ہے یا اگر باخبر ہے۔ تو قلت تدین کے سبب اس پر وثوق نہیں کہ وہ ان احکام کی رعایت کرے گا۔ اور اس لئے وہ شخص خواہ بے علمی سے یا قلت مبالاۃ یعنی بے پروائی سے اپنی رائے یا خواہش کے موافق اس رقم یا جنس کو صرف کرتا ہے۔ اور اس دینے والے کا کفارہ ادا نہیں ہوتا۔ اور خود یہ کارکن بھی وبال میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حد ضروری ہے کہ ایسے مہمل بے باک آدمی کو ہرگز ایسی چیز سپرد نہ کریں بلکہ جہاں یہ احتمال ہو اور اس کے ساتھ ہی مدرسہ یا انجمن میں پہنچانا بھی ہو تو اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ وہاں جا کر مستحقین طلبہ یا یتامیٰ کو جو کہ مصارف زکوٰۃ ہوں تحقیق و انتخاب کرکے اپنے ہاتھ سے حسب احکام شرعیہ تقسیم کرے اور مدرسہ اور انجمن کے حساب میں جمع کرا دے تاکہ وہ اپنی اعانت کے وقت اس کو محسوب کر سکیں اور طور پر مدرسہ و انجمن کو مدد پہنچ جاوے۔

اگر کسی کے جبر و اکراہ سے قسم توڑ دی اس کا کفارہ بھی واجب ہے

بعض عوام ایک عجیب کوتاہی میں مبتلا ہیں کہ کسی کے مجبور کرنے پر اگر قسم توڑ دیں تو اپنے اوپر کفارہ واجب نہیں سمجھتے یا اس جابر کے کہنے پر کہ میرے ذمہ گناہ رہا یا میں کفارہ دیدوں گا

عہ قسم ۱۲

اپنے کو بے کدورتی سمجھتے ہیں یا اس کے روزہ رکھ کر بلا عذر توڑ دیتے ہیں سو یہ سب غلطیاں ہیں جو شخص
توڑے گا اس پر کفارہ واجب ہوگا۔ پھر اگر یہ حانث کفارہ ادا نہیں کرتا۔ تو خود ہی اس کو
تین روزے رکھنے پڑیں گے اور اگر نادار ہے تو وہ جب اس کے ذمہ ہوگا۔ اس حالت کے پہنچنے
سے پہلے تک ہونا درست نہیں۔ بلکہ اگر اس حالت سے پہلے ادا بھی کیا۔ یعنی اس حانث نے کیا تھا
جب بھی ادا نہیں ہوا۔ البتہ اگر اس حانث نے اس کو وکیل بنایا۔ اور اس نے ادا کر دیا تو
اس کی طرف سے ہی ادا ہو جاوے گا لیکن عوام کا تمام تر اس تفصیل سے ناواقف ہونا بڑی
غلطی ہے۔ هذا ما حضرني الآن وبعض عن غيري ابلغ من هذا البيان

تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور

احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ عرض کرتا ہے کہ میرے مضامین مندرجہ
رسالہ ہذا کی نسبت بعض ناظرین نے تقریرًا و تحریرًا عام لوگوں کے سمجھنے
کی بعض اوقات شکایت ظاہر کی بعد مکرر سماع کے مجھ کو بھی کسی کسی وقت اس کی
تلافی کا خیال ہوتا تھا۔ یہ تو مجھ سے ہو نہ سکا اور مناسب بھی معلوم نہ ہوا کہ مضمون
کے لکھنے کا طرز بدل دوں کہ اس میں تکلف بھی زائد تھا۔ اور اہل علم کو بھی اس
سے انس نہ رہتا۔ یہ سہل و مصلحت معلوم ہوا کہ وہ اپنے طرز سابق پر جیسا
مضمون لکھ لیا جایا کرے۔ پھر اگر کسی حصہ یا پورے مضمون میں ضرورت ہوگی
تو اسی کی عبارت کو دوسرے عنوان سے خوب سلیس کر دیا جایا کرے اس تجویز کے
شروع ہونے میں بھی اتفاق سے دیر ہوتی رہی مگر آج اس کے نفاذ کا آغاز کا
بحمد اللہ تعالیٰ وقت آگیا۔ چنانچہ مضمون کفارہ بالا جس مذکور ہوا تو سہل عبارت
میں اندراج کرتا ہوں اور سہولت ہی کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کو مسلسل
نہ رکھا جاوے گا۔ بلکہ اس کے چھوٹے چھوٹے جدا جدا ٹکڑے کر دیا جایا کریں گے
بعنوان مسئلہ یا اور جو عنوان مضمون کے مناسب ہو۔

خلاصۂ مضمون سابق

اعادہ بغرض تسہیل بعنوان مسائل

مسئلہ: جس شخص کی قسم ٹوٹ جاوے۔ یا وہ توڑ دے۔ تو ہر شخص کو کفارہ میں تین روزہ رکھ لینا کافی نہیں بلکہ جس کے پاس ضروری گذر سے زیادہ اتنی گنجائش ہو کہ وہ دس مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر خوب معمولی کھانا کھلا سکے۔ یا دس مسکینوں کو فی مسکین اتنا اناج دے سکے جتنا عید کے دن صدقۂ فطر میں دیا جاتا ہے۔ یا دس مسکینوں کو فی مسکین معمولی قیمت کا جوڑا مثلاً کرتہ پائجامہ یا چادر لنگی یا کرتہ لنگی یا چادر پائجامہ دے سکے۔ تو اس کا اس وقت ادا ہوگا جب اس طرح دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا یا ان کے دام دے۔

اور ضروری گذر کا مطلب یہ ہے کہ رہنے کا گھر پہننے کا کپڑا اور ایک دن کا کھانا اگرچہ غریب ہی ہو۔ اور زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہو۔ اور جس کے پاس اتنی گنجائش بھی نہ ہو اس کا کفارہ البتہ تین روزے پے در پے رکھنے سے ادا ہو جاوے گا۔

اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کا کفارہ روزے سے ادا ہوتا ہو۔ کیونکہ اتنی گنجائش والے تو کثرت سے ہیں۔

مسئلہ: یہ گنجائش ہونا یا نہ ہونا اس وقت دیکھا جاوے گا جب کفارہ ادا کرنے کا قصد ہو۔ قسم ٹوٹ جانے کے وقت نہ دیکھا جاوے گا۔ سو اگر قسم توڑنے کے وقت گنجائش نہ تھی اور ادا کرنے کے وقت گنجائش ہو گئی تو دس مسکینوں کو بطریق مذکور کھانا یا غلہ یا کپڑا یا دام دینا ہوگا اور اگر قسم توڑنے کے وقت گنجائش تھی پھر ادا کے وقت گنجائش نہ رہی تو روزے ہی سے کفارہ ادا ہو جاوے گا۔

مسئلہ: ہر مسکین کو دینا کفارہ میں درست نہیں۔ بلکہ وہ مسکین ایسا ہو جو سید اور بنی ہاشم میں سے نہ ہو۔ اور اسی دینے والے کا باپ، دادا، نانا، ماں، دادی، نانی، بیٹا، پوتا، بیٹی، پوتی، نواسی، نواسہ، میاں بی بی نہ ہو۔ البتہ بیٹے کی بی بی کو یا داماد کو دینا درست ہے۔

مسئلہ: ایک مسکین کو ایک دن میں دو تین حصے دینا درست نہیں اگر ایک ہی مسکین کے

ساتھ زیادہ احسان کرنا منظور ہو تو اس کو پورا دے ایک حصہ دے دیا کرے اور تاریخ شریعت میں دن چھپنے سے شروع ہو کر اگلے دن کے چھپنے پر ختم ہوتی ہے۔

مسئلہ: اگر غلطی سے کوئی کفارہ ادا نہ ہوا تو وہ کافی نہیں بلکہ پھر یاد کر کے ادا کرنا چاہئے اور بلا عذر دیر کرنے سے گناہ ہوگا۔

"اگر زندگی میں کفارہ ادا نہ کر سکا تو کیا کرے"

مسئلہ: اگر کفارہ ادا نہ کرنے پایا تھا کہ موت آ گئی۔ تو اس کے ذمہ واجب ہے کہ وارثوں کو وصیت کرے کہ وہ اس کے ترکہ سے اس کو ادا کریں۔ ... وارثوں پر ... کو ... اگر ... اس شرط سے واجب ہے کہ وہ اس میت کے ترکہ کے تہائی حصہ سے نکل سکے۔ مثلاً اس کے ذمہ چار قسموں کا کفارہ واجب تھا اور وہ پانچ روپے کے غلہ سے ادا ہو سکتا ہے اور میت کا ترکہ تھا جو اس کی تجہیز و تکفین کر کے اور قرضہ مہر وغیرہ دے کر پندرہ روپیہ یا زائد بچتے ہیں تو اس صورت میں اس کی وصیت کا پورا کرنا ان کے ذمہ واجب ہوگا۔ اور جو مثلاً ساڑھے سات روپے بچتے ہیں تو صرف دو کفاروں کا ادا کرنا اڑھائی روپے سے واجب ہوگا اور اگر مثلاً تین ہی روپے بچتے ہیں تو ایک کفارے کا بھی ادا کرنا واجب نہ ہوگا۔

اسی طرح نرخ کے اختلاف سے کفارہ کی قیمت کی کمی بیشی کا حساب دیکھ لیا جاوے۔ البتہ ایسی صورت میں اگر کوئی وارث بالغ اپنے حصے ترکہ سے یا اپنے سرمایہ سے ادا کر دے تو بڑا ثواب ہے۔ لیکن وارث کے روزہ رکھنے سے کفارہ ادا نہ ہوگا۔

اگر میت کے پاس نقد نہ ہو لیکن غلہ یا کپڑا رکھا ہوا یا ہے سلا تہائی ترکہ کے اندر اتنا ہو کہ وہ دس مسکینوں کو فی مسکین بقدر صدقہ فطر یا ایک جوڑا تقسیم ہو سکے تب بھی کفارہ دینے کی وصیت کو پورا کرنا واجب ہے۔

"اگر متعدد قسمیں ٹوٹیں تو ایک کفارہ کافی نہیں"

مسئلہ: اگر دو قسمیں ٹوٹیں تو کفارہ (۲) دینا واجب ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر ایک ہی تاریخ میں ایک مسکین کو دونوں کفاروں کا ایک ایک حصہ دیدیا جائے تو درست نہیں گر ایسا کیا تو ایک ہی حصہ ادا ہوگا دوسرا اس کے ذمہ رہیگا۔ جیسا ایک قسم کے کفارہ کے دو حصے ایک مسکین کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں۔ البتہ اگر تاریخ بدل جائے تو درست ہے۔

"کفارہ ادا ہونے کیلئے تملیک شرط ہے"

مسئلہ: کفارہ کی رقم یا جنس یا کپڑا جب تک کسی خاص مسکین کی ملک نہ کیا جاویگا اس وقت تک وہ کفارہ ادا نہ ہوگا۔ خواہ اپنے ہاتھ سے کسی کو مالک کر دے یا دوسرے شخص کے سپرد کر دے کہ وہ کسی کو مالک کر دے۔ مثلاً کسی مدرسہ کے مہتمم کو دیدیا۔ یا کسی انجمن کے کارکن کو دیدیا۔ اس صورت میں وہ اس کفارہ دینے کا وکیل ہو جاویگا۔ اور کفارہ محض اس کے سپرد کرنے سے ادا نہ ہوگا بلکہ جب وہ وکیل موافق احکام شرعیہ کے مساکین کو دیگا تب ادا ہوگا۔ پس اگر اس وکیل نے کوئی غلطی کی تو کفارہ دوبارہ دینا پڑے گا۔ اس لئے ایسے شخص کو وکیل نہ بنا دے جو احکام شرعیہ سے بے خبر ہو یا کہ خبردار ہو مگر بے پرواہ اور احتیاط رکھتا نہ ہو۔

مسئلہ: اوپر کے مسئلہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ جن کارخانوں میں کوئی خاص مالک نہیں ہوتا اگر وہاں رفاہ عام کے کام ہوتے ہوں وہاں دینے سے ایسی رقمیں جیسے کفارہ ہے، زکوٰۃ ہے، صدقہ فطر ہے، چرم قربانی کی قیمت ہے۔ خواہ خود مالک چرم نے فروخت کی ہو خواہ اس کے وکیل نے۔ اور بھی جن جن رقموں میں تملیک خاص شرط ہے۔ ادا نہیں ہوتے۔ پس جنہوں نے چندہ مجاز جلسے میں ایسی رقمیں دی ہوں ان کو چاہئے کہ وہ دوبارہ پھر موافق شریعت کے ادا کریں۔

"وکیل اگر وزنہ رکھدے یا بغیر اجازت کے کفارہ ادا کرے تو ادا نہ ہوگا"

مسئلہ: اگر قسم توڑنے والے کی طرف سے دوسرا شخص کفارہ ادا کرنا چاہے۔ تو

اگر کفارہ میں اس دوست نے روزے رکھے تب بھی کفارہ ادا نہ ہوگا۔ اور اگر دس مسکینوں کو موافق مسائل مذکورہ بالا کھانا یا کپڑا یا غلہ یا دام دیئے تو اگر کفارے والے نے اجازت نہیں دی تھی۔ تو بھی کفارہ ادا نہ ہوگا۔ اور اگر تصریحاً اجازت دیدی ہے تو ادا ہو جاویگا فقط۔ باقی اجزاء مضمون کے آسان ہے محتاج تسہیل نہیں۔

"منت مالی کے متعلق کوتاہیاں"

(ایفاء نذر مالی)

منجملہ طاعات متعدیہ بالزکوٰۃ کے نذر مالی کا ایفاء ہے۔ اس میں بھی مثل دیگر طاعات کے چند کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

اگر نذر کو کسی شرط پر معلق کیا تو اس شرط کے وجود سے ایفاء واجب ہو گیا چاہے اس شرط کا دوام نہ ہو۔

ایک کوتاہی تو یہی ہے کہ بعضے لوگ شوق شوق میں نذر تو کر لیتے ہیں مگر اس کا ایفاء نہیں کرتے یا تو یاد نہیں رکھتے یا یہ سمجھ کر کہ اب تو کام نکل گیا۔ بے پروائی و سستی کرتے ہیں۔ یا اس کا بیان کہ اگر شفاء نہ ہو تو عدم بقاء کو مثل عدم حدوث کے قرار دے کر ایفاء کو واجب نہیں سمجھتے مثلاً کسی نے نذر کی کہ اللہ تعالیٰ فلاں مریض کو شفاء دے تو میں دس روپے خیرات دوں گا۔ اور وہ تندرست ہو گیا۔ مگر نذر پورا کرنے سے پہلے وہ پھر بیمار ہو گیا۔ تو یہ گمان غلط ہوگا کہ اب نذر پورا کرنا ضروری نہیں رہا۔ کیونکہ معلق تندرست ہونے پر کیا تھا۔ نہ کہ عمر بھر تندرست رہنے پر۔ جب معلق بہ پایا گیا الخ نذر واجب ہوگا علاج ان کوتاہیوں کا مسائل معلوم کرنا اور ہر وقت معصیت کو پیش نظر رکھنا ہے۔ تاکہ نہ غلطی ہو نہ بے پروائی۔

○

"غیر اللہ کی منت شرک ہے"

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے نذر غیر اللہ کی کرتے ہیں بعض تو کھلم کھلا کہ اے فلاں بزرگ اگر ہمارا کام ہوگیا۔ تو آپ کی نام کا کھانا کر دیں گے۔ یا آپ کی قبر پہ غلاف چڑھا دیں گے، یا آپ کی قبر پختہ بنا دیں گے یہ تو بالکل شرک جلی ہے۔ کیونکہ نذر بھی عبادت کی ایک قسم ہے (درالمختار عن الاختیار اوائل احکام النذور وقبیل باب الاعتکاف)

عبادت میں کسی کو شریک کرنا صریح شرک ہے۔ اس کا علاج توبہ اور عقیدہ کی درستی ہے۔ اور وہ نذر بھی منعقد نہیں ہوتی۔ اس کو پورا نہ کرے۔ اور اگر تشابہ بالغیر اللہ سے قطع نظر کرکے بھی وہ غیر مشروع ہو۔ تو اس کا مضاعف وبال ہے جیسے قبر پر غلاف چڑھانا۔ یا قبر پختہ بنانا کہ خود بھی غیر مشروع ہے۔ اور غیر اللہ کے تقرب کا ذریعہ بنانا یہ دوسری معصیت ہے۔ اور ایسا کھانا ما اهل به لغير الله میں داخل ہونے کے سبب مباح الاستعمال بھی نہیں اور ایسا غلاف وغیرہ بھی اسی سبب سے کسی کے لئے جائز الاستعمال نہیں۔ جیسا بعض مجاورین اس میں تصرف درست سمجھتے ہیں اور دوسرا سبب مالک کا اس کے لئے نذر نہ ہونا ہے۔ کیونکہ اس کی نیت صرف تبرع کی تھی اس سے نہ کہ مجاوروں کے گھر جانے کی اجازت اگر ناذر توبہ کرے۔ تو پھر وہ کھانا مجاوروں کے لئے اور وہ غلاف مالک کے اذن سے کھالینا اور استعمال کرلینا حلال ہے اور اگر کوئی جانور تھا۔ جو اسی نیت پر ذبح ہوچکا۔ تو اب توبہ سے وہ حلال نہ ہوگا۔ اسی طرح ایسی قبر کی اینٹیں لے جانا غیر مالک کے لئے حلال نہیں۔ البتہ مالک کو اختیار ہے کہ قبر سے اکھاڑ کر جو چاہے کرے۔

قبر کی کوئی چیز کسی کام میں بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے

یہ بے احتیاطی بعض اتقیاء سے بھی ہوتی ہے کہ پختہ قبر تو منہدم کر دینے کو ثواب سمجھتے ہیں اور جہاں تک تو ٹھیک سمجھے مگر آگے یہ بھی نقصان کر دیتے ہیں کہ بعد انہدام ان

لہ صفت ماثبت بالسنہ ۱۲

بعضوں کو کہیں بھی جگہ نکال دیا جاوے - سو یہ غلط ہے - اسی طرح قبروں پر جو عود پھول یا ہار وغیرہ رکھی جاتی ہیں یا پھول پڑھے ہوتے ہیں ان کا استعمال کرنا کسی کو جائز نہیں - مگر ان کا چڑھانا گناہ ہے -

بعض دفعہ شرک ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مدفون ہوتا ہے

بعض لوگ نذر تو اللہ ہی کے لئے کرتے ہیں لیکن اس کے تحت میں شرک مدفون ہوتا ہے کہ ذرا التفات و تامل سے کام لیا جاوے تو اس کا ادراک ہو جاتا ہے مثلاً نذر کی کہ اے اللہ اگر میرا فلاں کام ہو جاوے تو آپ کے نام کی ایک دیگ کھانے کی پکوا کر کھلا کر بڑے پیر صاحب کو ثواب بخشوں گا - اور یہ نیابت ہی عنقا کا صیغہ سمجھا جاتا ہے - تو یہ ظاہر میں تو نذر اللہ کے لئے ہے لیکن یقینی ہے کہ یہ لوگ اس سے مقصود محض ان بزرگ کو کسی قدر معین اور دخیل اور متصرف سمجھتے ہیں چنانچہ اگر ان سے کہا جاوے کہ ان بزرگ کو دوسرے وقت ثواب پہنچا دینا اس وقت اس تخصیص کو رو خالی نفع مساکین کی نیت رکھو تو ان کے دل میں فوراً یہ خطرہ قریب بہ ترجیح اعتقاد و جزم کے ہو گا کہ اس کے منضم نہ کرنے سے اس نذر میں اثر ضعیف ہو جاوے گا جس کا سبب ان بزرگ کے روحانی امداد کا نہ پہنچنا ہے -

پس ہر مسلمان اس پر غور کر کے دیکھ لے کہ یہ خلاف توحید ہے یا نہیں اور اس کا ایک امتحان ہے - وہ یہ کہ اگر وہ کام ہو جانے کے بعد ان نذر سے کہا جاوے کہ صرف اللہ کے نام مساکین کو دیدو اور کسی کو ثواب مت پہنچاؤ ، یا جن کے ثواب پہنچانے کی نیت کی ہے ان کو نہ پہنچاؤ ، اور کسی بزرگ کو بخش دو کیونکہ نذر میں ایسی تخصیصات شرعاً لازم و معتبر نہیں ہوتیں - (جیسا آگے بھی آتا ہے) تو اس وقت نذر کرنے والوں کی حالت دیکھنے کے قابل ہے کہ کس کو گوارا کر سکتے ہیں - یا نہیں - اگر گوارا نہ کیا تو سمجھئے کہ اعتقاد میں خلل ہے - جس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ اگر عقیدہ میں بھی شائبہ کسی کے ہو تب بھی حاجت کے لئے نذر کرنے کے وقت ہرگز کسی بزرگ کے ایصال ثواب کو منضم نہ کیا کریں ، اس کو دوسرے وقت بلا نذر ثواب بخش دیا کریں -

اغنیاء کو دینے سے منت پوری نہیں ہوتی

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ نذر کے مصرف میں اغنیاء اور غیر مستحقین کو بھی شامل سمجھتے ہیں چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ قبول کی ہوئی شیرینی مسجد میں لاکر سب نمازیوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ جن میں اغنیاء اور ناذر کے اصول و فروع بھی ہوتے ہیں جن کو دینے سے نذر ادا نہیں ہوتی ۔

(در مختار قبیل باب الاعتکاف)

بلکہ جس قدر ان لوگوں کے حصہ میں آیا ہے اسی قدر اور مساکین کو دینا واجب ہوگا۔ البتہ نذر ہی کرنے کے وقت یہ کہہ دیا کہ میں اغنیاء و غیرہم کو بھی دوں گا تو ان کے حصے کی نذر ہی منعقد نہیں ہوتی ہو۔ (رد المحتار عن القنیہ)

یہاں سے مانی ہوئی گیارھویں کی شیرینی کے بعض خوش حال دوستوں کے گھر بھیجنے کا بھی حکم معلوم ہو گیا ہوگا۔ ورنہ خود اس گیارھویں کی تعیینات کا بدعت ہونا باعث عوام کا فساد عملی یا عقلی ہونا مستقل بحث ہے۔

نذر کی تمام تخصیصات کا التزام ضروری نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ نذر کی تمام تر تخصیصات کو لازم و واجب سمجھتے ہیں مثلاً نذر کی کہ دو روپے کی مٹھائی دوں گا یا کسی مسجد میں دوں گا یا اتنی رقم فلاں محتاج کو دوں گا یا رمضان میں خیرات کروں گا تو اس کا اہتمام کرنا کہ مٹھائی ہو اور مسجد میں جاوے یا اسی محتاج کو ملے یا رمضان کا انتظار کرے ضروری نہیں۔ بعض اوقات بعض تخصیصات کی بناء پر قدرت نہ ہونے سے اصل نذر ادا ہونے سے رہ جاتی ہے۔

مثلاً کرنے جانے والا کوئی نہ ملا اور یہاں ادا نہ کی۔ اسی میں موت آگئی۔ تو گنہگار مرا۔ یا اگر اتفاقاً تخصیصات پر قدرت بھی ہوئی لیکن کسی وجہ سے دوسرا مصرف یا دوسری صورت افضل ہے۔ تو ملتزم تخصیص اس فضیلت سے محروم رہتا ہے مثلاً اکثر اوقات مسجد میں مٹھائی بانٹنے والوں سے یہ افضل ہے کہ گھر بیٹھے دانوں محتاجوں کو دو روپے نقد یا اس

کا عذر دیا جاوے۔ تو ایسے التزام ما لا یلزم میں کیوں مبتلا ہو۔ البتہ جو نذر معلق ہو اس میں قبل وجود شرط ادا صحیح نہیں پس اتنی تخصیص شرعاً معتبر ہے اور دوسری تخصیصات نذر معلق میں بھی معتبر نہیں (درمختار)

یہاں سے زبان عوام کی اس تخصیص کا حکم بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ فلاں کام ہو جاوے تو میں مسجد کا طاق بھروں گی سو یہ قید بھی شرعاً معتبر نہیں البتہ اگر کوئی نذر کرے کہ ایک سال قربانی کروں گا۔ یہاں تخصیص ایام نحر کی ہو جاوے گی (رد المحتار) نہ اس وجہ سے کہ زمان مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ جو ایام نحر میں نہ ہو وہ قربانی ہی نہیں جو کہ مقصود ہے اور جو صدقہ نذر میں نہ ہو وہ بھی صدقہ ہی ہے اور صدقہ ہی مقصود ہے یہ فرق ہے دونوں تخصیصوں میں۔

ناجائز فعل کی نذر اور اس کا ایفاء جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم جس فعل کی نذر کرتے ہیں وہ شرعاً جائز ہے یا ناجائز اور اس لئے بعض معاصی کی نذر کرتے ہیں مثلاً قبروں پر غلاف چڑھانا، عرسوں میں جانا، یا بطریق بدعت مولود شریف کرانا سو ظاہر ہے کہ یہ نذر خود معصیت ہے اور اس کا ایفاء جائز نہیں بلکہ توبہ واجب ہے۔ علاج اس کا علم دین اس باب میں حاصل کرنا اور اہل حق کی صحبت اختیار کرنا ہے۔ البتہ اگر نذر ہو طاعت کی اور معلق کیا ہو اس کو معصیت کے ساتھ تو نذر منعقد ہو جاتی ہے پھر اگر وہ معصیت صادر ہو جاوے تو اگر مقصود اس قائل کا اس تعلیق سے اس معصیت کے ترک کا اہتمام ہے تو خواہ نذر ایفاء کرے یا کفارہ یمین دے۔ اور اگر مقصود اس معصیت کی تحصیل پر اظہار مسرت ہے یعنی وہ معصیت اس کو مرغوب ہے تو اس نذر کا ایفاء اس پر واجب ہے (درمختار ورد المحتار)

اور اگر وہ فعل جائز بھی ہو مگر قربت مقصودہ نہ ہو، مثلاً شربت بھی تو جواز اصلی کی وجہ سے اس فعل کا کرنا جائز ہے مگر نذر منعقد نہ ہوگی اور نہ وہ واجب ہوگا۔ یہاں سے حکم معلوم ہو گیا ہوگا مولود بطریق مشروع کی نذر کا کہ اس کا ایفاء واجب نہیں ہوگا۔

ایسی چیز کی نذر نہ کرے جو اپنی طاقت سے باہر ہو، اگر کر لی تو ایفا واجب ہوگا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جس طرح صورت بالا میں نذر مالی اس قدر کر لی تھی جو ملک میں نہ تھی اسی طرح بعضے ایسے عبادات بدنیہ کی نذر کر لیتے ہیں جو ان کی طاقت سے خارج ہوتی ہے۔ مثلاً یہ نذر کر لی کہ عمر بھر روزے رکھا کروں گا۔ یا تا زیست ہر سال حج کیا کروں گا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خفیف خفیف نذریں بہت سی جمع ہونے سے وہ ثقیل ہو گئی مثلاً کسی بار میں دس دس روزوں کی نذر کی مگر ادا میں سستی کرنے سے وہ جمع ہو کر ایک ہزار روزے ہو گئے۔ جو تین سال میں جبکہ بلا ناغہ رکھے جائیں پورے ہو سکتے ہیں جس کا موقع بظاہر ملنا نہایت بعید ہے۔ پھر اس کے بعد ناواقفی سے یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ ان میں سے جتنا جی چاہا پورا کر دیا بقیہ کا کوئی تدارک نہیں کیا جاتا سو سمجھ لینا چاہیے کہ اولاً ایسی نذر نہ کرے اور اگر ہو جائے تو اس کو پورا کریں اور جو پورا ہونے سے رہ جائے۔ اس کا بدل کرے اور اگر موت آ جاوے تو اپنے ترکہ میں اس کے متعلق وصیت کریں۔ مثلاً عمر بھر کے روزے رکھنے کی نذر کر لی تو جتنے روزے نہ رکھ سکے اس کا فدیہ دے (درمختار) اور جو مرنے کے وقت رہ جاویں فدیہ کی وصیت کرے (درمختار و ردالمحتار قبیل از باب الاعتکاف) یا تیس حج کی نذر کر لی اور نہ کر سکا تو وصیت کر جاوے (ردالمحتار)

حل شبہ: ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ نذر مت کرو کہ نذر سے تقدیر نہیں ٹلتی۔ البتہ اس کے ذریعہ سے بخیل کے پاس سے کچھ (نیک کام میں) نکل آتا ہے (جو بلا نذر اس نیک کام میں خرچ نہ کرتا) اھ (بالحاصل) اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر نذر کا عبادت ہونا ثابت ہو چکا ہے اور عبادت مامور بہ ہوتی ہے گو درجہ ندب ہی میں ہو اور اس حدیث سے اس کا منہی عنہ ہونا ثابت ہوتا ہے گو درجہ کراہت ہی میں ہو پس ان میں جمع ہونے کی کیا صورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ نذر خود عبادت مقصودہ نہیں بلکہ اس کا عبادت ہونا اس لئے ہے کہ وہ دوسری عبادت مقصودہ سے متلبس و متعلق اور ان کا ذریعہ اور سبب ہے (کما فی ردالمحتار، احکام الیمین والنذر ما لفظہ قربۃ فلما یلازمہ من القرب

کالصلوٰۃ والصوم والحج والعتق ونحوھا)

اور ان عبادات مقصودہ کے عمل میں لانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک بدون نذر کے۔ اور دوسری بعد نذر کے اور اول صورت افضل ہے دوسری سے اور مقبول بمقابلہ فاضل وافضل کے اولیٰ یا ترک ہوتا ہے۔ پس نہی عن النذر اسی درجے میں ہے۔ تو یہ منافی نہیں اس کے مامور بہ فی درجۃ التوسل بہ الی الطاعات المقصودۃ (یعنی طاعات مقصودہ کے لئے وسیلہ بننے کے درجے میں) ہونے کے۔ اس حدیث میں یہ تو عمل کی اصلاح ہے۔ اور ایک عقیدہ کی اصلاح ہے کہ عوام کی طرح یوں نہ سمجھو کہ نذر کرنے کو اس کا روائی میں کچھ خاص دخل اور اثر درجۂ مزعومہ عوام کا ہے۔ اور اگر نذر نہ ہوتی تو یہ کام نہ ہوتا کام تو ہر حال میں اسی طرح ہوتا جس طرح مقدر تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اور اسباب طبعیہ یا دعا جن کا تو مشاہدہ و سمع سے ثابت ہے نذر میں اتنا اثر بھی ہونے کے لئے دلیل کی حاجت ہے اور ظاہر یہ حدیث بھی اس کی نفی کر رہی ہے۔ ورنہ نفی نہ ہوتی بلکہ مثل دوا و دعا اس کی ترغیب ہوتی اور اس میں بھی مثل ان کے تبدیل قدر کے شبہ کے جواب میں یہ ارشاد ہوتا وذالک من القدر) اور یہی تقریر میں سے ہے:

مقصود حضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ نذر کے دباؤ سے خیر کرنا بخل ہے۔ بلا نذر خیر کرنا زیادہ بہتر ہے اھ

اور اگر شکریہ کا روائی میں خیر کرنے کی نیت ہو تو زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے دل میں رکھے اور موقع پر عمل کرے۔ نیت کرنے سے نذر بھی نہیں ہوتی (لانہ مما یتعلق بالقول (یعنی اس کا تعلق قول سے ہے) کما فی الدرالمختار۔ اور اصل مقصود بھی حاصل ہو جاتا ہے شارع کا بھی کہ نفس عبادت ہے۔ اور اس حال کا بھی کہ اظہار، انجلاح حاجت و تضرعات ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور)

بعنوان مسائل: مسئلہ شرعی منت کا ادا کرنا فرض ہے۔ مسئلہ اگر منت مانی کہ

تندرست ہو جاؤں تو اتنا خیرات کروں پھر بالکل تندرست ہو گیا۔ اور اتفاق سے پھر بیمار ہو گیا
تو بھی منت اس کے ذمہ رہے گی ادا کرنا ضروری ہے۔ مسئلہ: خدا کے سوا کسی کی منت
ماننا جائز نہیں۔ جیسے بعض عوام کا طریقہ ہے کہ بزرگوں سے عرض کرتے ہیں کہ ہمارا فلاں کام
ہو جاوے تو آپ کے نام کی دیگ کریں گے۔ مسئلہ: اور اگر صورت مذکورہ میں خود وہ فعل
بھی ناجائز ہو تو دو گناہ ہوں گے۔ ایک غیر اللہ کی منت دوسرے معصیت کی منت۔ مسئلہ: ایسی
منت کی چیز استعمال میں لانا نہ چاہئے۔ مسئلہ: البتہ اگر نذر کرنے والا توبہ کرے تو وہ چیز
درست ہو جاوے گی۔ مسئلہ: اگر اسی نیت پر جانور ذبح ہو چکا تو توبہ سے کچھ نہ ہوگا۔
مسئلہ: اگر نیت اللہ کے واسطے ہو تب بھی منت میں کسی کے ایصال ثواب کا ملا دینا خلاف
احتیاط ہے۔ عوام کو یہ خیال ہو ہی جاتا ہے کہ ان بزرگ کا نام لگا دینے سے کچھ سہارا ان
بزرگ کی طرف سے بھی لگے گا۔ مسئلہ: منت کی چیز خوش حال لوگوں کو دینا بھی حرام ہے جن میں
سید بھی داخل ہے۔ یا اپنے ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، یا بیٹے، بیٹی، نواسہ،
نواسی، پوتا، پوتی کو دینا درست نہیں۔ اگر ایسا کیا تو جتنا ان کو دیا ہے اتنا پھر محتاجوں کو
دینا پڑے گا۔ اگر مسجد میں بانٹے تو خوشحال لوگوں کو نہ دے۔ مسئلہ: منت ماننے میں
کسی محلے کی یا کسی مسجد کی یا مکہ کی تخصیص لازم نہیں ہے پس اگر مٹھائی یا کھانے کی منت
مانی تو دے پیسے یا کپڑے دینا بھی درست ہے۔ داموں میں دونوں چیزیں برابر ہوں۔ اسی
طرح بجائے مسجد میں بانٹنے کے گھروں میں دے دینا بھی درست ہے اسی طرح بجائے
مکہ معظمہ کے ہندوستان کے حاجت مندوں کو دے دینا بھی درست ہے۔

مسئلہ: جو فعل خود یا کسی خاص طریقے سے شرعاً درست نہ ہو اس کی منت
ماننا درست نہیں۔ جیسے یوں کہنا کہ میرا فلاں کام ہو جاوے تو خواجہ صاحب کے عرس
تک جاؤں۔ یا جس طرح سے اکثر جاہل عوام مولود شریف پڑھتے ہیں ایسے مولود کی نذر
کرنا یہ درست نہیں۔ اور اگر ذکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بطریق سنت ہو جائز ہے۔ مگر
نذر کرنے سے وہ بھی واجب نہیں ہوتا جیسے وضو کے باوجود عبادت ہونے کے اس کی نذر
منعقد نہیں ہوتی۔

مسئلہ: جو چیز اپنی ملک میں نہ ہو۔ اس کی نذر صحیح نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی نے منت مانی کہ اگر فلاں کام ہو جاوے تو ہزار روپیہ دوں گا۔ اور کام ہو گیا اور ہزار روپیہ اس وقت موجود نہیں نہ اتنا سامان ہے تو یہ نذر نہیں ہوئی پس اگر ایک مہینے کے بعد ہزار روپیہ اس کو مل گئے تو اس نذر کا پورا کرنا واجب نہ ہوگا۔ البتہ کام پورا ہونے کے وقت جتنے روپیہ یا جتنا سامان اس کی ملک میں ہے اس کا دینا واجب ہوگا۔ اگر نقد نہ ہو تو سامان بیچ ڈالنا واجب ہوگا۔ اگر سب کے بیچنے سے تکلیف اور حرج ہو تو بقدر ضرورت سامان سے جو گنجائش ہونے کے وقت جتنا سامان لیا تھا وہ سب بیچ کر دے ڈالے مثلاً ہزار روپیہ کی منت مانی تھی مگر کام ہو جانے کے وقت پانچ سو روپیہ کا سامان موجود ہے تو وہ نذر پانچ سو روپے کے ساتھ متعلق ہوگی۔ اس میں اگر سو روپے کے سامان اپنی ضروریات کے لئے رکھ لیا تو چار سو اب دیوے اور سو کا سامان پھر دے۔ اسی طرح دوسرے کی ملک میں نذر نہیں ہوتی مسئلہ نذر کرنے سے پہلے سوچ لے کہ جس عبادت کی نذر کرتا ہوں مجھ سے اس کا سرانجام ہو سکے گا یا نہیں۔ کیونکہ جو نذر کرے گا وہ اس کے ذمہ واجب ہو جاوے گی۔ پھر ادا کرنا مشکل ہوگا۔ یا بھول جاوے گا تو اس کے ذمہ وبال اور گناہ رہے گا۔ اگر ہزار روزوں کی نذر کر لی یا کئی نذریں جمع ہو کر ہزار روپے ہو گئے تو ان سب کا ادا کرنا واجب ہوگا۔ اور جب طاقت نہ رہے گی فدیہ دینا پڑے گا۔ اور جب مرنے لگے گا تو وصیت کرنا پڑے گی کہ میرے ترکہ میں سے اس قدر فدیہ ادا کر دیا جاوے۔

تتمہ آخر مضمون نذر

(دو سو چوہتر [illegible])

اور یہ جو نذر کرنے سے جو حدیث میں ممانعت وارد ہے جس کی تحقیق اس مضمون میں مذکور ہوئی ہے مخصوص ہے نذر معلق کے ساتھ جیسا کہ اس نہی کی اس تعلیل سے صاف ظاہر ہے انہ لا یرد شیئا وانما یستخرج بہ من البخیل۔ یعنی یہ نذر تقدیر میں سے کسی چیز کو نہیں ٹال سکتی بلکہ اس نذر کے ذریعہ بخیل سے مال نکالا جاتا ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے۔ «لانه لم يخلص من شائبة العوض حيث جعل القربة في مقابلة الشفاء ولم تسمح نفسه بها بدون التعليق عليه مع ما فيه من ايهام اعتقاد التاثير للنذر في حصول الشفاء» (یعنی اس کا یہ عمل عوض کے شائبہ سے خالی نہ رہا کیونکہ اس نے ایک عبادت کو شفاء کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیا اور ساتھ اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ وہ حصول شفاء میں نذر کو مؤثر اعتقاد کرنے لگے) جو ایک خلاف شرع عقیدہ ہے۔

بخلاف نذر منجز کے کہ اس میں یہ علت نہیں «فهو تبرع محض بالقربة لله تعالى والزام النفس بما عساها لا تفعله بدونه فيكون قربة كذا في رد المحتار ج ۳ ص ۷۰» (یعنی نذر منجز ایک زائد چیز ہے جس سے مقصد اللہ کی عبادت ہے اور نفس کو ایسی زائد چیز کے ساتھ لازم کرنا ہے جسے بغیر نذر کے نفس کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا لہٰذا یہ عبادت ہوگی۔

"نماز و روزہ کے متعلق کوتاہیاں"

(فدیہ صوم و صلوٰۃ)

مثل دیگر طاعات مالیہ (مذکورہ سابقہ) اس میں بھی متعدد کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

اگر کسی کی کچھ نمازیں یا روزے رہ گئے ہوں جو اپنی زندگی میں ادا نہ کر سکے، مرتے وقت فدیہ کی وصیت کرنا ضروری ہے۔

مثلاً ایک کوتاہی یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کے ذمہ بہت سی نمازیں اور روزے چھوٹے ہوئے ہیں۔ مگر مرنے کے وقت بھی فدیہ کی وصیت نہیں کرتے حالانکہ ایسے شخص کو فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہے۔

(لوجوب الفدية عن الصوم نصا وعن الصلوٰة قياسا)

مقدار ایک روزہ اور ایک نماز کی فدیہ کے برابر صدقہ فطر کی ہے۔ خواہ غلہ یا قیمت یا ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلا دینا اور نمازیں ایک دن کی پانچ فرض اور ایک وتر کل چھ ہیں۔

فدیہ کے بھروسے پر نمازیں اور روزے قضا نہیں کرنے چاہئیں

اس کے متعلق ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی فدیہ کے بھروسہ پر اپنی نمازیں اور روزے چڑھاتے چلے جاتے ہیں کہ ہم مالدار ہیں۔ فدیہ کی وصیت کر جائیں گے۔ تو اس میں ایک تو بڑی بیباکی ہے کہ گویا نماز روزہ اس کے نزدیک قابل اہتمام ہی نہیں۔ خصوصاً مالداروں نے گویا اس کا جرمانہ دے کر ان کو سبکدوش کر دیا گیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک)

دوسرے چونکہ نمازوں کا بہت عدد بڑھ جاتا ہے۔ اور اس لئے اس کا مجموعہ فدیہ اکثر تہائی وصیت سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ تو اگر کل ادا کیا تو ورثہ کو ضرر پہنچایا گیا اور اگر کل ادا نہ ہوا تو اس کے ذمہ بار رہا اور یہ دونوں امر غیر مشروع ہیں۔

اور اسی فدیہ کے بھروسہ پر رہنے کے متعلق اس زمانہ میں نئی غلطی مگر بہت گندی غلطی یہ ایجاد کی گئی ہے کہ روزہ اتنا ضروری نہیں جو زیادہ وسعت والے ہیں ان کی طرف سے فدیہ دے دینا کافی ہے۔ روزہ رکھنا فرض نہیں۔ اس کا بطلان اچھی طرح سے احقر نے رسالہ اصلاح ترجمہ دہلویہ کے متن میں مختصراً اور اس کے تتمہ لعبادت غریبہ میں مبسوطاً اور عزیزم مولوی شبیر احمد صاحب سلمہ دیوبندی نے القاسم کے نمبر ۲ جلد میں عقلاً و نقلاً ثابت کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے)

قدرت یا امید قدرت کے ہوتے ہوئے فدیہ دینا درست نہیں ہوتا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ باوجود اس کے کہ وہ نمازیں قضا کر سکتے ہیں، اور صحت سے بھی مایوس نہیں ہوئے اور صحت کے بعد روزے قضا کر سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی ازراہ نسخہ فدیہ کا یاد کر کے اس کے استعمال کو کافی سمجھتے ہیں۔ سو سمجھ لینا چاہئے کہ قدرت یا امید قدرت ہوتے ہوئے فدیہ دینا درست نہیں ہوتا۔ بلکہ نماز پر تو انسان ہر وقت قادر ہے۔ اگر رکوع و سجود نہ ہو سکے اشارہ ممکن ہے۔ بلکہ مرض میں بھی وقتیہ کو ادا اور

فائت کو قضا کر سکتا ہے۔ اس کا فدیہ تو اس لئے جائز نہیں رہا۔ روزہ تو جب تک صحت کی امید ہے۔ بعد صحت کے بقدر زمانہ صحت اس پر قضا کرنا واجب ہوگا۔

البتہ اگر ایسا مرض ہو گیا کہ اب بالکل امید صحت کی نہیں رہی۔ یا ایسا بوڑھا ہو گیا کہ اب بالکل امید قوت کی نہیں رہی۔ یا کسی نے عمر بھر روزہ رکھنے کی نذر کر لی تھی۔ مگر اب اس سے بالکل عاجز ہو گیا۔ حاصل یہ کہ ایسا عذر لازم ہو گیا کہ اب قضا پر قادر ہونے کا قطعاً احتمال نہیں رہا۔ ان حالات میں حیات میں بھی روزہ کا فدیہ دینا جائز اور کافی ہے۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۱۴۱)

اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ اگر قضا نمازیں بہت کثرت سے ہو گئیں اور مرض کی ایسی حالت ہو کہ اشارہ سے بھی زیادہ قضا نہیں پڑھ سکتا۔ اور امید صحت کی منقطع ہو گئی۔ تو بقدر قدرت قضا کرنا واجب ہوگا۔ اور بقیہ کا فدیہ حیات میں بھی دینا درست ہوگا (لیکن لم اراہ فلیراجع)

زندگی میں جواز فدیہ کی صورت

اور جو نمازیں اور روزے قضا ہو کر فدیہ طلب رہ جاویں۔ ان کے فدیہ کے لئے وصیت کرنا واجب ہوگا۔ البتہ اگر نا امیدی کے قبل بھی اس نظر سے فدیہ دیدے کہ معلوم نہیں میرے ورثہ وصیت پر عمل کریں یا نہ کریں۔ اور یہ بھی نیت رکھے کہ بعد فدیہ کے اگر قدرت قضا کی ہو گئی تو قضا کر دوں گا۔ اور اگر قدرت نہ ہوئی۔ اور مسائل بالا کی رو سے جس مقدار فدیہ کا ناکافی ہونا ثابت ہوگا وصیت بھی کر دوں گا۔ ایسے فدیہ کا کچھ مضائقہ نہیں۔ بلکہ مستحسن اور احتیاط ہے۔ بشرطیکہ اگر مرض الموت میں ہو تو ثلث سے زیادہ نہ دے۔

اور قضا سے نا امیدی ہونے کی حالت میں جو روزہ کے فدیہ کا جواز اوپر مذکور ہوا ہے اس میں ایک اور بھی شرط ہے وہ یہ کہ یہ روزہ کسی اور واجب کا بدل نہ ہو ورنہ اس میں یا اصل واجب کو ادا کرے۔ اور وہ نہ ہو سکا تو صرف وجوب وصیت متعین ہے فدیہ بھی حالت میں نہیں ہو سکتا جیسا کفارہ یمین میں روزہ اس وقت ہوتا ہے جب اعتاق و اطعام و کسوت پر قدرت نہ ہو۔ پس اس روزہ کا فدیہ حیات میں درست نہیں اگر اصل اور بدل دونوں پر

قدرت نہ ہو تو مرتے وقت ترکہ میں فدیہ کی وصیت واجب ہوگی (امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۰۹)

وارثوں کی کوتاہیاں

ایک کوتاہی وارثوں کی یہ ہے کہ باوجود وصیت اور وسعت کے اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور میت پر گرانبار رہتے ہے حالانکہ ثلث سے اندر وصیت مقدم ہے ترکہ پر بھی۔

ایک کوتاہی پہلی کوتاہی سے کم درجہ کی یہ ہے کہ وہ بلا وصیت مرجانے تو اس فدیہ سے کم درجہ کے مصارف میں بلکہ اس سے بڑھ کر بیہودہ فضول مصارف میں اور اس سے بھی مزید بڑھ کر معاصی میں میت کا ترکہ اڑاتے ہیں۔ مگر اس طرف کسی کو توجہ نہیں ہوتی کہ ان مصارف میں صرف کرنے کے بجائے کچھ فدیہ میں دیدے۔ اور گو ایسی حالت میں دینا بعض فقہاء کے نزدیک مسقط واجب نہ ہوگا لیکن بعض کے نزدیک حقیقاً عدم وصیت کے بھی مسقط واجب ہو جاوے گا۔ اور جو مسقط واجب نہیں ان کے نزدیک بھی اس طرح سے نافع ہونا تو یقینی ہے کہ میت کو اس کا ثواب ہی پہنچ جاوے گا۔ کیا عجب ہے کہ وہ ثواب اس ترک واجب کے عذاب کو زائل کر دے۔ (امداد الفتاویٰ ج ۱ ص ۱۹۱)

اور یہ کوتاہی کم درجے کی اس لئے ہے کہ صورت سابقہ میں بوجہ وصیت کے فدیہ واجب تھا اور اس صورت میں بوجہ وصیت نہ کرنے کے واجب نہیں ہوا۔ لیکن جب اس سے ان محل میں صرف کیا ہے تو یہ اس سے احق و احسن و اقدم و اہم ہے۔

جو فدیہ قواعد شرعیہ کے موافق نہ ہونے سے ادا نہیں ہوتا اس کی ایک مثال

ایک کوتاہی ورثہ ہی کی یہ ہے کہ بعض مقامات پر بزعم خود فدیہ ادا کرتے ہیں اور وہ بوجہ قواعد شرعیہ پر منطبق نہ ہونے کے ادا نہیں ہوتا اور ورثہ پر ارتکاب منہی عنہ کا اور میت پر ترک عمل واجب کا بار رہتا ہے۔

اور وہ طریق غیر منطبق یہ ہے کہ میت کی تمام عمر کے نمازوں اور روزوں کا حساب کر کے اس کی ایک رقم مثلاً دس ہزار روپے تجویز کر کے ایک ملا کے ہاتھ ایک قرآن مجید دس ہزار

روپے کو ہدیہ کرتے ہیں، پھر وہ قیمت اس ملّا کو بہ نیت فدیہ کے معاف کر دیتے ہیں اور اس کو اسقاط کہتے ہیں اور یہ صورت ان سب اسقاط کی صورتوں سے اسلم جن کو جہلاء عمل میں لاتے ہیں کہ ان میں تو کوئی شائبہ بھی انطباق علی القواعد کا نہیں ان میں سے یہ صورت سرسری نظر میں منطبق سمجھی جاتی ہے۔

لیکن ظاہر ہے جب یہاں بیع مقصود نہیں تو ثمن بھی واجب نہ ہوگا۔ پھر فدیہ کس رقم سے ادا ہوا۔ اور دلیل بیع مقصود نہ ہونے کے علاوہ وجدان کے یہ ہے کہ اگر ملّا کو ثمن معاف نہ کیا جاوے بلکہ اس کا مطالبہ کرنے لگیں تو یہ اور تمام دیکھنے والے اس ثمن کو واجب اور اس مطالبہ کو حق کبھی نہ سمجھیں گے بہرگز نہیں پھر یہ تو ایک قسم کا فریب دینا ہو۔ البتہ جس کو وسعت کم ہو اس کے لئے دوسرا طریق درمختار میں لکھا ہے۔ وہ قواعد پر منطبق ہے مثلاً ایک روپیہ مسکین کو فدیہ میں دیا اور اس نے بخوشی ولی کو ہبہ کر دیا ولی نے پھر اس کو فدیہ میں دیا۔ اسی طرح اگر ہزار بار کیا تو ہزار روپیہ ادا ہو گئے۔ اور اس میں ہر بار میں اختیار ہے جب چاہے رکھ لے دوسرے کو نہ دے۔ فقط

تنبیہ: صوم و صلوٰۃ کے فدیہ میں اباحت و تملیک دونوں جائز ہیں اور ایک مسکین کو نصف صاع سے زائد دینا سب درست ہے لیکن نصف صاع سے کم نہ دے یہ تحقیق ہے (از رد المحتار ج ۱ ص ۵۰۸ و ص ۶۸۹) واللہ اعلم بالصواب

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور بہ رعایت تفہیم جمہور)

بعنوان مسائل

مسئلہ: جس شخص کے ذمے کچھ نمازیں اور روزے قضا ہوں اور ان کو قضا نہ کر سکا ہو اس کو واجب ہے کہ مرنے سے پہلے ان کے فدیہ کی وصیت کر جاوے۔

مسئلہ: ایک روزے کا فدیہ اس قدر ہے جس قدر صدقہ فطر دیا جاوے۔ اسی طرح ایک نماز کا بھی اسی قدر ہے اور ہر روز کی چھ نمازیں شمار کی جاتی ہیں۔ پانچ نماز فرض اور ایک واجب یعنی وتر۔ مسئلہ: فدیہ کے بجائے دوسرے سے نماز اور روزہ کا قضا کرا ڈالنا

یا جو قضا ہو گئے ہیں ان کی ادا میں سستی کرنا سخت گناہ ہے۔

مسئلہ: بیماری میں جو روزے قضا ہوئے اگر اس بیماری کے بعد زمانہ صحت اتنا ملا جس میں کل روزے یا بعض روزے قضا رکھ سکتا تھا۔ اسی قدر واجب ہوں گے باقی واجب نہ ہوں گے تو اگر بیس روزے قضا ہوئے۔ دس کی طاقت مل سکی اور قضا رکھنے نہ پایا تا آنکہ مر گیا تو دس روزے کے فدیہ کی وصیت واجب ہوگی۔ مسئلہ: فدیہ کی وصیت ثلث ترکہ سے زائد میں نہیں یعنی تجہیز و تکفین اور قرض سے بچ کر تین سو روپے بچے تو سو روپے سے زائد میں وصیت صحیح نہ ہوگی۔ البتہ اگر بالغ وارث اپنے حصہ میں جائز رکھے تو ان کو اختیار ہے۔ مسئلہ: جب تک روزہ قضا کرنے کی قدرت رہے اس وقت تک فدیہ دینا کافی نہیں۔ بلکہ قضا ہی رکھنا فرض ہوگا۔ ایک مترجم قرآن کے حاشیہ پر وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ کی تفسیر میں جو اس کے خلاف مضمون لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے اس پر عمل حرام ہے۔ اہل علم نے اپنی تحریرات میں اس کی غلطی ظاہر کر دی ہے۔

مسئلہ: اسی طرح جب تک امید صحت اور قدرت ہو فدیہ دینا کافی نہیں۔ البتہ اگر کوئی ایسا مرض ہو کہ اس سے صحت کی امید نہ رہے اور مرض کی حالت میں قوت نہ ہو یا بہت بوڑھا ہو گیا اور قوت روز بروز گھٹتی جاتی ہو۔ تو ایسے شخص کو ادا اور قضا روزہ کے بدلے فدیہ دینا درست ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی نے بارہ مہینے روزے رکھنے کی نذر کرلی تھی اور اب عاجز ہو گیا تو اس کو بھی روزانہ روزے کا فدیہ دینا درست ہے۔

مسئلہ: لیکن مرض و ضعف میں نماز چونکہ اشارہ سے بھی درست ہے۔ اس لیے قضا نمازوں کا فدیہ اس وقت درست ہو سکتا ہے۔ جب اشارہ سے بھی ان کے پورا کرنے کی امید نہ رہے۔ جیسے مرض الموت میں ایسی حالت ہو جاتی ہے مگر اس مسئلہ کو زیادہ تحقیق بھی کر لیا جاوے۔

مسئلہ: اگر کوئی ایسی حالت میں کہ فدیہ کافی نہ ہو۔ اس غرض سے فدیہ دیوے کہ شاید میری وصیت کو وارث پورا نہ کریں اور یہ بھی نیت رکھے کہ اگر صحت و قدرت عود کر آئے تو اس فدیہ کو کافی نہ سمجھوں گا بلکہ نمازیں اور روزے قضا کروں گا تو اس کا مضائقہ نہیں۔

مسئلہ: جو روزہ قسم کے کفارہ میں اس پر واجب تھے حیات میں اس کا فدیہ درست نہیں بلکہ اگر اخیر عمر تک ادا سے عاجز رہے تو مرتے وقت فدیہ کی وصیت کرے۔

مسئلہ : اگر میت بلا وصیت مرجاوے۔ تب بھی ورثہ کا بہت ثواب ہوگا۔ اگر اس کی نماز اور روزہ کا فدیہ ادا کریں۔

مسئلہ : ایک عمل بعض جگہ عوام میں : اسقاط کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے فدیہ ادا نہیں ہوتا۔

مسئلہ : جہاں رقم فدیہ بہت زیادہ ہو اور اس قدر گنجائش ہو نہیں تو بالکل اس کو نظر انداز کرنے سے یہ صورت کریں کہ مثلاً وارث اروپے کسی مسکین کو بہ نیت فدیہ دیں پھر وہ اپنی خوشی سے اس وارث کو وہ رقم ہبہ کر دے۔ یہ وارث پھر اس کو بہ نیت فدیہ کے دیں۔ تو گویا بیس روپے فدیہ میں پہنچے اسی طرح اگر سو بار کیا تو ہزار روپے ادا ہو گئے۔ مگر گنجائش ہوتے ہوئے ایسا نہ کرے۔

مسئلہ : فدیہ میں اختیار ہے خواہ مساکین کو بٹھلا کر کھلا دے۔ خواہ غلہ بقدر صدقہ فطر دیدے یا اتنی قیمت دیدے مگر ایک مسکین کو ایک حصہ سے کم نہ دے۔ زیادہ دینا درست ہے یعنی ایک مسکین کو کئی حصے ایک تاریخ میں دیدینا بھی درست ہے۔

صدقۂ نافلہ کے متعلق کوتاہیاں

(از : اصلاح معاشرہ بصدقۂ نافلہ)

منجملہ ان کے متعلق زکوٰۃ جن کا اوپر سے ذکر چلا آ رہا ہے۔ ایک صدقۂ نافلہ ہے اس میں بھی منجملہ دیگر اعمال کے متعدد کوتاہیاں واقع ہو رہی ہیں۔

شریعت میں صدقاتِ نافلہ کا بھی حکم ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود قدرت علی الحاجۃ ہونے اور مصارف ضروریہ پیش آنے کے محض بوجہ بخل کے بجز زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کے صدقۂ نافلہ میں ایک کوڑی خرچ نہیں کرتے بلکہ بعض نے ان میں سے بعض سے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک فہرست دیدی ہے۔ ہم کو اس سے بھی زیادہ کرنا کیا ضرور۔ تو ایسے لوگ صرف یہی نہیں کہ صدقات نافلہ میں بے رغبت ہیں بلکہ اس سے ترقی کر کے ان کو ناپسند اور ان کو زیادت علی الشریعۃ سمجھتے ہیں۔ یہ شیطان کی بہت بڑی رہزنی ہے جو براہ تعجب دین کے

پھر وہ بھی نیکی ہے۔ اور منکر وہ کو بصورت مستحسن دکھلایا ہے۔ چونکہ منشاء اس کا بخل ہے، اس لئے
ناپسندیدہ ہونا اس ترک صدقہ کا ظاہر ہے اور علاوہ قواعد کلیہ شرعیہ کے جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس کی کسی درجہ میں مہتم بالشان ہونے کی تصریح بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔
ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ۔ یعنی مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی بعض حقوق ہیں۔ اور حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے استشہاد میں اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ وآتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ
والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ وآتی الزکوٰۃ۔ ترجمہ:
اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور
سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو
اور وجہ استشہاد ظاہر ہے کہ آتی المال اور آتی الزکوٰۃ سے علیحدہ فرمایا جس سے معلوم
ہوا کہ یہ علاوہ زکوٰۃ کے ہے۔ اور اس کو صدقات واجبہ کے ساتھ خاص نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ آتی المال
کے بعد مصارف کو بعنوان استحقاق واحتیاج کے بیان فرمانا مشیر اس طرف ہے کہ سوق کلام
ان کے حقوق و مطالبات کو پورا کرنا ہے۔ اور ان کے مصارف زکوٰۃ کی حیثیت سے مذکور نہ ہونے
کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد زکوٰۃ کا مستقلاً بیان ہے جس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ کے علاوہ
جو آتی المال ہے وہ اس حیثیت سے مطلوب ہے کہ ان مصارف کی اعانت ہے۔ اور ظاہر ہے
کہ صدقات واجبہ میں خود وہ تصدق بھی شرعاً مقصود ہوتا ہے۔ اعانت کی یہ خصوصیت
مقصود نہیں ہوتی۔ پس یہ قرینہ ہے اس کا کہ یہ شامل ہے صدقات نافلہ کو بھی۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور بعد استشہاد بالآیت کے اس شبہ کا جواب بھی ہو گیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جو ایک
فہرست دیدی ہے پھر اس سے تجاوز کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جواب یہ ہوا کہ اس فہرست
میں صدقہ نافلہ بھی تو داخل ہو گیا۔ چنانچہ ابھی ظاہر ہوا۔ پھر اگر فہرست سے مراد فہرست
واجبات کی لی جاوے۔ تو اول تو جب دونوں فہرستیں ہم کو دی گئی ہیں پھر وجہ کیا کہ ایک
فہرست کو لیا جاوے اور دوسری کو چھوڑا جاوے۔ دوسرے تجاوز کرنے کے یہ معنی ہی غلط

گیا ہے کہ نوافل کو ادا کیا جاوے۔ اگر یہ ہے تو نوافل کے فضائل مخصوصہ کا کیا جواب ہوگا۔ بلکہ
مطلب اس کا یہ ہے کہ حدود کو نہ چھوڑا جاوے۔ مثلاً جس جگہ صرف کرنا ممنوع ہے وہاں پر
صرف کیا جاوے۔ یا نفل کو بمنزلہ واجب کے واجب سمجھا جاوے۔ پہلا تجاوز عملی و معصیت
ہے اور دوسرا تجاوز اعتقادی اور بدعت ہے۔ اور جب یہ نہ ہو تو وہ تجاوز نہیں ہے۔

اور بعض صدقات نافلہ کے اعتبار سے ایک اور بھی جواب ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ بعضے
ان میں سے تامل کرنے سے فہرست واجبات ہی میں داخل معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کو نفل کہنا
باعتبار ان کی ذات کے قطع نظر خصوصیات سے ہے ورنہ عوارض کے اعتبار سے وہ واجب
ہی ہے۔

"واجبات کی دو قسمیں ہیں"

پس واجبات کی مشہور فہرست مطلق واجب کی فہرست نہیں ہے بلکہ واجبات
موظفہ کی فہرست ہے۔ یعنی یک وہ واجبات ہیں۔ جو فی نفسہ واجب ہے۔ عوارض و
خصوصیات کا اس میں دخل نہیں۔ جیسے زکوٰۃ صدقہ فطر وغیرہ خواہ کوئی مستحق پیش نظر
ہو یا نہ ہو مال میں سے مقدار خاص نکالنا ضروری ہے۔ پھر مستحق کو تلاش کرکے اس تک
پہنچانا ضروری ہے۔ ان کو واجبات موظفہ کہنا چاہیے۔

دوسرے وہ واجبات کہ اگر کوئی مستحق معلوم نہ ہو تو اس کا تلاش کرنا ضروری نہیں۔ اس مرتبہ میں نفل ہی ہیں
لیکن اگر مستحق روبرو آ جاوے۔ اور اس کی احتیاج درجہ اضطرار تک ہو یا کوئی مصیبت دینی عارض ہو جاوے اور اس کی تکمیل
درجہ ضرورت تک ہو تو اس وقت اس پر خرچ کرنا واجب ہوگا۔ لیکن علی الکفایہ نہ کہ علی التعیین۔ مثلاً کوئی
مسافر محلہ کی مسجد میں اترے اور سب اہل محلہ اپنے گھروں میں کھائیں پئیں اور اس کو نہ پوچھیں
تو سب گنہگار ہوں گے۔ اس وقت اس کی اعانت سب اہل محلہ پر اور ان کی اعانت نہ کرنے
کی صورت میں جس کو خبر ہو ان سب پر واجب ہے علی الکفایہ۔

اور اگر کوئی کھانے کو بیٹھا اور کسی نادار کی حاجت سے بہت زائد ہے اور ویسے ہی
کوئی گرسنہ آیا جس کی جان بھوک سے نکل جاتی ہے اور اس نے آکر اس شخص سے سوال کیا

تو حضرت استاذی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کیا کوئی اس کا قائل ہو سکتا ہے کہ اس شخص پر اس سائل کو بقدر ضرورت کھانا دینا واجب نہیں اور یہ وجوب اس وقت علی التعیین ہوگا۔

پس حاصل یہ ہوا کہ بعض صورتیں صدقہ نافلہ کی بھی واجب ہیں اور نفل اور وجوب کے اجتماع کا اشکال ابھی مرتفع کر دیا گیا ہے۔ اور بعض صدقات نافلہ جو ہر حال میں نافلہ ہی رہا کریں ایسے بہت کم نکلیں گے لیکن جتنے بھی ہوں وہ گو فہرست واجبات میں داخل نہ ہوں مگر ان میں جواب سابق جاری ہوگا۔ یعنی ہم کو دوسری فہرست بھی ملی ہے۔ پس دونوں فہرستوں پر عمل کرنا چاہئے اور تارکین صدقہ نافلہ کے ذمہ میں یہ تنبیہ کافی تھی کہ محض بخل کی وجہ سے [illegible] وجہ اس کی یہ ہے کہ جب اس کا بھی کوئی مصلحت بالفعل ہوتی ہے جیسے افتقار و انکسار و اعطے معالجہ عجب و اذلال کے یا عدم حصول خشوع و خضوع یا جسم یا مادہ موجود ونحو ذالک سو وہ مذموم نہیں لیکن یہ ترک اس مصلحت کے وجود تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ ترک متروک ہو جاتا ہے۔ اور یہ مسئلہ فن سلوک کا ہے یہ مقام اس کے ذکر کا نہیں ہے۔ ایسے ترک نوافل کو اصطلاح میں تستر کہتے ہیں۔ یہاں تک بحث تھی ترک صدقات نافلہ کی جو کہ اس کے متعلق ایک کوتاہی ہے۔

"صدقۂ نافلہ میں زیادہ غلو بھی درست نہیں"

ایک کوتاہی اس باب میں اس کے مقابل یہ ہے کہ ان کو اس باب میں اس قدر غلو ہوتا ہے کہ حقوق واجبہ ضائع ہو جاویں۔ گو قرض خواہ روتے پھریں۔ مگر ان کو اس کا شوق ہے کہ کوئی سائل اور صاحب ضرورت محروم نہ جاوے۔ خاص خاص تاریخوں میں خاص صدقات قضا نہ ہوں اور اس پر بعض اوقات خود بھی فخر کرتے ہیں اور دوسرے خود غرض لوگ اور بعضے بے غرض مگر کم فہم لوگ مدح بھی کرتے ہیں اور حدیث وابدأ بمن تعول (اپنے زیر پرورش والوں سے شروع کرو) اس طرز کو ناجائز بتلاتی ہے حقوق واجبہ اہل و عیال کے ہوں یا قرض

خواہوں کے یہ ان نوافل سے مقدم ہے بلکہ اگر کسی کے ذمہ کوئی حق واجب بھی نہ ہو مگر اپنی طبیعت کے انداز سے جانتا ہے کہ ناداری کا تحمل نہ کر سکے گا تو ایسے شخص کو بھی جائز نہیں کہ تمام ذخیرہ مصارف خیر میں صرف کر کے خالی ہاتھ رہ جاوے۔ حدیث: افضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى، بہترین صدقہ وہ ہے جو کہ انسان تمام مصارف ضروریہ سے بے نیاز ہو کر کرے۔ اس پر صاف دال ہے۔ اور اکثر تو ایسے لوگ ریاء یا واقتخاراً خرچ کیا کرتے ہیں۔ سو ان کا مذموم ہونا ظاہر ہی ہے (یہاں چندہ جمع کرنے والوں کو بھی متنبہ ہونا چاہئے کہ ایسے لوگ جو اپنی حیثیت سے زائد جوش میں آکر دینا چاہیں تو یہ حضرات نہ لیا کریں)

صدقہ صرف اللہ کے نام پر دینا چاہئے کسی بزرگ کے نام پر دینا شرک ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی جو صدقہ نافلہ نکالتے ہیں ان کا دل گوارا نہیں کرتا کہ محض حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے خرچ کریں۔ بلکہ وہ ہر چیز کو کسی پیر شہید ولی کے نامزد کر دیتے ہیں۔ سو اگر خود وہ بزرگ ہی اس سے مقصود ہے تو وہ ما اهل به لغير الله۔ الآية (یعنی جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو) میں داخل ہو کر بڑی دور یعنی حد شرک تک پہنچ گیا۔ اور بعض غلاۃ جہلاء کا واقعی یہی عقیدہ ہے۔ سو ایسی چیز کا تناول بھی درست نہیں۔

اور اگر مقصود اس عمل سے حق تعالیٰ ہے اور ان بزرگ کو محض ثواب ہی بخشنا ہے تو وہ اس حد تک تو نہیں پہنچی اور ظاہراً جائز بھی ہے۔ لیکن عوام بلکہ بعض خواص کالعوام کے حالات و خیالات کی تفتیش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ محض ثواب ہی پہنچانے کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ فلاں ولی کو ثواب پہنچے گا تو وہ خوش ہوں گے اور ہماری اس حاجت میں مدد کریں گے خواہ تصرف باطن سے اور یہ عقیدہ بھی ہے اور اس کا بھی قریب شرک ہونا ظاہر ہے۔ اور خواہ دعا سے۔ سو احتمال دعا کا عقیدہ تو ناجائز نہیں۔ لیکن دو عقیدے اس میں بھی فاسد ہیں ایک اس احتمال

کے دفع ہونے کا عقیدہ کرنا کہ جس پر کوئی دلیل نہیں اور یقینی عقیدہ کرنا کذب نفس اور مخالف ہے آیت ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ جس کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ نیز کسی دوسرے کے بعد فرض و تخرج دعا اس دعا کے بالضرور مقبول ہو جانے کا عقیدہ کرنا دعا تو بعض اوقات حضرات انبیاء علیہم السلام کی بھی کسی مصلحت سے قبول نہیں ہوتی۔ تا بغیر انبیاء چہ رسد۔

اس لئے مصلحت یہی ہے کہ جب بزرگوں کو کچھ بخشنا ہو اپنی حاجت کا خیال ان میں نہ ملایا کریں کہ توحید کے خلاف ہے تمنا نہ کرو۔ ورنہ اگر بہت ہی احتیاط کی تو اخلاص کے تو خلاف ہے۔ ایسی مثال ہو گئی کہ کسی زندہ کو ہدیہ یا دعوت سمجھا کر محبت سے دیا۔ دل خوش ہوا پھر معلوم ہوا کہ کسی مطلب کو دیا تو فوراً وہ مکدر ہو جاوے گا۔

صدقہ میں ردی اور خراب چیز نہ دینا چاہئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اکثر لوگ اللہ کے نام کی وہ چیزیں نکالتے ہیں جو کسی کے کام کی نہ رہی ہو۔ مثلاً کھانا جب دیں گے کہ سڑ جاوے کپڑا جب دیں گے کہ گل جاوے۔ وعلی ھذا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون ولستم باخذیہ الا ان تغمضوا فیہ واعلموا ان اللہ غنی حمید۔ ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں۔ ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ تو اور بات ہے اور یہ یقین کر رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں تعریف کے لائق ہیں۔ اس باب میں کافی ہدایت ہے۔ حق تعالیٰ کا اس میں یہ ارشاد ہے:۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون الآیۃ ... تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔ اور اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ پرانا کپڑا مثلاً خدا کی راہ میں دینا ممنوع ہے۔ حدیث میں نیا کپڑا پہن کر پرانا راہ میں دینے کی خود فضیلت آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ برا یہ ہے کہ جب دے تو ناکارہ چیز ہی دے اور اگر اصل عادت تو عمدہ چیز دینے کی ہو۔ اور پرانی بچی چیز بھی دے دیا کرے تو مضائقہ نہیں اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پرانی بھی ہو

کر سکتے ہو۔ پس نیکی بھی نہ کر سکے۔ (اس عذر مروجہ درست نہ ماننا چاہیئے)

وارثوں کو محروم کر کے تمام مال خرچ نہیں کرنا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی صرف وارثوں کو محروم کرنے کے لئے سب مال خیرات کر ڈالتے ہیں۔ بعض اس غلطی کا یہ ہے کہ وارثوں کے لئے چھوڑ جانے کے ثواب کی ان کو خبر نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی موقع پر یہ ارشاد فرمایا ہے۔ ان تذر ورثتک اغنیاء خیر من ان تذرہم عالۃ یتکففون الناس۔ اور تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ دو یہ بہتر ہے تمہارے لئے اس سے کہ تم ان کو فقر کی حالت پر چھوڑ دو اور وہ لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں۔ اور گو وہ حق اضطراری ہے جس میں میت کے قصد کو بھی دخل نہیں۔ لیکن حدیث میں ہے کہ کھیت میں سے اگر کوئی جانور کھا جاوے تو کھیت والے کو ثواب ملتا ہے۔ تو کیا مسلمان وارث جانور سے بھی گئے گذرے ہو گئے۔

کوئی تاریخ متعین کر کے صدقہ دینا بدعت ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض صدقات کو بطریق بدعت خرچ کرتے ہیں۔ جیسے خاص تاریخ کی پابندی سے یا ہیئت کے۔ ہو میں اس کی تفصیل اصلاح الرسوم میں ملاحظہ فرمائی جاوے۔

میت کی کوئی چیز وارثوں کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنا درست نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اکثر شرائط شرعیہ کا لحاظ نہیں کرتے۔ خواہ وہ شرائط ظاہرہ ہوں۔ مثلاً میت کے کپڑے حسب رواج سب نکال کر مدارس و مساجد و مساکین کو دے دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ ترکہ مشترکہ میں جملہ ورثاء کا اذن شرط ہے۔ وہ اذن بھی ایسا جو طیب خاطر سے ہو شرم اور لحاظ اور پابندی رسم کی مجبوری سے نہ ہو۔ اور نابالغوں کا اذن بھی معتبر نہیں یہ بات بھی بہت مہم ہے۔ اور خواہ شرائط باطنہ ہوں مثلاً قبول ہونے کی یہ شرط ہے کہ ریا و افتخار سے نہ ہو مال حرام سے نہ ہو اس میں بہت بے پروائی ہے۔ اکثر نام آوری کے لئے خرچ ہوتا ہے۔ اکثر سود و رشوت سے ایک

کاموں میں لگاتے ہیں اور یہ بھی شبہ کرتے کہ حلال اس زمانے میں کہاں ہے۔ تو کیا نیک کاموں
میں خرچ کرنا بالکل ہی چھوڑ دیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ اس زمانہ میں حلال نہیں۔
ابواب فقہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ معاملات میں بہت توسع ہے۔ پھر اگر حلال غالب بھی ہو
تب بھی صرف کرنا امور خیر میں جائز ہے۔ تو اس میں جتنا جز حرام ہے۔ اس کی تفصیل کتاب میں منقول
ہوگا۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ جو شخص ذرہ برابر
نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور بعبارت تفہیم)

مسئلہ: علاوہ صدقات واجب کے کبھی کبھی تھوڑا نفل صدقہ بھی نکالا کرو اور حاجتمندوں
کو دیا کرو اور نیک کاموں میں خرچ کیا کرو۔ مسئلہ: نفل صدقہ میں یہ خیال کیا کرو کہ کسی کا
حق واجب ضائع نہ ہو۔ مثلاً اپنے اہل و عیال کو پہلے دو۔ کسی کا قرض ہو اس کو پہلے
دو۔ جب ان سب سے بچے نیک راہ میں اٹھاؤ۔

مسئلہ: بعض نفل صدقہ بعض خاص موقع پر واجب ہو جاتے ہیں۔ جیسے کوئی بھوکا
آجاوے۔ تو ہمارے پاس کھانا زیادہ موجود ہو تو اس کی امداد واجب ہوگی۔ یا کہیں شاعت
علوم دینیہ کی ضرورت ہو۔ اور وہاں مدرسہ قائم کیا جاوے۔ تو سب پر واجب ہوگا کہ چندہ
علوم دینیہ کی ضرورت ہو اور وہاں مدرسہ قائم کیا جاتے تو سب پر واجب ہوگا کہ چندہ سے اعانت کریں۔ مسئلہ: اتنا
خیرات نہ کرو کہ خود محتاج ہو کر بیٹھ رہے۔ اور پھر بے صبر ہو سکے۔ اس لئے کسی علل میں مبتلا ہو جاوے۔ مسئلہ: جو
شخص اپنی گنجائش سے زیادہ دے اپنے والے کو چاہئے نہ لے اور سمجھا دے۔ مسئلہ: بعضے لوگ بزرگوں کو اس لئے
ثواب پہونچاتے ہیں کہ وہ خوش ہو کر ہمارا کام کر دیں گے۔ سو یہ شرک ہے اور اگر یہ
سمجھے کہ دعا کریں گے اور وہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ تو یہ دونوں مقدمات بھی غلط ہیں۔ نہ
تو کہیں یہ ثابت ہے کہ وہ ضرور دعا کریں گے۔ اور نہ یہ ثابت ہے کہ دعا ضرور قبول ہوگی۔
پس ایسی مشکوک بات کا پختہ یقین کر لینا بھی گناہ ہے۔ مسئلہ: اللہ کی راہ میں جو
چیز دی جاوے وہ اچھی کارآمد ہونا چاہئے۔ ایسا شخص کبھی پرانے پھٹے بھی دیدے۔

ثواب زیادہ ہے۔ ہمیشہ تنگی کو چھانٹ کر دینا برا ہے۔ مسئلہ: جس کے وارث موجود ہوں۔ اپنا
تمام مال خیرات میں نہ لٹا دیوے۔ خاص کر جب وہ حاجت مند ہوں۔

مسئلہ: بعض بدعات کا رواج ہو گیا ہے۔ ان میں صرف کرنے سے ثواب نہیں ہوتا
پس ان میں خرچ نہ کرے۔ مسئلہ: مردہ کے سب کپڑے اللہ کی راہ میں اس طرح دیدینا کہ نہ غیر
حاضر وارثوں سے اجازت لی جاوے۔ اور نہ نابالغوں کے حصے جدا کر دیا جاوے۔ جیسا عام
رواج ہو رہا ہے جائز نہیں۔

مسئلہ: صدقہ قبول اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس میں نمائش نہ ہو۔ فخر و قصد شہرت
نہ ہو۔ اور مال بھی حلال ہو۔ اگر کسی کے حلال خالص نہ ہو۔ تو حلال غالب ہو۔ مثلاً دس روپے میں
اگر چھ حلال۔ اور چار حرام ہوں۔ اور ان سب روپیوں میں تمیز نہ رہے تو مجموعہ کو نیک کام میں کرنا
جائز ہے۔ گو ان چار روپیوں کے کمانے کا گناہ الگ ہوگا۔

مختلف مالی تبرعات کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ تبرعات مالیہ متفرقہ)

منجملہ تطوعات مالیہ صدقہ زکوٰۃ کے اور بھی بعض حالتیں ہیں جن میں مختلف کوتاہیاں ہوتی ہیں مختصراً ان کا بیان بھی مناسب مقام ہے۔ ایک ان میں سے سائل کو دینا ہے۔ اس میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ بعض دیتے ہیں اور بعض نہیں دیتے ہیں۔

سائل سے بے رخی اور اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہیے بلکہ اسے دیکھ کر اللہ کی نعمت یاد کرنا چاہیے۔

چنانچہ بعضے تو بوجہ بخل یا بے دلی کے سائل سے نہایت نفرت اور بے رخی کرتے ہیں۔ گو وہ کیسا ہی محتاج یا اپاہج ہو۔ اس کے حال پر ذرا توجہ نہیں کرتے بلکہ بعضے تو بالکل اس سے تمسخر یا اس کے ساتھ سختی کرتے ہیں۔ دھکے دلوا دیتے ہیں۔ جھڑکتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں سائل کا بڑا حق آیا ہے۔ درحقیقت سائل کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرنا چاہیے کہ ہم کسی کے دروازے پر سائل نہیں ہوئے۔ اور اس نعمت کے شکریہ میں سائل پر رحم اور اس کی اعانت کرنا چاہیے۔

اس مضمون کو شیخ تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے نظم میں خوب ادا فرمایا ہے۔

دو خواہندہ ز بر در دیگراں

بشکرانہ خواہندہ از در مراں

البتہ ضروری نہیں کہ جو مانگے وہ ضرور ہی دے دے۔ یہ اس کی ضرورت اور اپنی گنجائش پر ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے دینے کو نہ ہو تو اس کو نرم جواب دے کر سمجھا دے کہ اس وقت میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ اگر دوسرے وقت وسعت ہوئی اور تمہاری حاجت اس وقت تک رفع نہ ہوئی تو ان شاء اللہ تعالیٰ خیال رکھوں گا۔

صدقہ دے کر احسان جتلانا ممنوع ہے

دو۔ بعضے لوگ دیتے تو ہیں لیکن دے کر اس کو خریدنا چاہتے ہیں یعنی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہمارا احسان مند ہو، ہمارا شکریہ ادا کرے، جب ہم سے ملے ہم کو سلام کرے۔ اگر ہم کچھ حکم دیں تو وہ اس کا امتثال کرے اور اگر سائل کی طرف سے کسی امر میں کوتاہی ہو تو اس کو سخت تعجب ہوتا ہے اور ناگوار گزرتا ہے اور آئندہ کو سلسلہ احسان کا بند کرنے کا ارادہ کر دیتے ہیں بالخصوص جب اس کی طرف سے کسی معاملہ میں، گو اس میں وہ سائل ہی حق پر ہو، صفائی کا برتاؤ عمل میں آوے تو اس وقت تو صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ بڑا نمک حرام ہے ہم نے کس کس طرح اس پر احسان کئے اور اس نے ہمارا خیال نہ کیا۔

اس طرح بے مروتی کی صورت ذرا جس کی مذمت قرآن مجید میں آتی ہے وہ یہی ہے۔ اس سے صدقہ کا اجر ضائع ہو جاتا ہے حق تعالیٰ شانہ نے ایسے دینے والوں کی مدح و فضیلت بیان فرمائی ہے جو دے کر اس کا صلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔ لوجہ اللہ خدمت کرنا ہی ہے — قال اللہ تعالیٰ انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا۔۔۔۔ ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے اس کا عوض چاہتے ہیں اور نہ اس کا شکریہ (ترجمہ بیان)

بعضے اس کے مقابل یہ افراط کرتے ہیں کہ ہر سائل کو دینا فرض سمجھتے ہیں بعضے تو آغا خر

کے واسطے کہ نام ہوگا کہ فلاں شخص کے پاس سے کوئی سائل محروم نہیں آتا اور بعضے بوجہ غایت تدین
وقلت علم کے زائر کی حاجت روائی کو فرض شرعی سمجھتے ہیں۔ اور بعضے بوجہ طمع یا خوف دنیوی
کے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ان بردوں میں کوئی کامل ہو۔ اس کی خدمت کرنے سے ہم مالا مال
ہوجاویں گے۔ مال میں اولاد میں ترقی ہوگی۔ اور اگر نہ دیں گے۔ شاید بددعا کریں۔ یا ناراض
ہوجاویں۔ تو ہم برباد ہوجاویں گے اور ان اغراض کے سبب (جن کا منشا مختلف ہے
کہ بعض میں تفاخر بعض میں کثرت تمدن ہے اور قلت العلم بعض میں غرض دنیوی) یہ لوگ
اکثر قرضدار بھی ہوجاتے ہیں اور اس قرض کا خمیازہ کبھی اپنے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کبھی اولاد
کو کبھی ادا نہیں ہوتا اور آخرت کا گناہ سر پر رہتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں اجازت دی
کہ خود مفلس ہوجاؤ مگر سائل کا پیٹ بھرو۔ قال اللہ تعالیٰ ولا تجعل یدک مغلولۃ الیٰ عنقک
اور نہ رکھو اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ۔ اس میں تعریض مذکور بخل کی اصلاح ہے)۔
ولا تبسطها کل البسط فتقعد ملوما محسورا۔ اور نہ کھول دے اس کو بالکل، پھر تو بیٹھ رہے
الزام کھایا ہارا ہوا۔ یعنی ایسی اشاعت دستی نہ دکھلاؤ کہ پھر بھیک مانگنی پڑے۔

کمانے کے قابل شخص کو سوال کرنا جائز نہیں

بلکہ بعض اوقات باوجود اپنی تنگدستی کے بھی بعض سائل کو دینا بجائے ثواب یا
جائز کے گناہ اور ناجائز ہوتا ہے۔

فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر ایک سائل قوی مکتسب ہو۔ یعنی ہاتھ پاؤں سے درست
ہو اور معاش کی قدرت رکھتا ہو تو ایسے سائل کو سوال کرنا بھی حرام ہے اور سوال پر اس کو
دینا بھی بدیں وجہ کہ اعانت علی المعصیت ہے۔ ناجائز ہے اور جب ناجائز ہوا۔ تو ایسے دینے
سے وہی مثل ہوگئی۔ نیکی برباد گناہ لازم اور اکثر تو بلا ٹالنے کے لئے اس طرح دیتے ہیں کہ ثواب کی
بھی نیت نہیں ہوتی۔ تو اس صورت میں ثواب نہ ملنا اور زیادہ ظاہر ہے۔

اور ان لوگوں نے ایک غلطی یہ کی کہ یہ تو سمجھ لیا کہ ہم پر سے بلا ٹل گئی لیکن یہ نہ سمجھا کہ ہمارے
دینے سے سائل پیچھے لگا کر لپٹنے سے اور سر ہونے ہی سے مانگتا ہے۔ تو یہ سمجھ کر اور بھائی

یہ ذکر تھا سائل کے دینے نہ دینے کے متعلق کوتاہیوں کا، اور ایک ان ہی احوال مالیہ متعلقہ بالغیر میں سے قرض مانگنے والے کو قرض دینا ہے۔ اس میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔

اگر گنجائش ہو تو قرض مانگنے والے کو قرض دینا چاہیے

ایک یہ کہ بعضے لوگ باوجود اس کے کہ اپنے پاس حاجت سے زائد رقم رکھی ہے یا آسانی انتظام کر سکتے ہیں اور مانگنے والا سخت حاجت مند ہے اور بے اعتبار بھی نہیں مگر پھر بھی غایت بے رخی سے قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بعض دفعات جھوٹ بول دیتے ہیں کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وجہ اس کی یا بخل ہے یا بے رخی ہے یا جہل اور یہ سمجھتا ہے کہ قرض دینے سے فائدہ کیا ہوگا اس لئے نہ دینا تجویز کرتے ہیں اگر بخل یا بے رخی ہے تو اس کا مذموم ہونا ظاہر اور مسلم ہی ہے محتاج بیان نہیں اور اگر جہل ہے تو اس کا فائدہ سمجھانا ضروری ہے۔ تاکہ اس علم سے وہ جہل مرتفع ہو جاوے سو اول تو جس قلب میں ترحم کا جوش ہوتا ہے وہ اس وقت فائدہ کو بھی نہیں سوچتا خود ترحم حامل علی الاعانت ہوتا ہے۔ کیا جو شخص اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے تو اس میں فائدہ دینی ہے دنیا کا یا آخرت کا۔ مگر کیا پرورش کے وقت اس فائدہ کو سوچتا ہے کیا اگر فائدہ نہ سوچے تو پرورش نہ کرے گا۔ پس مسلمانوں میں باہم وہی ترحم تو ادا ہونا چاہیئے جو اقارب میں ہوتا ہے۔

اگر بدون فائدہ سوچے ہوئے قرض دینے کی ہمت نہ ہو تو فائدہ بھی سمجھ لینا چاہیئے اور گو فائدہ دنیوی بھی ہے مثلاً ممنون کے قلب میں محسن کی محبت پیدا ہونا باہم الفت و ہمدردی بڑھنا لیکن مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے فائدہ دنیویہ کو مطمح نظر نہ بنانا چاہیئے اس لئے اس سے قطع نظر کر کے فائدہ اخرویہ سمجھنا چاہیئے اور وہ ثواب ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور پر نور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس گنا ثواب ملتا ہے اور قرض دینے سے اٹھارہ گنا اور حدیث میں اس کی وجہ بھی آئی ہے کہ صدقہ تو وہ شخص بھی مانگ لیتا ہے جس کو حاجت نہ ہو۔ مگر قرض بدون حاجت کے [illegible] اور حاجت بھی اکثر اضطراری ہوتی ہے، کیونکہ لوگوں کو اپنی آبرو کا لحاظ ہوتا ہے یعنی غالب عادت یہی ہے۔ پس صدقہ دینے میں ضروری نہیں کہ رفع اضطرار ہوا ہو اور قرض دینے میں رفع اضطرار ہوتا ہے اور اضطرار اور پریشانی کو دفع کرنا ظاہر ہے کہ کس قدر عظیم راحت پہنچانا ہے۔

سود کرد یا بدایں جنس بازار را
کہ جز یک گل بحسب رنگ گلزار را

تیر جاں بست عمر و عہد بپایاں دہد
آنکہ جاں در دست حبیب بداں دہد

اور یہ عدد تو بطور مثال کے فرض کیا گیا ورنہ جب وہ قرض میں صرف ہو گی حد نہیں لقولہ
تعالیٰ۔ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء
واللہ واسع علیم ۔
انھیں صدقات یعنی مہربانی میں ہر صورت۔ وہ اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے۔ اور اللہ
بہت بخشش کرنے والا ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔
تو قرض میں بھی بارہ سو ساٹھ کی مدد ہو گی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ توقع ہے۔ کیا اس کو
بھی نا حق کہے گا۔

رہ گیا تضاعف ثواب قرض میں ثواب صدقہ کی تقریر کی تفصیل میں جناب نے طرز خود کا حوالہ
ہے بحیثیت صدقہ ہونے کی قید اس لئے لگائی گئی کہ اس سے کوئی نہ سمجھ جاوے کہ قرض کا ثواب عملی
مطلق صدقہ سے مضاعف ہوتا ہے۔ اور یہ سمجھ کر یا تو صدقہ کی جگہ بھی قرض ہی دینے لگے۔ اور
یا صدقہ میں بے رغبتی ہو جاوے۔ اور اس میں خسارہ دیکھے۔ سو یہ بات ہے کہ مختلف احکام
مختلف حیثیات سے ہوتے ہیں۔ سو ایک حیثیت سے تو جیسا کہ ذکر ہوا قرض کا ثواب زیادہ ہے مگر
دوسری حیثیات سے صدقہ کا ثواب قرض سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً قرض میں واپسی ہوتی ہے۔
صدقہ میں واپسی نہیں ہوتی۔ اور اس وجہ سے صدقہ لینے والے کے قلب پر کوئی بار نہیں رہتا۔ اور
قرض لینے والے کے قلب پر بار رہتا ہے۔

ایک خدشہ کا ازالہ

اور ہم نے قرض دینے میں فائدہ دنیویہ بیان کیا ہے کہ باہم الفت و محبت و ہمدردی
بڑھتی ہے جو بیہ ذوہ مسعود نہیں۔ مگر چونکہ وہ قطعی ہے اس لئے اس پر کوئی خدشہ واقع ہو۔

تو اس کا قطع کرنا ضروری ہے۔ تو اس میں ظاہراً ایک خدشہ ہے وہ یہ کہ ہم تو کثرت سے اس کے خلاف یہ دیکھتے ہیں کہ قرض دینے سے بجائے الفت کی توقع ہو جاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے باہم رنج و کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک تجربہ کار بزرگ کا ارشاد ہے۔

صدوست ان قرض دستان ہم حب

فان الصدیق من معسر من الحبیب

تو کیا فصل کو آلۂ وصل کہنا کیسے صحیح ہوگا۔ دفع اس خدشہ کا یہ ہے کہ یہ قطع محبت اثر قرض کا نہیں ہے اس کا اثر تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی ازدیاد محبت والفت۔ بلکہ یہ اثر مستقرضین یعنی قرض لینے والوں کی بدتمیزی کا ہے۔ وہ یہ کہ اکثر لوگوں کی حالت دیکھی جاتی ہے کہ قرض لے کر بے فکر ہو جاتے ہیں۔ باوجود گنجائش کے اور تمام فضول کاموں کے قرض کے ادا کا اہتمام نہیں کرتے۔ بعضے تو بہت ہی ٹال کر دیتے ہیں اور بعضے دیتے ہی نہیں۔ اگر تقاضا کیجئے برا مانتے ہیں۔ اور ان کی اس حرکت سے مقرض یعنی قرض دینے والے کو کلفت ہوتی ہے۔ اور جب یہی کلفت روز مرہ بڑھتی تک پہنچے تو ضرور اس کا اثر یہ ہوگا کہ محبت قلب سے نکل جاوے گی اور رنج و شکایت پیدا ہو جاوے گی۔ تو اس بے عنوانی کے اثر کو قرض کی طرف منسوب کرنا بڑی غلطی ہے۔ پس خدشہ رأساً و اساساً منقلع و منقطع ہو گیا۔

لیکن مقرض کو کلفت سے تنگ دل ہو کر قرض دینے کا سلسلہ بند نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ بھی اجر سے خالی نہیں۔ احادیث میں اس سے کم تر تنگ دلی پر وعدۂ ثواب آیا ہے کہ اگر کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جاؤ اور اس کی تلاش میں تھوڑی پریشانی ہو، پھر وہ مل جاوے تو اس میں بھی ثواب ہے۔ تو قرض وصول نہ ہونے پر یا وقت پر وصول نہ ہونے پر تو اس سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔ تو اس میں اس سے زیادہ اجر کیوں نہ ملے گا۔ اس لئے بقدر تحمل اتلاف کو بھی برداشت کر لینا چاہئے لیکن اس کے ساتھ قرض لینے والے کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ اس کو بھی چاہئے کہ قرض دینے والے کا احسان مانے۔ اور اس کو تکلیف نہ دے۔ اور وقت پر اس کی امانت پہنچا دے تاکہ پھر بھی قرض ملنے کا منہ رہے۔

اور اسی نادہندگی کی بدولت آجکل قرض نہیں ملتا۔ پھر کافروں سے سودی لیتے ہیں۔

دو تباہ ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اگر وقت پر دوسرے کا حق پہنچ جایا کرے۔ تو بہت مسلمان ایسے ہیں کہ وہ خود
اپنی مصلحت سے اپنے روپیہ کا قرض پر چلنا بہت زیادہ پسند کرتے ہیں کہ حفاظت سے بچتے ہیں۔ اور
تجارت کو یہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ یا تو بوجہ احتمال خسارہ کے اور یا بوجہ توحش تعلقات کے۔ یا بوجہ
عدم مناسبت کے تو ایسے لوگوں کا روپیہ قرض میں آسانی سے ملتا ہے اور غیر قوموں کو سود دے کر
تباہ و برباد ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ لیکن معاملات خراب ہیں کہ لے کر دینا نہیں چاہتے۔ وہ چار
جگہ ٹھوکر کھا کر سب سے متوحش ہو جاتا ہے اور بقول شخصے دودھ کا منہ جلا چھاچھ کو پھونک پھونک
کر پیتا ہے۔ وہ کسی کو بھی قرض نہیں دیتا۔ اور ایک باب عظیم خیر کا بند ہو جاتا ہے جس کا وبال ان
نادہندوں کی گردن پر ہوگا۔ اس کوتاہی مذکورہ کا عمل تو قرض نہ دینا ہے۔ جس کا مفصل
بیان ہو چکا۔

نادار کو مہلت دینا قرآن کی رو سے واجب ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ قرض تو دیتے ہیں لیکن تقاضا بے ڈھب کرتے ہیں وقت آنے پر مہلت
دینا جانتے ہی نہیں۔ حالانکہ نص قرآنی وان کان ذو عسرة فنظرة الی میسرة۔ اور اگر وہ تنگ
دست ہے تو اس کو کشادگی تک مہلت دینی چاہئے۔
تنگ دست نادار کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کی بھی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔

رہن کی چیز سے نفع حاصل کرنا سود میں داخل ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے بدون سود کے قرض نہیں دیتے۔ پھر سود کے طریقے مختلف ہیں۔
بعضی صورتیں تو وہ ہیں جن کو یہ لوگ بھی سود سمجھتے اور بچتے ہیں یعنی آنہ دو آنہ روپیہ پر لینا یا ٹکہ روپیہ
پر لینا۔ اور بعض وہ صورتیں ہیں جن کو سود نہیں سمجھتے۔ مگر واقع میں وہ سود ہیں۔ جیسے رہن رکھ کر
اس سے نفع حاصل کرنا۔ اس کا سود ہونا مع جواب شبہات عوام و خواص کے رسالہ صفائی معاملہ
میں احقر نے ثابت کر دیا ہے۔ اور بھی تاجروں میں بہت سی صورتیں تجارت میں مروج ہیں ان میں دونوں قسم
کے سود لینے والے ہیں بعضے ایسے جری ہیں کہ اس کو حلال سمجھتے ہیں۔ کوئی بعض عبارت فقہیہ سے

بزعم خود تمسک کرتا ہے۔ کوئی تمدنی و قومی مصلحتوں کو شریعت پر مقدم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کوئی حربی کی روایت کو پیش کرتا ہے۔ علمائے شکر اللہ تعالیٰ سعیہم اللہ تعالیٰ ان کی کوشش سے بدلہ دے، نے ان سب کی اچھی طرح اپنی تحقیقات سابقہ و کتابوں میں خدمت کر دی ہے، بندہ نے بھی بقدر ضرورت رسالہ صفائی معاملات میں جس کا اوپر حوالہ ہے اور رسالہ تحذیر الاخوان میں اور اپنی تفسیر بیان القرآن تحت آیۃ یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوٰ الخ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود، میں اس کی کافی بحث لکھ دی ہے۔ دراصل کا مطالعہ منصف کے لئے انشاء اللہ کافی ہے۔

اور سود کی ان صورتوں میں سے کوئی صورت ظاہر میں بھی تو کسی شاید فقیہ پر منطبق نہیں۔ بجز ایک صورت بیع بالوفاء کے اور ایک صورت اس کی بھی خارج از حد لغو ہے۔

بیع بالوفاء کی تحقیق

تفصیل یہ ہے کہ اس وقت کے عرف میں دو معنے بیع بالوفاء کے مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ زید نے عمرو سے کہا کہ ہم کو ایک ہزار روپے قرض دے کر ہمارا باغ رہن رکھ لو اس شرط پر کہ اگر ہم دس سال کے اندر ہزار روپیہ ادا کر دیں تو اپنا باغ چھڑا لیں ورنہ اگر نہ ادا کریں تو وہ باغ اسی ہزار روپے میں تمہارے ہاتھ بیع ہے۔ دوسرے یہ کہ زید نے عمرو سے کہا کہ تم ہمارا باغ ہزار روپے میں خرید لو اور زر ثمن ہمیں دے دو۔ اور یہ وعدہ ہے کہ اگر ہم دس سال میں تمہارا زر ثمن واپس کر دیں تو تم ہمارا باغ واپس کر دو۔ اور بیع کا اقالہ یعنی فسخ کر دو۔

سو اول معنی کے اعتبار سے تو بالاجماع حرام اور سود ہے اور دوسری صورت کو بھی فقہائے متقدمین نے منع کیا ہے لیکن بعض متأخرین نے لوگوں کو مبتلائے سود دیکھ کر اجازت دے دی ہے۔ اگر کسی شخص کا دل بوجہ عنایت بے مروتی کے ویسے قرض دینے کو گوارا نہ کرے۔ اور بوجہ ضعف قوت تقویٰ کے وہ متقدمین کے قول کو بھی نہ لے۔ تو بجز سود کی اور صورتوں سے بیع بالوفاء دیعنی یا بمعنی ثانی بہتر غنیمت ہے کہ حرمت متفق علیہ تو نہیں لوگوں کی کم ہمتی پر نظر کر کے بادل ناخواستہ کہتا ہوں کہ خیر اسی کو کر لیا کریں اور دل سے تو بچیں۔ یہ بحث تھی قرض کے متعلق کوتاہیوں کی۔

کوئی چیز عاریت دینے میں بخل نہ کرنا چاہیے

اور ایک ان اعمال مالیہ مقصودہ یا مذکورہ میں سے کسی کو کوئی چیز عاریۃً دینا ہے۔ اس میں بھی بعض لوگ بہت بخل کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس میں بخل کرنے کو ناپسند اور اعمال منافقین سے فرمایا ہے۔ حیث قال فویل للمصلین الذین ہم عن صلوتہم ساہون الذین ہم یراؤن ویمنعون الماعون۔ سو ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھے ہیں جو ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیز تک نہیں دیتے۔

اور اسی قسم میں سے وہ چیز جو بطور رعایت نہ مانگی جاوے بلکہ بطور تملیک ہی مانگی جاوے۔ لیکن وہ بہت کم قیمت جیسے ایک ذرہ نمک جیسے ایک لوٹا پانی جہاں پانی کی فراغت ہو۔ جیسے ایک مٹی گلاس اور عاریت جیسے انگیٹھی، چھلنی، دو چمٹا، قلم بنانے کو چاقو، ایک خط لکھنے کے لیے قلم دوات ومثل ذالک البتہ اگر کوئی ضرر ہو۔ مثلاً ایک شخص کا تجربہ ہو گیا ہے کہ وہ چیز لے کر نہیں دیتا، یا خراب کر دیتا ہے، یا بے پروائی سے کہیں ڈال دیتا ہے اہتمام کر کے رکھا نہیں کرتا تو ایسے شخص کو عاریت دینے سے انکار کر دینا جائز ہے لیکن کم قیمت چیز کے دینے سے بھی انکار نہ کرے۔

ان طاعات مذکورہ کے علاوہ اور بھی تطوعات مالیہ ہیں کہ وقتاً فوقتاً ان کو عمل میں لانا موجب نفع خلائق ہے۔ جیسے مہمانوں کی خدمت استادوں کی اور پیروں کی خدمت، دوستوں کو ہدیہ دینا، روزہ داروں کے لئے افطاری لے آنا، اقارب کے ساتھ ہمدردی کرنا۔ اور بعض صورتوں میں اقارب کی خاص خدمات والنفقہ واجب ہے۔ جس کی تفصیل کتب فقہیہ میں مذکور ہے بالخصوص جو صدقات جاریہ ہیں۔ جیسے مساجد کی امداد تعمیر یا لوٹا بوریہ وغیرہ سے مدارس اسلامیہ کی امداد۔ کنواں بنا دینا، پل بنا دینا، سایہ دار درخت لگا دینا، قرآن مجید یا کتب دینیہ وقف کر دینا۔ ومثل ذالک کہ ان سب کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا جاتا ہے۔

اب میں طاعات مالیہ کی فہرست میں ان مذکورات بعد الزکوٰۃ پر اکتفا کرتا ہوں۔ طالب دین صاحب فہم اور مشترک صورتوں کو اس سے بخوبی سمجھ کر عمل کر سکتا ہے۔

میت کے معاملہ کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ میت)

یہ معاملے تین قسم کے ہیں۔ ایک قبل الموت (یعنی حالت مرض میں) دوسرے وقت الموت (یعنی موت کے بہت قریب) تیسرے بعد الموت (یعنی مرنے کے بعد جب تک اس کے متعلق کوئی تذکرہ یا کوئی کارروائی جاری رہے) اور ان تینوں قسموں میں مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔ جو اختصار کے ساتھ ذکر کی جاتی ہیں۔

حالتِ مرض

حالت مرض میں بھی حتی الامکان نماز کی پابندی ضروری ہے

اس میں ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ بوجہ نہایت ترحم مریض کو نماز کے وقت کی اطلاع نہیں کرتے اور نماز پڑھنے کے لئے اس سے نہیں کہتے کہ اس کو تکلیف ہوگی۔ بعضے مریض تو خود ہی جاہل یا کاہل ہوتے ہیں اگر پہلے سے نماز کے پابند ہوں مگر مرض میں اس وسوسے سے کہ کپڑے خراب ہیں، بدن ناپاک ہے یا صاف نہیں ہے۔ یا یہ کہ وضو و غسل نہیں کیا جاتا۔ اور تیمم کو دل نہیں گوارا کرتا۔ اور اس سے

طبیعت صاف نہیں ہوتی۔ وضو نہ غسل۔ نماز قضا کر دیتے ہیں۔ یہ تو جہل ہے۔ بعض کم ہمتی سے کہ کون اہتمام کرے تیمم کا بار بار سیدھا کرنے کا کہ اس میں تکلیف ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ تحمل سے زائد نہیں۔ مگر کسی قدر آرام کو فوت ہوتا ہے۔ اور دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اچھے ہو کر سب پوری کر لیں گے۔ اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ کاہلی ہے۔

اور علاج اس کا یہ ہے کہ اس کو سمجھایا جاوے کہ شریعت نے ہر حال میں آسانی کی رعایت کی ہے۔ بدن یا پارچہ کا صاف ہونا تو کچھ فرض نہیں اگر میلے ہیں ہونے دو۔ اسی طرح نماز پڑھو اور اگر ناپاک ہے تو ان کے پاک کرنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ تو پاک کرنا کیا دشوار ہے۔ آخر تھوڑی بہت مشقت سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں۔ چنانچہ مرض میں دوا پینا کیا مشقت نہیں؟ بعض اوقات کروٹ بدلنی مشقت ہے مگر مصلحت بدنی کے لئے اس کو گوارا کرتے ہیں۔ مگر نماز کے لئے بھی کہ مصلحت روحانی ہے۔ جس کی رعایت بدن سے بھی اہم اور اقدم ہے۔ کسی قدر مشقت گوارا کرلی جاوے۔ تو کیوں گرانی ہے۔ اور اگر پاک ہونے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ تو بدون پاک کئے ہوئے نماز پڑھ لو کہ شرع کی اجازت ہے۔ صرح الفقہاء بہ اور وضو اور غسل اگر نہیں ہو سکتا تو تیمم کی اجازت ہے اور اگر وضو ہو سکتا ہو اور غسل نہ ہو سکتا ہو تو وضو کر لو اور بجائے غسل کے تیمم کر لو اور طبیعت کا صاف ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں اور اگر نماز پڑھ لی تو اس سے طبیعت تو یوں ہی صاف ہو گئی اگر آدمی کو حس ہو تو معلوم ہو کہ اس سے الٰہی گندگی اور میل ہو جاتی ہے۔ یہ جہل کا علاج ہے۔

اور ناپاک کپڑے اور بدن کے پاک کرنے کے متعلق جو بھی مضمون ختم کیا ہے وہ علاج ہے کاہلی کا بھی کہ کم ہمتی مشقت تو ہر کام میں ہوتی ہے مثلاً ناگوار دوا پیتے ہی ہیں بلکہ ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات غذا کھانے میں بھی بعض مشقتیں لاحق ہو جاتی ہیں مثلاً مرچ لگ گئی یا جل گیا۔ لقمہ گلے میں اٹک گیا یا شوربے وغیرہ کا بلکہ بعض اوقات پانی کا پھندا پڑ گیا۔ کیسی بری حالت ہو جاتی ہے بعض اوقات پان کھانے میں چونا زیادہ ہو گیا یا تیز ہوا۔ اور منہ اور زبان کے ٹکڑے اڑ گئے مگر ان عارضی مشقتوں کے سبب کوئی بھی کھانا پانی نہیں چھوڑتا اگر کسی مریض کو کہا جاوے کہ تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر اگر فلاں شخص سے جا کر ملو جو کہ یہاں سے ایک فرلانگ پر ہے تو تم کو دس روپیہ یا سو روپیہ یا ہزار روپیہ مل جاویں تو اس وقت بیماری

شفقتیں راحت معلوم ہونے لگیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں کا جو آئین قدرتی نہیں رکھتا خصوصاً جبکہ
دنیوی کاموں سے بہت زیادہ ان دینی کاموں میں سہولت رکھی گئی ہے۔ چنانچہ جب کھڑے نہ ہو سکیں
بیٹھ کر پڑھیں۔ اگر بیٹھ کر نہ پڑھ سکیں تو لیٹے لیٹے پڑھیں اور رکوع سجدہ سر کے اشارہ سے
کریں۔ اور ایسا شاذ و نادر ہے کہ اس قدر ضعف ہو جاوے کہ سر سے بھی اشارہ نہ کر سکیں لیکن
اگر اتفاق سے ایسی نوبت آجاوے تو پھر شریعت کی سہولت دیکھئے کہ نماز کا مؤخر کر دینا اور بعد
میں قضا کر لینا اس حالت میں جائز فرما دیا۔ پس ان سہولتوں کے بعد کسی کے پاس کیا عذر
ہے اور یہ خیال کہ اچھے ہو کر قضا پڑھ لیں گے نہایت ہی جسارت کا خیال ہے۔ کیا ان کے پاس کوئی
سند پروانہ اس معاہدہ کا ہے کہ یہ اس مرض سے ضرور اچھے کر دیئے جاویں گے۔ ممکن ہے کہ
یہ ان کا آخری مرض ہو۔ مرض میں بوجہ اس کے کہ ہر مرض پیام موت ہے۔ آدمی کو زیادہ تنبیہ
اور تہیۂ آخرت کی طرف زیادہ توجہ چاہئے۔

شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

یہ تو ان مریضوں کا ذکر تھا جن کو خود ہی جہل یا کسل سے نمازوں کا اہتمام نہیں ہوتا۔ بعض
مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو پورا اہتمام ہے لیکن مرض کے غلبہ سے ان کو پورے طور سے اوقات وغیرہ کی
اطلاع نہیں ہوتی یا نماز کے وقت پر نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے یا غایت ضعف سے آنکھیں بند ہو کر غفلت
سی ہو جاتی ہے لیکن اگر ان کو نماز کے لئے آگاہ کیا جاوے تو ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ تیمار دار کے لوگ
اس وجہ سے کہ ان کو اس مریض کی راحت جسمانیہ کے مقصود تو اشد رہے لیکن دین کی کچھ مبالات
نہیں۔ اس مریض کو اطلاع ہی نہیں کرتے۔ یا اگر اس کو کسی طرح اطلاع بھی ہو گئی تو اس کی امداد
نہیں کرتے مثلاً اس کے لئے پانی یا تیمم کے لئے کلوخ نہیں لاتے اس کی چارپائی قبلہ کی طرف نہیں
بدلتے۔ اس کو پاک کپڑے نہیں بدلوا دیتے۔ اس تساہل میں یا تو مریض پھر غافل ہو گیا۔ یا اس
پر بھی کسل غالب آگیا اور ایسی اس کی نماز ضائع ہو گئی۔ ان لوگوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اپنے جس
عزیز کی تھوڑی سی معمولی مصیبت گوارا نہیں۔ اس کے دوزخ میں جلنے کی تکلیف کیسے گوارا کر لیتے
ہیں۔ اور اگر غایت بے رحمی سے اس کی یہ تکلیف گوارا کر لیں تو اپنی کیسے گوارا کر لیں گے۔ اس لئے
کہ یہ تعاون فی الدین واجب ہے۔ اور یہ امر بالمعروف بالید کی ایک فرد ہے جو کہ محل قدرت در

تو نیت قبول میں فرض ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور اگر یہ صورت ہو کہ جب سے کہ وقت نماز کا ہوش نہیں ہے تو بے ہوشی میں نماز معاف ہوئی تو اس کا دفعیہ یہ ہے کہ اس بے ہوشی میں نماز معاف نہیں ہوتی وہ وہ بے ہوشی ہے کہ جس میں کلام کرنے سے بھی آگاہ نہ ہو پھر اس میں بھی مطلق معافی نہیں بلکہ یہ تفصیل ہے کہ اگر چھ نمازیں متصل بے ہوشی میں گذر جائیں تب تو بالکل معاف ہے یعنی نہ ادا نہ قضا اور اگر اس سے کم بے ہوشی ہوتی ہے مثلاً چار نمازیں یا پانچ نمازیں اس حالت میں گذریں تو اس وقت ادا کا مکلف نہیں۔ مگر ہوش میں آنے کے بعد ان کی قضا واجب ہوگی۔ اور اگر قضا میں سستی کی تو فدیہ کی وصیت مرتے وقت واجب ہوگی۔ اور اگر وصیت میں بھی غفلت ہوئی تو ورثہ کو خوب ہوگا۔ اگر فدیہ ادا کر دیا لیکن اس صورت میں اپنے حصے میں سے ادا کرے نہ کہ ترکہ سے ادا کرے۔

وضو اور قیام کی قدرت ہوتے ہوئے تیمم سے اور بیٹھ کر نماز نہیں ہوتی

بعضے مریض یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ باوجود کہ وضو سے کوئی ضرر نہیں پھر بھی تیمم کر لیتے ہیں۔ بعض دفعہ اس کے لوگ وضو سے روکتے ہیں کہ بیمار کو تیمم کرنا شریعت میں جائز ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ باوجود قدرت علی القیام بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بعض دفعہ نمازیں باوجود قدرت ضبط کے نجاست کی حالت میں پڑھ لیتے ہیں۔ اور اکثر خوب صاف کپڑوں سے بچتے ہیں اور اس کی پروا بھی نہیں کرتے کہ ہماری نماز بیکار ہو جائے گی۔ سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ مطلق مرض سے تیمم یا بیٹھ کر نماز کی اجازت نہیں اس میں ایک خاص حد کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح قدرت ضبط ہوتے ہوئے ناپاکی دور نہ کرنے سے نماز جائز نہیں ہوتی ہے۔ نماز بڑی احتیاط کی چیز ہے اس کو بے کار نہ سمجھئے۔

بعضے ان ظاہری بے احتیاطیوں کے مقابل ایک دقیق بے احتیاطی کرتے ہیں۔ جو غالباً ان کے علم میں بڑا تقویٰ ہے وہ یہ کہ خواہ ان پر کچھ ہی مصیبت گزر جاوے۔ خواہ کیسا ہی مرض بڑھ جاوے اور خواہ مر ہی جاویں مگر تیمم جانتے ہی نہیں مریں گے۔ کبھی تیمم نہ کریں گے وضو ہی کریں گے

سو حقیقت میں اس فطر کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے جو واقع میں ناقص ہے اس لئے ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔ اصل میں شیطان کی سطروایۃ کا مبنیٰ اس کا یہی خیال ہے کہ یہ حکم حق تعالیٰ کا نامناسب ہونے کے سبب قابل عمل نہیں یہ معصیت تو اس کے عقیدے کی ہوئی۔ اور اگر اس کا کوئی مرشد بھی پہنچا ... تو اہلک نفس سے معصیت عملی ہوگی خوب فرمایا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا
و لیکن میفزائے بر مصطفےٰ

ولیس من البر الصیام فی السفر ...

اور دوسری حدیثیں بھی اس کی صاف دال ہیں۔ یہ کوتاہیاں تو نماز کے متعلق تھیں۔

حالت مرض میں بھی مریض کا ستر بغیر ضرورت کے دیکھنا جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ مریض کا ستر چھپانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اگر ذرا کھل گیا تو لنگی پڑی نہیں کی باقی۔ اگر ران کھل گئی تو کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر بضرورت تداوی کسی موقع کے کھولنے اور دیکھنے کی حاجت ہوئی تو اس کی احتیاط نہیں کرتے بقاعدہ الضرورۃ تتقدر بقدر الضرورۃ فقط اسی قدر کھلے جس کے کھولنے کی ضرورت ہے۔ یا صرف انہیں لوگوں کے سامنے کھلے جن کا تعلق اس تداوی سے ہے۔ وہ بھی دیکھتے ہیں اور دوسرے حاضرین اور عیادت کرنے والے بھی بے تکلف دیکھیں گے۔ بلکہ اس کو ہمدردی سمجھیں گے۔

غرض نہ دوسروں کو دیکھنا جائز اور نہ مقدار ضرورت سے زیادہ دیکھنا جائز یہاں تک کہ اگر عورت کے جننے کے وقت کو دائی بلائی جاوے تو موقع ولد کا دیکھنا اس کو اگر حاجت ہو درست ہے لیکن باوجود اس کے کہ وہ عورت نامحرم مرد کے حکم میں ہے۔ اس کے روبرو عورت کا سر کھولنا حرام ہوگا۔ کیونکہ اس کا کھولنا بلا ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر عورت کے ہاتھ میں فصد لی جاوے تو فصاد کو موقع فصد کا دیکھنا جائز ہے مگر دوسرے حاضرین کو وہاں سے ٹل جانا یا آنکھ بند کر لینا یا منہ پھیر لینا واجب ہے۔ اوروں کو اجازت

حـه شطح کے مرادیہ دعوےٰ کیا جاتا ۱۲

نہیں کہ اس کے ہاتھ کا وہ حصہ کھلا ہوا دیکھیں۔ اسی طرح حقنہ میں اگر ایسا ہو جس کا کھلا ہوا
بدن دیکھنا پڑے تو نہیں تو خفاف کو تو بقدر ضرورت دیکھنا درست ہے۔ دوسروں کو درست نہیں۔ اسی طرح
اگر کسی عضو مستور میں دنبل وغیرہ میں شگاف دینا ہو جائے تو جراح یا ڈاکٹر کے سوا یا ایسے شخص کے سوا جس
کے دیکھنے میں کوئی مصلحت معالجہ کی ہو دوسروں کو اس موقع کے دیکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ جزئیات
استطراداً ذکر کر دیئے گئے۔ اصل مقصود بیان کرنا مریض کے متعلقین کا ہے کہ اس میں بے پروائی برتی
جاتی ہے۔

ناپاک اور حرام دوا سے پرہیز کرنا چاہیے

ایک کوتاہی دوا کے متعلق یہ کی جاتی ہے کہ دوا کے حلال و حرام طاہر و نجس ہونے کی کچھ پروا
نہیں کی جاتی خصوص امراء کے یہاں کہ ہر انگریزی نسخہ پر بیٹھ جاتے ہیں خواہ تناول یا استعمال کے ساتھ ہی دم
نکل جاوے مگر کچھ انقباض ہی نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے حال پر تعجب ہے کہ جس چیز کو طبیعت قابل
نفرت بتلادے مثلاً پیشاب پینا اس سے تو نفرت ہو اور جس چیز کو شریعت قابل نفرت بتلادے۔
مثلاً شراب پینا اس سے نفرت نہ ہو تو گویا اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ یہ شخص اپنے
کو نفس کا بندہ سمجھتا ہے خدا کا بندہ نہیں سمجھتا۔ تو کیا مسلمان ہونے کے یہی معنی ہیں مصرعہ

ببیں کہ از کہ گسستی و با کہ پیوستی

ایک وسوسہ کا ازالہ

اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ دوا کے لئے تو شرع میں بھی اجازت ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس
کا دعویٰ علی الاطلاق محض غلط ہے اصل مذہب میں تو کسی حالت میں بھی دوا کے لئے ایسی چیز
کی اجازت نہیں ہاں مضطر بالمخمصہ یا مغصوص باللقمہ کے لئے ایسی چیز سے ابقاء حیوٰۃ ضرور جائز ہے
اور تداوی کا اس پر قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ مقیس علیہ میں نفع عادۃً تحقیقی اور مقیس میں
غیر تحقیقی چنانچہ اطباء خود علاج ہی کو ظنی کہتے ہیں اس لئے نفس معالجہ بھی واجب نہیں بخلاف حالت
مذکورین کے کہ واجب ہے اس دوا میں ایسی چیز کی مطلقاً اجازت نہیں خواہ مرض کیسا ہی ہلاکت کا

اور نفع کیساتھ مجرب سمجھا جا سکے۔

البتہ بعض متاخرین نے ضرورت شدیدہ اور تجربہ نفع کی قید کیساتھ اجازت دیدی ہے۔ مگر جو بے احتیاطی کرتے ہیں وہ ان قیدوں کا کب لحاظ کرتے ہیں بلکہ وہ تو محض احتمال نفع ہی پر برابر یعنی تعجیل صحت ہی کے لئے بلکہ بعض اوقات بدون مرض کے محض تقویت طبیعت ہی کے لئے یا مرض کے غیر خطرناک ہونے پر بھی بے تکلف ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں پس وہ اس فتوی سے کیسے تمسک کر سکتے ہیں۔ یہ تو جواز و عدم جواز میں گفتگو تھی باقی جو لوگ قلب سلیم طبع طاہر رکھتے ہیں وہ تو خلاف تقوی جواز سے بھی منتفع ہونا پسند نہیں کرتے۔ جس طرح بعض لطیف المزاج لوگ بعض اشیاء مکروہ طبعی کو حلق سے اتار نہیں سکتے اور اگر دھوکہ سے اتر جاوے تو معدہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح جن کا مزاج لطافت دینی رکھتا ہے ان کی ان اشیاء مکروہ شرعی کے تناول یا استعمال کے ساتھ یہی کیفیت ہے اور ادویہ محرمہ کچھ برانڈی ہی وغیرہ کے ساتھ خاص نہیں۔ بہت سی ادویہ طب یونانی میں بھی ایسی ہی حرام و نجس ہیں جیسے جند بیدستر، بادزہر حیوانی اور لبوب کبیر میں قضیب گاؤ۔

میں نے اپنے ایک طبیب دوست سے استدعا کی ہے کہ ایسی دواؤں کی ایک فہرست شائع کر دیں۔ اور خاص کر ایسی چیزوں کا استعمال ایسی جگہ کرانا تو ظلم عظیم ہی ہے جہاں مریض خود متقی اور ایسی اشیاء سے نفور ہو۔ مگر اس کی بے خبری میں یا اس کو دھوکہ دے کر کھلا پلا دی جاوے۔ کبھی تو اس کو خبر ہو گئی تو پھر کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت سے اس کا مرض بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس طرح سے اس کو جسمانی ضرر بھی لاحق ہوتا ہے اور اگر خبر بھی نہ ہوئی تو اس خیر خواہ نے پرائی دنیا کی درستی کے لئے اپنا دین برباد کیا۔ جس کو برباد کرنا خود اپنی دنیا کی درستی کے لئے بھی مذموم و مبغوض عند اللہ ہے۔ اور یہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہوا کہ حظ آخرت تو فوت ہوا ہی کوئی حظ دنیا بھی نصیب نہ ہوا۔ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہے۔

دعا غلاموں کی طرح کرنی چاہیے نہ کہ شکایت کرنے والوں کی طرح

ایک کوتاہی دوسرے قسم کے مسائل یعنی دعا، ختم، صدقہ و نذر میں ہوتی ہے کہ ان میں حدود شرعیہ

کہ مخلوق و معبود سمجھنے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ مثلاً دعا بصیغہ شکایت ہوتی ہے۔ اللہ میاں سے کہا جاتا ہے۔ اے اللہ کیا ہوگا۔ جس میں تو ویسے ہی تباہ ہو جاؤں گا۔ یا تباہ ہو جاؤں گی۔ یہ بچے کس پر ڈالوں گی بس جی میرا کہیں ٹھکانا ہی نہ رہے گا۔ اے اللہ ایسا ظلم نہ کیجیو۔ گویا شکایت الٹی کی جاتی ہے۔ اور رائے اللہ دی جاتی ہے۔

استغفر اللہ کیا حق تعالیٰ کا یہی ادب ہے۔ یہی عظمت ہے۔ دعا کو طاعون کی طرح اجازت ہے بلکہ محبوب ہے آگے رضا بالقضا واجب ہے۔ مصرعہ

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

ختم پڑھا جاتا ہے بعض جگہ تو غیر مشروع الفاظ سے مثلاً یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ اور بعض جگہ اس سے ناخوش خرابی معلوم ہوتی ہے کہ الفاظ تو مشروع مگر اس کا ثواب بزرگوں کو اس عقیدے سے بخشا جاتا ہے کہ وہ خوش ہو کر کچھ سہارا لگا دیں گے۔ یا بجائے امداد کے دعا ہی کا اعتقاد ہوا مگر اس طرح سے کہ وہ دعا ان کی رد ہو ہی نہیں سکتی۔ جس کے متعلق احقر نے بقدر ضرورت النور کی جلد (۱۳) نمبر ایک کے پرچہ میں صفحہ ۱۲ پر کچھ مفصل لکھ دیا ہے۔

صدقہ کے متعلق کوتاہیاں

صدقہ میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے نام کا کھانا پکا کر تقسیم کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے نام کا کھانا پکا کر تقسیم کرتے ہیں۔ یا کھلاتے ہیں اور مثل ختم مذکور کے غرض یہ کہ اس میں بھی اعتقاد امداد و اعانت ان بزرگ کے متعلق رکھتے ہیں جس کی نسبت ابھی لکھا گیا ہے بعض لوگ کچھ غلہ یا بکرا وغیرہ شب بھر مریض کے پاس رکھ کر اور بعض لوگ اس کا ہاتھ لگا کر خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس تلبس سے یا اس لمس سے مریض کی تمام بلائیں گویا اس صدقہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں پھر اس کے دینے کے ساتھ وہ بھی چلی جاتی ہیں۔ سو یہ اعتقاد محض خلاف شرع ہے۔

صدقہ دینا جو ایک فعل ہے اس کا اثر حدیث میں آیا ہے کہ بلا دفع ہو جاتی ہے۔ اس نص سے قبل مورد جرم صدقہ میں پیش کر مریض سے دور ہو جانے کا اعتقاد بدعت ہے مفہوم کی

خصوص تو اس کا نہ نفع ہے اس فعل سے اور معتقد عوام کا اس کا ایک گونہ اختراع ہے۔ قبل
اس فعل کے، اور مزاحمت نص کی دلیل ضعیف سے بھی جائز نہیں چہ جائیکہ بلا دلیل۔ بعض لوگ
مریض کی طرف سے بکرا ذبح کرتے ہیں اور خصوصیت ذبح کو دافع بلا میں موثر سمجھتے ہیں۔ جس
کی حقیقت اعتقاد ہے جس کا ادراک مشاہدہ یا لغت سے تو نہیں ہو سکتا بلکہ ضرورت ہے نقل کی،
اور نقل مفقود ہے۔ اس لئے یہ اعتقاد تقول علی اللہ ہونے کے سبب ناجائز ہے۔ اور اگر
کوئی عقیدہ پر قیاس کرے۔ تو وہ خود غیر مدرک بالقیاس ہے۔ اور حکم غیر قیاسی منحصر رہتا ہے
مورد نص پر اس میں قیاس جائز نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ میں صدقہ کو مقصود سمجھتا ہوں تو اس کی
تکذیب کے لئے یہ امتحان کافی ہے کہ اگر اس سے کہا جاوے کہ تم اس بکرے کو خریدنے کے عوض
اسی کی قیمت میں گوشت خرید کر دو یقیناً اس بکرے کے گوشت سے زیادہ آوے گا بجائیں
کو تصدق کر دو تو ہرگز اس عمل کا التزام کرنے والے اس پر راضی نہ ہوں گے اور یہی سمجھیں گے کہ
اس میں وہ اثر نہ ہوگا۔ سو اگر محض تصدق ہی مقصود ہے تب تو یہ زیادہ وجہ کہ یہاں تصدق
زیادہ گوشت کا ہوا۔ اس میں زیادہ اثر سمجھنا چاہیے تھا مگر جب اس پر بھی ایسا نہیں سمجھا
تو پھر اس میں بجز فعل

ذبح کے کیا چیز کم ہے۔ جس کی کمی سے اثر کم ہو گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ عوام الناس اس
فریق میں ذبح کو ہی مقصود سمجھتے ہیں۔ پس دعویٰ قصد تصدق کا غلط ٹھہرا۔ بعض لوگ ذبح کا
اہتمام نہیں کرتے بلکہ گوشت خریدتے ہیں۔ لیکن بجائے آدمیوں کے چیلوں کو کھلاتے ہیں سو
اس میں دو بدعت ہیں۔ گوشت کے خصوص کا موثر سمجھنا پھر چیلوں کے کھانے کی خصوصیت میں
اثر جاننا ایسی تخصیصات پر ابھی گفتگو آتی ہے۔ بعض لوگوں نے صدقہ کے لئے خاص چیزیں
تجویز کر رکھی ہیں جیسے ماش اور تیل اور پیسے جن میں اکثر ترکیب سیاہ رنگ کی چیز معلوم ہوتی ہے
جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ بلا کو ایک کالی چیز سمجھ کر اس کے جلب المسلب کے لئے
بھی کالی چیزوں کو تجویز کیا۔ سو اول تو بلا کوئی جسم نہیں جو سواد کے ساتھ موصوف ہو۔ اور اگر کوئی توجیہ
اس کی صورت مثالیہ کے اعتبار سے اس کی کر بھی لی جاوے تب بھی خود یہ ایک خلاف شرع دعویٰ ہے
کہ اس کا دافع بھی تصدق بالاسود ہی ہوگا۔ نص میں مطلق تصدق کو دافع بتلایا ہے خواہ

بانا سود ہو یا بالا تعین ہو۔ پھر تصدق کا محل سب سے اچھا مسلمان مساکین ہے۔ بعضے جنگیوں کو اور بعضے چیلوں کو اس کا مصرف متعین قرار دیتے ہیں۔ خود اس مصرف کے مساوی ہونے یا راجح ہونے کا دعویٰ مزاحمت ہے نص کی نیز متعین ہونا۔ اس میں تو نص کا بالکل ابطال ہی ہے۔

وصیت کے متعلق کوتاہی

ایک کوتاہی وصیت کے متعلق یہ ہے کہ بعض اوقات مریض اپنے بعد کے لئے خلاف شرع وصیت کرتا ہے اور کوئی اس کو تنبیہ بھی نہیں کرتا تاکہ اس کی اصلاح کر دی جاوے اور بعض اوقات دوسرے لوگ مریض کو ایسی وصیتوں کی رائے اور ترغیب دیتے ہیں مثلاً ثلث سے زیادہ کی وصیت یا کسی وارث کیلئے وصیت یا کسی وارث جائز کے محروم کرنے کی وصیت یا کسی معصیت کی وصیت کہ میرے مرنے کے متعلق فلاں کام بدعت کا بلا ضرور کیجیو مثلاً تیجہ دسواں وغیرہ کیجیو یا قبر میں عہد نامہ وغیرہ رکھیو یا ایسا ایسا کھانا کیجیو یا میرا عرس کیا کیجیو وغیر ذالک اسی طرح ان کاموں کیلئے کچھ وقف کر جانا اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر مریض ایسی غلطی کرے تو دوسروں کو اصلاح کر دینا چاہئے اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کرے تو وہ وصیت لازم نہیں ہوتی بلکہ بعض پر تو عمل جائز نہیں ہوتا جیسے وصیت بالمعاصی۔ ان احکام میں فقہاء و علماء سے وقت پر تحقیق کر کے عمل کرنا چاہئے یہ چند کوتاہیاں ہیں حالت مرض میں جو اس وقت خیال میں آئیں۔ تتبع یا تأمل سے اور بھی کوتاہیاں نکلیں گی جن کے لئے مذکورہ کوتاہیوں کے ضمن میں جو اصول شرعیہ بیان کئے گئے ہیں یا تو وہی یا بعض کوتاہیوں کے لئے علماء سے رجوع کرنا کافی ہوگا۔ اب دوسری حالت کے متعلق کچھ ضروری امور عرض کرتا ہوں۔

"بحالت وقت الموت"

حالت نزع میں رونے پیٹنے کی بجائے اس کو کلمہ کی تلقین اور اس کے خاتمہ بالخیر کی دعا کرنی چاہیئے۔

اس وقت کی کوتاہیوں میں عورتیں زیادہ مبتلا ہیں۔ مثلاً اس وقت بجائے اس کے کہ کلمہ پڑھیں حق تعالیٰ سے میت کی سہولت نزع وختم بالخیر کی دعا کریں رونا پیٹنا چلانا ہی یہ کلمات جزع و فزع کے کہتی ہیں کہ اگر مریض کو کچھ ہوش ہوا تو وہ پریشان ہوتا ہے اور اس پریشانی سے

خرابیاں ہیں ، کبھی تو ناامیدی کی وجہ اس کا دل شکستہ ہوتا ہے اگر اس وقت تک ناامیدی نہ ہوئی ہو اور مریض کے
دل شکنی اور رنج تھا خود بھی تو غم ہے حدیث میں نص ہے کہ مریض کو امید دلایا کرو ۔ اس سے وقت قریب
تھا ۔ لیکن اس کا دل خوف زدہ ہو جاتا ہے تو یہ حرکت اس علم کے کس قدر خلاف ہے اور کبھی اس سے وہ
خلق کی طرف مشغول ہوتا ہے حالانکہ وہ وقت خاص توجہ الی اللہ کا ہے ۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اگر وہ خود بھی
اس عالم کی طرف بلا ضرورت شرعیہ (مثل وصیت وغیرہ) متوجہ ہوتا تو اس کی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف
منعطف ومصروف کیا جاتا ۔ نہ کہ خود ہی اس غفلت کدہ کی طرف اس کو متوجہ کرنے کا سبب بن جاویں ۔
اور اگر ان کلمات میں کچھ اضافہ اس میت کے غرغرۃ الموت کی بری کر دیا تو ایسا ہوا اور ایسا تھا تو ایک خسارہ
میت کا (جیسا کہ حدیث میں ہے) یہ ہے کہ فرشتے اس کو ٹھیکتے ہیں ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہی تھا ۔
غرض اس نامعقول حرکت ۔ سے پریشانی اور پریشانی ہوتی ہے ۔ اور مثلاً بعض عورتیں اس وقت
اس کی بیوی کو سامنے لا کر کھڑا کرتی ہیں ۔ یا کبھی بی بی صاحبہ خود ہی تشریف لا کر کھڑی ہوتی ہیں ۔ اور
پوچھا جاتا ہے کہ اس کو یا مجھ کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں اور اس غریب کو جواب پر مجبور کرتے ہیں اسی
طرح بعض اوقات اس کے بچوں کو سامنے لاتی ہیں کہ ان کا کون ہوگا ۔ یا یہ کہ ان کو پیار کر لو ۔ ان کے
سر پر ہاتھ تو رکھ دے ۔ جس سے وہ غریب تو پریشان ہوتا ہی ہے اور توجہ علی المخلوق کا ضرر الگ
پہنچتا ہے لیکن بچے کس قدر دل شکستہ اور ناامید ہو جاتے ہیں یہ حماقت شعار اتنا نہیں سمجھتیں
مگر اس وقت کا تو مقتضا یہ تھا کہ اگر خود بھی بچوں کو یاد کرتا تو اس کو کہا جاتا کہ تم حق تعالیٰ کی طرف
خیال رکھو البتہ اگر وصیت ہی یاد کرے تو سرسری طور پر سامنے کر دیں تاکہ اس کا دل ان میں اٹکا نہ رہے
لیکن اگر خود یاد نہ کرے تو ہرگز اس کو یاد نہ دلاوے اور یہ بھی مقتضا تھا کہ بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا
جاتا ۔ تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور اگر وہ گھبراتے تو اپنے نفس پر قابو کر کے ان کو دلاسا دیا جاتا کہ تم کیوں
گھبراتے ہو اس سے زیادہ ہم تمہارے شفیق اور خدمت کرنے والے موجود ہیں ۔ یاد رکھنا چاہئے
کہ تطییب قلب مسلم اور تسلیہ محزون عبادت عظمیٰ ہے ۔ اسی طرح بیوی کی تسلی کرتے کہ بیماری لا علاج
کا علاج ہمارے قبضہ سے باہر ہے ۔ اور اس کا علاج تمہاری پریشانی سے بھی نہیں ہو سکتا ۔ باقی
تمہاری راحت رسانی اور دلجوئی کے لئے ہم حاضر ہیں ۔ تم اس قدر پریشان نہ ہو
غرض اس میں ایک تو پریشانی ہے دوسرے اس مخلوق کی طرف اس کو متوجہ کرنا جس کا

اور بدتر ہوجاتی ہے۔ اسی طرح بعض مرد بھی جن کا مزاج بگڑ گیا ہو وہ بھی بہت ناشائستہ حرکت کرتے
ہیں۔ اسی واسطے سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ قریب موت کے وقت میت کے پاس عاقل وہوشیار
لوگ ہوں۔ اگر گھر کی عورتیں اتفاق سے ایسی ہوں تو ان کے رہنے کا مضائقہ نہیں ورنہ مردوں میں
جو ایسے لوگ ہوں ان کو پاس رہنا چاہیئے۔ اور وہ ان سب امور کی احتیاط اور انتظام رکھیں۔

بعضے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بدفالی کے خیال سے یا قلت مبالات یا بد دینی کی وجہ سے نہ اس وقت
یٰسین پڑھیں اور نہ پڑھنا تجویز کریں۔ یا اس طرف التفات نہ کریں اور نہ کلمہ کا اہتمام کریں۔ نہ
اس کو متوجہ کریں جب کہ اس کو ہوش ہو اور نہ خود اس میں مشغول ہوں۔ جبکہ اس کو ہوش نہ ہو بلکہ
دنیا کے فضول قصوں میں خصوصاً ان بکھیڑوں میں جن کی ضرورت بعد میں ہوتی مگر ابھی سے مشغول
ہوجاتے ہیں۔ بعض جگہ تو کوئی اس کے پاس بھی نہیں رہتا اور وہ تنہا ہی ختم ہوجاتا ہے۔ سب ادھر
ادھر مال ومتاع پر قبضہ کرنے کی فکر میں بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور بعض جگہ اس لئے اس کے
پاس نہیں بیٹھتے کہ اس کی بیماری لگ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ اول تو بعض محققین کے نزدیک نفس
تعدیہ ہی غلط ہے دوسرے بعض قول پر کہیں ہو بھی تو بلا اذن خالق نہیں ہوتا اور نہ اذن دائم ہوتا ہے
چنانچہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اکثر جگہ کچھ بھی نہیں ہوتا پھر کتنی سنگدلی کی بات ہے کہ بچنے کو تو خود شخص سے
بچ بچا لیا اور اپنے ایک بھائی مسلمان یعنی اس مریض کو ضرر حقیقی میں مبتلا کیا۔ کیونکہ اس طرح
تنہا رہ جانے سے اس کی بعض ضروریات میں فروگذاشت ہونے سے اس کو تکلیف بھی ہوگی اور اس کی دل
شکنی بھی ہوگی۔ اور ان کے طرز عمل سے یہ معلوم کرکے کہ میں مرض متعدی مہلک میں گرفتار ہوں یاس
بھی ہو جاوے گی تو کتنی کلفتیں اس پر جمع ہو گئیں اور ان محتاط صاحب کی یک گونہ بھی احتیاط ہوئی تو ایسی
احتیاط نذر ڈالنے کے قابل ہے۔ اور اصل میں تو یہ ہے کہ جو طبقہ ادعاء ہمدردی کے نعرے لگاتا ہے وہی
اس ظلم احتیاط میں زیادہ حصہ لیتا ہے۔

یہ ان کی شکایت تھی جو کہ مریض کے لئے مفید امور یا پاس رہ کر یا اس کو تنہا چھوڑ کر اس کے متوجہ
الی اللہ کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔

بعض لوگ ان کے مقابل میں دوسری طرف غلو کرتے ہیں یعنی بزعم خود اس کو متوجہ الی اللہ کرنے
میں اس قدر متشددانہ برتاؤ کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں کہ وہ ذرا غافل ہوا اور اس پر تقاضا

شروع ہوا کلمہ پڑھنا استغفار پڑھنا۔ اور اگر اس کو ہوش نہ ہو تو برابر اس کے سرہانے میں جب
تک کہ روح ان کا حکم دو نہ لے۔ اور اگر ہوش آ گیا اور اس نے پڑھ بھی لیا تو اس پر کچھ نہیں کرتے
پھر پڑھواتے ہیں۔ چاہئے یہ کہ اسی طرح پڑھتے رہیں جب تک دم نہ نکلے۔ اس کی وجہ اس
چاہ بات زیادہ مختصر ہے۔

اس بات میں علماء کا ارشاد ہے کہ اگر وہ ہوش میں ہو تو اس کو بہت کلمہ و استغفار کی
طرف متوجہ کریں۔ اور جب وہ ایک بار پڑھ لے تو پھر کہنا چھوڑ دیں۔ پھر جب تک وہ کوئی دنیا
کا کلام نہ کرے دوبارہ پڑھنے کو نہ کہیں وہ مرض میں اور نزع میں پریشان ہوتا ہے مگر اس سے
قلب میں تنگی پیدا ہو کر کلمہ و استغفار سے طبیعت میں کراہت و ناگواری ہو کر خدا نخواستہ منہ
سے انکار نکل گیا تو کس درجہ مضر ہے گو اس وقت کا ایسا فعل بھی قانون شرع سے قابل مواخذہ
نہیں کیونکہ وہ وقت ہوش و حواس اختیار کا نہیں ہے لیکن تاہم دیکھنے والوں کی نظر
میں اس میت کی کتنی رسوائی ہے جس کا سبب یہ پڑھوانے والا ہے۔ اور اگر وہ بالکل بے ہوش ہے
تو اس کو کچھ پڑھنے پڑھانے کے لئے نہ کہیں۔ مرتے کے قریب پکار پکار کر سورہ یٰسین شریف اور کلمہ
کلام وغیرہ پڑھتے رہیں مگر قدرے آہستہ ہو، جب مر جائے تو قلب سے دعا اور متوجہ رہے اور اسی
توجہ میں خاتمہ ہو۔

بعضے آدمی میں یہ عادت دیکھی ہے کہ آخر وقت تک اس سے باتیں کرانا چاہتے ہیں۔
اور پڑھ کر رہتے ہیں۔ ان ناداں عقل والوں نے تو اس سے کلمہ ہی پڑھوانا چاہا تھا جو کہ دین کا کام ہے
انہوں نے دنیا کی باتیں کرانا چاہیں یعنی جہاں وہ ذرا بے ہوش ہوا اس کو پکارتے ہیں کہ میاں فلانے
ذرا آنکھ تو کھول مجھ کو تو دیکھو میں کون ہوں تو کیسے جو کچھ ہو گئے کیسی بات کو دل چاہتا ہے اور اسی طرح
خرافات خواہشات میں اس کو دق کرتے ہیں ان عقل کے دشمنوں سے کوئی پوچھے کہ یہ ان باتوں کا وقت
ہے اگر اس کا مرض مرض موت نہیں ہے ذرا اچھا ہو جاوے گا تو اچھا ہونے کے بعد جتنی چاہے
باتیں کر لیجیو۔ اس وقت اس کو کیوں تکلیف دیتے ہو مرض میں ایسا تعب ہوتا ہے کہ بات کرنا تو
بڑی بات ہے بات سننا بھی کسی طرف دیکھنا بھی گراں گزرتا ہے اور یہ بزرگ اس سے مجلس
آرائی کی توقع رکھتے ہیں اور اگر یہ اس کا مرض مرض موت ہے تو ایسی باتیں کرنا اور بھی برا ہے۔

کیونکہ قطع نظر تکلیف دینے کے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اب اس کو دنیا میں بہت تھوڑا وقت ملے گا سو اس کو تو اچھے مصرف میں صرف کرنا چاہیئے۔

البتہ اگر کوئی ایسی بات ہو جو سننا ضروری ہے مثلاً کسی امانت کو پوچھا جاوے کہ تم نے کہاں رکھدی ہے یا قرضہ اور لین دین کے بارہ میں پوچھا جاوے جس کا حال بدون اس کے دوسرے ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتا یا کافی نہیں ہوسکتا یا اور اسی قسم کا کوئی حق واجب ہو اس کے متعلق پوچھ پاچھ کرنے کا مضائقہ نہیں بلکہ ضروری ہے بشرطیکہ اس کو زیادہ دقت اور تکلیف نہ ہو جو تحمل سے زائد ہو سو ایسی بات درحقیقت دنیا کی بات نہیں ادائے واجب ہے جو طاعت کی فرد عظیم ہے اور چونکہ صورتاً دنیا ہی کی بات ہے اس لئے بہتر ہے کہ ایسی بات کا جواب لینے کے بعد پھر تہلیل و استغفار وغیرہ پڑھوا دیں۔ بشرائط مذکورہ سابقہ بعض لوگ قریب مرگ کو رو بقبلہ کرنے کا مسئلہ سن کر یہ کرتے ہیں تو اس کا تمام بدن اور منہ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر وہ نزع دفع میں بدن و گردن کو حرکت دے جو حرکت اضطراریہ ہوتی ہے تو پھر بدن و گردن موڑ کر رخ بدل دیتے ہیں۔

سو خوب سمجھ لینا چاہیئے اس مسئلے کا یہ مطلب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب اس پر شاق نہ ہو بارہا تکلف ہے جس وقت حرکت ہو جاوے اس وقت رو بقبلہ کر دیں نہ یہ کہ اس سے کشاکشی کرکے اس کو تکلیف پہنچا دیں (ردالمحتار)

نامحرم مرد کو مرنے کے بھی دیکھنا جائز نہیں

ایک بے احتیاطی یہ ہوتی ہے کہ اس وقت اکثر نامحرم عورتیں بھی اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں گویا پردہ ضروری نہیں رہتا سو اگر اس کو اتنا ہوش ہے کہ وہ دیکھتا سمجھتا ہے تب تو اس کے سامنے آنا ایسا ہے جیسا تندرست کے سامنے آنا۔ مرض سے احکام معاف نہیں ہو گئے اور اگر اس کو اتنا ہوش نہیں ہے تو بہت سے بہت اس نے نہ دیکھا مگر ان عورتوں نے اس نامحرم مرد کو بلا ضرورت دیکھا جس کی ممانعت حدیث، افعمیاوان انتما الستما تبصرانہ کیا تم دونوں بھی اندھی ہو گئی ہو کیا تم دونوں اسے نہیں دیکھ رہی۔

معصیت ہے اور اگر کہا جاوے کہ اس وقت تو کسی مفسدہ کا احتمال نہیں ہے سو جواب یہ

ہے کہ اول تو حکم اس وجہ سے مفسد ہی کی تھی نہیں۔ ہے دوسرے ہم نے مقصد ہی دیکھا بعض عورتیں اس وقت دیکھ کر باشی ہو گئی ہیں اور عمر بھر خیالات بخس میں مبتلا رہی ہیں اگر ان کے پیچھے کی تحقیق نہیں رہی۔ تو ایسی باتوں سے ... آنکھیں بھی نذر کی ہیں اور السبب مرض تو صادق آگیا۔

اگر عورت مرتے وقت شوہر کو مہر معاف کر دے تو اس کا اعتبار نہیں ہوتا

ایک عام بات یہ رواج عام ہے کہ جب کوئی عورت مرنے لگتی ہے تب کہتے ہیں کہ شوہر کو معاف کر دے اور وہ معاف کر دیتی ہے اور شوہر اس معافی کو کافی سمجھ کر اپنے کو دین مہر سے سبکدوش سمجھتا ہے اور اگر کوئی وارث مانگے جب بھی نہیں دیتا اور نہ اس کا دینا ضروری سمجھتا ہے۔

سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اس وقت کی معافی وصیت ہے اور وصیت وارث کے حق میں نافذ نہیں ہوتی جب تک کہ سب ورثہ بالغ بشرط بلوغ اس کو منظور نہ کریں۔

اور اگر بعض منظور کریں بعض نہ کریں تو اگر منظور کرنے والوں کے حصہ کے قدر نافذ ہو گی۔ باقی باطل ہو گی اور نابالغ تو اگر چہ منظور بھی کریں تو صحیح نہیں۔ پس اس صورت میں جو وارث نابالغ ہیں ان کے حصہ کا مہر اور اسی طرح جو بالغ وارث منظور نہ کریں ان کے حصے کا مہر شوہر کے ذمہ واجب الادا ہو گا۔ اور معافی ان کے حق میں محض باطل ہے مثلاً اس عورت کے وارث علاوہ شوہر کے تین بھائی ہیں ایک نابالغ اور دو بالغ جن میں سے ایک نے اس معافی کو منظور کیا اور دوسرے نے نامنظور کیا اور مہر چھ سو روپے تھا تو اس صورت میں یہ حکم ہو گا کہ تین سو تو حصہ شوہری میں اگر معاف ہو گئے۔ اور سو روپے بالغ منظور کرنے والے کے حصے میں اگر معاف ہو گئے۔ آگے دو سو روپے رہے سو تو نامنظور کرنے والے کا حق اس شوہر کے ذمہ ہے اور سو اس نابالغ کا حق اس کے ذمہ ہے یہ دو سو روپے ادا کرنا ہوں گے۔ یہ مختصر تذکرہ ہوا حالت موت کے بدعتوں کا جس کو نامیوں کا اب حالت بعد الموت کے متعلق لکھا ہوتا ہے۔

حالت بعد الموت

اس میں بہت قدر موجود رسومات شائع ہیں جن کا احصار مشکل ہے ان میں سے اکثر کی رسمیں سے اصلاح الرسوم فصل چہارم میں مفصل مدلل لکھا ہے یہاں صرف ان کی فہرست لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

(١) دفن میں دعوت وغیرہ کے انتظار میں دیر کرنا۔

(٢) قبر پہ اناج لے جانا۔

(٣) جانماز اور اوپر کی چادر ترکہ میں سے خریدنا۔

(٤) میت کے کپڑے بلا تقسیم ورثا کے مساکین کو دے دینا۔

(٥) تیجہ دسواں وغیرہ کرنا۔

(٦) برادری کو یا مساکین کو تفاخراً کھانا دینا۔

(٧) کئی بار عورتوں کا جمع ہونا جس میں ایک اجتماع بانقضائے عدت کے دن ہوتا ہے۔

(٨) بلا ضرورت دور دور سے عورتوں تک مہمانوں کا آنا اور میت والوں پر بار ڈالنا۔

(٩) خاص قریب کے سب تعزیت کے گھر اول روز کسی عزیز کے یہاں سے کھانا آنا۔

(١٠) حفاظ وغیرہ کو کچھ دیکر قرآن پڑھوانا۔

(١١) برسی تک سوئم کرنا یہ تو عام اموات کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے اور بعض معاملہ خاص بزرگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جن کو رسالہ مذکورہ کے باب مذکور کی فصل دوم رسوم میں ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے

(١٢) عرس و فاتحہ مروجہ کے منکرات اور

(١٣) شب برات کا حلوہ اور عاشورہ کا کھچڑا اور شربت کہ ان کی بحث بھی بہت ضروری ہے اگر شوق ہو اس میں ملاحظہ فرمالیا جاوے۔ اب بعض وہ معاملات اس تیسری حالت کے متعلق مختصراً لکھتا ہوں جو اس میں نہیں لکھے گئے۔

میت اگر وصیت نہ کرے تو اس کی نماز روزہ کا فدیہ ترکہ مشترکہ سے نہ دیں

چنانچہ ان میں سے ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے تعزیت کے جوش میں اگر ترکہ مشترکہ میں بلا وصیت میت نماز روزہ کا فدیہ دلاتے ہیں سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ وصیت کرے تو ثلث میں سے دینا حق ورثاء پر مقدم ہے اور اگر وہ وصیت نہ کرے جس کو دینا ہو خاص اپنے حصے ترکہ یا اپنے مال سے دے۔

حیلۂ اسقاط مروجہ کی تردید

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے بوجہ بے تدبیری کے ایک حیلہ اختراع کیا ہے کہ ایک قرآن مجید لاتے ہیں اور تمام عمر کی نماز و روزہ بلکہ کبھی کبھی کے سب ہی کا حساب لگا کر اس قرآن کی اتنی بڑی قیمت تجویز کر کے کسی مسکین کو دیدیتے ہیں اور اس کا نام اسقاط رکھا ہے چونکہ وہ رسم کسی نامور فقیہ سے منقول نہیں اس لئے محض باطل ہے۔

مُردہ دفن کر کے اذان دینے کا ثبوت نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ مردہ دفن کر کے قبر پر اذان کہتے ہیں۔ چونکہ شریعت میں کہیں وارد نہیں اس لئے واجب الترک ہے۔

اگر کہیں کوئی نماز جنازہ جاننے والا نہ ہو تو کیا کرے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض دیہات میں جہاں کوئی نماز پڑھنے والا میسر نہیں میت کو بدون نماز جنازہ کے دفن کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک خطبہ میں جبکہ بہت دیہاتی جمع تھے اس کی تدبیر بتلادی تھی کہ اگر ایک آدمی بھی وضو کر کے جنازہ کے سامنے کھڑا ہو کر صرف چار بار اللہ اکبر کہہ دے تو نماز فرض جنازہ کی ادا ہو جائے گی۔ کیونکہ رکن اس نماز کا یہی چار تکبیریں ہیں۔ باقی دعائیں وغیرہ سنت ہیں۔ سو جہاں ایسا موقع ہو اتنا ہی کر لیں۔ ترک فرض کی معصیت سے تو محفوظ رہیں گے۔

قبر میں رکھ کر میت کے بدن کو رو بقبلہ اچھی طرح کروٹ دیدینا چاہئے

ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ مردہ کو قبر میں رکھ کر صرف منہ تو قبلہ کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ باقی سارے بدن کو کروٹ نہیں دیتے۔ سو کتب فقہ میں مصرح ہے کہ تمام بدن کو اچھی طرح کروٹ دے دینا چاہئے۔

میت کا منہ کھول کر قبر کو دکھانے کی کوئی اصل نہیں

ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ قبر میں رکھنے کے بعد اس کا منہ کھول کر قبر کو دکھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ سو شریعت میں اس کی کچھ اصل نہیں۔

قبر میں عہد نامہ یا شجرہ وغیرہ نہ رکھنا چاہیے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ قبر میں عہد نامہ یا شجرہ وغیرہ رکھتے ہیں اور میت کے گلنے سڑنے سے اس کی بے ادبی ہوتی ہے سو اس کو بھی ترک کرنا چاہیے۔ البتہ جس چیز کا ادب شریعت میں حتی واجب نہیں اس کا قبر میں رکھ دینا درست ہے جیسے کسی بزرگ کا کپڑا وغیرہ۔

قبر پختہ کرنا ممنوع ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض قبر پختہ بناتے ہیں جس کی نصاً حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

لڑکیوں کو میراث نہ دینا ظلم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ لڑکیوں کو میراث نہیں دیتے جو نص قرآن حرام اور ظلم ہے۔

بیوہ کو تمام منقولات کا مالک سمجھنا بھی ظلم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض بیوہ عورتیں اپنے کو تمام منقولات کا مالک سمجھتی ہیں۔ یہ بھی ظلم ہے جو چیز شوہر نے اس کو ہبہ کر دی ہو وہ بیشک اس کی ہے۔ ورنہ اور سب ترکہ مشترک ہے حسب فرائض سب کو دینا چاہیے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جو چیز جس وارث کے قبضہ میں آجاتی ہے وہ اس کو چھپا لیتا ہے گو یاد رکھو کہ قیامت کو سب اگلنا پڑے گا۔

اگر دلہن میکے میں یا سسرال میں مرجاوے تو اس کا مال سب ورثہ کو ملے گا

ایک کوتاہی یہ بھی سخت ہے کہ اگر دلہن اپنے میکے میں مرجاوے تو اس کے تمام سامان پر میکے والے قبضہ کر لیتے ہیں اور اگر سسرال میں مرجاوے تو وہ قابض ہو جاتے ہیں ہم نے کہیں تقسیم شرعی ہوتے سنا ہی نہیں اس میں بھی اوپر کی وعید کو یاد رکھنا چاہیے۔

میت پر کسی قسم کا قرض اگر دلیل سے ثابت ہو تو انکار نہ کرنا چاہیے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جو قرضہ تمسک کے دست گردان قرض جو میت کے ذمہ ہو اور دلیل شرعی سے ثابت ہو اس کو کوئی شاذ و نادر ہی کرنے سے ادا کرتا ہے۔ صاف انکار کر دیتے ہیں جیسا کہ میت کا جو لینا ہی قرضہ اوروں کے ذمہ ہے اور لوگ اس کو ہضم کر جاتے ہیں۔ دونوں امر صریح ظلم ہیں۔ خصوصاً میت پر اگر قرضہ ہو تو ورثہ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ بروئے حدیث اس کی روح جنت میں جانے سے معلق رہے گی جب تک قرض ادا نہ ہو تو کیا اپنے عزیز کے لیے اتنا بڑا نقصان گوارا ہوگا۔

اگر میت کا کوئی وارث بطن مادر میں ہو تو اس کے تولد تک میراث تقسیم نہیں ہوگی

ایک کوتاہی یہ ہے کہ کبھی میت کے وارثوں میں وہ بچہ بھی ہوتا ہے جو ابھی بطن مادر میں ہے ہم کو یاد نہیں کہ کبھی مستفتی نے سوال میں کبھی اس کو ظاہر کیا ہو۔ اور ہم جواب دینے والے لوگوں کی بھی کوتاہی ہے اس کا احتمال ہی نہیں ہوتا اور نہ سائل سے اس کی تحقیق ہی نہیں کرتے۔ مذہب کا ضروری مسئلہ ہے۔ بہت زیادہ قابل اعتنا کے ہے۔ بدون اس کے تولد کے تقسیم ترکہ کی صورت معلق رہے گی۔ بعد تولد کے صحیح سوال تمام ہوگا۔

کفن میں میت کی لنگی باندھ دینا بدعت ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ کفن میں میت کی لنگی باندھی جاتی ہے۔ جو بالکل بدعت ہے بعض اور دوخوانوں کو اکثر یا اس کا ترجمہ لنگی دیکھ کر دھوکہ ہوا ہے کہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں پر چادر مراد ہے۔

چونکہ نبی کے بعد کا رواج زیادہ تر شروع ہوا ہے اس لئے اس کا نام یہی ہو گیا۔

شوہر اپنی مردہ بیوی کا منہ دیکھ سکتا ہے اور اس کے جنازہ کا پایہ بھی پکڑ سکتا ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ شوہر کو اس کی مردہ بیوی کا منہ نہیں دیکھنے دیتے نہ اس کے جنازہ کا پایہ پکڑنے دیتے ہیں یہ محض لغو ہے۔ میت کو ہاتھ لگانا تو بلا ضرورت جائز نہیں لیکن منہ دیکھنا درست ہے اور پایہ پکڑنا مستحب ہے۔ بلکہ اگر کوئی محرم قبر میں اتارنے والا نہ ہو تو اور اجنبیوں سے شوہر احق ہے اور عورت کے لئے تو مردہ شوہر کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا بھی درست ہے۔

کثرت آدمی کیلئے جنازہ کو دیر کرنا جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ نماز جمعہ کے انتظار میں جنازہ کو رکھے رکھتے ہیں کہ زیادہ نمازی نماز پڑھیں گے۔ سو یہ بالکل جائز نہیں۔ جس قدر جلد ممکن ہو نماز اور دفن سے فراغت کرنا واجب ہے

اگر میت نے کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص جگہ دفن کرنے کی وصیت کی تو شرعا ایسی وصیتیں لازم نہیں ہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض اموات کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص مقام پر دفن ہونے کی وصیت کر جاتے ہیں تو اولیاء اس کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ بعض اوقات بعضے واجبات شرعیہ بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ سو جان لینا چاہئے کہ ایسی وصیتیں شرعا لازم نہیں ہوتیں اگر کوئی امر خلاف شرع لازم آوے تو اس پر عمل جائز بھی نہیں۔

الحمد للہ قسم سوم سے بھی فراغت ہوئی اس وقت ذہن میں یہی امور ظاہر ہوئے جو انشاء اللہ تعالیٰ قریب قریب کافی ہیں باقی اگر کوئی اور بات قابل تحقیق خیال میں آوے تو علماء سے رجوع کر لیا جاوے۔ جیسا حالت قبل موت کے بیان کے ختم پر بھی عرض کیا ہے۔

سفر کے معاملے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ سفر)

منجملہ ان امور کے جن میں انقلاب واجب الاصلاح واقع ہوا ہے۔ سفر بھی ہے جو ایک معمولی روزانہ کی حالت ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے انقلاب کی طرف ذہن بھی نہیں جاتا مگر جہالت کی بے علمی اور بے عملی سے اتنا بڑا خفیف امر بھی اس انقلاب سے محفوظ نہیں رہا۔ چنانچہ مختصراً اس کو بھی لکھا جاتا ہے۔

بلا ضرورت سفر نہیں کرنا چاہیے

سو منجملہ ان کوتاہیوں کے جو سفر کے متعلق ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بکثرت سفر بلا ضرورت کیا جاتا ہے جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد میں ناپسند فرمایا ہے کہ جب سفر میں تمہاری حاجت پوری ہو جاوے تو جلدی گھر لوٹ آؤ۔ اس واسطے کہ سفر سے کھانے پینے سونے میں خلل پڑتا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب بلا ضرورت ابتداءً سفر پسند نہیں تو اس کا اعادہ تو بدرجہ اولیٰ ناپسند ہوگا۔ کیونکہ اعادہ سے ابتداء اہون اور اسہل ہے اور وہی جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ سفر میں تمام سامان ضروری آسائش کا مختل ہو جاتا ہے۔

اور جس طرح طبعی آسائش میں خلل پڑتا ہے۔ اسی طرح شرعی زندگی میں یعنی دینی معمولات میں بھی اختلال واقع ہوتا ہے۔ جو پابندی کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور عشق کے لئے بھی ایک درجہ میں مضر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ ایک حدیث میں نص ہے کہ اگر مرض یا سفر کے سبب معمولات میں خلل پڑتا ہے تو حق تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کے لئے اتنا ہی ثواب لکھنا جتنا حالت صحت و حضر میں لکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اختلال معمولات اوراد کا مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ اس سفر کیلئے ہے جو بضرورت ہو۔ اس لئے کہ اوپر غیر ضروری سفر کا ناپسندیدہ ہونا ثابت ہو چکا ہے تو اس کو اجر کے باب میں مقدر کیسے کیا جاوے گا۔ اور اجر کی قید اس لئے لگائی کہ ایسے سفر میں قصر صلوٰۃ کی مشروعیت پر شبہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو سفر معصیت میں بھی قصر مشروع ہے تو اس قید سے یہ شبہ جاتا رہا۔ حاصل یہ ہے کہ قصر تو احکام دنیویہ سے ہے۔ اس کے سفر کا مرضی یا نامرضی ہونا مانع نہیں بخلاف اجر کے کہ احکام اخرویہ میں سے ہے۔ اس کا مدار رضا پر ہے جیسے ایک شخص کسی دنیوی غرض سے قتال کرے شہید ہو جاوے تو اس کے متعلق جو احکام دنیویہ ہیں مثلاً غسل نہ دینا وغیرہ۔ وہ تو اس صورت میں بھی مرتب ہو جاویں گے باقی جو احکام اخرویہ ہیں مثلاً اجر و ثواب و درجات وہ مرتب نہ ہوں گے جب تک وہ قتال عند اللہ مرضی و پسندیدہ نہ ہو کہ نیت خالص اعلاء کلمۃ اللہ کی ہو۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

اور یہ بھی شبہ نہ کیا جاوے کہ کھانے سونے میں خلل پڑنا تو مجاہدہ ہے۔ اور مجاہدہ بھی اصل طریق ہے تو اس کا سبب کہ سفر ہے کسی حال میں ناپسندیدہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ اول تو ہر اختلال فی الطعام والمنام مجاہدہ نہیں۔ مجاہدہ وہی ہے جو بغرض اصلاح نفس کیا جاوے تو اگر ایسا ہے تو اس میں کلام نہیں چنانچہ عنقریب اسی کے جواز کی تحقیق آتی ہے کلام تو اس سفر میں ہے جو محض بلا مصلحت معتد بہا کیا جاوے مثلاً مدت تعطیل پوری کرنے کو۔ یا محض شہروں کی سیر کرنے کو۔ یا تماشہ دیکھنے کو۔ وغیرہ ذالک یا اس سے بڑھ کر کسی معصیت کی تحصیل و تکمیل کو اس میں

کہ ان ہی اصلاح نفس ہے پس اس میں جو اختلال ہوگا وہ مجاہدہ کس طرح ہوگا۔

ایک تیسرے شبہ کا ازالہ

اور یہ بھی شبہ نہ کیا جاوے کہ بہت سے بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنی تمام عمر ہی سیر سیاحت میں گزار دی۔ ایک جگہ قرار بھی نہیں لیا۔ اور ظاہر ہے کہ تمام عمر کبھی کوئی حاجت نہیں رہتی تو انہوں نے کیا حدیث کے خلاف کیا۔

جواب یہ ہے کہ حاجت منحصر دنیوی اور نفسانی ہی حاجت میں نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اپنی اصلاح اور حفظ دین کی حاجت ہے۔ سو بعضے بزرگوں کو اپنے تجربے سے یا کسی شیخ کامل کی تشخیص سے قیام میں مضرتیں محسوس ہوئیں مثلاً مخلوق سے زیادہ تعلق ہو جانا، لوگوں کا معتقد ہو جانا۔ جبکہ اس سے عجب وغیرہ کا اندیشہ ہو یا بداندیشوں سے اندیشہ ضرر لاحق ہونا ومثل ذالک۔ اور سفر میں ان آفات سے نجات دیکھی اور فوائد سفر سے محفوظ رہنے کی امید دیکھی۔ اس لئے سفر اختیار کر لیا سو وہ سفر بلا ضرورت نہ ہوا۔ جیسا کہ سیر میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر سفر میں رہتے تھے سو اختلاف مذاق سے مصلحتیں بدل جاتی ہیں مگر اس کی تشخیص کرنا کہ ہمارے لئے سفر نافع ہے یا مضر سزاوار ہے بلکہ علی البصیرت پر ہر شخص کو اپنی رائے پر موقوف نہ کر لینا چاہئے کسی شیخ کامل سے ضرور مشورہ کرے کہ اس کی اور اس کے متعلقین اہل حقوق کے مصالح پر گہری نظر کر کے اور جس طرح دینی مصلحت سے سفر ہے اسی طرح دنیاوی مصلحت بھی جو حسب قواعد شرعیہ مصلحت ہو مجوز سفر ہے۔ جیسا کہ تلاش معاش حلال کے لئے سفر کرنا یا تعدیل مزاج کے لئے سفر کرنا جبکہ طبیب نے تجویز کیا ہو یا کسی دوست یا قریب سے انس یا محبت و سرور کے لئے سفر کرنا، یا کسی نافع تحقیق کے لئے سفر کرنا بشرطیکہ اس میں غلو نہ ہو جیسا کہ بعض شائقان تحقیقات جدیدہ کو غلو ہو گیا ہے کہ ان کی مساعی شاقہ اس مثل کا مصداق ہو جاتی ہیں۔ کوہ کندن و کاہ برآوردن جن کی مذمت اس آیت میں آئی ہے وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشا فنقبوا فی البلاد الآیۃ

اور جب بلا ضرورت سفر مذموم ہے تو معصیت کے لئے سفر کرنا تو بہت ہی قبیح ہوگا۔ پھر بعض امور تو صورۃً بھی معصیت ہیں۔ جیسے کسی نامحرم عورت سے نفسانی خواہش پورا کرنے کو سفر کرنا یا ناچ رنگ دیکھنے کے لئے سفر کرنا، یا نامشروع رسم شادی میں شریک ہونے کے لئے سفر کرنا۔ ومثل ذالک۔

اور بعض امور عوام کے نزدیک طاعات وقربت ہے مگر اہل علم کے نزدیک معصیت ہے۔ جیسے آج کل کے اعراس میں جانا مزارات پر نذر و نیاز کے لئے حاضر ہونا۔ یا عوام کے نزدیک مباح ہے اور اہل علم کے نزدیک قبیح ہے۔ جیسے ان شادیوں میں یا برادری میں شریک ہونا جن میں ناچ رنگ وغیرہ ہوتے ہیں۔ لیکن افتخار و ناموری کے مارے کلام جن کو عوام تو بے تکلف تسلیم کر لیتے ہیں کہ اس میں ذرہ بھی نہیں، ناچ نہیں محض دل کی کیا بات ہے۔ لیکن اہل علم کے نزدیک جس طرح یہ امور معصیت ہیں اسی طرح عمرہ فخر و ریا کا سامان سب معصیت ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا اہل علم کی نظر میں کمال تعجب ہے۔ ولنعم ما قیل

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام

زہے شریعت وملت زہے طریقت و کیش

اور بعض امور ایسے دقیق ہیں کہ بعض اہل علم بھی ان کو مباحات یا قربت سمجھتے ہیں۔ حتی کہ بعض راسخین فی العلم بھی اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکے کر دیتے ہیں مثلاً شیخ کامل کی زیارت کے لئے سفر کرنا اگرچہ والدین مانع ہوں۔ ظاہر میں اہل علم بھی اس خیال میں مبتلا ہیں کہ پیر کا حق والدین سے زیادہ ہے کیونکہ وہ مربی روح ہے اور والدین مربی جسم ہے۔

سو حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ مقدمہ علی الاطلاق بھی ہو تو دوسرا مقدمہ جزئی محتاج اثبات ہے۔ یعنی پیر کا حق ہر مرتبہ میں جسم سے زیادہ ہے۔ بات یہ ہے کہ تربیت روح کے مراتب مختلف ہیں ایک مرتبہ تو تربیت فی الفرائض والواجبات کا ہے اس میں تو بے شک شیخ کا حکم مقدم ہے مگر والدین پر۔ اور وہ بھی نہ اس وجہ سے کہ وہ شیخ ہے۔

بلکہ اس وجہ سے کہ وہ واجبات شرعیہ کی طرف رہبری کر رہا ہے اور اگر والدین اس سے روکتے ہیں تو معصیت کی طرف بلا رہے ہیں اور لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ ترجمہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ تو فرق ترجیح ہے لیکن واقع میں یہاں خالق کی اطاعت مقدم ہوئی مخلوق کی اطاعت پر نہ کہ شیخ کی اطاعت مقدم ہوئی اطاعت والدین پر۔

اور ایک مرتبہ تربیت فی التطوعات کا ہے سو اس میں والدین کا حکم مقدم ہے تطوعات پر اس وجہ سے کہ یہاں والدین کی اطاعت مقدم ہو گئی ہے خالق کی اطاعت پر بلکہ اس وجہ سے کہ یہاں خالق کا امر ہی نہیں۔ ان تطوعات کے لئے بلکہ خالق نے مخلوق کی احتیاج کی رعایت

فرمایا۔ یہ حکم فرمایا کہ سبھی کی مصلحت کی رعایت کرو صوفی الوقت یہاں بھی غالب ہی کی اطاعت ہوئی۔
دوسری مثال جس کی فہم تک راسخین فی العلم ہی پہنچتے ہیں۔ سفر کرنا طلب علم دین کے لئے جبکہ والدین مانع ہوں کہ یہاں بھی ظاہر تحصیل علم دین مقدم ہے۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ آیا ہر درجہ تحصیل علم کا واجب و فرض ہے کہ وہ اطاعت والدین پر مقدم ہو۔ سو اس میں حل یہی بلا ریب تفصیل ہے کہ ایک درجہ واجب کا ہے وہ مقدم ہے حقوق والدین پر مگر وہ اردو میں بھی حاصل ہو سکتا ہے اور دوسرا عربی کے بعض نصاب سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تبحر فی العلوم النقلیۃ کی کرنے کی ضرورت ہے کہ خواہ والدین کو کیسی ہی جسمانی یا روحانی کلفت ہو مگر یہ جو درس زواہد ثلثہ کے ایک ایک حرف کے دعوے ہوتے اور ہر مسئلہ ذکر کریں گے اور ایسے مضامین حقوق زوائد میں ہوتے آگئے ہیں۔ میرے نزدیک تو جو لوگ ان کے طبقہ تحصیل کا انتظام کرتے ہیں وہ بھی ملامت سے نہیں بچتے کہ اعانت کرتے ہیں امر غیر ضروری پر۔

اور ایک مضمون اس باب میں اس سے زیادہ نازک ہے وہ یہ کہ بعض ظاہر بین یہاں تک پہنچ جاتے ہیں کہ صورت مذکورہ میں شیخ کی یا استاد کی خدمت و صحبت میں رہنا نہ چاہئے بلکہ والدین کی خدمت و اطاعت کرے مگر ان کو تنبیہ اس قدر غلو ہو جاتا ہے کہ اس سے پیچھے کی طرف کو نہیں دیکھتے صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ طالب جس کام میں مشغول ہے وہ مندوب ہے اور اطاعت والدین کی واجب ہے اور واجب مقدم ہے مندوب پر پس اس شخص کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنے شغل کو چھوڑ کر والدین کے پاس جا وے۔ سو اس نے اتنا تو صحیح سمجھا کہ واجب مقدم ہے مندوب پر مگر غلطی یہ ہوئی کہ اس کو مندوب سمجھ لیا اور غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے حدود حال کو دیکھا مآل کی تفتیش نہ کیا بعض امر ایسا ہوتا ہے کہ باعتبار حال کے وہ غیر ضروری نظر آتا ہے لیکن باعتبار مآل کے مقدمہ ہوتا ہے کسی امر واجب کا اور ظاہر ہے کہ مقدمہ واجب کا واجب ہے۔

پس اس بنا پر وہ واقع میں واجب ہی ہوتا ہے اور واجب کا تقدم حق والدین پر ہوتا ہے اس لئے ان ظاہر بینوں کا حکم اس میں غلط ہو جاوے گا۔ اور یہ امر اس قدر دقیق ہے کہ بعض وقت اہل ظاہر اس کو قبول کرنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ محققین نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر خلوت و ریاضت سے نسبت طاری ہو جاوے اور قرائن سے معلوم ہو کہ اگر اس حالت کو استمرار ہو سکتا تو البتہ

بے کار ہو جاوے گی تو اس شخص پر واجب ہے کہ خلوت چھوڑ کر تفریح مباح میں مشغول ہو، باہر نکلے، دوستوں سے ہنسے بولے۔ جب طبیعت میں تازگی و نشاط پیدا ہو جاوے۔ تب پھر خلوت میں جا بیٹھ رہے۔

ان محققین پر بڑی ملامت کی گئی ہے کہ اوراد کو جو عبادات ہیں محض عذر مزاج کو چھوڑ دیتے کا کام بھی نہیں واجب کہتے ہیں مگر جو شخص علوم شرعیہ میں اتقان و امعان کا ذریعہ رکھتا ہے اس کو اس حکم میں کچھ بھی شبہ نہ ہوگا۔ حدیث تو اس سے زیادہ کی تصریح کر رہی ہے وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب و پاخانہ کے دباؤ کے وقت نماز پڑھنے کو منع فرمایا ہے۔ سو دیکھئے کہ پیشاب و پاخانہ مزاح سے بھی ادون ہے۔ اور فرض نماز اوراد سے بھی اعلیٰ ہے۔ جب کسی شخص پر خاص حالت میں نماز کو تو علماء امت مکروہ فرمایا۔ تو ان بعض محققین پر ملامت کی کیا گنجائش ہے تو اس فرض کے وجوب کا سبب یہی ہے کہ تشغل و تبطالت و کسل کا علاج واجب ہے تاکہ اس کا اثر فرض و واجبات تک نہ پہنچ پاوے۔ اور اس واجب کا طریق معالجہ اس شخص کے لیے یہی مزاح ہو گیا تھا۔ کہ اس سے یہ مزاح بھی واجب ہو جاوے گا۔

اسی طرح بعض حالات میں مبصر کو کسی خاص شخص کی استعداد دیکھ کر ادراک ہوتا ہے کہ اگر اس کو تحصیل العلوم و اشغال نقلیات و عقلیات کا نہ ہوا یا یہ شخص کسی شیخ کامل کے پاس جذبہ نہ رہا تو شدہ و کسی وقت اس کے کسی ضروری جزو دین میں خلل واقع ہونا غالب ہے اور اس کی حفاظت واجب ہے۔ اور اس کا طریق یہی تجرید تفرغ للعبادۃ الی مدۃ محدودۃ ہے اس لئے مبصر اس شخص کے لئے اس مشورہ ظاہری کو واجب سمجھے گا۔ اور ظاہر بین اس کے حکم و تجویز کو غلط سمجھے گا۔ چنانچہ محققین کے کلام میں ایسی تصریحات موجود ہیں۔ پس اس ظاہر بین کو چاہیے کہ وہ حدیث الشاہد یری ما لا یری الغائب پر عمل کرکے اپنی رائے پر وثوق نہ کرے اور اس طالب کو تقدیم حق والدین کی رائے نہ دے۔

خضر علیہ السلام کے تصرفات کا مبنی یہی مآل بینی تھی تو وہ مثال موسوی سے اس سے بڑھا ہوا نہ تھا کہ خضر اس مآل بینی کا کشف تھا اور ان واقعات کو فراست اور بصیرت سے کوئی تعلق نہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا کلام یہی تھا۔ اس لئے ان کی نظر سے یہ امور غائب رہے اور ادراک بصیرت

ادراک مکشف سے افضل واکمل ہے اس لئے افضل موسیٰ ہی تھے۔

بعض جگہ اس مبصر کے نزدیک خود اس طالب پر اندیشہ اس کا نہیں ہوتا کہ بدون تبحر فی العلوم کے اس کا کوئی ضروری دینی جزو مختل ہو جاوے گا۔

مگر یہ طالب ہے ایسے مقام کا رہنے والا جہاں جہل و فساد غالب ہے اور اس کے ساتھ ہی کسی کو تحصیل علم دین کی طرف توجہ نہیں جس سے ان کی اصلاح ہو پس گو اس نوع واحد پر بطریق فرض کفایہ ہی تبحر واجب ہے مگر کوئی اس میں مشغول نہیں تو سب ہی گنہگار ہوں گے اور ان سب میں یہ طالب بھی گنہگار ہوگا اور گناہ سے بچنا واجب ہے اس لئے اس واجب پر نظر کر کے یہ مبصر اس طالب کو رائے دے گا کہ تم والدین کے امر کو چھوڑ کر تبحر علوم میں حاصل کرو۔ اور اپنی قوم کی اصلاح کرو۔ اس لئے ایسے مشتبہ مواقع میں ہی یا محض ظاہر پرست کی رائے پر وثوق نہ کرے کسی محقق حکیم مبصر جامع ظاہر و باطن سے فتویٰ لے کر اس کا اتباع کرے۔

تیسری مثال ایسے امور قیدیہ کی جن کو بعض اہل علم بھی مباحات یا قربت سمجھتے ہیں مگر محققین راسخین اس کو روکتے ہیں۔ سفر کرنا حج نفل کے لئے ظاہر قربت معلوم ہوتا ہے مگر بعض اشخاص کے خاص حالات سے محقق کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا حج کرنا اس لئے سفر ہوگا کہ یا تو اس سے فرض نماز کی پابندی نہ ہوگی یا اہل و عیال کے حقوق واجبہ ضائع ہوں گے۔ یا قلت زاد راہ کے سبب تکلیف اٹھاوے گا اور اس کے قلب میں بہت انتشار یا صاحب البیت سے شکایت پیدا ہوگی جیسا بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے یا وہ کر سوال حرام میں مبتلا ہوگا ونحو ذلک۔ اور یہ سب معاصی ہیں اور معصیت کا سبب بھی معصیت ہے اس لئے وہ محقق اس شخص کو حج سے منع کرتا ہے اس لئے کہ جس طرح مقدمۃ الواجب واجب قاعدہ ہے۔ اسی طرح مقدمۃ الحرام حرام بھی ایک قاعدہ ہے جس میں بعض اوقات غلبہ فاسدہ بالا اظہر چیزوں سے غلطی بھی ہو جاتی ہے اور ان کا اہل بصیرت کے بعض احکام پر استعجاب بھی ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک محقق کا بیان کیا قول ہے کہ اگر کسی شخص کو شریعت سفر حج کی اجازت نہ دے اور قرائن قویہ سے یہ معلوم ہو کہ اگر وہاں کے حالات اس شخص کے سامنے بیان کئے جاویں گے تو اس کو اس قدر شوق ہوگا کہ بہ اضطرار سفر حج کو چل کھڑا ہوگا۔ تو ایسے شخص کے سامنے ایسے شوق انگیز حالات بیان کرنا تک جائز نہیں۔ اس تحقیق پر اس حکم میں بعض ملامت ہوئی

کر دیتے وہاں کے حالات بیان کرنے کو منع کر دیا۔ مگر ان بزرگ مصنف نے یہ دیکھا کہ جس دلیل سے یہ منع کر رہے ہیں آیا اس کے کسی مقدمہ میں کوئی خدشہ ہے اگر ہے تو اس کو صاف کرنا چاہئے اگر نہیں ہے تو ماننا چاہئے مقدمات کو تسلیم کر کے نتیجہ میں کلام کرنا محض تحکم و تعنت و تنگ دلی و بے راہی ہے۔ یہی ہے وہ قاعدہ جس کی بناء پر محققین اکثر شبہات کو منع کرتے ہیں اور عامی لفظ کے لوگ یا اہلِ تعنت ان سے الجھتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے:

وکم من عائب قولا صحیحا
وآفته من الفهم السقيم

سفر شروع کرنے کے بعد کی کوتاہیاں یہاں تک ذکر تھا اس کوتاہی کا جو سفر شروع کرنے سے متعلق واقع ہوتی ہے۔ بعض کوتاہیاں بعد سفر شروع کرنے کے ہوتی ہیں مثلاً بعضے آدمی رفیقان سفر سے ذرا ذرا بات پر الجھتے ہیں کہیں اس پر کہ تم ہی باری میں جاگے کیوں نہیں، کہیں اس پر کہ اسباب کیوں اٹھاتے ہیں تو کیوں نہیں اٹھائے، اس پر کہ تم نے گاڑی کا کرایہ زیادہ دے دیا کہیں اور زیادہ خرچ کر دیا۔ بالخصوص سفر حج میں کہ گنواروں کی نوابی مزاج سخت ہو جاتا ہے سو یہ بات سخت بدخلقی میں داخل ہے۔ ہاں تو یہ امر قابلِ خیال و مطالبہ کے نہیں دوسرے اگر ان کا معاملہ ہر کسی رفیق سے مطلوب ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ یہ اس کے عیب چھانٹے اور وہ اس کے عیب نکالے، بلکہ طریقہ سہل اور مجرب نسخہ یہ ہے کہ تم اس سے کچھ مت کہو خود برابر کام کئے جاؤ اس سے خود وہ شرماوے گا۔ وہ خود بھی کام کرنے لگے گا۔ اور اگر وہ اس سے بھی متاثر نہ ہو اور تم میں صبر و تحمل نہ ہو تو بہتر ہے کہ اس سے معذرت رفاقت قطع کر دو اور جواب دے دو کہ اب ہم تم رفیق نہیں، جیسا کہ مثل اور مسافروں کے اس سے معاملہ رکھو نہ دوستی نہ شرکت۔ ورنہ دشمنی و عداوت ہے۔

بعض لوگ رفیقوں سے تو اچھا معاملہ رکھتے ہیں لیکن دوسرے مسافروں سے بدخلقی کرتے ہیں کبھی اپنے نفس کے لئے اور کبھی اپنے رفیق کے لئے۔ خصوصاً ریل میں کہ ایک آدمی یا دو آدمی کئی کئی آدمیوں کی جگہ گھیر کر کچھ خود پھیل کر کچھ اسباب و بستر پھیلا کر بیٹھتے ہیں اور نئے آنے والوں کو تو اکثر آنے ہی نہیں دیتے۔ طرح طرح کے حیلے کرتے ہیں، کبھی زور و ظلم سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور اگر وہ چلے

تک آنے والے کو بیٹھنے کی جگہ نہیں دیتے کیونکہ کسی اسٹیشن پر وہ لوگ زیادہ ہو کر قبضہ کر لیتے ہیں اور ان کو ذرا مروت
وحمیت نہیں آتا یہ نہیں سوچتے کہ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے اور یہ ہماری جگہ تو ہم اس وقت ان سے کیسے معاملہ کے
مستحق ہوتے۔ بس وہی معاملہ ہم کو ان سے کرنا چاہیے اور جو یہ سوچتے ہیں کہ یہ شرعاً بھی جائز نہیں۔ جیسے
کہ اور بھی بعض ناجائز امور کا ریل میں ارتکاب کیا جاتا ہے جن کی جزئیات کو بقدر ضرورت ہمارے
محسن و کرم مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی نے ایک رسالے کی شکل میں جمع فرمایا ہے جس کا نام
رفیق سفر یا زاد المسافرین ہے اور انشاء اللہ عنقریب طبع ہو جائے گا۔ اس لئے ہم ایسے جزئیات کے ذکر کا
اس جگہ اہتمام نہیں کرتے اور یہاں بلا قصد کوئی جزئیہ قلم پر آجاوے تو وہ اور بات ہے۔

بعضے آدمی مشترک سواری میں جیسے گھوڑا گاڑی یا اونٹ گاڑی یا موٹر یا ریل ایسی حرکتیں کرتے ہیں
کہ جس سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے۔ خاص کر ایسے غریبوں کو اذیت جو ان کی وجاہت کے سبب ان
کے سامنے ...... دم بھی نہ مار سکیں۔ مثلاً سگریٹ پینا اور دھواں باہر چھوڑنے کا کوئی خاص اہتمام
نہ کرنا۔ یا شب کے وقت غل مچا کر باتیں کرنا یا گانا بجانا اور کوئی بیہودہ حسی مذاق کرنا یا قولی یا فعلی
فحش اختیار کرنا اور اس کو مشغلہ سفر سمجھنا چاہیے۔ تو یہ کہ دوسروں کو راحت پہنچاوے اور اگر اس کی توفیق
نہ ہو تو کم از کم اس پر تو عمل رکھیں۔ معروضہ

حوالہ تحریر مولوی سید نفیس مرحوم

بعضے آدمی مالک سواری سے بدعہدی کرتے ہیں مثلاً معاہدہ ہوا ہے چار آدمی کے بٹھلانے کا اور بٹھلا دیئے
پانچ چھ۔ اگر وہ نزاع بھی نہ کرے۔ تب بھی اس کو ناراض سمجھنا چاہیے اور ایسا نہ کرنا چاہیے کہ جب خاموش
ہو گیا تو راضی ہی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خاموشی بوجہ مروت و لحاظ کے ہوتی ہے مگر دل سے راضی نہیں
ہوتی۔ تو ایسی خاموشی کافی نہیں۔ اور بعض دفعہ وہ نزاع بھی کرتا ہے مگر خواہ مخواہ اس کو دبا لیتے ہیں۔ کبھی
کہتے ہیں میاں ایسی کیا بے مروتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ میاں سواریاں ہی کیا ہیں دو تو بچے ہی ہیں۔
کبھی کہتے ہیں کہ ارے بھائی دو پیسے زیادہ لے لینا۔ کبھی کہتے ہیں کہ کسی دوسرے وقت کچھ نہ لینا اور
واہی تباہی عذروں سے کام لیتے ہیں۔ اور اس سے بحث نہیں کہ وہ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ سیدھی
بات تو یہ ہے کہ جب معاہدہ بدلے تو مالک سے صاف اطلاع کرے اور اس کے متعلق مستقل گفتگو
کرے جس طرح باہم طے ہو جائے اس کے موافق عمل کرے محض اپنے جی کو سمجھا لینا کافی نہیں۔

مزدوری کے متعلق کوتاہی

بعضے آدمی مزدور کی مزدوری نہیں ٹھہراتے، پھر چلتے وقت بلا کسی ضابطہ کے جو جی میں آیا دے دیا۔ خواہ دوسرا راضی ہو یا نہ ہو۔ اس کا ظلم ہونا تو ظاہر ہی ہے اور بعضے اپنے زعم میں بے رضی سے بچتے ہیں اور رفع بعد کی پابندی کرتے ہیں یعنی اس محکمہ کے قواعد کے موافق کرایہ مقرر اس قدر دیا جاوے گا دیدیتے ہیں اسی طرح گاڑی وغیرہ کا کرایہ گھنٹوں کے حساب سے دینے کو کافی سمجھتے ہیں ہم نے خود دیکھا ہے کہ بعض اوقات دوسرا آدمی یعنی مزدور یا گاڑی والا اپنی ناراضامندی تعریضاً ظاہر کرتا ہے کہ صاحب ایک پیسہ تو قلی بھی لے لیگا۔ دیکھئے! کیا وزنی اسباب ہے۔ اس کو زیادہ دینا چاہئے۔ فی عدد کا حساب تو مختلف مقدار کی گٹھریوں میں ہے۔ دیکھئے! چاروں گٹھریاں بڑی بڑی ہیں۔ مشکل سے اٹھائی ہیں ایک ایک عدد دو آدمیوں کے اٹھانے کا ہے۔ آپ اس کو بھی اسی حساب سے دیتے ہیں؟

غرض اس طرح سے وہ اپنی ناراضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ حضرات ان سب معروضات کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ صاحب ان لوگوں کی یہ عادت ہی ہوتی ہے۔ غرض التفات ہی نہیں کرتے اگر وہ زیادہ بولا دھمکاتے ہیں۔ ملامت کرتے ہیں وہ غریب خاموش ہوکر رہ جاتا ہے۔

عقد اجارہ میں مزدور یا مالک کی رضامندی شرط ہے

سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ عقد اجارہ میں مزدور یا مالک کی رضامندی شرط ہے کوئی ضابطہ مقرر ہو جانا شرعاً کافی نہیں یہ مسئلہ تسعیر کا ہے جس کو فقہاء نے ناکافی لکھا ہے۔ البتہ اس سے منتفع ہونے کی ایک صورت ہے جو شرع کے موافق ہے وہ یہ کہ پہلے سے ہی کہہ دیا جاوے کہ دیکھو۔ ہم اس ضابطہ کے موافق دیں گے اس کے بعد جب اس نے کام شروع کر دیا یا سواری میں بیٹھ لیا اب وہ اس کے حق میں حجت اور لازم ہو گیا۔ خوب سمجھ لینا چاہئے۔

بعضے آدمی اسباب شرط سے زیادہ لادتے ہیں بلکہ بعضے کچھ شرط ہی نہیں کرتے اور سواری والا یہ سمجھ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ معمول کے موافق ہوگا۔ مگر عین وقت پر اس کے زعم میں ثابت ہوتا ہے زیادہ ڈیوڑھا دوگنا کر رکھا ہے۔ اور باہم اختلاف اور نزاع ہوتا ہے پھر جو بھی غالب آ گیا سو اس میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب سواری کا مالک خود کہہ سکے کہ اس سے زیادہ اسباب نہ رکھا

جاوے اور پھر اس سواری کو کرایہ کرے تو اس مشورہ کا اس نے منظور کرنا پھر اس سے زیادہ لے جانا کسی
طرح جائز نہیں جب تک وہ بھی راضی نہ ہو۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مالک کا راضی ہونا شرط ہے جس نے
شرط ٹھہرائی ہے کسی دوسرے ملازم وغیرہ کا راضی ہونا کافی نہیں۔ البتہ اگر ملازم کو اختیارات شرط ٹھہرانے
کے بھی دیئے گئے ہوں تو پھر اس کی رضا بھی کافی ہے۔

ریل وغیرہ میں قانون سے زائد اسباب لے جانا جائز نہیں

یہاں سے ریل میں قانون سے زائد اسباب لے جانے کا حکم اور یہ بھی کہ اگر ریلوے کے ملازم چھوٹے بڑے زیادہ کی اجازت دیدیں تو اس کا نا جائز ہونا بھی
معلوم ہو جاوے گا خواہ وہ کچھ لے کر اجازت دیں یا ویسے ہی رعایت کریں۔ کیونکہ وہ ریل کے
مالک نہیں اور اگر ملک کی طرف سے کوئی شرط و قانون وغیرہ نہیں ہے تو پھر اس سے کرایہ کرتے وقت
دکھلا دے کہ یہ اسباب ہے یا وزن بتلا دے کہ اتنا ہوگا اس سے زیادہ نا جائز ہوگا۔

میں نے اپنے بعض اساتذہ کتب ابتدائیہ سے رئیس الاتقیاء حضرت مولانا مظفر حسین صاحب
قدس سرہ کی حکایت سنی ہے کہ اسباب دکھلانے کے بعد اگر کوئی شخص ایک خط بھی دیتا تھا کہ فلاں
شخص کو دیدیجئے تو فرما دیتے تھے یہ گھوڑے والے سے اجازت لے لو کیونکہ یہ مشروط سے زیادہ ہے۔
میرا اس حکایت کے نقل کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ یہاں تک رعایت واجب ہے بلکہ
مقصود یہ ہے کہ دیکھئے یہ احتیاط والے امر غیر واجب تک کی رعایت و اہتمام کرتے ہیں جس سے فرق
بھی ہوتی ہے کہ روشن ہوتا دیکھنے والے واجب کا تو خیال کریں گے تو مطمح نظر ان کا تعلیم ہی ہے۔ اب اس
کے بعد تنبیہ غلط بالتشبث کا بھی زائل ہو گیا سو اس حالت میں ہم کو امور واجبہ کی تو رعایت و اہتمام کرنا چاہیئے
یہ غلطیاں تو معاملات کے متعلق تھیں جو سفر میں ہوتی ہیں۔

سفر میں نماز چھوڑنا دیانات کے خلاف ہے

بعض غلطیاں دیانات کے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض آدمی سفر میں نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ
سمجھ لیتے ہیں کہ وضو اور نماز میں بڑی مشکلیں پڑتی ہیں اس لئے قضا کر لیں گے مگر کوئی ان سے
پوچھے کہ وہ مشکلیں قابل برداشت ہیں یا نا قابل برداشت ہیں۔ اگر قابل برداشت ہیں تو فرض کے
لئے برداشت کرو اور نا قابل برداشت ہیں تو جو لوگ سفر میں نماز کے پابند ہیں وہ کیسے برداشت

لیتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر کسی خفیف سی دنیوی غرض کی تکمیل بھی اس سے بعد جانا ہو تو اہتمام کر لیا ہے
تو خوشی خوشی سب گوارا کریں مگر وہ تو دین ہی کے نام سے روح قبض ہوتی ہے۔ بعض نماز تو پڑھتے
ہیں مگر اس کے شرائط و ارکان کی کچھ پروا نہیں کرتے، کوئی تیمم ہی کر رہا ہے اور پانی اسٹیشن
پر پانی کے اندر موجود مگر طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ وہ پانی پاخانہ کا ہے گو اس میں پاخانہ ملا ہوا نہیں مگر
منسوب پاخانہ کی طرف ہے۔

غضب کی بات ہے کہ شریعت کے ہوتے ہوئے دینیات میں طبیعت کو ترجیح دی جاوے۔ بعض
تیمم بھی کپڑے پر جس پر غبار بھی نہ ہو جو اجازت تیمم کی صورت میں بھی جائز نہیں۔ اور تختہ پر گرد موجود
ہے مگر اس کو یہ کیونکر ثابت ہوا کہ اس کا کیا اعتبار۔ کاش اگر مسائل شرعیہ کی تحقیق کرنے کا دستور بھی ان
کو معلوم ہوتا کہ ایسی صورت میں ان کے اس وہم ہی کا کچھ اعتبار نہیں، اصل اشیاء میں طہارت ہے
جب تک تختہ کا نجس ہونا یقینی نہ ہو اس وقت تک طاہر ہی ہے۔

بعضے استقبال قبلہ ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے بعضا اس سے کہ رخ سیدھا کرنے میں قدرے
تکلیف کرنا پڑتا ہے۔ سو اگر دیکھا جاتا کہ یہ لوگ دنیا کے کسی کام کے لئے خفیف مشقت بھی گوارا
نہیں کرتے تو ان کے اس عذر کو سنا جاتا۔ گو سننے کے بعد اس کا غلط ہونا سمجھا دیا جاتا کہ دینی
احکام کو دنیاوی مصالح پر قیاس نہیں کر سکتے کہ یہ تجارب سے اختیار کی گئی ہیں اور دین بوجہ حجاب
الٰہی کے غیر اختیاری، تو ایک کا قیاس دوسرے پر بے معنی! لیکن جب دنیوی مقاصد کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں
جھیلی جاتی ہیں اس حالت میں تو نماز کے باب میں ان کا یہ عذر قابل سماعت بھی نہیں تا بقبول چہ رسد
بعضے بیٹھ کر پڑھتے ہیں کھڑے ہوکر نہیں پڑھتے باوجودیکہ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ سو ان کی نماز بھی نہیں ہوتی۔
البتہ اگر قیام پر قدرت نہ ہو یعنی کسی سہارے سے بھی کھڑے نہ ہو سکیں، تب البتہ بیٹھ کر پڑھنا درست
ہے اس مسئلہ میں لوگ بحالت مرض بھی سخت غلطی کرتے ہیں یعنی ذرا مشقت ہوئی اور بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے
در مختار و رد المحتار میں تصریح ہے کہ اگر کسی سہارے سے کھڑا ہو سکے تب بھی کھڑا ہونا فرض ہے۔ اسی
طرح اگر تمام قرأۃ میں کھڑا ہو سکتا ہے یا بقدر تکبیر تحریمہ کھڑا ہو سکتا ہے تو اتنا ہی کھڑا ہونا فرض ہے۔
بعضے آدمی باوجودیکہ جماعت کر سکتے ہیں مگر پھر تنہا تنہا پڑھ لیتے ہیں بعضے آدمی سمجھتے ہیں کہ جماعت
کے لئے اتحاد مکان شرط ہے اور ہر درجہ جدا مکان ہے ایک درجہ میں اتنی جگہ نہیں اس لئے جماعت

نہیں کرتے۔ سو ہمارے نزدیک تو دوسری گاڑی آ جانے دوسرا امکان ہے لیکن ایک گاڑی کے متعدد ڈبے سب ایک ہی مکان ہیں۔ ان میں جماعت ہو سکتی ہے اور اگر کسی صاحب علم کی یہی تحقیق ہو یا کسی عالم کی اس تحقیق میں کوئی تقلید کرتا ہو کہ ہر ڈبہ جدا مکان ہے تو یوں کریں کہ ایک ایک ڈبہ میں دو دو آدمی جماعت کرلیں اگر اس رات کا تو اہتمام نہ ہو تو ایک ہی وقت میں دو نہ آگے پیچھے اور چونکہ یہ مسجد محلہ نہیں اس لئے اس میں تکرار جماعت کا اختلاف بھی نہ ہوگا۔

حد سے زیادہ تشدد بھی نہیں کرنا چاہیے

بعضے آدمی ان بے احتیاطیوں کے مقابلہ میں اس قدر محتاط بنتے ہیں کہ ان کی احتیاط درجۂ تشدد تک پہنچ جاتی ہے مثلاً ریل کے اندر ہرگز نماز نہ پڑھیں گے۔ اسٹیشن ہی پر تو فرض پڑھیں گے جس میں بعض اوقات۔ طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے مثلاً اسباب ریل ہی میں رکھا ہے اور کچھ جاتا رہا یا کم از کم طبیعت ادھر مشغول رہی یا دوسرے مسافروں نے ان کی جگہ پر قبضہ کر لیا یا نہیں کیا لیکن ان کو اس احتمال پر پریشانی رہی اور مثلاً گاڑی نے سیٹی دے دی اور ان کو نیت توڑنا پڑی یا ایسا نہیں کیا لیکن مضطرب ہو گئے اور بعض اوقات گاڑی چھوٹ گئی۔ اور ان کے اسباب کا نقصان یا سفر کا حرج ہوا اس وقت خود نماز سے قلب میں خدانخواستہ تنگی پیدا ہو گئی یا خود ان کو تنگی نہیں ہوئی لیکن جو لوگ ہمیشہ دین کو مشکل دیکھا کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان کو دین سے توحش ہے ان کا تنفر اور توحش اور بڑھ گیا۔ اور ان کی فہرست میں ایک عدد اور بڑھ گیا تو دیکھئے دین پر عمل کرنے سے یہ پریشانی اور مضرت ہوتی ہے اور اس جاہل کو کون سمجھائے کہ اس کی پریشانی کا سبب خود اس کا تشدد ہے ذکر دین میں سو حدیث۔ "یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا" ترجمہ تم دونوں کو چاہیے کہ آسان طریقہ اختیار کرو اور لوگوں کو تنگی میں نہ ڈالو اور لوگوں کو بشارت سناؤ ان کو نفرت نہ دلاؤ۔ ظاہراً قول اور فعل دونوں کو عام ہے۔

اور اس پر بعض اوقات ایک طرہ اور ہوتا ہے کہ اسٹیشن پر اتر کر جماعت کرنے کے لئے امام صاحب ایسے تجویز ہوتے ہیں کہ وہ فرصت کا وقت پا کر قرأت میں تطویل اور رکوع اور سجود میں اطمینان سے تعدیل شروع کر دیتے ہیں اگر گاڑی نہ نکلے تب بھی مقتدیوں کا خصوص اس وقت کہ مجمع میں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں کیسا دل پریشان ہوتا ہے۔ گویا ان بزرگ کو عمر بھر میں آج ہی موقع عبادت

کا طالب ہے۔ تو اس سے پہلے کسی نے عمر بھر اور نہ آئندہ کوئی ہے اس لئے اس وقت کو غنیمت سمجھا اور عمر بھر کا ارمان آج رات نکالنا ضروری ہو گیا۔

دو جاہل صوفیوں کی حکایت

اسی طرح ریل میں دو گدڑی والوں کی حکایت ہے کہ دہلی میں ایک قافلہ کے ساتھ سوار تھے۔ ایک صاحب نے تو یہ کیا کہ نماز ظہر کے لئے اترے اور پختہ وضو کرتے ہی بیٹھ کر وظیفہ شروع کر دیا کہ میں تو عصر پڑھ کر اٹھوں گا۔ بیچارے رفیق مصیبت میں آ گئے کہ ظہر کو وضو اور پڑھ لیں کا عصر۔ اسی ایک صاحب مغرب کے وقت اترے اور نماز کے بعد صلوۃ الاوابین شروع کر دی اور تاریکی بڑھنے سے مشروع ہوئی۔ اور منزل کسی قدر بہت پرے تھی اور مقام خطرناک سو شریعت ایسے تشددات کو پسند نہیں کرتی۔ جس سے خود کو یا اس سے بڑھ کر دوسروں کو کلفت و ضیق ہو۔ یہاں راز معلوم ہوا ہو گا اس ارشاد کا ان اللہ یحب ان یوتی رخصہ کما یحب ان یوتی عزائمہ۔ یعنی رخصت پر عمل کرنے میں بہت سی مصلحتیں ہیں کہ وہ سبب ہو جاتا ہے دینی سہولت اور بشاشت اور انشراح اور نشاط اور دلچسپی کا اور یہ مقصد عظیم ہے۔ مقاصد تو ایسی البتہ یہ تو احوال قطع مسافت کے متعلق تھیں۔

عارضی قیام کے متعلق کوتاہیاں

بعض کوتاہیاں عارضی قیام کے متعلق ہیں یعنی کسی مقام پر ایک دو شب قیام ہو یا خواہ سرائے میں یا کسی خاص میزبان کے یہاں۔ اگر سرائے میں قیام کیا ہے تو دوسرے امر کی تو ضرورت ہی ہے کہ دوسرے مسافروں کو اس سے کلفت نہ ہو نہ سرائے کے منتظم والوں کو تکلیف نہ ہونے پاوے۔ مثلاً بعضے لوگ بلا ضرورت شور و غل مچاتے ہیں بلا ضرورت جاگتے ہیں اور دوستوں کے ساتھ قصہ کہانی بکتے ہیں۔ بعضے آدمی گانا بجاتے ہیں جس سے دوسرے مسافروں کے آرام و نوم میں خلل پڑتا ہے۔ بعضے ایسا کرتے ہیں کہ دوسرے مسافر کے حجرہ میں سے جگہ روک لیں یا جو چاہتے ہیں اٹھا لاتے ہیں وہ غریب آ کر پریشان ہوتا ہے اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ جواب سے مانگ لیں اور تکرار بے ہودگی ہے۔ کیا حق ہے کہ دوسرے کی سابق قبضہ کی ہوئی جگہ لے لیں۔ یہ شریعت کے بھی خلاف ہے۔ اور مروت سے بھی بعید ہے۔ اگر یہی معاملہ ان کے ساتھ ہو تو کیسی دل پر گذرے تو انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند۔ اور مثلاً بعضے لوگ باوجود یکہ پیشاب پاخانہ کے لئے خاص موقع ہیں مگر کوٹھڑی ہی میں حاجت لے لیتے ہیں۔ یا بعض گذرگاہ مسافران پر ایسا کرتے

ہیں۔ جس سے بعض اوقات ٹھیکیدار کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور بعض اوقات دوسرے مسافروں کو تکلیف
ہوتی ہے۔ مثلاً بعض لوگ چلتے وقت ٹھیکیدار کا حساب صاف کر کے نہیں جاتے یا آنکھ بچا کر نکل گئے یا زائد
خرچ کر بیٹھے۔ اس میں علاوہ گناہ کے جس میں حق اللہ و حق العبد دونوں ضائع کئے جاتے ہیں۔ ایک
خرابی یہ ہوتی ہے کہ دوسرے مسافروں کا بھی اعتبار جاتا رہتا ہے اور ان کے لئے ضوابط سخت تجویز کئے جاتے
ہیں۔ لہٰذا اس کے سبب یہ شخص بنتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت حدیث میں مفتاح الشر و
مغلاق الخیر آیا ہے۔

اگر کسی کے پاس جانا ہو تو اسے پہلے سے اطلاع دینی چاہیے

اور اگر کسی میزبان کے پاس ٹھہرے ہیں، تو اس میں
بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ بدون اس کے کہ اس کو اپنی آمد کی اطلاع دیں اس کے پاس بے وقت
کھانا کھانے بے وقت جا پہنچتے ہیں کہ اس وقت اس کو کھانا تیار کرنے میں کلفت ہوتی ہے۔ اگر
حساب سے پہنچنے کا وقت نہ ہو تو چاہیے کہ کھانے کا انتظام پہنچنے کے وقت بطور خود کر لیں۔ اور
فارغ ہو کر وہاں جاویں اور جاتے ہی اطلاع کر دیں۔

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ اول اس کو اپنی آمد کے وقت سے اطلاع تو دیدی ہے مگر اس وقت
پہنچے نہیں وہ بے چارہ اسٹیشن پر آیا سواری لا کر یہ دیا وقت صرف کیا مگر ناکام آیا اور یہ نواب صاحب ذرا
اٹھنے میں یا کسی دوسرے میزبان کے اصرار کرنے سے پھسل گئے۔ بعض اوقات کئی کئی وقت اسی طرح
تکلیف اٹھاتا ہے اور ان کو یہ توفیق بھی نہیں ہوتی کہ وقت موعود آنے سے قبل اس کو مکرر اس
ارادہ کے فسخ یا تبدیل کی اطلاع کر دیں۔

خوب یاد رکھو کہ یہ سب ایذا کے خلاف ہے مگر لوگ اس کو سرسری سمجھتے ہیں۔ حدیث میں
نص ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده۔ ترجمہ: مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے
دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

پھر جب اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان نہ بچا تو مسلم بدرجہ مقصود فی الحدیث کہاں
رہ گیا۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل بزرگی تسبیح پڑھنے کا نام رہ گیا کسی کی راحت و کلفت کی پروا ہی نہیں۔
یہی وجہ ہے کہ اس خاص کوتاہی میں بہت سے ثقات و منتسبین الی العلم و الدین بھی مبتلا ہیں۔ اور اس

کا ٹھیک تو ان کے مطلب سمجھا نہیں۔

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ کھانا کھا کر پہنچے مگر جاتے ہی اس کو یہ اطلاع نہیں کی کہ میں کھانا کھا چکا ہوں اس وقت اہتمام نہ کیا جاوے۔ وہ بیچارہ خود تو تنگ طبیعت ہوا اور نہ لحاظ سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ آپ کھانا تو نہیں کھائیں گے۔ غرض اس نے بڑے اہتمام سے کھانا تیار کیا جب ان کے سامنے کھانا آیا تو آپ نے نہایت بے رخی سے ایک چیز میں اس کے تمام انتظام کا خون کر دیا کہ میں تو کھا چکا تھا۔ بندۂ خدا پہلے کس نے منہ بند کر دیا تھا۔ کہہ دینا تھا۔

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ کھانا کھانے بیٹھے اس وقت فرماتے ہیں کہ میں تو گوشت نہیں کھاتا یا میں تو مرچیں نہیں کھاتا۔ ظالم اگر پہلے ہی اس کو اطلاع دے دی ہوتی تو کیا مشکل تھا۔ اب وہ مظلوم فکر میں پڑ گیا۔ کہیں پڑوس سے بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ کہیں گھر میں کچھ تدبیر کرتا ہے۔ غرض زر دادن و درد سر خریدن کا مصداق بن گیا۔

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ بے اطلاع میزبان کے کہیں چل دیئے۔ اب وہ تلاش کرتا پھرتا ہے اور منتظر بیٹھا ہے یا اگر وقت گزر گیا۔ تب سب کا روزہ کھلا، یا آ کر کہہ دیا کہ مجھ کو فلاں شخص نے اصرار کر کے کھلا دیا تھا۔ میں نے انکار بھی کیا مگر اس نے مانا ہی نہیں۔ ان بیچاروں کو یہ خبر نہیں کہ کسی کی دلجوئی کب جائز ہے کہ دوسرے کی دل شکنی ہو۔ اور وہ بھی ایسے شخص کی جس کا حق مقدم اور سابق ہو۔

بعض آدمی ایسا کرتے ہیں کہ دوسرے کی دعوت قبول کر لی اور میزبان سے اجازت لینا کیسا اس کو اطلاع بھی نہیں کی۔ بعض ایسا کرتے ہیں کہ رخصت ہونے کا قصد دل میں کر لیا مگر میزبان کو نہیں بتلایا۔ اب عین وقت پر آ کر دستر خوان پر کہتے ہیں، ہم گاڑی پر جائیں گے، سواری کا انتظام کر دو۔ اس کا سامان ضیافت کا بھی ضائع گیا اور بعض اوقات بعض قصبات میں عین وقت پر سواری کے انتظام میں دشواری ہوتی ہے۔ غرض یہ سب پریشان کرنے کی باتیں ہیں۔ جن سے احتیاط و احتراز واجب ہے۔

مسافر کی گھر کے متعلق کوتاہیاں

اب بعض کوتاہیاں اپنے گھر والوں کے متعلق رہ گئیں۔ ان کے ذکر پہ مضمون کو ختم کرتا ہوں مثلاً سفر میں جا کر گھر والوں کو ایسے

پھر لے کر ان کو اپنی خیریت تک کی اطلاع نہیں دی۔ ان سے اپنا اطمینان کر لیا۔ سب کو عافیت چھوڑ کر آیا
تھا، اب بھی بعافیت ہوں گے۔ مگر وہ تو پردیسی ہیں کہ سفر میں ہزاروں حوادث محتمل ہوتے ہیں، ان کو بھی
مطمئن کرنا چاہیے تھا۔ اور مثلاً ان کو واپسی کے وقت کی اطلاع دی۔ مگر اس وقت نہیں پہنچے وہ
بے چارے اسی الجھن میں رات بھر بیدار و پریشان رہتے ہیں۔ اس کو محض اپنی تکلیف سے پریشانی ہوئی
اور گھر والوں کو تعلق محبت کے سبب یہ کیا پریشانی ہوتی ہے کہ خدا جانے خیریت بھی ہو گی اور مثلاً وجود
اطلاع کر سکنے کے بلا کسی مصلحت کے دفعۃً گھر آ جانا احادیث میں اس کی بھی ممانعت ہے جس کی حکمتوں
میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ شریف عورتیں شوہر کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے زیب و زینت
نہیں کرتی ہیں۔ سو اندیشہ ہو کہ اسی مبتذل حالت میں دیکھ کر اس کو نفرت ہو جائے جو بنیاد ہو جاوے
مصالح خانہ داری کے تباہ ہونے کی، اگر پہلے سے اطلاع ہو تو وہ آراستہ اور پیراستہ ہو جاوے۔
ممکن ہے کہ سفر کی کوتاہیاں کئی بہت اور بھی ذہن میں ہوں مگر فی البدیہہ جو خیال میں آ گئیں۔ وہ
لکھ دیں، فہیم آدمی ان ہی کے اصول سے دوسری کوتاہیوں کی بھی اصلاح کر سکتا ہے فقط

واللہ الموفق لسبیل لا وکس فیہ ولا شطط

تعلیم نسواں سے متعلق کوتاہیاں

اصلاح متعلقہ بہ تعلیم نسواں

جب تک کہ بعد ورود حدیث طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ، ترجمہ: علم طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، وغیرہ تمسک من النصوص الموجبۃ لتحصیل العلم علی الرجال والنساء۔ اس بحث پر مستقل کلام کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ خصوص جبکہ ما تقدم بہت قبل اس میں مجملاً اس سے تعارض بھی ہو چکا ہے لیکن بعض واقعات و خصوصیات کے اکثر وارد ان میں ہندوستانی مستورات کے حالات میں جن کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے اس باب میں مستقل اور کسی قدر مفصل گفتگو کئے جانے کو مقتضی ہونے کے سبب اس کا بقدر ضرورت مکرر ذکر کیا جاتا ہے

تعلیم نسواں کے متعلق لوگوں کی تین قسمیں

سو جاننا چاہیے کہ اس مقدمہ میں جہاں تک تتبع کیا گیا۔ تین خیال کے لوگ ہیں۔ ایک وہ کہ تعلیم نسواں کے موافق ہیں۔ دعائی مگر تعلیم کا اہتمام نہیں۔

دوسرے وہ کہ اس کے مخالف ہیں۔

[illegible] فی تفسیرہ وابن مردویہ وفیہ ضعف الی آخرہ)

۳۔ قولہ ولمن غلبہم وحلی عن صفوانہ کذا فی کنز العمال وغیرہ من التصریح بعدالۃ

بالرجال والنساء۔

دلیل عقلی

اور دلیل عقلی یہ ہے کہ اصلاح عقائد و اعمال کی فرض ہے اور وہ موقوف ہے ان کی تحصیل پر، چنانچہ ظاہر ہے۔ اور فرض کا موقوف علیہ فرض ہے۔ پس تحصیل علم فرض ہوا۔ اور جس چیز پر موقوف ہونا اعمال کا علم پر بالکل بدیہی ہے۔ مگر اس سے ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ درستی بھی ہے۔ چنانچہ بے علم عورتیں جس حالت میں ہیں سب دیکھتے ہیں کہ ان کو شرک کفر کی کچھ تمیز ہے نہ ایمان اور اسلام کی کچھ محبت ہے۔ جو چاہیں خدا تعالیٰ کی شان میں بک دیتی ہیں، جو چاہیں احکام شرعیہ کے مقابلہ میں زبان سے نکال بیٹھتی ہیں۔ اولاد کے لئے یا شوہر کو مسخر کرنے کے لئے ٹونے ٹوٹکے، جادو منتر، تعویذ جو کوئی بتلا دیتا ہے بلا امتیاز مشروع نامشروع کے سب ہی کچھ کر گذرتی ہیں۔

جب عقائد ہی میں یہ حالت ہے تو نماز روزہ کا کیا ذکر ہے۔ حتیٰ کہ بعض کی نوبت ترک سے گذر کر استخفاف بلکہ تمسخر و تحقیر و بدخیالی تک پہنچ جاتی ہے یعنی بعض تو باوجود فرض سمجھنے کے اس کو ترک ہی کر دیتی ہیں۔ اور بعض اس کی وقعت بھی نہیں کرتیں کہ کوئی ضروری امر نہیں سمجھتیں اور بعض اس کو نحوست کا موجب معرفت اعتقاد کرتی ہیں۔ اور یہ دونوں کفر صریح ہیں۔ اور اول فسق و کبیرہ ہے۔

جب نماز روزہ میں یہ کیفیت ہے جس میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا تو زکوٰۃ و حج جس میں روپیہ کا بھی خرچ ہے اس کو تو پوچھو ہی مت .....! اور جب عقیدہ اعمال دیانات کا یہ حال ہے تو معاملات کی درستی کا تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نماز روزہ کی صورت تو دین کی سی ہے۔ اور معاملات تو عوام کی نظر میں بالکل دنیا ہی کی شکل رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی درستی کا اہتمام تو خاص لوگ کرتے ہیں جاہل مستورات کیا درستی کریں گی۔

پھر جب معاملات کے ساتھ یہ طرز عمل ہے تو معاشرت کی اصلاح تک تو کیا نوبت پہنچ سکتی ہے کیونکہ معاملات کو حقوق العباد تو سمجھا جاتا ہے۔ بخلاف معاشرت کے کہ اس میں یہ بھی نہیں سمجھا جاتا اس لئے اس کا بالکل ہی اہتمام نہیں ہے۔ پھر جب معاملات و معاشرت سے تنگی پیدا [illegible]

ہے تو اخلاقِ باطنی مثل تواضع و اخلاص و خوف و خشیت و صبر و شکر و توکل وغیرہ کی طرف توجہ کیا تو یہ ہوتی۔ کیونکہ معاملات کا زیادہ اور معاشرت کا اس سے کم دوسروں تک تو اثر پہنچنا معلوم ہے۔ نیز ان پر بعض اوقات نیک نامی و بدنامی کا ترتب بھی ہو جاتا ہے۔ بخلاف اخلاقِ باطنی کے کہ اس کا غالب اثر بھی اپنی ہی ذات تک محدود ہے۔ اور بوجہ خفا کے دوسروں کو ان کا علم بھی کم ہوتا ہے جس سے نیک نامی یا بدنامی مرتب ہو۔ اس لئے اس کا اہتمام تو بالکل ہی نادر ہے حتیٰ کہ بہت سے خواص میں بھی ناپید چہ جائیکہ عوام

و مستورات

بہرحال ان سب امور دینیہ میں قلت مبالات کا اصل منشا وہ سبب قلت علم دین ہے۔ پھر جہاں بالکل ہی علم نہ ہو اور اس سے بڑھ کر یہ فطرۃً عقل بھی کم ہو۔ جیسا کہ طبقۂ اناث یعنی عورتیں پر ناقص العقل ہیں۔ غرض جہاں نہ عقل ہو نہ علم ہو تو وہاں امور مذکورہ میں کوتاہی کی کیا حد ہوگی؟

غرض عقل اور مشاہدہ دونوں شاہد ہیں کہ بدون علم کے عمل کی تصحیح ممکن نہیں اور عمل کی تصحیح واجب اور فرض ۔۔۔ پس تحصیل علم دین کا فرض ہونا جیسا اوپر مروی ہوا ہے۔ عقلاً بھی ثابت ہو گیا اور شرعاً فرض ہونا اس سے اوپر بیان کیا گیا ہے تو دونوں طرح تحصیل علم دین فرض ہوا۔

پس ان لوگوں کا یہ خیال کہ جب عورتوں کو نوکری کرنا نہیں ہے تو ان کی تعلیم کیا ضرور ہے؟ محض غلط ٹھہرا۔ یہ جواب ہوا ان کی مذکورہ کوتاہی کا۔

تعلیمِ نسواں کی فرضیت پر ایک شبہ اور اس کا جواب

البتہ اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ علم دین کی فرضیت سے تعلیم بطریق متعارف کا واجب ہونا لازم نہیں۔ کہ مستورات کو کتابیں بھی پڑھائی جائیں۔ بلکہ یہ فرض زبانی علم سے پوچھ پاچھ رکھنے سے ادا ہو سکتا ہے۔

سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ واقعی یہ بات صحیح اور ہم تعلیم متعارف کو فی نفسہ واجب بھی نہیں کہتے۔ لیکن یہاں چند مقدمے قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے گو بنفسہ نہ ہو۔ جیسے جو شخص پیادہ سفر حج قطع کرنے پر قادر نہ ہو۔ اور اس شخص کے زمانہ میں ریل اور آگبوٹ و جہاز ہی ذریعہ قطع سفر کا متعین ہو۔ اور اس کے پاس اس قدر وسعت و استطاعت بھی ہو۔ تو اس شخص پر واجب ہوگا کہ سفر کا عزم کرے

اور ریل اور اگبوٹ کا ٹکٹ خرید کر اس میں سوار ہو۔ سو ریل اور اگبوٹ کا ٹکٹ خریدنا اور اس پر سوار ہونا فی نفسہٖ شرعاً فرض نہیں۔ لیکن چونکہ ایک فرض کا ذریعہ ہے اس لئے یہ بھی فرض ہوگا۔ گویا لغیرہٖ ہے یہ مقدمہ تو ثابت ہو چکا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ تجربہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ علم کا اذہان میں قابل اطمینان درجہ میں محفوظ رہنا موقوف ہے کتب کے پڑھنے پر جو کہ تعلیم کا متعارف طریق ہے اور محفوظ رکھنا علم دین کا واجب ہے۔ پس بنا بر مقدمہ اولیٰ بطریق متعارف تعلیم کا جاری رکھنا بھی واجب ہے۔ البتہ یہ واجب علی الکفایہ ہے۔ یعنی ہر مقام پر اتنے آدمی دینیات پڑھے ہوئے ہونے چاہئیں کہ اہل حاجت کے سوالوں کا جواب دے سکیں۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ یہ بھی تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ مردوں میں علماء کا پایا جانا مستورات کی ضروریات دینیہ کے لئے کافی وافی نہیں۔ دو وجہ سے اول پردہ کے سبب جو کہ اہم الواجبات ہے سب عورتوں کا علماء کے پاس جانا قریباً ناممکن ہے اور گھر کے مردوں کو اگر واسطہ بنایا جاوے تو بعض مستورات کو تو گھر کے ایسے مرد بھی میسر نہیں ہوتے اور بعض جگہ خود مردوں ہی کو اپنے دین کا بھی اہتمام نہیں ہوتا تو وہ دوسروں کے لئے سوال کرنے کا کیا اہتمام کریں گے۔

پس ایسی عورتوں کو دین کی تحقیق از بس دشوار ہے اور اگر اتفاق سے کسی کی رسائی بھی ہو گئی یا کسی کے گھر میں باپ بیٹا بھائی وغیرہ عالم ہیں تب بھی بعض مسائل عورتیں ان مردوں سے نہیں پوچھ سکتیں۔ ایسی بے تکلفی شوہر سے ہوتی ہے تو سب شوہروں کا ایسا ہونا خود عادتاً ناممکن ہے۔ تو ان کی عام ابتلائی رفع ہونے کی بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ کچھ عورتیں پڑھی ہوئی ہوں۔ اور عام مستورات ان سے اپنے دین کی ہر قسم کی تحقیقات کیا کریں۔ پس کچھ عورتوں کو بطریق متعارف تعلیم دین دینا واجب ہوا۔

پس اس شبہ کا بھی جواب ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ جیسے پڑھے مردوں کی طرح عورتوں میں بھی تعلیم ہونا ضروری ہے۔ اور اس غلط خیال عدم ضرورت تعلیم نسواں کا بالکلیہ استیصال ہو گیا۔

روشن طبیعت والوں کے شبہات اور ان کا جواب

اب روشن طبیعت کے متعلق کچھ لکھا جاتا ہے جو تعلیم نسواں کے مخالف

ہیں۔ اور اس کو جنت فردوس سمجھتے ہیں۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ ہم نے جتنی پڑھی عورتوں کو آزاد
اور بے باک اور ذلیل کیا اور بدکار اور عفت سوز کیا ہے۔ خاص کر اگر لڑکیاں بھی جب نئی ہوں تو
اور کبھی شوخ چشم اور چلتی ہیں جس کو چاہا خط لکھ بھیجا۔ جس کو چاہا پیام و سلام پہنچا دیا۔ اس طرح دوسری طرف
بھی طمع ہوتی ہے کہ اپنے نفسانی جذبات کو ان تک بذریعہ تحریر پہنچا دیتے ہیں۔ اور ان کے پاس پہنچتی ہیں
کبھی تو وہ بھی متاثر ہو کر نرم جواب دیتی ہیں اور سلسلہ بڑھتا ہے یہاں تک کہ جو کچھ واقع ہونا ہے
واقع ہوتا ہے۔ اور کبھی جواب نہیں دیتیں اور سکوت کرتی ہیں تو مریض القلب لوگ اس سے بھی آس لگایا
کرتے ہیں اور ان کے نیم راضی ہونے پر پھر وہ لوگ آئندہ کے پیام و سلام و تحریر سے اس کمی کو پورا کیا کرتے
ہیں جو کچھ گوش زد ہو کر سکے وارد۔ قاعدہ اکثریہ ہے کہ بعض کو طرز بیان جادو نشان ہوتا ہے پھر نسوانی طبع
معمولی طور پر نرم بھی ہوتی ہیں تو شیطان کا داؤں چلنا کچھ زیادہ عجیب نہیں ہوتا اور اگر کسی مکتوب الیہا نے
ناراضی بھی ظاہر کی اور اس ناراضی کا جواب کو تب تک بھی پہنچا دیا ہے مگر اپنے شوہر یا والدین کے خوف
سے کہ خود جانے کیا گمان کریں گے۔ اور کیا معاملہ کریں گے نیچے غم و دل سے اس کا اخفا کرتی ہیں اور
اسطرح پردہ کہ انہیں ہر طرح کی مضرت سے محفوظ سمجھتے ہیں اس لئے ان کی جسارت بڑھتی ہے۔ اور
پھر وقت موقع پر اس کی کسر پوری کرتے ہیں۔

اور ان سب دقتوں کا جبکہ ان مستورات کا تعلیم یافتہ ہونا ہے اگر وہ ناخواندہ ہوں تو ان
کے پاس مضمون بھیجنے سے اندیشہ ہوگا۔ دوسرے کو مطلع کرنے کا یہ سبب ہو جاوے گا اس باب
کے مسدود ہو جانے کا۔

اور یہ مفسدہ اس صورت میں زیادہ ممکن ہے جبکہ کسی عورت کے مضامین اخباروں میں بھی چھپنے لگیں
اور ان مضامین کو دیکھ کر سخن سنج اس خیال میں اندازہ کرتے ہیں کہ اس کے رنگ طبیعت اور جذبات کا اندازہ
کا قیاس مستورات کے خطوط سے وہ بہت زیادہ کھینچتے ہیں۔ بالخصوص اگر وہ کلام منظوم بھی ہو تو اور بھی آفت اور
اس زمانے میں تو ایک اور غضب ہے کہ اکثر کے صاحب مضامین کا نام اور پتہ تک صاف لکھ دیا
جاتا ہے کہ فلانے کی بیوی فلانے کی بیٹی۔ فلاں جگہ کی رہنے والی۔ اور یہ تمام تر خرابیاں ان کے لکھے پڑھے
ہونے سے پیدا ہوتی ہیں اور اگر ان عفیفہ نیک روایتوں کی کسی طرح پر شوہر یا اہل خانہ کو اطلاع بھی
ہوگئی تو جب تک پڑھا آدمی ہوشیار نہ ہو صحن مادری پر زیادہ قدر ہوتا ہے وہ ایسی تو نہیں کرتی

کہ کبھی ان پر حرف بھی نہ آنے دے گا اور الٹا منہ بند کرا دیں گی۔ مکاری سے وہ دھمکی دیتی کہ ہم کو یوں کیا کہیں خودکشی اور کنوئیں میں ڈوب جانے کی دھمکی دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ اس غریب بازپرس کرنے والے کو خوشامد کرنا پڑتی اور ڈر کے مارے پھر کبھی زبان تک نہ ہلا سکے گا۔

ایک نمونہ اس تعلیم یافتہ طبقہ اناث میں یہ ہوتی ہے کہ بہت سی کتابیں مثلاً کر زمین میں عشق بازی کے قصے، مناظر اور رنگا رنگ کے ناول شوق انگیز غزلیں پھر ان سے طبیعت بگڑتی ہے کبھی ایسی غزلیں زبانی یاد کر کے پڑھتی ہیں کہ دروازہ میں یا پڑوس اور محلہ میں یا سڑک پر آواز جاتی ہے۔ اور آواز پر کوئی فریفتہ ہو کر درپے ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ ناکام بھی رہا تاہم رسوائی اور پریشانی کا سبب تو بن ہی جاتا ہے۔

یہ خلاصہ ہے ان صاحبوں کے خیالات کا اور میں ان واقعات کی تکذیب نہیں کرتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان صاحبوں نے کوتاہ نظری سے کام لیا۔ واقعات کے حقائق میں غور نہیں کیا اصل یہ ہے کہ ان سب خرابیوں کا ذمہ دار تعلیم نہیں ہے بلکہ طرز تعلیم ہے یا نصاب تعلیم ہے یا طرز عمل ہے یا سوء تدبیر ہے یعنی یا تو یہ ہوا کہ ایسی کتابیں نہیں پڑھائی گئیں جن سے احکام حرام و حلال اور تفصیل ثواب و عقاب اور طریق تہذیب اخلاق معلوم ہوں اور جس سے خوف و خشیت و معرفت و عظمت حق حاصل ہو ان کو صرف حرف شناس بنا کر چھوڑ دیا ہے انہوں نے اپنی رائے سے اردو کے مختلف رسالوں کا مطالعہ کر کے پڑھنے کی عبارت بڑھائی ہے اور تعلیم یافتہ کا لقب پا کر اس طرح تعلیم کو بدنام کیا ہے۔
تو ظاہر ہے کہ محض حرف شناسی کو تعلیم کہہ سکتے ہیں اور نہ صرف حرف شناسی اصلاح اعمال و اخلاق کی کفالت کر سکتی ہے۔

اور یا یہ ہوا ہے کہ باوجود نصاب تعلیم کے مفید و کافی ہونے کے اس نصاب کے مضامین کو قلب میں جمانے کی کوشش نہیں کی گئی اور عمل کی نگرانی نہیں کی گئی۔ مثلاً اس کی ضرورت ہے کہ جس روز کسی لڑکی نے یہ مسئلہ پڑھا کہ غیبت گناہ ہے اس کے بعد اگر وہ غیبت کرے تو فوراً اس کو یاد دلا دے کہ دیکھو تم نے کیا پڑھا تھا۔ اس کے خلاف کرتی ہو۔ اور مثلاً ان کو پردہ کی ضرورت یا بابت آیات و احادیث کی تاکید پڑھائی گئی تھی اور پھر اس میں کوتاہی یا غفلت کا مشاہدہ ہوا۔ فوراً اس کو روکنا چاہئے یا ان کو حرص مال و زیور کی مذمت پڑھائی گئی پھر انہوں نے کسی تکلف کے کپڑے یا غیر ضروری زیور کی ہوس کی تو فوراً ان کو متنبہ کیا جاوے۔ اسی طرح امید ہے کہ اخلاق فاضلہ و اعمال صالحہ کا ملکہ ان میں پیدا ہو جاوے گا۔

اور یا یہ ہوا ہے کہ ان کی خود طبیعت اور طینت ہی میں صلاحیت اور قابلیت نہیں ہے تو ایسی
صورت میں تربیت نا اہل را چوں گردکان بر گنبد ست کا اور شعر ہے ؎

شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے
ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

کا مضمون ہے۔

یہ گفتگو تو خود ان کے احوال و اعمال کے متعلق تھی اور جو افعال دوسرے شریر لوگوں کے شمار کرتے
ہیں ان کا انتظام دوسری تدبیر سے ہوتا ہے اس کے انسداد کی اچھی تدبیر یہ ہے کہ واسطے کے ساتھ بہت
سختی کی جاوے اور اپنے مردوں کو بالکل صاف اطلاع دیدی جاوے۔

غرض مفاسد کے اسباب یہ پائے جب یہ ہے تو اس میں عورتوں کی کیا تخصیص ہے۔ یہی اسباب
فساد اگر مردوں کو پیش آویں۔ وہ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ پھر کیا وجہ کہ عورتوں کو تعلیم سے روکا جاوے۔
اور مردوں کو تعلیم میں ہر طرح کی آزادی دی جاوے بلکہ اہتمام کیا جاوے۔

اس فرق کی وجہ بجز تامل بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ عورت سے مفاسد و قبائح یا اس
کی طرف نسبت قبائح عرفاً موجب ذلت اور رسوائی ہے اور یہی امور اگر مرد سے صادر ہوں یا
اس کی طرف منسوب ہوں تو وہ عرفاً موجب ذلت اور رسوائی نہیں ہے اس لئے عورت کے لئے
ان مفاسد کے احتمال کو مانع تعلیم سے قرار دیا ہے۔ اور مردوں کے لئے نہیں۔ باقی شرعاً ظاہر ہے
کہ اس باب میں مرد و عورت یکساں ہیں اگر عورت کے لئے معصیت مذموم و قابل لوم ہے تو اسی
درجہ میں مرد کے لئے بھی۔ اور اگر مرد کے لئے موجب طہارت و نزاہت ہے تو اسی
درجہ میں عورت کے لئے بھی۔ پس جب شرعاً دونوں برابر ہیں اور عرفاً متفاوت۔ پس اس تفاوت
سے متاثر ہونا یعنی ایک کے لئے ان احتمالات کا اعتبار کرنا دوسرے کے لئے نہ کرنا عرف کو
شرع پر ترجیح دینا ہے۔ جو سبب بڑا شعبہ ہے جاہلیت کا جس کا منشا تکبر اور ترفع ہے۔ اور
یہ صرف میرا ہی دعوی نہیں بلکہ مدعا علیہم کو اقرار بھی ہے چنانچہ بکثرت ان لوگوں کی زبان سے سنا گیا ہے
کہ میاں مرد کا کیا ہے۔ اس کی مثال تو برتن کی سی ہے کہ دس دفعہ سن گیا اور جب دھویا صاف ہو گیا
اور عورت کی مثال موتی کی آب کی سی ہے کہ اگر ایک دفعہ اتر گئی تو پھر چڑھ نہیں سکتی۔ اس کے معنے دوسرے
لفظوں میں صاف یہی ہیں کہ مردوں کے لئے معصیت کو خفیف سمجھتے ہیں۔ اور عورتوں کے لئے شدید

تو علاوہ ضرر کے اس میں ان کو اتنی یا استحقاق کے جو یہ ہونے کا بھی اندیشہ اور سخت اندیشہ ہے۔

اب صرف تیسرے طبقہ کے متعلق کلام باقی رہ گیا جو تعلیم

تیسرے طبقہ والوں کی غلطیوں کی نشاندہی

کے حامی تو ہیں لیکن اس تعلیم کے تعین میں یا اس کے طریقہ کی تجویز میں ان سے غلطی ہوئی چنانچہ ان میں سے بعض کا بیان بعض مسائل جزئیہ البتہ ثابت کے اور یہ ہو چکا ہے خود ان کو صرف حروف شناس بنا کر چھوڑ دینا، پھر ان کا اپنی رائے سے مختلف رسالوں کا مطالعہ کرنا۔ اور خود بعد تعلیم کے شوہر کی نگرانی نہ کرنا جس کی مفاسد مضامین بھی ساتھ ساتھ مذکور ہو چکے ہیں۔

اور بعض کا بیان اب کیا جاتا ہے

عورتوں کو دنیوی علوم بغیر ضرورت کے نہیں پڑھانے چاہئیں

مثلاً بعض مستورات کو بجائے علوم دینیہ پڑھانے کے ان کو تاریخ و جغرافیہ یا اس سے بڑھ کر انگریزی پڑھاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بعض پڑھاتے ہیں جس کی وجہ صرف تقلید اہل یورپ کی ہے یعنی ان کے نصاب تعلیم میں شائستگی و تہذیب اس کی بنا ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم میں اور ان میں اگر رسوم و عادات و طبائع ہی کا بھی فرق نہ ہوتا، تاہم سب سے بڑا فرق مذہب ہی کا ہے کہ ہم مذہب اسلام کا التزام رکھتے ہوئے ہیں اور وہ یا کوئی مذہب نہیں رکھتے اور جو رکھتے ہیں ان میں ایسے ہی ہیں اور یا ہمارے مذہب کے مغائر دوسرا مذہب رکھتے ہیں۔

اس لئے ان کے یہاں یا تعلیم مذہبی بالکل نہ ہوگی صرف زبان کی تعلیم ہوگی یا دنیوی مصنوعات کی تعلیم ہوگی اور یا دوسرے مذہب کی تعلیم ہوگی۔

بہرحال ان لوگوں کی اس تعلیم کا تو ایک خاص مبنیٰ ہے، لیکن ہم لوگ اگر ان کی تعلیم پر خود عمل کریں تو اس کا کیا مبنیٰ ہے جب غرض تعلیم سے ان کی وہ ہے جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اور ہماری غرض دوسری ہے جس کا مختصر بیان مقصود ذیل اصلاح خیال کے ذکر میں ہوا ہے یعنی اصلاح عقائد و اعمال و معاملات و معاشرت و اخلاق اور یہ غرض منحصر ہے علم دین پر تو ظاہر ہے کہ ہم ان کی تعلیم کا اقتباس کرنا ہر طرح بے ربط ہے البتہ اگر کسی کو تحصیل معاش کی بھی حاجت واقع ہوتی ہو تو بعد علوم دینیہ کے اس فن کو حاصل کر لینے کا مضائقہ نہیں جو اس زمانہ میں معاش کا موقوف علیہ ہو، جیسے اس وقت انگریزی زبان، جغرافیہ وغیرہ باقی ان کی اس شخص کو بھی ضرورت نہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ

کسب معاش کی حاجت صرف مردوں کو ہوتی ہے اور عورتیں اول اس وجہ سے کہ ان کا نان و نفقہ
مردوں کے ذمہ ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اسلام میں پردہ کی تاکید ہے اور وہ اسباب خاصہ معاش
کے جو خاص علوم پر موقوف ہیں۔ پردہ کے ساتھ حاصل نہیں کئے جا سکتے اس لئے عورتوں کے لئے تعلیم
بالکل فضول اور ان کے وقت کی اضاعت ہوگی بلکہ فضول سے تجاوز ہو کر ہر طرح مضر ہوگی جیسا عنقریب
ان مضار کا بیان بھی آوے گا۔

بہرحال یہ علوم جن کا لقب تعلیم جدید ہے عورتوں کے لئے ہرگز زیبا نہیں۔ البتہ فنون دنیا میں سے
بقدر ضرورت لکھنا اور حساب اور کسی قسم کی دستکاری کہ اگر کسی وقت کوئی سرپرست نہ رہے تو عفت
کے ساتھ چار پیسے کما سکے یہ مناسب ہے۔ رہا تعلم شائستگی کا جس کو دل چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔
کہ علم دین کی برابر دنیا بھر میں کوئی دستور العمل اور کوئی تعلیم شائستگی اور تہذیب نہیں سکھلاتا۔
چنانچہ ایک شخص لیجئے جس پر علم دین نے پورا اثر کیا اور ایک وہ شخص لیجئے جس پر تہذیب جدید
نے پورا اثر کیا ہے پھر دونوں کے اخلاق اور معاشرت و معاملہ کا موازنہ کیجئے تو آسمان و زمین کا تفاوت
پائیے گا البتہ اگر لفظ و لغت کا نام کسی نے تہذیب رکھ لیا ہو تو اس کی یہی غلطی ہوگی کہ ایک مفہوم کا مصداق
اس نے غلط ٹھہرا لیا اور اگر کسی کے ذہن میں اس وقت کوئی دیندار ایسا آیا جس میں تہذیب حقیقی کی کمی
ہو تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس نے علوم دینیہ کا پورا اثر نہیں لیا۔

دین صرف نماز روزہ ہی کا نام نہیں ہے — بلکہ دین کے اجزاء متعدد ہیں۔ عقائد، اعمال و معاملات و
معاشرت و اخلاق۔ بالخصوص بعضے لوگ صرف نماز روزہ کے
احکام کے جاننے کو علم دین اور احکام کی پابندی کرنے والے کو دیندار لقب دیتے ہیں سو خود یہی غلط ہے
سب اجزاء مذکورہ کے احکام ضروریہ کا اسی طرح جاننا علم دین اور سب کی پابندی دینداری ہے۔
سو جس کو دیندار لقب دے کر قلیل التہذیب قرار دیا گیا ہے وہ واقع میں سب اجزاء دین کا متبع
نہیں اور کلام اس میں ہے جس نے سب اجزاء کا اثر لیا ہو پس وہ شبہ رفع ہوگیا بندہ نے اس قسم کے
شبہات کے جواب کے لئے رسالہ حقوق العلم لکھا ہے (جو قابل ملاحظہ ہے)
غرض تہذیب علم دین کے برابر کسی علم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی علم دین تو تھا جس نے سلف
میں اپنے اثر سے وہ اخلاق و شائستگی پیدا کی کہ خود یورپ کو بھی اس کا اعتراف بلکہ اس سے استفادہ بھی
ہے مگر ہم اپنے گھر کی دولت سے بے خبر ہو کر دوسروں سے اس کی دریوزہ گری کرتے ہیں۔ والله

حدیث عارف الرومی حیث قال –

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر
تو ہمی جوئی لب نان در بدر

تا بزانوئی میان قعر آب
وز عطش وز جوع گشتستی خراب

لڑکیوں کے لئے آزاد اور بے باک استانی مقرر نہیں کرنی چاہیے

بچنے ضروری ہے اپنی لڑکیوں کو
آزاد بے باک عورتوں سے

تعلیم دلاتے ہیں یہ تجربہ ہے کہ ہم صحبت کے اخلاق و جذبات کا آدمی میں ضرور اثر ہوتا ہے خاص کر جب وہ شخص ہم صحبت ایسا ہو کہ متبوع اور معظم بھی ہو اور ظاہر ہے کہ استاد سے زیادہ ان خصوصیات کا کون جامع ہوگا تو اس صورت میں وہ آزادی و بے باکی ان لڑکیوں میں بھی آوے گی۔ اور یہی دلائے میں سب سے بڑھ کر جو عورت کا حیا اور انقباض طبعی ہے اور یہی مفتاح ہے تمام خیر کی۔ جب یہ نہ رہا تو اس سے پھر کوئی خیر متوقع ہے نہ کوئی شر مستبعد ہے اور حدیث کہ اذا فاتک الحیاء فافعل ما شئت، حکم عام ہے لیکن میرے نزدیک ما شئت کا عموم الفساد کے لئے بہ نسبت رجال کے زیادہ ہے اس لئے کہ مردوں میں با وجود بے حیائی کے عقل کسی قدر مانع ہے اور عورتوں میں اس کی بھی کمی ہوتی ہے – اس لئے کوئی مانع ہی نہ رہے گا۔

اسی طرح اگر استانی ایسی نہ ہو لیکن ہم سبق اور مکتب لڑکیاں ایسی ہوں تب بھی اسی کے قریب مفاسد واقع ہوں گی۔

اس تقریر سے دو چیزوں کا حال بھی معلوم ہو گیا ہوگا جن کا اس وقت بہت تکلف سے رواج ہے ایک لڑکیوں کا عام زنانہ اسکول جانا اور مدارس عامہ کی طرح اس میں مختلف اقوام اور مختلف عادات اور مختلف خیالات لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا۔ گو منتظم مسلمان ہی ہوں اور ڈولیوں میں آنا جانا ہو اور گو یہاں آکر بھی پردہ ہی کے مکان میں رہنا ہو لیکن تاہم واقعات نے دکھلا دیا ہے اور تجربہ کرا دیا ہے کہ وہاں ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن کا ان کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ صحبت اکثر عفت سوز ثابت ہوئی ہے اور اگر استانی بھی کوئی آزاد بے باک مل گئی تو کریلا اور نیم چڑھا کی مثال صادق آجاتی ہے۔

اور دوسری چیز یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم سے بھی مدد زنانہ یا مستورات کو تعلیم یا صنعت سکھانے

کے بہانہ سے اختلاط ہونے تب تو نہ آبرو کی خیر ہے اور نہ ایمان کی۔ مگر افسوس صد افسوس ہے کہ بعضے لوگ ان آفات کو مایۂ افتخار سمجھ کر خود اپنے گھروں میں جاتے ہیں جس سے نہ تہذیب قرآن آنحضرت مجسمہ سے بچ پاتی ہیں اور نہ ایسے ہو کر تو یہ ذکر کسی بڑی بوڑھی مسلمان عورت کا معتبر ہو کر بھی عمر بھر میں ایک بار ملاقات ہو تو بھی خطرناک ہے جن مفاسد کے ذکر کا وعدہ تھا ان میں سے بعض یہ ہیں اور بعض کا ذکر اوپر دوسرے قصہ کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کا اسلم طریقہ

اسلم طریق لڑکیوں کے لئے یہی ہے جو زمانہ دراز سے چلا آتا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے اپنے تعلقات کے مواقع میں آ بیٹھیں اور پڑھیں اور حتی الامکان اگر ایسی استانی مل جاوے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت اور باثر ثابت ہوئی ہے۔ اور بدرجہ مجبوری اس کا بھی مضائقہ نہیں اور جہاں کوئی ایسی استانی نہ ملے اپنے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں پڑھانے کا تو یہ طرز ہو۔

نصاب تعلیم

اور نصاب تعلیم یہ ہو کہ اول قرآن مجید حتی الامکان صحیح پڑھایا جاوے۔ پھر کتب دینیہ سہل زبان کی جن میں تمام اجزائے دین کی تعلیم ہو جیسے مثلاً بہشتی زیور کے دسوں حصے ضرورت کے لئے کافی ہیں اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل مستورات کے ہوں ان کو چھوڑ دے اپنی بی بی کے ذریعہ سمجھوا دے۔ اور اگر یہ انتظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کر دے تاکہ یہ مقامات محفوظ رہیں پھر وہ سیانی ہو کر خود سمجھ لیں گی یا اگر عالم شوہر میسر ہو اس سے پوچھ لیں گی یا شوہر کے ذریعہ سے کسی عالم سے تحقیق کرا لیں گی۔ (چنانچہ بندہ نے بہشتی زیور کے دستور العمل میں جو ٹائٹل پر مطبوع ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ لکھ دیا ہے مگر بعضے لوگ اس کو دیکھتے ہی نہیں اور اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کوئی مرد پڑھانے لگے تو ایسے مسائل کس طرح پڑھا دے۔ اس لئے ان مواقع ہی کتاب میں مناسب مقام پر بھی لگا دیا ہے) بہشتی زیور کے اخیر میں مفید رسالوں کا نام بھی لکھ دیا گیا ہے جن کا پڑھنا اور مطالعہ عورتوں کو مفید ہے اگر سب نہ پڑھے ضروری مقدار پڑھ کر باقیوں کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں۔ اور تعلیم کے ساتھ ان کے عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا بھی انتظام کر دیا کریں کہ ان کو دینی کا شوق ہو۔ تاکہ علم و عمل کا شغل رہے تو اس سے علم و عمل کی تجدید و تقویت ہوتی رہتی ہے۔ ان کو بھی ترغیب دیں کہ مطالعہ کتب مفیدہ سے کبھی

غافل نہ رہیں اور مزید دینی نصاب کے بعد اگر طبیعت میں قابلیت دیکھیں عربی کی طرف متوجہ کریں تاکہ قرآن و حدیث و فقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جاویں۔ ورنہ قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطی کرتی ہیں اس لئے لڑکی کے لئے مناسب نہیں۔ یہ ترجمہ پڑھنے کے متعلق بحث تھی۔

<u>عورتوں کو لکھنا سکھلانے کے متعلق حکم</u> | ہاں لکھنا اگر قرائن سے طبیعت میں بے باکی معلوم نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ضروریات خانگی کے لئے اس کی بھی حاجت ہو جاتی ہے اور اگر اندیشہ خرابی کا ہو تو مفاسد سے بچنا جلب مصالح وغیرہ سے اہم ہے۔ ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھلا دیں اور نہ خود سیکھنے دیں اور یہی فیصلہ ہے عقل کے اس اختلاف کا۔ لکھنا عورت کے لئے کیسا ہے۔ اب مضمون ختم کرتا ہوں۔

"استاذ شاگرد اور ہم جماعت ساتھیوں کے حقوق کے متعلق کوتاہیاں"

(اصلاح معاملہ بہ ادائے حقوق معلم و متعلم و شریک تعلم)

علوم دینیہ کا جس طرح تعلیم و تعلم ضروری ہے اسی طرح اس تعلیم و تعلم کے سبب جن لوگوں سے ساتھ تعلقات ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے اور یہ حقوق جس طرح فی نفسہ دلائل سے ضروری ہیں۔ اسی طرح تجربہ سے ثابت ہوا کہ برکات علمیہ کے موقوف علیہ ہونے کے اعتبار سے بھی ضروری ہیں اور جن سے یہ تعلقات ہوتے ہیں وہ تین جماعتیں ہیں۔ اول معلمین یعنی اساتذہ، دوسرے متعلمین یعنی تلامذہ، تیسرے شرکاء فی التعلم یعنی ہم درس یا ہم سبق، پس تینوں جماعتوں کے کچھ حقوق واجب ہیں اور قبل دیگر اعمال کے ان میں بھی کم و بیشی کوتاہیاں کی جاتی ہیں۔

متعلمین کی کوتاہیوں کی تفصیل

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ بعضے تو استاد کے حقوق و آداب بھی ادا نہیں کرتے۔ پھر ان میں بھی دو قسم کے ہیں بعض زمانہ تحصیل علوم ہی میں کوتاہیاں کرتے ہیں اور بعض اس زمانہ میں تو کسی قدر رعایت کرتے ہیں مگر بعد

مفارقت پر مطلق اس کا اہتمام نہیں کرتے۔ وجہ یہ ہے کہ تحصیل علوم میں جو کوتاہیاں کرتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ بعضے تو ظاہر ظاہر حقوق میں بھی کوتاہی کرتے ہیں اور بعضے ایسا تو نہیں کرتے مگر جن حقوق و آداب کے سمجھنے میں کسی قدر سلیقہ کی حاجت ہے ان میں کوتاہی کرتے ہیں اور ان سب میں اکثر معدود ہیں جو بعد مفارقت پھر استاد کو یاد نہیں رکھتے اور سب میں بدتر وہ بدنصیب ہیں جو کسی نفسانی مقتضی سے استاد کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ یہ سب اقسام ان لوگوں کے ہیں جو استادوں کا حق ادا نہیں کرتے۔ اور ان مضیعین حقوق اساتذہ سے زیادہ معذور وہ حضرت ہیں کہ اپنی استادی کے زمانہ میں شاگردوں کا کوئی حق اپنے ذمہ نہیں سمجھتے اور اپنے حقوق واجبہ سے گذر کر غیر واجب بلکہ غیر جائز کے ادا کے بھی متوقع و منتظر رہتے ہیں اور صراحتاً یا اشارۃً ان کا مطالبہ ان سے کرتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ وہ لوگ ہیں بلکہ شاید قریب قریب کل کے ایسے ہی ہیں کہ ہم جنسوں کے حقوق کا تو ان کے ذہن میں خطرہ بھی نہ گذرتا ہوگا۔

گو کہیں دوسرے اسباب سے باہم دوستی بھی ہو جاتی ہو لیکن یہ بات کہ محض اس علاقہ سے باہم دوسرے کے کچھ حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہوں یہ بات بہت نادر بلکہ قریب قریب معدوم ہے اور جب سمجھتے ہی نہیں تو پھر ان کے ادا کرنے کے اہتمام کا تو کیا ذکر ہے بلکہ بعض جگہ تو نہایت افسوس کی بات ہے کہ بجائے باہم الفت و اتفاق و رعایت حقوق کے ایک طرف سے یا کبھی دونوں طرف سے بغض و حسد و مخالفت و عقوق دیکھا جاتا ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان سب حقوق کی کچھ کچھ جزئیات بطور نمونہ لکھی جاویں۔ خود ان جزئیات کے بیان میں ان شاء اللہ تعالیٰ ایسے اصول بھی آجاویں گے کہ ان اصول سے دوسری غیر مذکور جزئیات کا سمجھنا اور رعایت کرنا سہل ہو جاوے گا۔ اور ہر چند کہ تینوں قسم کے حقوق و آداب میرے نزدیک فطری ہیں اور ذرا بھی فطرت میں سلامتی ہو تو ان کے معلوم کرنے اور نیز ان پر تقاضا کرنے کے لئے صرف وجدان کافی ہے لیکن اس خیال سے شاید کسی احتمال پرست کو گمان ہو کہ مثل دیگر حقوق کے یہ حقوق شریعت میں منقول نہیں۔ نیز مناسبت معلوم ہوا کہ

ذیل نصوص کو نقل کر کے ساتھ ساتھ ان حقوق کی تقریر کرنا مناسب اور حتی الامکان ترتیب کا بھی لحاظ رکھوں اس طرح کہ اول حقوق استاد کے پھر شاگرد کے، پھر ہم درس کے بیان کروں گا۔

حتی الامکان اس لئے کہ بارہا ممکن ہے کہ کسی نص سے دو یا تین جماعتوں کے حقوق مفہوم ہوتے ہوں تو
خاص اس ہی میں وہ ترتیب ملحوظ نہ رہے گی۔ گو ایسا قلیل ہوگا۔

اور جاننا چاہیے کہ استاد عام ہے سبق پڑھانے والے اور پوچھنے پر مسئلہ بتلانے والے اور
امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے اور اصلاح نفس کے طریقے بتلانے والے یعنی پیر کو،
اسی طرح شاگرد عام ہے تلمیذ متعارف اور سائل عن الدین اور مرید کو، اسی طرح ہمدرس عام
ہے متعارف ہم سبق اور کسی عالم کی مجلس میں شرکت کرنے والوں اور پیر بھائیوں کو،

اور جاننا چاہیے بعد سوق نصوص کے بطور تفریع یا توضیح یا تفصیل یا تتمیم کے کچھ جزئیات کی بھی
تقریر کی گئی ہے وہ بھی گویا اصل ہی کے ساتھ ملحق ہوگا۔

حقوق و آداب معلم

آیۃ۔ لقد من اللہ علی المؤمنین الی قولہ تعالیٰ یعلمہم الکتاب والحکمۃ الآیۃ
(البتہ احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر (الیٰ قولہ) سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت)

اس آیہ کریمہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت بعثت پر منت ہونے کی علت
میں تعلیم کتاب و حکمت کو ذکر فرمانا صاف دلیل ہے کہ جو شخص کسی کو دین کی تعلیم کرے وہ اس
شخص کے حق میں نعمت الٰہی ہے اور اس کی قدر و تعظیم اس پر لازم ہے اور اس تعلیم میں سبق
پڑھانا اور مسئلہ بتلانا وغیرہ سب داخل ہیں کہ یہ سب تعلیم کے طریقے ہیں حتی کہ کسی کی تصنیف
سے مستفید ہو جانا اس قدر سے اس کے شاگردوں میں داخل ہو جاتا ہے اس کے حقوق بھی مثل
استادوں کے ثابت ہو جاویں گے۔

آیۃ۔ قال لہ موسیٰ ہل اتبعک الی آخر القصۃ
(حضرت موسیٰ نے حضرت خضر سے کہا کہ کیا میں تمہاری پیروی کروں)

ان آیتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ ہے اس سے چند
حقوق و آداب ثابت ہوتے ہیں اول استاد کی خدمت میں خود شاگرد جایا کرے ان کو تکلیف نہ دے

کر اگر پڑھا دیا کریں اگرچہ استاد کسی اعتبار سے شاگرد سے رتبے میں کم ہی ہو تب بھی اس کا اتباع کرے۔

سوم:- جس بات کے پوچھنے کو وہ منع کرے یا نہ پوچھا کرے۔ اس کی مخالفت یا اس کو تنگ نہ کرے۔

چہارم:- اگر کسی شخص سے اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جاوے تو معذرت کرے۔ پنجم اس کے تنگ ہونے یا مرض وغیرہ سے کسل مند ہونے کے وقت سبق بند کر دے

استاد کے ساتھ گفتگو کے آداب ملحوظ رکھنا

آیت: یا ایھا الذین آمنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا۔ الآیۃ

(ترجمہ) اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت کہو راعنا اور کہو انتظار کرو ہمارا اور سنو۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ استاد کے ساتھ گفتگو میں بھی ادب ملحوظ رکھے تا بدمعاملت نہ ہووے۔

آیت: انما المؤمنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہ علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ

(ترجمہ) بجز این نیست کہ مومن وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ اور جب ہوتے ہیں ساتھ رسول کے کسی اجتماعی بات پر تو نہیں جاتے جب تک اجازت نہ لے لیں۔

استاد کی خدمت میں بلا اجازت نہ جاوے

اس آیت سے استاد کا یہ حق ثابت ہوا کہ اس کی خدمت سے بلا اذن نہ جاوے خواہ اذن صریح ہو یا دلالۃً

تعلیم دین بھی احسان ہے

حدیث:- عن ابن عمر رضی اللہ عنہ من صنع الیکم معروفا فکافئوہ فان لم تجدوا ما تکافئونہ فادعوا لہ حتی ترووا انکم قد کافأتموہ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی وابن حبان فی صحیحہ والحاکم فی مستدرکہ کذا فی الترغیب)

(ترجمہ) جو شخص تم پر احسان کرے اگر تم اس کی مکافات کر سکتے ہو تو کر دو ورنہ اس کے لئے دعا کرو یہاں تک کہ تم سمجھ لو کہ تم نے اس کی مکافات کر دی۔

کیا کوئی شخص تعلیم دین کے معروف یعنی احسان ہونے سے انکار کر سکتا ہے۔ جب اس کا احسان ہونا مسلّم ہو گیا تو اس کے مکافات میں ہر قسم کی خدمت مال سے جان سے داخل ہو گئی جو

حدیث ہٰذا میں مامور بہ ہے۔

اور جب کسی قسم کی استطاعت نہ رہے تو اس وقت اقل درجہ دعا ہی سے یاد رکھنا ضروری ہے

حدیث:۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ رواہ احمد والترمذی۔

ترجمہ:۔ جس نے آدمیوں کا شکر ادا نہ کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر نہ ادا کیا۔

اس حدیث کے عموم میں استاد بدرجہ اولیٰ داخل ہے کہ بہت بڑی نعمت یعنی علم دین کا واسطہ ہے اس کی حق شناسی میں کوتاہی کرنا بنص حدیث حق تعالیٰ کی ناشکری ہے جس کا محل وعید ہونا نص قطعی سے ثابت ہے۔

قال تعالیٰ لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم (مقابل شکرتم) ان عذابی لشدید ہ الآیۃ۔

ترجمہ:۔ اگر تم شکر کرو گے تو ہم اور زیادہ دیں گے اگر تم کفران نعمت کرو گے تو یاد رکھو ہمارا عذاب شدید ہے۔

یہ حدیثیں تو عموماً مدعا پر دال ہیں، آگے خصوص کے ساتھ دلالت کرنے والی احادیث منقول ہیں۔

استاد اور شاگرد ایک دوسرے کو مغالطہ میں نہ ڈالے

حدیث: عن معاویۃ رضی اللہ عنہ قال ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الاغلوطات رواہ ابوداؤد

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (علوم میں) مغالطہ دینے سے منع فرمایا ہے۔

اس سے ایک ادب استاد کا ثابت ہوا وہ یہ کہ بعض طلبا کی عادت ہے کہ خواہ مخواہ کتاب میں احتمالات نکال کر استاد کے سامنے بطور اعتراض پیش کیا کرتے ہیں اور خود بھی سمجھتے ہیں کہ محل اعتراض نہیں مگر اپنی ذہانت جتلانے اور استاد کا امتحان کرنے کے لئے ایسی نامعقول حرکت کرتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ مغالطہ ہوا کہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ مقام مشتبہ ہے حالانکہ خود اپنے نزدیک بھی مشتبہ نہیں اور اس سے شاگرد کا بھی ایک حق ثابت ہو گیا وہ یہ کہ بعض مدرسین کی عادت ہے

کہ کسی مقام پر خود بھی شبہ ہے مگر شاگرد پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے کیونکہ مرادِ مصنف تحریر کر دیتے ہیں۔ اور اس کو دھوکا دیتے ہیں کہ اس مقام کی یہی تقریر ہے حالانکہ خود بھی یہ اطمینان نہیں۔

علم دین پڑھانے والا سب سے زیادہ سخی ہے۔

حدیث: عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هل تدرون من اجود جودا قالوا اللہ ورسوله اعلم قال اللہ اجود جودا ثم انا اجود بنی آدم واجودهم من بعدی رجل علم علما فنشره یأتی یوم القیامة امیرا وحده رواه البیهقی۔

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ سب سے زیادہ سخی کون ہے؟ انہوں نے از راہِ ادب عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کا نبی زیادہ جانتے ہیں تو آپ نے فرمایا ہے کہ سب سے زیادہ سخی اللہ تعالیٰ ہے پھر تمام بنی آدم میں سب سے زیادہ میں سخی ہوں اور پھر سب سے زیادہ سخی وہ شخص ہے کہ جس نے علم دین سیکھا اور اس کو پھیلایا یہ شخص قیامت میں تنہا بمنزلہ ایک امیر کے آوے گا (بیہقی)

اس حدیث میں بعد اللہ و رسول کے سب سے زیادہ صاحب جود اس عالم کو فرمایا ہے جو علم کو شائع کرے جس طریق سے بھی ہو خواہ تدریس سے یا وعظ و تلقین سے خواہ تصنیف سے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص کسی پر جود کرے اس کا کتنا حق ہوتا ہے پس یہ شخص جن طالب علموں پر جود خاص کر رہے ہیں اور وہ متعلمین ہیں تو ظاہر ہے ان پر ان کا کیسا کچھ حق ہو جاوے گا۔

اگر استاد کسی کتاب پڑھنے سے منع کرے تو شاگرد کو اس پر عمل کرنا چاہیے

حدیث: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتب لامیر السریة کتابا وقال لا تقرأه حتی تبلغ مکان کذا وکذا فلما بلغ ذلک المکان قرأه علی الناس واخبرهم بامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ البخاری)

ترجمہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امیر لشکر کو ایک تحریر لکھ کر دی اور ایک مصلحت کے سبب سے فرمایا کہ جب تک فلاں مقام پر نہ پہنچ جاؤ اس کو مت پڑھنا۔ چنانچہ انہوں نے اسی کے موافق عمل کیا۔ (بخاری)

اس حدیث سے ایک ادب ثابت ہوا جو طالب علموں پر لازم ہے وہ یہ کہ استاد اگر کسی کتاب

پڑھنے سے کسی خاص وقت میں منع کرے مثلاً اس کے نزدیک شاگرد کی استعداد سے زیادہ ہے اس مصلحت سے اس وقت پڑھنے سے منع کرتا ہے تو طالب علم کو چاہیئے اس پر عمل کرے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہر طرح مبارک ہی تھا اور اس کا پڑھنا اور جاننا ہر وقت عبادت تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مصلحت سے ایک وقت معین کے قبل تک اس کے مطالعہ سے منع فرمایا اور ان صحابی نے ویسا ہی کیا۔

شاگرد کے بے ڈھنگے سوال پر اگر استاد غصہ کرے تو صبر کرنا چاہیئے

حدیث ۱: عن زید بن خالد الجهنی ان

النبی صلی اللہ علیہ وسلم سألہ رجل عن اللقطة فقال اعرف وكاءها او قال وعاءها وعفاصها ثم عرفها سنة ثم استمتع بها ان كنت فقيرًا والا تصدق بها فان جاء ربها فأدها اليه قال فضالة الابل فغضب حتى احمرت وجنتاه او قال احمر وجهه فقال ما لك ولها معها سقاؤها وحذاؤها ترد الماء وترعى الشجر فذرها حتى يلقاها ربها الحديث

رواه البخاری۔

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے لقطہ (گری ہوئی چیز کے پانے کا) مسئلہ دریافت کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ اس کا سربند اور ظرف پہچان لے۔ اور سال بھر تک اس کی تعریف کر اگر کوئی مالک نہ ملے (اور تو محتاج ہو) تو اس سے نفع اٹھا (ورنہ صدقہ کر دے) پھر اگر اس کا مالک آوے تو اس کو دیدے۔ اس سائل نے کہا کہ گمشدہ اونٹ کا کیا حکم ہے۔ اس سوال سے آپ پر آثار غصہ نمودار ہوئے حتی کہ رخسار ہائے مبارک سرخ ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔ تجھ کو اس سے کیا کام ہے اس کے ساتھ تو اس کی مشک ہے اور اس کے موزے۔ پانی پر جا کر پانی پیتا ہے اور درختوں سے چارہ کھاتا ہے (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی بے ڈھنگے سوال پر استاد غصہ کرے تو شاگرد کو چاہیئے کہ اس کو گوارا کرے مکدر نہ ہو۔ جس طرح یہاں اس صحابی نے برا نہیں مانا۔

جہاں تک ہو سکے استاد کے ساتھ رہنے کی کوشش کریں

حدیث ۱: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ فی حدیث طویل

وان ابا هريرة رضي كان يلزم رسول الله صلى الله عليه وسلم لشبع بطنه ويحضر ما لا يحضرون ويحفظ ما لا يحفظون (رواه البخاري)

ترجمہ۔ ایک طویل حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اپنے پیٹ بھر غذا ملنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمیشہ رہتے تھے۔ اس قدر اور لوگ حاضر نہ رہتے تھے اور احادیث اس قدر یاد کرتے تھے کہ اور لوگ نہ یاد کر سکتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر بہت مجبوری کا نازل ہو جاوے تو حتی الامکان استاد سے جدا نہ ہو کہ اس کی عنایت بھی بڑھ جاتی ہے اور فوائد علمیہ بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس کی خدمت کا بھی موقع ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے موقع بموقع مضامین لینا بھی احادیث میں وارد ہے۔

استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش رہنا چاہیے

حدیث:۔ عن جریر رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال له فی حجة الوداع استنصت الناس (رواہ البخاری)

ترجمہ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ کے وقت حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ لوگوں کو چپ کرو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش اور متوجہ رہنا چاہیے کوئی بھی بات نہ کرے کسی کی طرف التفات نہ کرے۔

اگر استاد کسی بات پر ناراض ہو تو ان کو خوش کرنا چاہیے

حدیث:۔ عن جابر رضی اللہ عنہ ان عمر بن الخطاب رضی الله تعالى عنه اتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بنسخة من التوراة فقال يا رسول الله هذه نسخة من التوراة فسكت فجعل يقرأ ووجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتغير فقال ابو بكر رضي الله عنه ثكلتك الثواكل ما ترى ما بوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال اعوذ بالله من غضب الله ورسوله (الحديث) (رواه الدارمي)

ترجمہ۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک نسخہ توراۃ کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ نسخہ توراۃ

کا ہے۔ آپ سن کر خوش ہوتے ہیں۔ حضرت عمر نے اس کو پڑھنا شروع کیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے عمر روویں تم کو رونے والیاں۔ رسول اللہ صلی اللہ کے روئے انور کو تم دیکھو کر خوشی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھتے ہی فرمایا۔ پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے غصے سے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کے غصہ سے (دارمی)

اس حدیث سے ایک حق استاد کا ثابت ہوا کہ اگر وہ کسی بات پر غصہ کرے تو شاگرد کو معذرت کرنا اور اس کو خوش کرنا ضروری ہے۔ دوسرا حق شاگرد کا ثابت ہوا کہ اگر اس سے کوئی نامناسب بات صادر ہو تو اس کو متنبہ کرنا ضرور ہے اور اس سے اس کی اصلاح ہوتی ہے تیسرا حق شریک علم کا ثابت ہوا کہ اس کی غلطی پر جس پر وہ خود مطلع نہ ہوا۔ خیرخواہی سے مطلع کر دے کہ وہ اس کا تدارک کرے اور وہ بھی اس کو قبول کرے۔ جیسا حضرت شیخین سے واقع ہوا۔

اہل علم اور استاد کے ساتھ ادب و تواضع سے پیش آنا چاہئے

حدیث ۱ فی الترغیب والترہیب للمنذری عن ابی ہریرۃ رض

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلموا العلم وتعلموا للعلم السکینۃ والوقار وتواضعوا لمن تتعلمون منہ۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم سیکھو اور علم کے لئے سکینہ اور وقار اختیار کرو اور جس سے علم سیکھتے ہو اس کے ساتھ تواضع اور ادب سے پیش آؤ (ترغیب و ترہیب)

اس حدیث میں ترغیب جو اختیار وضع اہل علم کے ساتھ استاد کے ساتھ ادب و تواضع سے پیش آنے کا صریح امر ہے۔

استاد کے حقوق کے متعلق مختلف کوتاہیاں

اب بعد سوق نصوص کے واقعات پر نظر کر کے پھر کوتاہیاں اس باب کے متعلق عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سو جاننا چاہئے کہ جو لوگ استاد کے حقوق ضائع کرتے ہیں جیسا کہ تمہید مضمون میں بیان کیا گیا

مختلف اقسام ہیں بعض تو خود زمانہ تحصیل علوم میں بھی کوتاہیاں کرتے ہیں پھر ان میں بعضے تو کہا ہر حقوق میں بھی کوتاہی کرتے ہیں جیسے ان کا ادب کرنا مثلاً آنے جانے کے وقت سلام کرنا ان کی طرف پشت کر کے بیٹھنا، یا ادھر پاؤں پھیلا دینا، اور جیسے اطاعت کم کرنا، مثلاً کوئی بات ٹال مٹول کسی بات کو ٹال دیا اور جیسے خلوص میں کمی کرنا، مثلاً اس سے فریب کرنا، جھوٹ بولنا، اپنی خطا کی تاویل کرنا اور جیسے خدمت میں کمی کرنا، خواہ بدنی ہو، مثلاً اس کو پنکھا جھلنا، اس کا بدن دبانا۔ وغیر ذالک۔ اور خواہ مالی ہو مثلاً حق تعالیٰ نے اپنے کو وسعت دی ہے اور استاد نادار ہے، اس وقت اس کی خدمت میں کچھ نقد یا متاع یا طعام بطور ہدیہ کے پیش کرنا۔ اس میں ایسے متکبر ہیں کہ وہ بدنی خدمت کو عار و ذلت سمجھتے ہیں۔ اور بعض ان سے دریغ کرتے ہیں۔ خصوصاً اگر استاد ان کا تنخواہ دار ہو تو تنخواہ دے کر سب حقوق سے اپنے کو سبکدوش سمجھ بیٹھتے ہیں۔ واقعی پھر کوئی حق واجب تو نہیں رہتا لیکن کیا واجب کے بعد تطوع کا کوئی درجہ نہیں خصوصاً جبکہ اس میں اپنا ہی نفع ہو تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ استاد کا دل جس قدر خوش رکھا جاوے گا۔ اسی قدر علم میں برکت ہوگی۔

استاد کا حق پورا کرنے کے متعلق ایک عجیب حکایت

میں نے ایک جگہ کسی بہت بڑے عالم کی حکایت لکھی دیکھی ہے کہ ایک دفعہ استاد ان کے وطن کی طرف اتفاق سے آئے تھے۔ سو سب شاگرد ان کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوئے اور یہ عالم بوجہ اس عذر کے کہ وہ اپنی والدہ کی خدمت میں مشغول تھے حاضر نہ ہو سکے۔ چونکہ ایسی مشغولی بھی نہ تھی کہ حاضر ہونے سے خدمت میں کوئی حرج واقع ہوتا۔ کسی قدر سستی سے بھی کام لیا۔ استاد کو یہ امر ناگوار ہوا۔ اور یہ فرمایا کہ بہ برکت خدمت والدہ کے ان کی عمر تو طویل ہوگی مگر ہمارے حقوق میں کمی کرنے کے سبب ان کے علم میں برکت نہ ہوگی۔ چنانچہ عمر تو بہت ہوئی لیکن تمام عمر گذر گئی نشر علم کے اسباب ان کے لئے جمع نہ ہوئے۔ کچھ ایسے اتفاقات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے کہ کبھی شہر میں رہنا ہی نصیب نہ ہوا۔ ہمیشہ گاؤں میں رہتے رہے۔ جہاں نہ درس و تدریس کا سلسلہ ہوا نہ دوسرے طریق اشاعت علم کا۔

غرض کہ استاد کے مکدر سے علم کی برکت جاتی رہتی ہے اور اس کی خوشی سے برکت ہوتی ہے۔

پس جو حقوق واجب نہیں ہیں۔ ان کی رعایت کرنے سے اپنا ہی نفع ہے۔

اور کر غور کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ اگر استاد بھی اسی قاعدہ پر عمل کرے کہ تعلیم واجب سے زیادہ ایک حرف نہ بتلاوے ایک منٹ زیادہ نہ دے۔ تقریر ایک بات سے زیادہ ہرگز نہ کرے تو کیا اس طرح سے اس کو علم حاصل ہو سکتا ہے وہ بے چارہ اس کی تعلیم و تفہیم میں واہی خون جگر کھاتا ہے تو اس کو کیا زیبا ہے کہ اس کے حقوق میں ضابطہ سے ایک نقطہ نہ بڑھے۔ یہ تو بڑی بے حسی و قساوت ہے

کتابوں کا مطالعہ کرنا بھی استاد کے حقوق میں داخل ہے۔

اور بعضے ایسے موٹے موٹے حقوق کی تو رعایت کرتے ہیں لیکن ایسے حقوق میں کوتاہی کرتے ہیں جن کے سمجھنے میں سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً مطالعہ کم دیکھنا جس سے عبارت پڑھنے میں غلطیاں ہونے سے یا مقام کے نہ سمجھنے کے سبب استاد کو بڑی تقریر کرنے کی ضرورت واقع ہونے سے یا اسی کم سمجھنے کے سبب فضول سوال کرنے سے استاد کو تنگی و انقباض و پریشانی ہو تو یہ محسن کا بھی حق ہے کہ اس کو بلا وجہ پریشان کیا جاوے اور یہاں بلا ضرورت ہی ہے کیونکہ مطالعہ کے اہتمام سے یہ سب قباحات رفع ہو سکتے تھے میں یہ نہیں کہتا کہ مطالعہ دیکھنے سے پھر عبارت میں غلطی یا اہم مطالب میں کمی نہیں ہوتی۔ ضرور پھر بھی ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے استادوں کو ایسی بصیرت عطا فرمائی ہے کہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس نے اپنی کوشش صرف کی ہے یا نہیں۔ پس باوجود بذل جہد کے جو کمی رہ جاتی ہے وہ چونکہ اس کی وسعت سے خارج ہے اس لیے جتنا ثقل نہیں ہوتی اس میں اس شاگرد کو معذور سمجھا جاتا ہے۔ اور بے پروائی اور سستی معلوم ہونے سے بے حد ناگواری ہوتی ہے۔

استاد کی تقریر کے وقت ادھر ادھر نہیں دیکھنا چاہیے

اور مثلاً استاد کی تقریر کے وقت دوسری طرف التفات کرنا کہ استاد تو اس کی طرف متوجہ اور یہ دوسری طرف متوجہ اس سے استاد کو بہت کوفت ہوتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب کوئی سوال بھی کرے۔ ایسا کہ اگر توجہ سے تقریر سنتا تو پھر یہ سوال ہی نہ کرتا۔ اس وقت استاد کو سخت شکایت ہوتی ہے کہ ناحق ہی مجھ کو پریشان کیا ہے۔

جہل اور لغو اور اپنی ذہانت دکھلانے کیلئے سوال نہیں کرنا چاہیے

اور مثلاً ایسا سوال کرنا جس کا جواب

یا جس کی لغویت خود بھی معلوم ہے۔ جس طرح بعض طلباء کی عادت ہے کہ محض اپنی ذہانت دکھلانے یا استاد کا امتحان لینے یا محض مشغلہ و تفریح کی غرض سے دور از کار لچر لچر سوالات کیا کرتے ہیں۔

ایک حکایت

جیسے ایک طالب علم کی حکایت سنی ہے کہ انہوں نے حدیث میں پڑھا کہ طلوع شمس کے وقت نماز نہ پڑھو۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ لا تصلوا بھی عام اور طلوع شمس بھی عام خواہ کسی مقام کا طلوع شمس ہو اور یہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ہر وقت کہیں نہ کہیں طلوع ہوتا ہی رہتا ہے۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ کبھی شخص کو کسی وقت بھی نماز پڑھنا جائز نہ ہو۔ ہر چند ان کو سمجھایا گیا کہ بھائی جہاں کا طلوع شمس ہو وہیں کے لوگوں کو اس وقت کے اعتبار سے لا تصلوا کا حکم ہے۔ مگر ان بزرگوار نے مانا ہی نہیں۔ یہی فرماتے رہے کہ نہیں صاحب دونوں ہی میں عموم ہے۔ ان سے کہا گیا کہ بھائی اس سے تو نماز کی فرضیت ہی لغو ہوئی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ خواہ کچھ ہو جائے انصاف ہے۔ کیا یہ سوال قابل پیش کرنے کے ہے؟ اور کیا یہ کچھ بھی عقل کی بات تھا محض فضول وقت ضائع کرنے کے لئے اس نے یہ حرکت کی اور بجائے اس کے کہ اس کے ذہن کی تیزی و اس کی ذہانت ظاہر ہوتی۔ الٹا اس کا کوڑھ مغز ہونا ثابت ہو گیا۔ ایسے طالب علموں کو کبھی علم نصیب نہیں ہوتا۔

غرض استاد کو کبھی پریشان نہ کرے۔ بلکہ ادب کی بات تو یہ ہے کہ اگر اور کسی سبب سے یا خود کسی کے سبب سے وہ پریشان ہو تو اس وقت یا تو سبق ملتوی کر دے یا بجز بہت ہی ضروری بات کے زائد باتیں نہ پوچھے۔

اور مثلاً تعیین سبق یا مقدار سبق میں استاد کی رائے نہ ماننا جیسے بعض طلباء کی عادت ہے کہ باوجود استاد کی رائے معلوم ہونے کے بھی اپنی رائے پر اصرار کرتے ہیں کہ ہم تو فلاں ہی کتاب شروع کریں گے۔ یا اتنا ہی سبق پڑھیں گے یا فلاں ہی شخص سے پڑھیں گے۔ ان امور میں تو طالب علم کو پیرو بننا چاہیے کہ ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔

ترجمہ: یعنی کہاں تجربہ کار اور کہاں ناتجربہ کار۔ اس کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

تنہا یہ است از خلاف نفس کردن ذکر خدمت حق کردن یہ وہ حقوق ہیں کہ جن کے کرنے کے لئے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ یہاں تک یہ سب جزئیات ہوئیں ان اضاعات حقوق کی جو زمانہ تحصیل علوم میں ان سے سرزد ہوتی ہیں۔

فراغت کے بعد کی کوتاہی

ایک قسم وہ ہے جو بعد مفارقت استاذ کا کوئی حق اپنے ذمہ نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں مگر عمل کا اہتمام نہیں کرتے۔ اور اس بلا میں بہت زیادہ ابتلاء ہے اور تو کیا کرتے کبھی خط بھیجنے کی اور استاد کی خیریت پوچھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ سمجھتے ہیں کہ اب کیا علاقہ رہا۔ کیا صاحب محسن کا حق صدور احسان ہی کے زمانہ تک ہوتا ہے پھر نہیں رہتا؟ عجیب بات ہے۔ پس بعد بالغ ہو جانے کے والدین کے حقوق بھی رخصت ہو جاویں گے۔ ولا قائل بہ۔

پھر یہ بھی کہ گو صدور احسان کا اس وقت استاد سے نہیں ہو رہا ہے لیکن اس احسان کے آثار کا ظہور و ترتب تو اس وقت بھی ہو رہا ہے بلکہ زیادہ اسی وقت ہو رہا ہے کیونکہ جتنا کمال جس وقت تمہارا ظاہر ہو رہا ہے اس کا منشاء بجز رحمت حق کے اسی تعلیم استاد ہی کا تو ہے جیسا قیل فی ہذا المعنی

فعاجوا فاثنوا بالذی انت اہلہ

ولو سکتوا اثنت علیک الحقائب

غرض یہ تو سب ہی کی بے کہ اپنا کام نکالا اور الگ ہوئے یہ تو پوری خود غرضی ہے۔ سب سے بڑی بات یہی ہے کہ ہمیشہ جب تک جائیں یہی جان ہے وہ وقت یاد رکھے کہ جب یہ ان کے سامنے کتاب رکھ کر بیٹھتا تھا اور یہی سمجھے کہ گویا ابھی ان کے پاس سے پڑھ کر اٹھ کر آیا ہوں اور پھر پڑھنے کے لئے جانا ہے تو اس وقت جتنے حقوق کی پابندی کرتا تھا جن کی بقدر ضرورت تفصیل ابھی ہو چکی ہے وہی حقوق اب بھی باقی ہیں ایسا کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ یقیناً ثمرتا علوم و برکات میں ترقی ہوگی۔ قال تعالیٰ لئن شکرتم لازیدنکم۔

بلکہ ان حقوق کو ایسا مستمر سمجھے کہ استاد کی وفات کے بعد بھی وہ حقوق ختم نہ سمجھے جو اس وقت ادا کئے جا سکتے ہیں اور ان کا خلاصہ دو امر ہیں۔ ایک اس کے لئے ہمیشہ دعائے مغفرت کرنا دوسرے اس کے اہل و اقارب کی تعظیم و خدمت کرنا اسی طرح استاد کے دوستوں اور معاصرین کا احترام کرنا

اور اگر ان کو حاجت ہو تو ان کی خدمت کرنا۔

احادیث میں اس قسم کے حقوق والدین کے لئے آئے ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے جو بعد وفات نبوی آپ کے اہل کی خدمت کریں گے اور آپ کی عزت سے محبت رکھیں گے۔ اب صرف ان مخصوص حقوق استاد میں سے وہ حقوق رہ گئے جن کو ہم نے تمہید میں بہ تفصیل لکھا ہے۔ بعض جو نفسانی اغراض سے استاد کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ ان کی شان میں تقریراً یا تحریراً گستاخی کر کے ان اشعار کا مصداق بنتے ہیں۔

از خدا جوئیم توفیق ادب ÷ بے ادب محروم گشت از لطف رب

ہر کہ گستاخی کند اندر طریق ÷ باشد اندر وادی حیرت غریق

بد ز گستاخی کسوف آفتاب ÷ شد عزازیلے ز جرأت رد باب

استاد تو وہ چیز ہے کہ اگر بضرورت دینیہ بھی اس کے خلاف کرنا پڑے تب بھی باپ کی طرح دین کے باب میں تو اس کی موافقت نہ کرے لیکن ادب اور احترام اس کا ترک نہ کرے۔ کیونکہ وہ بھی ایک قسم کا یعنی روحانی باپ ہے۔ گو تعارض حقوق کے وقت باپ سے بڑھا ہو مگر حقوق غیر متعارضہ میں تو اس کا بھی وہی حکم ہے۔ آنحضرت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اسی تربیت روحانیہ و تعلیم دینیہ ہی کے سبب تو یہ ارشاد ہوا ہے۔

النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم وازواجہ امہاتہم وفی بعض القراءات وھو اب لہم۔

پس ہر استاد بھی آپ کا وارث و نائب ہے گو اس درجہ میں نہ سہی۔ چنانچہ آپ کے حقوق علی الاطلاق تمام نسبتوں پر مقدم ہیں۔ اس وجہ سے کہ آپ کے حقوق حقوق الٰہیہ ہیں جو سب پر مقدم ہیں۔ یہ مختصر بیان ہوا اقسام مخصوص حقوق و آداب اساتذہ کا۔

تنخواہ دینے سے استاد کے حقوق سے سبکدوش نہیں ہو جاتا

ان سب اقسام میں ایک مشترک شکایت ہے وہ یہ کہ جو اساتذہ کسی مدرسے سے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کے حقوق لوگ بہت خفیف سمجھتے ہیں۔ افسوس یہ نہیں سمجھتے کہ جو بنا رہے ان حقوق کی وہ تنخواہ پانے سے منعدم نہیں ہو گئی تو

مجتبیٰ کیسے منقود ہو جاوے گا اول تو تنخواہ کیا اس احسان کا بدل ہو سکتی ہے دوسرے وہ تنخواہ انہوں نے بھی دی تھی اس سے زیادہ اس نے ان کو دیا۔

اور اگر کہا جاوے کہ جب نیت تنخواہ کی دنیا کی تھی تو احسان کم ہو گیا یہ بھی محض غلط ہے۔ ثواب خواہ کم ہو جاوے مگر احسان تو ویسا ہی ہے اور شاید اس مقام پر بعض کو یہ خیال ہو کہ ہم فلاں استاد کے بہت حقوق ادا کرتے ہیں تو تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نرا استاد سمجھ کر حقوق ادا کم کرتے ہیں۔ جس استاد کے حقوق کچھ ادا ہوتے ہیں ان میں کوئی دوسرا کمال بزرگی وغیرہ کا سمجھ کر ایسا کرتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ جہاں نری استادی ہو وہاں کیا ہوتا ہے۔ اگر وہاں بھی رعایت حقوق کی ہو تو قابل مدح و تحسین ہے اسی طرح بعض اساتذہ کو جاہ دنیوی حاصل ہونے سے اس کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے وہ بھی کوئی دلیل شاگرد کی خوبی کی نہیں۔ وہ اس سے خود اپنی بڑائی کا سامان کرتا ہے۔ چنانچہ اگر استاد جاہ و شہرت میں شاگرد سے کم ہوتا ہے۔ بعض نالائق اپنے کو اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے عار کرتے ہیں۔ مگر ایسے استاد کا بھی حق ادا کرے تو مبارک عادت اور قابل قدر ہے

شاگرد کے حقوق

اب بعد بیان حقوق و آداب معلم کے اسی طرز مذکور پر کچھ حقوق متعلم یعنی شاگرد وغیرہ کے بیان کرتا ہوں کہ اولاً بعض نصوص اور ثانیاً بعض جزئیات از قبیل واقعات مذکور ہونگے۔

آیتؐ: ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔

ترجمہ: بلاؤ خدا کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور مناظرہ کرو اچھا اور نرم طریقہ سے۔

شاگرد کے ساتھ نرمی اور ان کی استعداد کی رعایت کرنی چاہیے

اس آیت سے نصاً معلوم ہوا کہ مستفیدین کے ساتھ ترحم چاہیے خواہ وہ طالب نہ ہوں۔ کیونکہ آیت میں مدعوین ایسے ہی لوگ ہیں۔ رعایت ان کے مذاق و استعداد اور

ومما رزقناهم ينفقون كما نقله البيضاوي ومما رزقناهم من الانوار المعرفة يفيضون ۔

(ترجمہ) صدقہ دیکر احسان نہیں جتاتے اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں اور جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں جیسا کہ نقل کیا اس کو بیضاوی نے یعنی جو ہم نے انوار معرفت ان کو عطا کئے ہیں لوگوں پر ان کا فیضان کرتے ہیں ۔۱۲

طالب علم کے ساتھ بھلائی کرنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت

حدیث ۵
عن ابی سعید

الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الناس لکم تبع وان رجالا یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیرا (رواہ الترمذی)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اور لوگ تمہارے تابع ہیں تمہارے پاس دور دراز ملکوں سے لوگ علم دین سیکھنے اور سمجھنے کو آویں گے ان کے بارے میں میری وصیت کے موافق بھلائی سے پیش آنا۔ (ترمذی)

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ جو شخص علم دین طلب کرنے کے لئے آوے اس کے حق میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر اور حسن معاملہ کی وصیت فرماتے ہیں گو ابھی تحصیل بھی شروع نہیں کی اور بعد تحصیل کے تو اور بھی تعلقات و خصوصیات جو کہ مقتضیات زیادت حقوق میں زائد ہوں گے۔

یہ حقوق اور بھی کمال تاکید کے ساتھ موکد ہو جاویں گے اور چونکہ دوسرے نصوص سے صاحب افادہ کو تنگ کرنے کی ممانعت ثابت ہے۔ کما قال تعالیٰ ولا یضار کاتب ولا شہید آیۃ: یعنی لکھنے والے اور گواہ کو تکلیف نہ پہنچانا چاہئے۔

اس سے یہ بھی مفہوم ہو گیا کہ طلباء کو بھی اپنی حوائج علمیہ وما یتعلق بہا کی درخواست معلمین اور مہتممین سے اسی درجہ تک کرنی چاہئے کہ ان کو کلفت نہ ہو، یہ ان کے ذمہ واجب نہیں کہ جتنے طلباء آویں سب کے لئے طعام اور سبق کا انتظام ضرور ہی کر دیا کریں۔ البتہ بشرط سہولت اس کا انتظام اور پھر بعد کام شروع کر دینے کے ان کے مصالح علمیہ کی رعایت حسب حدیث ضروری ہے۔

کسی مقام کی غلط تقریر کرنا یا کسی سائل کو غلط مسئلہ بتلانا جائز نہیں

حدیث عن سمرۃ

عن سمرة بن جندب والمغيرة بن شعبة قالا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من حدث عني بحديث يرى انه كذب فهو احد الكاذبين (رواه مسلم)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ تو جھوٹ ہے وہ جھوٹا ہے (مسلم)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سبق کی تقریر میں غلط مطلب بتلا دینا یا مستفتی کو غلط مسئلہ بتلا دینا یہ حرام ہے۔ جیسا بعض مدرسین و مفتیین کی عادت ہے کہ طالب علم یا سائل سے اپنا جہل چھپانے کے لئے غلط سلط ہانک دیتے ہیں اور اگر طالب علم قبول نہیں کرتا اور کچھ ضد کرتا ہے۔ کبھی مغالطات و تلبیسات سے اور کبھی غضب اور سب و شتم سے اس کو خاموش کر دیتے ہیں۔ اتنا کہنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ یہ مقام ہماری سمجھ میں نہیں آیا پھر سوچیں گے۔ یا یہ کہ دوسرے مدرس سے خود پوچھ لیں یا اس طالب علم ہی کو پوچھنے کی اجازت دیدیں اس سے عار آتی ہے حالانکہ یہ کوئی عار کی بات نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عالم ہوگا۔ آپ نے بہت سے سوالوں پر لاادری فرما دیا اور جب وحی نازل ہوئی اس وقت بتلا دیا اور واقعی جب احاطۂ کل علوم کا خاصہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کا ہے تو بعض چیزوں کا نہ جاننا ممکن کے لوازم سے ہے۔ تو اس لازم کا اگر اقرار کر لیا تو کون سی نئی بات ہوئی بلکہ واقع میں تو غیر معلومات معدودہ معلومات سے زیادہ بھی ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

اور تم کو تو بہت تھوڑا علم دیا گیا۔

ایک حکایت میرے ایک ابتدائی کتب کے استاد علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک حکایت بیان فرمائی تھی کہ انہوں نے کسی معلم سے فارسی پڑھنے کی درخواست کی انہوں نے کہا کہ بھائی پڑھنے سے پہلے یہ سن لو کہ تم مجھ کو عالم الکل سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہو یا عالم البعض اگر شق اول ہے تو بھائی مجھ کو معاف رکھو کیونکہ میں عالم الکل نہیں اور اگر ثانی ہے تو بے شک مجھ میں یہ صفت ہے لیکن اس کے معتقد رہنے سے کبھی یہ بھی ہوگا کہ کسی مضمون کی نسبت یہ کہہ دوں گا کہ مجھ

کو معلوم نہیں تو مجھ کو پریشان مت کرنا اور دوسری جگہ حل کر لینا۔

سبحان اللہ کیسی پاکیزہ بات انہوں نے کہی۔ یہی سمجھنا ہر عالم پر فرض ہے۔

اسی طرح اگر اولاً اپنی غلطی معلوم نہ ہوئی لیکن بعد تقریر کے از خود یا طالب کے متنبہ کرنے سے اطلاع ہو گئی تو چاہیے کہ فوراً اسی تقریر سے اپنا رجوع ظاہر کر دے ورنہ غلط تقریر کرنے میں یا غلطی پر اڑے رہنے میں چند خرابیاں ہیں۔ ایک تو گناہ جیسے حدیث موصوف سے معلوم ہوا، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ تو تعریف حدیث کے ساتھ خاص ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنے علوم دینیہ ہیں، سب حکایات عن الرسول ہیں۔ خواہ لفظاً یا معناً (ومن شئت قیل ان المقیاس مظہر لا مثبت)

اور جتنے علوم آلیہ ہیں وہ علوم دینیہ کے تابع ہیں۔ والتابع له حکم المتبوع

پس اس طرح سے اس حدیث کا مضمون تمام علوم مقصودہ و مبادی للمقصودہ کو عام ہے۔ پس غلط تقریر یا اس پر اصرار کرنے میں گناہ ہونا ان سب میں عام ہے۔ ایک خرابی یہ ہوئی۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر طالب علم کو معلوم ہو گیا کہ یہ تقریر غلط ہے تب تو طبعاً استاد سے تنفر اور اس کی تحقیر قلب میں پیدا ہو گئی اور اس کے ہوتے ہوئے پھر حقوق استادی کا ادا کرنا سخت دشوار ہے۔ تو یہ تنفر استاد کا اخلال بالواجب کا سبب ہوا اور اعانت معصیت ہے اور اگر طالب علم کو پتہ نہ لگا تو وہ بے چارہ عمر بھر کے لئے جہل میں مبتلا رہا۔ پھر یہی سلسلہ آگے معلوم نہیں کہاں تک چلے گا۔ پھر اس وبال کی کوئی حد ہے۔ ذرا سی عار پر نادر کو اختیار کرنا کون عقل یا دین کی بات ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ استاد کے اخلاق اکثر تلمیذ میں سرایت کرتے ہیں۔ یہی ہٹ دھرمی اور سخن پروری کی صفت ذمیمہ اس میں پیدا ہو جاوے گی۔ اور استاد صاحب اس حدیث کے مصداق بنیں گے۔ من سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا من بعدہ (الحدیث رواہ مسلم) یعنی جو شخص کوئی برا کام جاری کرتا ہے اس کو اس پر بھی گناہ ہوگا اور اس کے بعد جو بھی یہ کام کرے گا اس کا بھی گناہ ہوگا۔

بہرحال گناہ بھی اور شاگرد کے حقوق کی اضاعت بھی۔ گناہ کی تقریر ہو چکی اور اضاعت حقوق ظاہر ہے کہ اس کی خیر خواہی کے خلاف اس کے واجب کو تلف کرنا۔ اس کے اخلاق کا اثر دوسرے کے عمل میں منتقل کرنا ایک قسم کا غش اور خیانت ہے جو کچھ دین میں خصوصیت کے ساتھ اس سے تحرز چاہیے۔

بغیر علم کے مسئلہ بتانا جائز نہیں

حدیث ۸: عن ابی ہریرۃ رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ ومن اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ (رواہ ابوداؤد)

جس سائل کو کسی نے بلا علم کے مسئلہ بتلا دیا تو اس کا وبال اس بتانے والے پر ہے۔ اور جس شخص نے اپنے بھائی مسلمان کو مشورہ دیا اور یہ جانتا ہے کہ وہ مشورہ ٹھیک نہیں ہے تو اس نے اس کی خیانت کی۔ (ابوداؤد)

اس حدیث میں غلط مسئلہ بتلانے کا گناہ ہونا اور غلط بات بتلا دینے کا (جس میں دین کی بات بھی آگئی) خیانت ہونا صاف منصوص ہے۔

اگر کوئی بات معلوم نہ ہو تو کہہ دے کہ معلوم نہیں اپنی طرف سے نہ کہے

حدیث ۹: عن عبد اللہ

قال یا ایہا الناس من علم شیئاً فلیقل بہ ومن لم یعلم فلیقل اللہ اعلم فان من العلم ان یقول لما لا یعلم اللہ اعلم قال اللہ تعالیٰ قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما انا من المتکلفین۔ متفق علیہ۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو جو شخص کسی بات کا علم رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بتا دے، اور جو نہ جانتا ہو اس کو چاہیے کہ کہہ دے کہ اللہ جاننے والا ہے۔ کیونکہ یہ کہنا بھی علم کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی کہہ دو کہ میں تم سے کچھ مزدوری نہیں مانگتا اور نہ میں تکلیف کرنے والوں میں سے ہوں (کہ اپنی طرف سے کچھ بنا کر کہہ دوں)۔ روایت بخاری و مسلم۔

اس حدیث میں صریح تاکید ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو کہہ دے کہ معلوم نہیں۔ یہی طریق سب کے برحق کرنا عالم اور طالب علم دونوں کا حق ہے۔

نااہلوں کو دینی خدمات کا متولی بنانا قیامت کی علامت ہے

حدیث ۵: عن ابی ہریرۃ فی حدیث طویل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا وسد الامر الی غیر اہلہ فانتظر الساعۃ (بخاری)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دینی خدمت نالائقوں اور نااہلوں کے سپرد ہو جاویں تو قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔ (بخاری)

اس حدیث کے عموم میں یہ بھی داخل ہو گیا کہ اگر کسی طالب علم کا کوئی سبق کسی دوسرے کے سپرد کرے تو اس کا لحاظ رکھے کہ وہ شخص اس کا اہل ہو اگر نااہل و بد عقیدہ یا غیر شفیق کو سپرد کرے گا تو سخت گنہگار ہوگا یہ بھی شاگرد کا ایک حق ہے۔

شاگرد کے تین حقوق

حدیث ۶: عن عبد اللہ بن عمرو قال تخلف عنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفرۃ سافرناہا فادرکنا وقد ارہقتنا الصلوٰۃ ونحن نتوضا فجعلنا نمسح علی ارجلنا فنادی باعلی صوتہ ویل للاعقاب من النار مرتین او ثلاثا (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے آپ ہم سے ایسے وقت آکر ملے کہ نماز کا وقت آگیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے۔ جلدی کی وجہ سے ہم نے پاؤں دھونے میں بہت جلدی کی کہ کچھ سوکھا رہ گیا آپ نے دیکھ کر دو تین بار فرمایا خبردار ہو جاؤ عذاب دوزخ ان ایڑیوں کے لئے ہے جو سوکھی رہ جاویں (بخاری)

اس حدیث سے تین حق شاگردوں کے ثابت ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ صرف ان کی تعلیم علوم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے اعمال و اخلاق کی بھی حتی الامکان نگرانی رکھے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کے پاؤں کے خشک رہ جانے پر تنبیہ فرمایا۔ اور یہ باب بالکل ہی مسدود ہو گیا ہے۔ اساتذہ صرف سبق پڑھا دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی طرف توجہ نہیں فرماتے اور عملی غلطی پر تنبیہ نہ کرنا تو اور بھی غضب ہے کیونکہ اس کا تو انہوں نے باتصریح التزام کیا ہے جیسا بعض معلمین قرآن کی عادت دیکھی گئی ہے کہ شاگرد پہلو میں بیٹھا ہوا غلط پڑھ رہا ہے اور یہ بہرے گونگے بنے بیٹھے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعض اساتذہ شاگردوں سے ایسے کام لیتے

ہیں کہ ان کے اخلاق اور تباہ ہو جاتے ہیں تو اگر اصلاح نہ کرے تو نقصان ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی وجہ سے احتمال ہو کہ بدوں آواز بلند کئے ہوئے بات نہ پہنچے گی مثلاً مجمع بڑا

ہے یا اور کوئی عارض ہے تو بلند آواز سے تقریر کرنا حق ہے شاگرد کا، ورنہ تقریر ہی بیکار ہے

دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح با آواز بلند فرمایا۔

تیسرے اگر احتمال ہو کہ ایک بار تقریر کرنے سے خوب ذہن نشین نہ ہوگا تو دوسری تیسری بار

بھی تقریر کر دینا مناسب ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین بار فرمایا۔

اور آئندہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی عادت مستمرہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ حدیث

۸ عن انس رضی اللہ عنہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثا حتی تفھم عنہ (رواہ البخاری)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات اہتمام سے فرماتے تھے تو تین مرتبہ فرماتے تھے تاکہ لوگ

خوب سمجھ لیں (بخاری)

یہ حدیث فائدہ ثالثہ مذکورہ حدیث سابق میں نص ہے۔

کبھی کبھی شاگرد سے امتحان بھی لینا چاہیئے

حدیث ۹ عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من الشجر

شجرۃ لا یسقط ورقھا وانھا مثل المسلم فحدثونی ما ھی فوقع الناس فی شجر البوادی قال

عبد اللہ ووقع فی نفسی انھا النخلۃ فاستحییت ثم قالوا حدثنا ما ھی یا رسول اللہ

قال ھی النخلۃ (رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا

کہ ایک ایسا درخت ہے کہ اس کے پتے نہیں جھڑتے اور مثل مسلم کے ہے بتاؤ وہ کیا ہے۔ سب

لوگ جنگل کے درختوں کو سوچنے لگے کہ کون سا درخت اس شان کا ہے۔ میرے دل میں آیا کہ

یہ کھجور کا درخت ہے مگر چونکہ میں چھوٹا تھا اس لئے میں نے حیا کی اور جب رہا پھر لوگوں نے عرض

کیا یا رسول اللہ ارشاد فرمایئے کہ کون سا درخت ہے تو آپ نے فرمایا کھجور کا درخت (بخاری)

اس حدیث سے طلباء کے امتحان لینے کی مشروعیت نکلتی ہے جس کے فوائد بدیہی ہیں

ان فوائد کے انتظام کے لئے امتحان لینا بھی منجملہ حقوق تلامذہ ہے۔

تعلیم میں شاگرد کی استعداد کا لحاظ رکھنا چاہیئے

حدیث : قال علی حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ (رواہ البخاری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی بات کرو جو وہ سمجھیں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں (بخاری)

اس حدیث سے ایک یہ بات معلوم ہوئی کہ طالب علم کی تعلیم میں اس کے فہم و استعداد کا لحاظ رکھے اور اسی کے لحاظ سے ترتیب کتب و مقدار و عدد سبق تجویز کرے جیسا کہ ارشاد حق کونوا ربّٰنیّٖن کی ایک تفسیر امام بخاری نے یہی نقل کی ہے۔ الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہ۔ حدیث آئندہ سے بھی مرفوعاً اس کی اصل نکلتی ہے۔

کوئی فن یا کوئی کتاب کسی خاص طالب علم کیلئے مضر ہو تو اس کو اس سے روکنا چاہیئے

حدیث: عن انس رضی اللہ عنہ قال ذکر لی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لمعاذ من لقی اللہ لا یشرک بہ شیئاً دخل الجنۃ قال الا ابشر بہ الناس قال لا انی اخاف ان یتکلوا (رواہ البخاری)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضہ سے فرمایا کہ جو شخص مرے اور خدا سے ملے۔ اور وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ سمجھتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت معاذ رضہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سنادوں۔ فرمایا کہ مت سناؤ۔ کیونکہ میں خوف کرتا ہوں کہ اس پر تکیہ کرلیں گے۔ (بخاری)

یہ حدیث نص ہے اس میں کہ باوجود کہ یہ مضمون من لقی اللہ الخ کا مقاصد عظیمہ شرعیہ سے تھا مگر بعض لوگوں تک اس کا پہنچنا اس لئے پسند نہیں کیا گیا کہ وہ اس سے متضرر ہوتے ہیں اسی طرح جو کتاب یا کوئی فن کسی خاص طالب علم کے لئے نامناسب ہو اس کو اس سے روکنا بذمہ معلم لازم ہے اور اس طالب علم کو بھی اس میں اطاعت فرض ہے۔

شاگردوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کا معاملہ کرنا چاہیے

حدیث ۳۷ عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا (رواہ البخاری)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دینی امور میں لوگوں سے آسانی کرو تکلیف میں مت ڈالو خوشخبری سناؤ دین سے نفرت مت دلاؤ (بخاری)

اس حدیث کے عموم سے معلوم ہوا کہ طالب علم کے ساتھ درس میں بھی تیسیر و عدم تنفیر کی رعایت رکھے، تقریر بھی ایسی صاف و سلیس کرے جو ذہن نشین ہو جاوے۔ مقدار اسباق میں بھی اس پر زیادہ بار نہ ڈالے اسی طرح ایک حق یہ بھی معلوم ہوا کہ تنبیہ و تادیب میں اتنی سختی نہ کرے کہ شاگرد کو وحشت ہو جاوے اس میں میاں جی لوگ بکثرت مبتلا ہیں۔

شاگرد کے لیے اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دعا بھی کرنی چاہیے

حدیث ۳۸ عن ابن عباس قال ضمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال اللھم علمہ الکتاب (رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو سینے سے لگایا اور یوں فرمایا کہ یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرما دے (بخاری)

اس حدیث سے شاگرد کا حق علاوہ تعلیم کے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے لیے حق تعالیٰ سے دعا بھی کیا کرے کہ اس کو علم نافع عطا ہو۔

شاگرد کی دلجوئی کے متعلق ایک مثال

حدیث ۳۹ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول بینا انا نائم اتیت بقدح لبن فشربت حتی انی لاری الری یخرج فی اظفاری ثم اعطیت فضلی عمر بن الخطاب قالوا فما اولتہ یا رسول اللہ قال العلم (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ خواب میں مجھے ایک پیالہ دودھ کا دیا گیا میں نے خوب سیر ہو کر پیا کہ ناخنوں تک سیرابی کا اثر محسوس ہوا پھر میں نے بچا ہوا دودھ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضور اس کی تعبیر کیا ہوئی

فرمایا دودھ سے مراد علم ہے (بخاری)

اس حدیث سے دو امر معلوم ہوئے ایک باعتبار صورت لبن کے ایک باعتبار معنی لبن کے اول یہ کہ شاگردوں کو بچا ہوا اپنے کھانے پینے میں بھی شریک کر لیا کرے کہ اس کا دل بڑھتا ہے اور محبت زائد ہوتی ہے جس قدر اس کو استاد سے محبت ہوگی اسی قدر علم میں برکت ہوگی۔
دوسرا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی باطنی برکت عطا فرما دے تو شاگرد سے اس کو دریغ نہ کرے۔ غرض غذا ظاہری و باطنی کا کچھ حصہ اس کو بھی دیدے۔

اگر کوئی بات غصہ کی صورت میں کہنے سے شاگرد کیلئے بہتر ہو تو اس صورت میں کہے

حدیث
متن

عن ابی مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ قال قال رجل یا رسول اللہ لا اکاد ادرک الصلوۃ مما یطول بنا فلان فما رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی موعظۃ اشد غضبا من یومئذ فقال یا ایہا الناس انکم منفرون فمن صلی بالناس فلیخفف فان فیہم المریض والضعیف وذا الحاجۃ (رواہ البخاری)

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ فلاں شخص نماز طول کرنے کی وجہ سے قریب ہے کہ میں نہ پا سکوں (یعنی بددل ہو کر جماعت چھوڑ دوں) تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر برافروختہ ہوئے کہ ایسے کبھی میں نے برافروختہ ہوتے آپ کو نہ دیکھا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو۔ جو آدمی نماز میں امامت کرے اس کو چاہئے کہ قرأت میں تخفیف کرے کیونکہ مریض اور ضعیف اور حاجت مند سب قسم کے لوگ نماز میں ہوتے ہیں (بخاری)

اس حدیث سے دو امر متعلق طالب علموں کے ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ اگر کچھ اسباق کسی اپنے شاگرد یا ماتحت مدرس کے سپرد کئے جاویں اور وہ طالب علم اس کی شکایت کرے تو شکایت سننا چاہئے اور تحقیق کے بعد اس کا انتظام کرنا چاہئے یہ نہیں کہ محض اس کے طالب علم ہونے کے سبب اس کو اور اس کی بات کو محض لاشئے سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاوے۔
دوسرے یہ کہ اگر کسی طالب علم سے کوئی امر نامناسب صادر ہوا اور کسی طور سے معلوم ہو جاوے

ے کے بعد پھر وہ کوئی معقول سوال کرے تو اس کے جواب میں پہلے غصے کا اثر نہ آنا چاہیے اور اس سے زیادہ اثر نہ رکھنے کا محل وہ ہے کہ جب دوسرا طالب علم کوئی بات پوچھتے تھے۔ وہاں تو بدرجہ اولیٰ پہلا اثر نہ آنے پاوے۔ بعض تیکھے مزاج کے استاد ایک پر خفا ہوئے تو بس اب ختم درس تک سب ہی پر برستے رہیں گے۔

حدیث ۲۸: عن عائشة زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت لا تسمع شیئا لا تعرفه الا راجعت فیه حتی تعرفه وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من حوسب عذب قالت عائشة فقلت اولیس یقول اللہ عز وجل فسوف یحاسب حسابا یسیرا قالت فقال انما ذلک العرض ولکن من نوقش الحساب یهلک (رواہ البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں سنتی تھیں کہ جو ان کو معلوم نہ ہو تو برابر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ گچھ کرتی تھیں یہاں تک کہ سمجھ لیتی تھیں۔ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص حساب میں گرفتار ہوا وہ عذاب میں مبتلا ہوا۔ تو حضرت عائشہ رضی نے عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ حساب آسان کیا جائے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پیشی ہے ورنہ جس سے مناقشہ کیا گیا حساب میں وہ ہلاک ہو گیا (بخاری)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر استاد کی تقریر میں کوئی شبہ رہے اور طالب علم اس کو پوچھے تو نازک مزاج سے ناخوش نہ ہو البتہ اگر فضول سوال ہو تو ناخوشی کا اظہار بھی جائز ہے۔ جیسا کہ اوپر حدیث میں لقطہ اونٹ کے سوال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برہم ہونا مذکور ہے۔

اگر طالب علم کے فہم یا حفظ کی کوئی تدبیر معلوم ہو تو کرنی چاہیے

حدیث ۲۹: عن ابی ہریرۃ قال قلت یا رسول اللہ انی اسمع منک حدیثا کثیرا انساہ قال ابسط رداءک فبسطته فغرف بیدیه ثم قال ضمه فضممته فما نسیت شیئا بعده (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ سے بہت سی حدیثیں سنتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں آپ نے فرمایا کہ اپنی چادر پھیلا۔ میں نے چادر پھیلا دی تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ

اس پر ہنکار بیٹھا دی فرمایا کہ اس چادر کو اپنے سینہ سے لگالے میں نے اس کو اپنے سینہ سے لگا لیا تو اس کی برکت سے پھر کچھ نہ بھولا (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طالب علم کے فہم یا حفظ کی کوئی تدبیر اگر اپنے علم و قدرت میں ہو تو مقتضائے شفقت یہ ہے کہ اس کے مشورہ اور سعی کا اہتمام فرما دے۔

شاگرد کے سوال کے جواب میں اگر ضروری اور مفید باتوں کا اضافہ ہوسکے تو کرے

الحدیث ۲۰

عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان رجلا سالہ ما یلبس المحرم فقال لا یلبس القمیص ولا العمامۃ ولا السراویل ولا البرنس ولا ثوبا مسہ الورس او الزعفران فان لم یجد النعلین فلیلبس الخفین ولیقطعھما حتی یکونا تحت الکعبین (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ محرم میں کیا کپڑا پہنے، فرمایا کہ کرتہ اور عمامہ اور پاجامہ اور بارانی کوٹ اور ورس و زعفران کا رنگا ہوا نہ پہنے جوتہ نہ ہو تو موزے پہنے اور ان کو جوتہ کی طرح کاٹ لے کہ ٹخنے سے نیچے رہیں (بخاری فی باب من اجاب السائل باکثر مما سالہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر طالب علم کوئی بات پوچھے مگر کوئی اور ضروری بات پوچھنے سے رہ جاوے تو شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ صرف اس کے سوال کے جواب پر اکتفا نہ کرے بلکہ وہ دوسری بات از خود جتلا دے۔

یہاں تک بیس حدیثیں اس باب میں ہوئیں اور اتفاق سے ان حدیثوں کا عدد حقوق معلم متعلقہ حدیثوں سے مضاعف بلا قصد ہو گیا۔ جس میں ایک عمدہ نکتہ خیال میں آیا کہ بندہ نے تمہید میں عرض کیا تھا کہ اضاعت حقوق تلامذہ میں زیادہ ابتلا ہے تو قدرتی انتظام اس کی اصلاح کا یہ ہوا کہ اس کے دلائل کا عدد بھی مضاعف ہو گیا کیونکہ تکثیر دلائل سے تنبیہ کا زیادہ ہونا امر طبعی ہے اور یہ محض نکتہ ہے پس اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ پھر حقوق مشترکہ متعلم کے دلائل میں اس سے بھی تضاعف ہونا چاہئے۔ سو اول تو یہ نکتہ ہے اس کا اطراد ضروری نہیں دوسرے چونکہ تعلقات استاد و شاگرد کے قوی ہیں اس لئے اس حق اخیر کو بھی نہیں۔ تو حق ان کی

زیادہ واضح ہے زیارت تنبیہ کا اور مرشد کے بعد سوق احادیث مثل باب اول یعنی بیان حقوق
معلم بیان کئے واقعات جزئیہ کے طرز پر کچھ مضمون ہونا چاہئے تھا چنانچہ اس باب ثانی کے اول
میں اس کا وعدہ بھی ہے اور اس وقت ارادہ بھی تھا لیکن اتفاق سے جو کچھ اس کے ضمن
میں لکھا وہ بذیل احادیث مذکورہ مذکور ہو چکا اس لئے اس باب ثانی کو ختم کر کے اب باب
ثالث یعنی حقوق مشترکہ مربی اسلامیہ کے متعلق بقدر ضرورت عرض کرتا ہوں اور عجب نہیں کہ
اس میں بھی سوق دلائل اور اس کے ضمن میں واقعات کا آجانا کافی ہو جاوے۔ (والدلائل ھذا)

"ساتھیوں کے حقوق"

آیت نمبر ۱۔ قال اللہ تعالیٰ واعبدوا اللہ (الی قولہ) والصاحب بالجنب الآیۃ
عبادت کرو اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو
اور اپنے قرابتیوں اور یتیموں اور فقیروں اور قرابتی ہمسایہ اور اجنبی ہمسایہ اور جو تمہارا ہم صحبت
پاس بیٹھنے والا ہو ان سب کے ساتھ احسان کرو۔

اس آیت سے مشترکہ تعلق کا حق دو طرح ثابت ہوتا ہے۔ ایک اس لفظ سے والجار
الجنب اور دوسرے اس لفظ سے والصاحب بالجنب کیونکہ اس کا جار ہونا بھی ظاہر ہے اور صاحب
بالجنب ہونا بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ مفسرین نے شریک فی التعلم کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے

ہمسایہ دینی بھائی ہے لہذا اس سے بھائیوں جیسا معاملہ کرنا چاہئے

آیت ۲ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا
ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم
بنعمتہ اخوانا الآیۃ۔

اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوط پکڑو اور متفرق مت ہو اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت
کو جو تم پر ہے جب تم آپس میں دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت
ڈال دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی ہو گئے اور تم دوزخ کے کنارے پر تھے تم کو اللہ تعالیٰ

نے اس سے کیا یا۔ الخ

ظاہر ہے یہ تعلم علوم دینیہ اعتصام بحبل اللہ ہے۔ اور یہاں جیسی جماعت صحابہ کو شرف ان

زمارے ہیں کہ وہ معتصم بحبل اللہ اور تعلم دین میں شریک تھے جب یہ اعتصام اور شرکت متحقق

ہو گئی اخوۃ کہ پس جو حقوق اخوان کے ہوں گے وہ اس تعلق میں بھی قابل رعایت ہوں گے۔

ساتھیوں کے ساتھ رعایت کرنے کا حکم

آیت ۷ یاایھا الذین آمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا۔ الآیتہ

ترجمہ: جب کہا جاوے تم کو کشادگی کر دو مجلس میں تو تم کشادگی کر دو اللہ تعالیٰ تم کو جنت میں کشادگی کر دے گا۔ (یعنی دنیا و آخرت میں) اور جب کہا جاوے تم کو اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو اور درجے بلند کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جو تم میں سے ایمان لائے اور ان لوگوں کے جن کو علم دیا گیا اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرکاء تعلم کو بیٹھنے کی جگہ دینے کے لئے اہتمام کرنا چاہئیے جو امکان میں ہو۔

اگر کسی عذر کی بنا پر کوئی ساتھی سبق میں نہ آسکے تو دوسرے کو چاہیے کہ ناغہ شدہ سبق اس کو تکرار کرے

حدیث ۸ ۔ عن عمر قال کنت انا وجار لی من الانصار فی بنی امیۃ بن زید وھی من عوالی المدینۃ وکنا نتناوب النزول علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینزل یوما وانزل یوما فاذا نزلت جئتہ بخبر ذلک الیوم من الوحی وغیرہ واذا نزل فعل مثل ذلک۔ (رواہ البخاری)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اور ایک شخص میرا پڑوسی انصاری عوالی مدینہ میں بنو امیہ میں رہا کرتے تھے اور ہم باری باری جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ایک دن میں اور ایک دن وہ جس دن میں جاتا تو جو کچھ سنتا اس سے بیان کر دیتا اور

جس دن وہ جاتا تو جو سن کر آتا مجھ سے بیان کر دیتا (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنا شریک فی التعلم اگر کسی سبق میں حاضر نہ ہو تو ناغہ شدہ سبق کو اس کو تکرار کر دیا جاوے اور یہ اس کا حق ہے اور یہاں سے مدارس میں باری باری پڑھنے کی بھی اصل نکلتی ہے۔

حدیث ۷۔ عن ابی شریح فی حدیث طویل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیبلغ الشاہد الغائب (رواہ البخاری)

حضرت ابو شریح رضہ سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام بیان فرمائے اور بعد میں فرمایا کہ جو لوگ حاضر ہیں اور وہ سنتے ہیں وہ غائبوں کو پہنچا دیں (بخاری)

اس حدیث سے بھی مثل حدیث سابق حق بالا ثابت ہوتا ہے۔

مجلس میں بعد میں آنے والوں کے متعلق نصیحت

حدیث ۸ عن ابی واقد اللیثی رضہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینما ھو جالس فی المسجد والناس معہ اذ اقبل ثلثۃ نفر فاقبل اثنان الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وذھب واحد قال فوقفا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاما احدھما فرای فرجۃ فی الحلقۃ فجلس فیھا واما الآخر فجلس خلفھم واما الثالث فادبر ذاھبا فلما فرغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا اخبرکم عن النفر الثلثۃ اما احدھم فاوی الی اللہ فاواہ اللہ واما الآخر فاستحیی فاستحیی اللہ منہ واما الآخر فاعرض فاعرض اللہ عنہ (رواہ البخاری)

حضرت ابو واقد لیثی رضہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع کچھ آدمیوں کے مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ناگاہ تین آدمی آئے دو تو مجلس میں بیٹھ گئے۔ ایک کنارہ پر سب کے پیچھے۔ وہ ایک مجلس میں کشادگی پاکر اندر بیٹھ گیا اور تیسرا چلا گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو فرمایا کہ کیا ان تین شخصوں کے حال کی اطلاع نہ دوں ایک شخص نے تو اللہ کی طرف ٹھکانہ ڈھونڈا اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹھکانہ دیدیا۔ ایک نے شرم کی اور کنارہ پر بیٹھ گیا۔ اللہ نے اس سے شرم کی اور تیسرے نے اللہ سے اعراض کیا تو اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا (بخاری)

اس حدیث سے شرکاء مجلس علم کا یہ حق معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والے کو چاہئے کہ دیکھ لے کہ حلقہ میں گنجائش ہے یا نہیں اگر گنجائش ہو تو برابر میں بیٹھ جانا مضائقہ نہیں ورنہ لوگوں کو پریشان نہ کرے ان کے پیچھے بیٹھ جاوے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پیچھے بیٹھنے سے عار نہ کرے جب حق تعالیٰ کا انکار نہ

اگر کوئی ساتھی دیر سے آوے تو اس کو جگہ دینا چاہئے

حدیث ۷ ۔ عن واثلۃ بن الخطاب قال دخل رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی المسجد قاعد فتزحزح له رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال الرجل یا رسول اللہ ان فی المکان لسعة فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان للمسلم لحقا اذا رآہ اخوہ ان یتزحزح له (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت واثلہ بن خطاب سے روایت ہے کہ ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ مسجد میں تشریف فرما تھے آپ اس کے لئے ذرا سرکے کہ جگہ فراخ ہو جائے تو اس نے عرض کیا یا رسول اللہ جگہ وسیع ہے تو آپ نے فرمایا کہ مسلمان کا مسلمان پر حق ہے کہ جب اس کو دیکھے تو اس کے لئے کچھ ہٹے اور جنبش کرے (شعب الایمان بیہقی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شریک فی التعلم کا بدرجہ اولیٰ یہ حق ہے کہ اس کے آنے کے وقت ضرور اس کو بیٹھنے کی جگہ دے بعض طلبہ اس میں بہت کوتاہی کرتے ہیں۔

حدیث ۸ ۔ عن علی رض بن ابی طالب قال کنت رجلا مذاء فامرت المقداد ان یسال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسأله فقال فیه الوضوء (رواہ البخاری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو مذی بہت آتی تھی اس کا مسئلہ پوچھنا تھا خود تو بسبب شرم کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا نہیں حضرت مقداد رض سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو۔ حضرت مقداد رض نے پوچھا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مذی نکلنے سے وضو آتا ہے (یعنی غسل نہیں آتا) بخاری۔

اس حدیث سے یہ حق معلوم ہوا کہ اگر کوئی اپنا ہم سبق استاد سے کوئی بات پوچھنا چاہے اور شرماوے اور اس سے پوچھنے کی درخواست کرے تو خود غرضی کو چھوڑ کر پوچھ لے البتہ اگر نامعقول سوال ہو تو عذر کر دے یا مناسب ہو تو کسی مصلحت سے کہہ دے کہ جس کا سوال ہے وہ خود کرے تو اس وقت کی

پر عمل کرے۔ یہ چند نصوص بقناعت اجمالیہ طالب کے لئے اس باب میں نقل کردیئے گئے ہیں باقی
اس کی تفصیل و تکمیل کے لئے حضرات صحابہ رض کا طرز عمل باب معاشرت میں دیکھ لینا کافی ہے۔ اب
تو ادائے حقوق تو درکنار بعضے سلسلوں میں تو معرجہ۔

مرا بخیر تو امید نیست بد مرسان

پر بھی عمل نہیں رہا بلکہ استاد بھائیوں اور پیر بھائیوں میں باہم تحاسد و تباغض اور تنافر و تزاحم اغراض
ہیں اور استاد یا پیر کے ایک دوسرے کی چغلی اور غیبت اور دوسروں کے سامنے تحقیر و تنقیص
کرتے ہیں الحمد للہ کہ حق تعالیٰ نے ہمارے سلسلہ کو ہمارے بزرگوں کی برکت سے اس بلاء سے
تو بہت کچھ محفوظ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے۔

اب ان ابواب ثلاثہ کو ختم کرتا ہوں جن میں بفضل اللہ تعالیٰ دس آیتیں، بتیس حدیثیں
یعنی سب بیالیس نصوص ہیں۔ گو چاہا اس سے زیادہ نصوص ذکر نہیں کی گئیں کیونکہ محض نمونہ دکھلانا
مقصود تھا جو کہ ایک بڑے عدد سے محدود ہونے کے سبب اس غرض کے لئے کافی ہو گیا کہ
یہ حقوق بھی منصوص ہیں یہاں ان ابواب کے مناسب ایک باب رابع اور بھی تھا یعنی خود علم کے
حقوق جو بذمہ اہل علم ہیں یا بذمہ غیر اہل علم ہیں اور گو یہ مناسبت بوجہ جزئیت تو نہیں کیونکہ
ان ابواب کے مقسم میں خاص معلم و متعلم و قدر کا تعلم مضاف الیہ حقوق کے واقع ہوتے ہیں لیکن
جو تعلق فرد ہے اور یہ تعلق مقتضی ہو سکتا تھا کہ اس کا بھی یہیں ذکر ہوتا گو تبعاً سہی۔ لیکن
اتفاق سے اس کے قبل احقر اس بحث خاص میں نہایت مفصل مضمون بشکل ایک رسالہ جس کا نام
حقوق العلم ہے لکھ چکا ہے۔ اور وہ چھپ بھی گیا ہے اس لئے وہ مستغنی عنہ ہو گیا۔ اب آخر
میں بطور تذنیب کے بعض جزئیات متعلقہ مقام کی تنبیہ میں لکھ کر فارغ ہوتا ہوں۔

تذنیب و تنبیہ اول۔ ہر چند کہ مفہوم معلم کا استاد بالمعنی متعارف اور پیر اور واعظ
اور مصنف یعنی ہر صاحب افادہ دینیہ کو جب کہ کسی کو استفادہ ہو سب کو عام ہے لیکن قواعد
سے معلوم ہوتا ہے کہ سب حقوق میں متساوی نہیں ہیں۔ ان سب میں استاد بالمعنی المعروف کا
حق زیادہ ہے۔ دو وجہ سے۔ ایک تو یہ کہ استاد جس قدر مشقت افادہ تلامذہ کے لئے برداشت
کرتا ہے۔ اس قدر دوسرے اہل افادہ نہیں کرتے۔ بعض طرق افادہ میں تو چنداں مشقت ہی

مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی کوتاہیوں کی نشان دہی نیز
عبادات، نکاح و طلاق، حقوق العباد اور دیگر معاشرتی معاملات سے متعلق
معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا شریعت کی روشنی میں حکیمانہ علاج

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ

تسہیل و ترتیب

مفتی محمد اقبال قریشی

مولانا حسین احمد نجیب
رفیق دارالتصنیف دارالعلوم کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرفِ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ؛
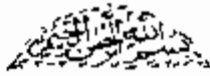
حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اپنے دین کی نشر و اشاعت کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ آپ نے مختلف موضوعات پر تقریباً ایک ہزار تصانیف کا وہ بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے جو ان شاء اللہ رہتی دنیا تک مسلمانوں کی رہنمائی کرے گا، ان تصانیف میں حضرتؒ نے اپنے زمانہ کی بیشتر ضروریات سے متعلق بڑی نادر تحقیقات و ہدایات جمع فرمادی ہیں، اور شاید ہی عصرِ حاضر کی ضرورت کا کوئی موضوع ایسا ہو جس پر آپ کی تصانیف یا مواعظ و ملفوظات میں کم از کم اصولی ہدایات موجود نہ ہوں۔

حضرتؒ کے مجددانہ کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ زیرِ نظر کتاب یعنی "اصلاحِ انقلابِ امت" ہے۔ اس کتاب میں حضرتؒ نے اُن تمام خرابیوں اور بیماریوں کا انتہائی باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے سبب سرایت کر گئی ہیں اور پھر ان کا علاج بھی تجویز فرمایا ہے۔ دراصل یہ ایک سلسلۂ مضامین ہے جو حضرت تھانوی قدس سرہ نے ماہنامہ القاسم دیوبند کے لئے تحریر فرمایا تھا، اور اس میں کئی سال تک قسط وار چھپتا رہا، بعد میں اسے کتابی صورت بھی دیدی گئی۔

عرصہ سے احقر کی خواہش تھی کہ یہ کتاب دوبارہ شائع ہو کر افادۂ عام کا سبب بنے۔ لیکن چونکہ اس کتاب سے استفادہ کو آسان بنانے کے لئے اس پر کچھ کام کی ضرورت تھی، اس لئے اشاعت ملتوی رہی، بالآخر کتاب کے پہلے حصہ پر برادرِ عزیز مولوی محمد علی صاحب سلمہٗ نے عنوانات وغیرہ لگا کر اسے مکمل کر دیا، چنانچہ "ادارۃ المعارف" سے یہ پہلا حصہ جو عبادات سے متعلق تھا عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔

دوسرا حصہ احقر کی نظر میں بیحد اہم تھا، اس لئے کہ وہ زیادہ تر اُن احکام پر مشتمل ہے جو نکاح وطلاق اور گھریلو زندگی کے دوسرے اہم مسائل سے متعلق ہیں، اور جن کو ہمارے معاشرے نے دین سے بالکل خارج تصور کر رکھا ہے، لیکن مولوی محمد علی صاحب اس دوسرے حصے پر کام کرنے سے معذور ہوگئے اس لئے اس کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہوگئی، بالآخر ہمارے محب محترم جناب صوفی محمد اقبال قریشی صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا، اس پر عنوانات لگائے، اور مشکل الفاظ کی تشریح فرمائی، اس کے بعد برادرِ عزیز مولانا حسین احمد صاحب نجیب رفیق دار التصنیف دار العلوم کراچی نے اس پر محنت سے نظرِ ثانی کی، اور اس کی تسہیل و ترتیب میں مفید اضافے فرمائے، اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے،

اس کتاب میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے ان خرابیوں کا انتہائی بالغ نظری کے ساتھ حکیمانہ جائزہ لیا ہے جو ہماری گھریلو زندگی میں بُری طرح پھیل گئی ہیں، اور جن کی بناء پر ہمارا معاشرہ گوناگوں آفتوں کا شکار ہو رہا ہے، اس میں نکاح، مہر، نفقہ، عدل، رضاعت، طلاق، لقطہ اور دوسرے حقوق العباد سے متعلق شرعی احکام کی تشریح بھی ہے، اور اس بات کی مؤثر نشاندہی بھی کہ ہمارے معاشرہ میں کس کس طرح غلط فہمیاں یا بے عملیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور اُن کے نتائج کتنے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں،

امراض کی یہ تشخیص اور ان کا یہ علاج اُس حکیم الامت کی طرف سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے گزشتہ صدی میں تجدیدِ دین کے لئے منتخب فرمایا تھا، اور جسے اُمت کی نبض شناسی کی خاص توفیق مرحمت فرمائی تھی:

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ان احکام کے سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہو کر اپنی دنیا و آخرت سنوارنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین،

احقر
محمد تقی عثمانی
۲ صفر ۱۳۹۹ھ

دار العلوم کراچی ۱۴

تعارف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ وبارک وسلم تسلیما کثیرا کثیرا۔

اما بعد: "اصلاح انقلاب امت" حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی تصنیف ہے جو حقیقی معنی میں حکیم الامت، مصلح ملت اور مجدد وقت تھے۔ ان کی بہت روشن درخشندہ حیات مبارکہ بالکل اس آیت مبارکہ کے مصداق تھی إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔ اور وہ صحیح معنوں میں اس شعر کی عملی تصویر تھے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مورخ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندوی اپنے مقالہ "حکیم الامت کے آثار علمیہ" کے باب "اصلاحیات" میں حضرت والا کی اصلاحی تصنیفات (کتاب جزا اور حیوۃ المسلمین اور اصلاح الرسوم، صفائی معاملات، اصلاح امت وغیرہ) میں بطور تعارف تحریر فرماتے ہیں:

"ان کتابوں میں ہر ایک کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی زندگی خاص شریعت اسلامی طرز پر، زیادہ شرعی نہج پر ہو اور ان کے سامنے وہ صراط مستقیم پیش ہو جو منزل مقصود کی طرف جاتی ہے۔"

(ماہنامہ معارف، صفر ۱۳۶۳ھ بحوالہ حیات اشرف، ص ۱۵۵)

پاکستان میں پہلی بار اس نادر کتاب کی جلد اول ادارۃ المعارف کراچی نے شائع کی تھی۔ دوران طباعت احقر نے برادر محترم جناب مکرم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہم سے اس کتاب کی جلد دوم کی اشاعت کے بارے میں مشورہ کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر اشاعت میں تاخیر نہ ہو تو حضرت کے ذوق کے مطابق ذیلی سرخیاں لگانے کے سبب بہتر ہو رہی ہے تو عنوانات کیجئے

حاضر ہوئے، مولانا عثمانی صاحب مدظلہم نے اسے منظور فرمالیا اور کتاب روانہ فرمادی، درحقیقت بندہ اس کا بالکل اہل نہ تھا، "مصلحت کار کجا و من خراب کجا"

تاہم حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کی ایک نادر اصلاحی تصنیف کی خدمت کو سعادت جان کر توکلاً علی اللہ میں کام کو شروع کیا، دوران باتوں کا اہتمام کیا۔

(۱) ہر باب میں ذیلی سرخیاں قائم کرکے شروع میں ایک مختصر فہرست مضامین لگادی ہو، اس فہرست پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے ہی کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۲) کتاب کی زبان چونکہ علمی ہونے کی وجہ سے خاصی مشکل ہے اسلئے قارئین کی سہولت کے مدنظر بعض مقامات پر مشکل الفاظ کا مفہوم قوسین میں لکھ دیا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ قرآنی آیات، احادیث، فقہی عبارات اور فارسی اشعار کا ترجمہ بھی قوسین میں کردیا ہے، فقہی عبارات کے ترجمہ کے سلسلہ میں برادرم علامہ اختر علی صاحب سینئر اورینٹل ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول ہارون آباد نے بڑا تعاون فرمایا، بلکہ بعض عبارات کی تصحیح اور حل کے لئے فصل فتاوی سے مراجعت فرمائی، حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

(۴) فقہی اصطلاحات (مثلاً طلاق بائن، خلع وغیرہ) کی تشریح حواشی میں کردی گئی ہے۔

(۵) جدید اردو میں بعض مقامات پر واؤ کا استعمال متروک ہوچکا ہے مثلاً "جاوے" "کھاوے" وغیرہ میں واؤ کو حذف کرکے "جائے" "کھائے" وغیرہ کردیا گیا ہے۔

غرض کہ کتاب کو حتی المقدور عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے، جو صاحب اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں وہ احقر سراپا ننگ، خاکپائے اہل اللہ کے لئے بطور خاص دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ شانہ زندگی کی بقیہ ساعات میں اپنی مرضیات پر چلنے، نامرضیات سے بچنے کی توفیق بخشتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی کے افادات زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی توفیق بخشیں اور ہم کو اور آپ کو ان پر عمل کی توفیق عنایت فرمائیں ؎

انہی کے طرز عمل پہ ہوا ہے ختم احیا
ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

آخر میں دوبارہ عرض ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اس پر عمل کی نیت سے کیا جانا چاہئے،
اللّٰہم وفقنا لما تحب وترضیٰ، آمین۔

دعاؤں کا محتاج
بندہ محمد اقبال قریشی عفی عنہ
شب جمعہ ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

اصلاحِ انقلابِ امت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصلاح انقلاب امت (حصہ دوم)

اصلاح متعلق بہ نکاح

مثل عبادات مقصودہ (یعنی عبادت جو اصل مقصود ہیں) جن کا بیان حصہ اوّل میں ہو چکا ہے، مثلاً عقائد دیانات مثل نماز روزہ حج زکوٰۃ، قربانی، معاملات بیع و شراء، معاشرت مثل طعام، لباس و کلام وغیرہ، اخلاق باطنہ مثل ریاء وغیرہ، کے امر نکاح میں بھی مختلف کوتاہیوں کا وقوع شائع ہے (یعنی مختلف کوتاہیاں پھیلی ہوئی ہیں) اس لئے مختصراً ان پر بھی متنبہ کرنا ضروری ہو کر ذیل میں مذکور ہے:

ناکارہ ہونے کے باوجود بلا ضرورت محض عرفی رسم سمجھ کر نکاح کرنا: ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ بالکل ضرورت نہ ہوتے بلکہ باوجود از کار رفتہ (نکاح کے لئے بیکار) ہونے کے محض خاندانی یا عرفی (رواجی) رسم سمجھ کر اپنی خدمت کی مصلحت سے جوان عورت یا لڑکی سے نکاح کرتے ہیں، اور اپنے ناکارہ ہونے کو منکوحہ دار لیا، منکوحہ (جس سے نکاح کرنا ہو اور نکاح کرنے والے کے ولی) سے چھپاتے ہیں، تو یہ لوگ اپنی دینی مصلحت کے سبب دوسرے آدمی کو یقینی مفسدہ (خرابی) میں مبتلا کرتے ہیں، نتیجۃً اس کے دو امر ہوتے ہیں:

(۱) اگر وہ عورت عفیفہ (پارسا) یا متعففہ (خود کو پارسا رکھنے والی) ہوئی، تب تو وہ تمام عمر کے لئے قید شدید میں مبتلا ہوئی، اور اگر اس صفت سے معرّا (خالی) ہوئی تو بدکاری میں مبتلا ہوئی، اور دونوں حالتوں میں زوجین (میاں بیوی) میں ناگوار رنجش و نا اتفاقی امر مشترک ہے

(۲) دوسری صورت میں دونوں کی بے آبروئی بلکہ دونوں کے خاندان کی بھی ساتھ ساتھ رسوائی کہ

مال و زر کی طمع و حرص سے اپنی لڑکی کی زندگی برباد کرنا

بعضے لوگ یہ اندھیر کرتے ہیں کہ باوجود شہرت اس امر کے پھر بھی اپنی لڑکی ایسے شخص سے بیاہ دیتے ہیں جس کا سبب اکثر مال و زر کی طمع و حرص ہوتی ہے جس کی اُن کو اپنے لئے توقع ہے، یا پہلے ہی لے لیتے ہیں۔

بعض سادہ لوح نکاح کی غایت کھانا پینا سمجھتے ہیں

اور اس سے بھی زیادہ عقل کے دشمن وہ ہیں جو خود بھی منتفع نہیں ہوتے صرف اولاد کی احمقانہ خیرخواہی ہی اس کا باعث ہوتی ہے، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ خیر فراغت سے کھانے پینے کی تو ملے گی، اُن سادہ لوحوں (بیوقوفوں) کو یہ خبر نہیں کہ نکاح کی غایت (و مقصد) آیا کھانا پینا ہے یا مصالح زوجیت؟ اگر امر اوّل غایت ہوتی تو چاہئے تھا کہ جو لوگ کھانے پینے کی وسعت رکھتے ہیں یا خود وہ منکوحہ صاحب وسعت (مالدار) ہے تو ایسی جگہ نکاح ہی نہ کیا جایا کرتا حالانکہ مشاہدہ (دیکھا جاتا) ہے کہ بنات سلاطین (بادشاہوں کی بیٹیاں) تک اس سے مستغنی (بے نیاز) نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نکاح سے مقصود دوسری ہی مصالح ہیں۔

بدون موافقت تام کے نکاح کے مصالح پورے نہیں ہو سکتے

اور وہ بدون موافقت تام (پورے) نہیں ہو سکتے، اور موافقت حالت مذکورہ میں ہو نہیں سکتی پس وہ مصالح بھی اس حالت میں تمام نہ ہوں گے، بلکہ بعض مصالح جو کہ مقتضا ہیں طبیعت بشریہ کے وہ تمام کیا حاصل بھی نہیں ہوتے، اس لئے نکاح میں اس امر کی رعایت سخت ضروری ہے، تاکہ زندگی تلخ نہ ہو۔ پھر مرد کو اگر عورت سے ناگواری پیش آئے تو وہ طلاق دے کر تخلاص (آزاد ہونے) پر قادر ہے، یا بدون طلاق دوسری عورت سے نکاح کرکے اس ناگواری کی تلافی (کمی پوری) کر سکتا ہے، مگر عورت بیچاری کیا کرے کہ عمر بھر سوختہ (افروختہ) (دل جلی) رہا کرے، اور تفریق قاضی (حاکم کے عورت کو شوہر سے الگ کر دینے) کا سامان ہر جگہ میسر نہیں ہو سکتا، اور بعض عورتیں اس اظہار کو خلاف غیرت سمجھتی ہیں، بعض جگہ ایسے موانع ہیں کہ عورت کو شب و روز تنگ کرتی ہے اور گھل گھل کر خاتمہ ہو گیا، کیا یہ ظلم نہیں، خواہ عورت ایسا کرے یا اولیاء منکوحہ ایسا کریں۔

عمر کے تناسب کا خیال نہ رکھنے سے بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں

اور اسی کے قریب ہے عمر کے تناسب کا خیال نہ کرنا، جب لڑکی بے زبان یعنی کنواری یا مثل کنواری (کنواری جیسی) کے تجربہ کی رائے (یعنی اپنی رائے نہ رکھنے والی) ہو جیسا بعضے لوگ ستر ستر اسی اسی برس کے بڈھوں سے تیرہ تیرہ چودہ چودہ برس کی لڑکیوں کو بیاہ دیتے ہیں، یہاں بھی وہی مفاسد مرتب ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، اور اس سے ایک مفسدہ زیادہ وہ یہ کہ اکثر بوڑھا پہلے مر جاتا ہے، اور وہ مظلومہ اکثر بوجہ

عوناً رسم و رواج میں داخل ہونے کے جیسا بہت قوموں میں اب تک یہ جہالت موجود ہے، بیوہ
بیٹھی رہتی ہے، علاوہ مفاسد مذکورہ کے بعض اوقات یہ غریب کھانے پینے سے محتاج ہو جاتی ہے
اگر شرافت عرفیہ رسمی شرافت اسکے ہونے سے کسی کی مزدوری نہیں کر سکتی، اور اگر مزدوری
گوارا کی دوسرے گھر بلکہ بعض اوقات رہنا پڑتا ہے چونکہ اس کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا،
بدنفس برے خیالات کے لوگ اس بیچاری کے درپے ہوتے ہیں، اور کبھی ترغیب اور
کبھی ترہیب (ڈرا دھمکا کر) کبھی کسی حیلہ (بہانہ) سے خاص کر جب اس میں بھی کوئی
نفسانی تقاضا (نفسانی خواہش) ہو اس کی آبرو اور دین خراب کر دیتے ہیں، اور یہی مطلوب
خدمت تو وہ دوسرے طریقے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

بغرض خدمت نکاح مقصود ہو تو کیسی عورت سے نکاح کرنا چاہئے

اور اگر نکاح اسی پر موقوف ہو تو ایسی عورت سے نکاح کیجئے جو خود مختار ہو اور وہ اپنے لئے پورے طور سے رائے قائم کر سکے،
اور اس سے اس کی حالت (ضعف پوشیدہ رہنے) بھی نہ ہو اور بہتر یہ ہے کہ اس کی
حالت سے بوجہ زیادتی سن (عمر زیادہ ہونے کے سبب) یہ بھی گمان غالب ہو کہ اس میں تقاضا
نفسانی (نفسانی خواہش) نہیں رہا تو اس صورت سے کوئی مفسدہ مظنون (خرابی کا گمان) نہ ہوگا
ہاں یہ ممکن بلکہ غالب ہے کہ ایسی عورت ہم کفو (ہم مرتبہ) کم ملے گی، تو خدمت کے لئے کفو ہی کی
کیا ضرورت ہے، اس کا زیادہ لحاظ توالد و تناسل (اولاد کے ہونے اور نسل کے بڑھنے) میں
کیا جاتا ہے، کہ اگر اولاد غیر کفو سے ہوئی اہل برادری عرفاً اس کو اپنے برابر نہیں سمجھیں گے اور
ان کے ازدواج (شادی کرنے) میں دشواری ہوگی۔ تو جب یہ مرد از کار رفتہ فرض کیا گیا ہے
تو توالد و تناسل کی نوبت ہی کہاں آئے گی، اس کے لئے غیر کفو ہونا نامناسب ہے۔

مرد کو دھوکہ دے کر نکاح کر دینے کے مفاسد

ایک کوتاہی اس کے مقابل ایک امر یہ ہے کہ منکوحہ کسی وجہ سے ایسی ہو کہ غالب ظن (گمان غالب) ہے کہ مرد اس کو پسند نہ کرے گا، اور اولیاء
منکوحہ نے دھوکہ دے کر کسی سے نکاح کر دیا، مثلاً اس کو کوئی ایسا مرض ہے جو ہمبستری سے مانع
ہے، کہیں کہیں ایسا مشاہدہ ہوا کہ رتقاء (جس کی تنگی فرج کے سبب جماع کرنا محال ہو)،
یا قرناء (فرج میں ایک زائد گوشت کا پیدا ہو جانا جو وقت جماع میں حاجب ہوتا ہے)، ایک جگہ
مجنونہ (پاگل) کا نکاح ایک اندھے سے کر دیا تھا۔ اس نے شوہر کو کاٹ لیا وہ بھاگا، اور
بے حد رسوائی ہوئی، آخر طلاق ہوئی، مہر کا جھگڑا پڑا۔ ایک جگہ عورت بالکل بہری تھی یعنی جلد

ایسی سفید تھی جیسے برص کے مریض میں ہو جاتی ہے، سو مرد تو کہیں صابر شاکر بے نفس ہوتا ہے اور اپنا
کو مرد جھیلتا ہے، مگر تمام زندگی اس کی بے حلاوت (بے مزہ) ہوتی ہے، اور گو اختلاص بعض کو ممکن
ہے مگر طبائع (طبیعتیں) مختلف ہیں، بعض اس کو بے مروتی سمجھتے ہیں، بعضے وسعت کم رکھتے ہیں
اس لئے وہ اس کا اہتمام نہیں کرتے تو جن لوگوں نے ان کو دھوکہ دیا ہے اُن پر تو اس تلبیس
(دھوکہ دہی) و ایذاء رسانی (تکلیف پہنچانے) کا وبال ضرور ہی ہوگا۔

بعض جگہ دیکھا گیا ہے کہ آسیب زدہ لڑکی کو کسی کے سر منڈھ دیا اور جب وہ متوجہ ہوا تو
جن صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے، غرض بڑی بے صبری کر کے رہ گیا اور خدمت اس کی جدا اس کے
ذمہ رہی، تو زر دادن و درد سر خریدن (رقم دے کر سر کا درد خریدنے) کی مثل صادق آگئی، تو یہ
لوگ لڑکی کے لئے شوہر تجویز نہیں کرتے، بلکہ جن کے لئے ایک مزدور تلاش کر لیتے ہیں، اور خاص کر
ان عوارض (پیش آنے والی چیزوں) کے ساتھ بی بی صاحبہ بدزبان و بدمزاج بھی ہوں تب تو
اچھی خاصی شوہر کے لئے دوزخ ہے۔

اسی طرح اگر وہ اندھی ہو، کانی ہو، مبروص (برص کے مرض میں مبتلا) ہو، مجذوم (جذام
کے مرض میں مبتلا) ہو، ان سب کا نتیجہ ظاہر ہے: اگر مرد بے نفس ہوا تو اس کی زندگی ان عنایت
فرماؤں کی بدولت برباد ہوئی، اور اس سے صبر نہ ہو سکا تو اس نے اس عورت کو تکلیف پہنچانا
شروع کیا جس سے اس پر ایک مصیبت مرض وغیرہ کی تو پہلے ہی تھی ہی، دوسری اور بڑھ گئی اور
ان دونوں سے یہ ناچاقی (نااتفاقی) بڑھتے بڑھتے آگے، ہو کر دونوں کے خاندانوں تک نوبت پہنچتی ہے،

مرد و عورت کے مزاج ناموافق ہونے کے مختلف عوارض

ان میں باہم عداوت (دشمنی) ہو جاتی ہے، مقدمہ بازی ہوتی ہے،
کبھی تفریق (علیحدگی) کی کوشش کی جاتی ہے، اور مرد انکار
کرتا ہے، کبھی مہر کی نالش (دعویٰ) ہوتی ہے، کبھی جھوٹے گواہ معافی کے بنائے جاتے ہیں، اور
کبھی باوجود معاف کر دینے کے جھوٹا حلف معاف نہ کرنے کا گوارہ کر لیا جاتا ہے، غرض ہزاروں
قضیان (جھگڑے) کھڑے ہو جاتے ہیں، اُن سب کی جڑ مرد و عورت کا ناموافق ہونا ہے، جس کے
اسباب کہیں مرد کے عوارض ہیں، کہیں عورت کے۔

نکاح کے معاملہ میں زوجین اور اولیاء زوجین کو نہایت دیانت اور صفائی سے کام لینا چاہئے

چونکہ نکاح بھی ایک معاملہ ہے، جس کا تعلق دو نئے آدمیوں سے ہے
اس لئے زوجین و اولیاء زوجین کو اس میں نہایت دیانت و صفائی
سے کام لینا واجب ہے، کہ کسی قسم کا خلجان مخفی (الجھاؤ کا احتمال)

نہ رہے، جہاں تک اپنا ذہن رسائی کرے ہر بات کو صاف کر دینے۔

باوجود ضرورت نہ ہونے کے براہ ہوسناکی کئی کئی بیویاں کرنے کے مفاسد

ایک کوتاہی یہ ہے کہ باوجود ضرورت نہ ہونے کے بعض لوگ براہ ہوسناکی کئی کئی بیبیاں نکاح میں جمع کر لیتے ہیں، اور یا تو بوجہ اس کے کہ مرد میں دین یا وسعت کم ہے اُن میں عدل نہیں ہو سکتا، یا بوجہ اس کے عورتوں میں دین و عقل کم ہے باوجود شوہر کے عدل رکھنے کے پھر بھی وہ باہم لڑتی جھگڑتی ہیں یا شوہر سے بگڑتی ہیں، در عدل نہ رکھنے کی صورت میں مرد پر مخالفت شرع (شریعت کی مخالفت) کا الزام ظاہر ہی ہے جس سے احتراز (بچنا) واجب ہے، اور جہاں غالب گمان اس عدل کا ہونا عدم کے سبب سے بھی کہ تعدد ازواج (بیویوں کے ایک سے زائد ہونے) سے بنا بر اس کے کہ مقدمہ ناجائز کا ناجائز ہے احتراز واجب ہوگا، اور عدل رکھنے کی صورت میں مرد پر یہ الزام تو نہیں لیکن پریشانی میں تو پڑ گیا، جس کے بڑھ جانے سے بعض اوقات دین میں خلل پڑنے لگتا ہے اور بعض اوقات صحت و عافیت میں، اور اس کے واسطہ سے اکثر دین میں بھی خرابی آجاتی ہے۔

پریشانی کے بڑھ جانے سے دین میں خلل آنے کا ظن غالب ہو تو اس پریشانی و باعث اسباب سے بچنا واجب ہے

جہاں اس کا ظن غالب ہو ایسی پریشانی سے بچنا ضروری ہے، اور اس کے ساتھ ہی پریشانی کے اسباب سے بھی کہ اس .... موقع پر تعدد ازواج سے بچنا لازم ہوگا، اگر یہ لزوم بدرجہ وجوب شرعی بھی نہ ہوتا تاہم عقل کا اقتضاء (تقاضا) تو ضرور ہے، اور شرعاً بھی مرجح و مستحسن (پسندیدہ اور اچھا) اور اس کا خلاف ناپسندیدہ و غیر مستحسن ہوگا، اور اس کے معنی یہ نہ سمجھے جائیں کہ تعدد ازواج میں فی نفسہ کوئی کراہت ہے، نعوذ باللہ، کیونکہ اس کی اباحت بلا کراہت منصوص قطعی (قرآن سے ثابت) ہے اور سلف میں بلا نکیر شائع (رائج) تھا۔

تعدد ازواج کا انکار تقلید ملاحدۂ یورپ کا سبب ہے

اس میں کراہت یا حرمت کا اعتقاد یا دعویٰ اور اس کی بنا پر آیات قرآنیہ میں تحریف کرنا جیسا کہ اس وقت تقلید ملاحدۂ یورپ بعض مسلمانوں کے لئے اس کا سبب ہوگئی ہے سراسر الحاد و بددینی ہے، اصل عمل میں شائبہ (شک) بھی کراہت یا ناپسندیدگی کا نہیں، اور نہ اس کا جواز (جائز ہونا) بمعنی صحت و نفاذ متیقن عدل کے ساتھ مقید (یعنی نکاح کا صحیح اور نافذ ہونا عدل کر سکنے کی شرط کے ساتھ پابند ہے)، بلکہ اگر عدم عدل (انصاف نہ ہو سکنے) کا تیقن (یقین) بھی ہو تب بھی

صحت ونفاذ اس کا یقینی،

محض عوارض کے سبب تعدد ازواج گناہ ہوسکتا ہے

البتہ بعض عوارض کے سبب اس کا جواز یعنی عدم الاثم (گناہ نہ ہونا) مرتفع ہوجاتا ہے، یعنی جب احتمال غالب عدم عدل کا ہو تو اس وقت باوجود استحسان فی نفسہ (بذات خود اچھا ہونے) کے اس عارض خاص کی وجہ سے اس تعدد سے منع کیا جائے گا، لقولہ تعالیٰ :-

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (النساء، آیت ۳)

(پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ کرو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو)

لیکن خود عورتوں کی بے اعتدالیوں کا اندیشہ ہو تو اس وقت تعدد سے نہی شرعی (شرعی ممانعت) تو نہیں، لیکن قواعد شرعیہ (شریعت کے اصولوں) کی رُو سے مشورۃً ایک پر کفایت کرنے کے لئے کہا جائے گا، اور یہ مشورہ بھی اس معنی کو شرعی ہوگا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دیا تھا :-

هَلَّا بِكْرًا تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ ( )

"کیا کنواری نہیں تھی کہ تم اس سے جی بہلاتے اور وہ تم سے دل بہلاتی"

بالغ ہونے کے بعد کنواری لڑکیوں کی جلد شادی نہ کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں

اور اس کے مقابل ایک کوتاہی عورتوں کے متعلق ہے، یعنی کوتاہی جو اور بیجا حسن تو مردوں کے لئے توسع (وسعت کرنا) تھا کہ کئی کئی عورتوں سے شادی کرتے ہیں، اور یہ اس آئندہ کوتاہی کا حاصل عورتوں کے حق میں تنگی کرنا ہے، وہ یہ کہ بعض احوال میں ان غریبوں کے لئے خود شادی ہی کو مہتم بالشان نہیں سمجھتے، کہیں صرف عملاً، کہیں اعتقاداً بھی بصورت عملاً ایسا کر لیتے، ناعاقبت اندیش کنواری لڑکیوں کو بالغ ہوجانے پر بھی کئی کئی سال بٹھلائے رکھتے ہیں، اور محض ناموری کے سامان کے انتظار میں ان کی شادی نہیں کرتے، حتیٰ کہ بعض بعض جگہ تیس تیس اور کہیں چالیس چالیس برس

---

[1] بہتر اور مناسب تو یہی ہے کہ بچیوں کا جوان ہونے کے بعد فوراً نکاح کر دیا جائے، اور محض خیالی توہمات کی بنا پر زیادہ تاخیر نہ کی جائے، چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اگر تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دینداری کو تم پسند کرتے ہو تو تم اپنی لڑکی کا اس سے نکاح کر دو، ورنہ زمین میں بڑا فتنہ و فساد ہوگا"، اسی طرح جمع الفوائد میں بحوالہ ترمذی

کی عمر کو پہونچ جاتی ہیں اور والدین سرپرستوں کو کچھ نظر نہیں آتا کہ اس کا کیا انجام ہے، حدیث شریف میں جو اس پر وعید آئی ہے کہ اگر اس صورت میں عورت سے کوئی لغزش ہو گئی تو وہ گناہ باپ پر بھی بوجہ ذی اختیار اس پر بھی لکھا جاتا ہے،

جلد شادی نہ کرنے کے دنیوی مفاسد

اگر کسی کو اس وعید کا خوف نہ ہو تو دنیا کی آبرو کو تو دنیا دار بھی ضروری سمجھتے ہیں، سو اس میں تو اس کا بھی اندیشہ ہے، چنانچہ کہیں حمل گرائے گئے ہیں، کہیں لڑکیاں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہیں، اگر کسی شریف خاندان میں ایسا بھی نہ ہو تب بھی وہ لڑکیاں ان سرپرستوں کو تو دل ہی دل میں کوستی ہیں، اور چونکہ وہ مظلوم ہیں[1] اُن کا کوسنا خالی نہیں جاتا، ان لوگوں کو یہ بھی شرم نہیں آتی کہ خود تو باوجود بوڑھے ہو جانے کے ایک جوڑ بیاہ کر کہ وہ اس لڑکی کی ماں ہے خلوت میں لے جا کر اس کے ساتھ عیش و عشرت کرتے ہیں، اور جس غریب مظلوم کی عیش کا موسم ہے وہ پہرہ داروں کی طرح ماما اور نوکرانی کے ساتھ ان کے گھر کی چوکسی کرتی ہیں، کیسا بے ربط خبط (بے جوڑ دیوانگی) ہے،

جہیز کے انتظار میں نکاح میں تاخیر نہ کرنی چاہئے،

اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جس انتظار میں یہ تاخیر کی ہے وہ بھی نصیب نہیں ہوتا، یعنی سامان اور زیور اور نقد کے لئے وہ سرمایہ بھی میسر نہیں ہوتا، اور مجبوری کو جھک مار کر خشک نکاح ہی کرنا پڑتا ہے، پھر اُن سے کوئی پوچھے کہ دیر کرنے سے بجز خسارۂ دنیا و آخرت کے کیا حاصل ہوا، بلکہ اس دیر میں تو اور بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حضرت ابن نجیح ؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یوں منقول ہے مِسْكِينَةٌ مِسْكِينَةٌ امْرَأَةٌ لَيْسَ لَهَا زَوْجٌ، قِيلَ وَإِنْ كَانَ غَنِيَّةً مِنَ الْمَالِ قَالَ وَإِنْ كَانَ كَثِيرَةَ الْمَالِ (یعنی محتاج ہے محتاج ہے وہ عورت جس کا شوہر نہ ہو، لوگوں نے عرض کیا اگرچہ وہ بہت مالدار ہو، تب بھی محتاج ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ بہت مالدار ہو، (بندہ احقر قریشی غفرلہ)

[1] جیسا کہ حدیث پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِتَّقُوا دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ، یعنی مظلوم کی بددعا سے ڈرو کیونکہ اس کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے، حضرت شیخ سعدی ؒ نے گویا اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ؎

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن ✽ اجابت از در حق بہر استقبال می آید

خلائق کے نزدیک بدنامی ہو کہ بیاں لئے دن بھی لگتے اور پھر خاک نہ ہو سکا، لڑکی کو اگر ایسا ہی دینے کا شوق ہو تو بعد نکاح کے دینے کو کس نے منع کیا ہے، اگر دعوت عام ہی کا شوق ہو تو دعوت کے جزا پہلے ہر وقت نکل سکتے ہیں، یہ کیا فرض ہے کہ سارے ارمانوں کی اسی منظوم پر مشق کی جائے، یہ بالکل ظلم صریح اور عمل قبیح و بڑا کام ہے،

موقع کا رشتہ نہ ملنے کا عذر بالکل صحیح نہیں

اور بعض لوگ دیر میں یہ عذر کرتے ہیں کہ کیا کریں کہیں سے موقع کا رشتہ ہی نہیں آتا، تو کیا کسی کے ہاتھ۔۔۔ پکڑا دیں؟ یہ عذر اگر واقعی ہوتا تو صحیح تھا، یعنی سچ مچ اگر موقع کا رشتہ نہ آتا تو واقعی یہ شخص معذور تھا، لیکن خود اسی میں کلام ہے کہ جو رشتے آتے ہیں آیا وہ سب ہی بے موقع ہیں، بات یہ ہے کہ بے موقع کا مفہوم خود انھوں نے اپنے ذہن میں تصنیف کر رکھا ہے جس کے اجزاء یہ ہیں۔

لائق داماد کی ذہنی تراشیدہ صفات

(۱) حسب نسب حضرات حسنین رضی اللہ عنہما جیسا ہو، (۲) اور اخلاق میں جنیدؒ جیسا ہو، (۳) اور علم میں اگر وہ دینی ہے تو ابو حنیفہؒ کے برابر ہو اگر دنیوی ہو تو بو علی سینا کا مثل ہو، (۴) حسن میں یوسف علیہ السلام کا ثانی ہو، (۵) اور ثروت و ریاست میں قارون و فرعون کے ہم پلہ ہو،

بس ان کا لقب کہیں لائق داماد ہوگا، ان صفات کے لحاظ کا مضائقہ نہیں، بلکہ منجملہ حقوق اولاد کے ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی دو امر اور بھی لحاظ کے قابل ہیں،

غلو ہر امر میں مذموم ہے

ایک یہ کہ ہر امر میں اعتدال مدنظر رکھنا چاہئے، غلو ہر امر میں مذموم ہے، دوسرے یہ کہ ایک شخص میں تمام صفات کا مجتمع ہونا بھی شاذ و نادر ہے، پس اگر صفات مذکورہ بقدر ضرورت کسی میں مجتمع ہوں مگر ان میں جو اہم ہیں وہ موجود ہیں، اور وہ تین امر ہیں،

نکاح کرتے وقت لڑکے میں تین امر کا دیکھنا ضروری ہے

ایک قوت اکتساب (کمانے کی قوت) دوسرے کفاءت (برابری) یعنی زیادہ تفاوت نہیں، تیسرے دینداری، ان تینوں امور میں زیادہ کاوش (کھوج) نہ چھوڑ دے، ورنہ وہی بات پیش آئے گی جس کا ذکر حدیث میں ہے کہ جب خلق و دین پسند

---

[1] وہ حدیث یہ ہے: اِذَا خَطَبَ اِلَیْکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَهٗ وَخُلُقَهٗ فَزَوِّجُوْهُ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَکُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ (رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃؓ کذا فی المشکوٰۃ)

(منہ حضرت تھانوی غفرلہ)

کفاءت ہو تو نکاح کر دیا کرو ورنہ زمین میں فساد کبیر ہوگا، یہ تو تحقیقی جواب تھا ان لوگوں کی غلط فہمی کا،

موقع کا رشتہ نہ ملنے کے عذر کے تین الزامی جوابات

اور تین جواب الزامی ہیں جو ان کے جواب میں قابل احتجاج ہیں:
ایک یہ کہ جن صفات کو جس درجہ میں تم دوسروں میں ڈھونڈتے ہو
تم کو جس شخص نے لڑکی دی تھی جس کی بدولت آج اپنی لڑکی کے باپ بن کر یہ چوچلانیاں
دکھا رہے ہو کیا اس شخص نے بھی تمہارے لئے ایسی ہی تفتیش و کاوش (تحقیق اور جستجو) کی تھی،
اگر وہ ایسا کرتا تو تم کو عورت ہی میسر نہ ہوتی، اور ان باتوں کے بنانے کا موقع ہی نہ ملتا،
غرض اس نے ایسا نہیں کیا، تو اس نے جب ایسا نہ کیا تو تم نے یا تمہارے باپ نے دوسرے
بھائی مسلمانوں کی بدخواہی کیوں کی، کہ باوجود تمہارے اندر ان اوصاف کے علی سبیل الکمال
(مکمل طور پر) مجتمع نہ ہونے کے اس کی لڑکی پر نکاح قبضہ کر لیا، آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں
مپسند (جو چیز تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے کیوں پسند کرتے ہو) پر عمل
کیوں نہیں کیا؟

دوسرا الزامی جواب یہ ہے کہ جب تم اپنی دختر کے لئے ان صفات کا شوہر تلاش کرتے ہو،
انصاف کرو تم جب اپنے فرزند کے لئے کسی کی لڑکی کی درخواست کی تھی یا کرنے کا خیال ہے، کیا
اپنے صاحبزادہ میں بھی یہ صفات اسی درجہ کی دیکھ لی ہیں یا دیکھنے کا ارادہ ہے، افسوس! آنچہ بر
خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند کے مقولہ کا یہاں بھی خون کیا،

تیسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح لڑکوں میں بے شمار خوبیاں ڈھونڈھی جاتی ہیں اگر دوسرا
شخص تمہاری لڑکیوں میں اس سے عشر عشیر (دسواں حصہ) خوبیاں اور ہنر بھی دیکھنے لگے تو میں یقین
کرتا ہوں کہ تمام عمر ایک لڑکی بھی بیاہی نہ جائے، یہاں بھی وہی آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں
مپسند کا بیان (دھجیاں اڑا دینا) لازم آتا ہے،

غرض یہ عذر کہ رشتہ موقع کا نہیں آتا اکثر احوال میں بے موقع ہے، یہ تو بیان تھا عورتوں
کے حق میں شادی کے باب میں عملاً تنگی کرنے کا،

اعتقاداً بیوہ کے نکاح ثانی کو معیوب سمجھنا جہالت ہے

اور اعتقاداً تنگی کرنا اور وہ ستم تر ہے ایسا کہ جیسے اکثر لوگ بوجہ افراط
جہل (یا بسبب کثرت جہالت) کے بیوہ کے نکاح ثانی کو معیوب سمجھتے
ہیں، بعض جگہ تو یہاں تک غضب سنا ہے کہ منگنی ہونے کے بعد اگر لڑکا مر گیا تو پھر لڑکی کو تمام
عمر بٹھلائے رکھا، اور یہ تو بکثرت ہے کہ بعد شادی کے بچپن میں یا جوانی میں بیوہ ہو گئی بس اب

اس کی شادی کرنا گویا اُن کا حق سمجھا جاتا ہے۔ بعض لوگ اگرچہ بوجہ بے علمی دین اور وضع کے بچوں کے اب اس درجہ کا عیب نہیں سمجھتے مگر تاہم جس طرح اس لڑکی کی پہلی شادی کی فکر تھی دوسری شادی کی فکر اس سے آدھی بھی نہیں یعنی اہتمام نہیں۔

بیوہ کا نکاح ثانی نہ کرنے سے اس کی عصمت آبرو اور دین برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔

مگر اس میں اور اس میں فرق کیا ہے بلکہ اگر غور صحیح سے کام لیا جائے تو بہ نسبت نکاح اول کے نکاح ثانی اس بیوہ کا اہم ہے کیونکہ پہلے تو وہ خالی الذہن تھی، مصالح زوجیت کا یا تو علم ہی نہ تھا یا تھا تو علم الیقین تھا، اور اب اس کو عین الیقین ہو گیا ہے، اس حالت میں اس پر وساوس و خطرات کا ہجوم زیادہ ہوتا ہے، جس سے کبھی عصمت، کبھی آبرو، کبھی دین، کبھی سب برباد ہو جاتے ہیں۔

بیوہ کو شفقت اور محبت سے نکاح ثانی کی ترغیب دی جاوے

بعض لوگ کہتے ہیں ہم نے پوچھا تھا وہ راضی نہیں ہوتی۔ صاحب! مجھ کو اس میں بھی کلام ہے کہ جو طریقہ پوچھنے کا ہوتا ہے اسی طرح پوچھا تھا؟ یا چلتی ہوئی بات کہہ کر ازالہ کر دیا۔ پوچھنے پر جو بیوہ انکار کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتی ہے کہ اگر میں ایک دم سے راضی ہو جاؤں گی تو خاندان کے لوگ یوں کہیں گے کہ یہ تو منتظر ہی بیٹھی تھی خاوند کو ترس رہی تھی، اس میں بدنامی ہوگی، اس خوف سے وہ ضرور انکار کر دیتی ہے۔ چاہئے یہ کہ اس کو اچھی طرح مصلحتیں بتلاؤ، اس کے وسوسے دفع کرو، شفقت اور اہتمام سے گفتگو کرو، مگر اس پر بھی وہ راضی نہ ہو تو تم معذور ہو۔

بچوں والی عمر رسیدہ صاحب وسعت بیوہ کو نکاح ثانی کرنا ضروری نہیں۔

غرض حتی الامکان بیوہ کا نکاح ہی کر دینا مناسب ہے۔ البتہ اگر کوئی بیوہ بچے والی ہو اور عمر بھی ڈھل گئی ہو اور کھانے پینے کی بھی گنجائش ہو اور وہ انکار کرتی ہو اور قرائن سے استغناء اور بے نیاز ہونا اس کا زوج و شوہر سے معلوم ہو تو اس کے لئے اہتمام ضروری نہیں۔

زوجین کی مرضی کے خلاف نکاح کر دینے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اکثر بلکہ قریب قریب کل ہی مواقع میں متناکحین یعنی نکاح کرنے والے جوڑے کی مرضی حاصل نہیں کی جاتی۔ تعجب ہے کہ نکاح جو کہ عمر بھر کے لئے دو شخصوں کا تعلق ہے جن کے ساتھ ہزاروں مصلحتیں وابستہ ہیں، وہ تو کسی کی اور رائے سے ہو درگذشت کی، گو ان دو شخصوں کے مصالح کے یقیناً خلاف ہی ہو اور اگر وہ اپنی ناخوشی بھی ظاہر کرتے ہوں تو ان کو ذرا نہ پوچھا جائے، زبردستی نکاح کر دیا جائے۔ بعض دفعہ عین وقت تک متناکحین یا ان میں سے ایک بے خبر

انکار کرنا ہے تو کس قدر گھونٹ اور جبر کر کے خاموش اور لب بند کر دیا جاتا ہے۔ اور عمر بھر کے کی مصیبت میں اس کو جھونک دیا جاتا ہے، کیا یہ عقل اور نقل کے خلاف نہیں ہے، اور کیا اس میں ہزاروں خرابیوں کا مشاہدہ نہیں کیا جاتا، اور پھر کیا ان خرابیوں کا کوئی انتظام یا انسداد دروک تھام کیا جاتا ہے۔ اس کو یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر جگہ لڑکے لڑکی سے کہنا ضروری ہے،

صغیر یا صغیرہ پر ولایت جبریہ حاصل ہے

نابالغ وصغیرہ پر ولایت جبریہ کوئی چیز نہیں۔ یا بالغہ پر ولایت بعنیہ تھم سکوتیہ یعنی ولایت جس میں ولی نکاح کی اجازت مانگنے پر صرف خاموشی کافی ہے) کا انکار ہے، یا اولیاء کو مصالح مخصوص کرنے کا حق نہیں، سو یہ مطلب نہیں کیونکہ یقیناً بعض جگہ لڑکا اور لڑکی ذی رائے اکثر جگہ ذی رائے نہیں ہوتے، تو ان نادانوں کی رائے کیا، اور اس پر اعتماد ہی کیا، نابالغ ہونے کی حالت میں اگر شاذ و نادر ذی رائے بھی ہوں تو شاذ و نادر کا کیا اعتبار، یا بالغ اور ذی رائے ہونے کے باوجود حیا، جو خاصۂ فطرت کر الوہیت و بکارت رعورت اور دوشیزگی) کا وہ طبعاً مانع ہوتی ہے متکلم بات کرنے اور اظہار رائے سے، بعض جگہ بلوغ وعقل کے انتظار میں موقع صالح ہاتھ سے نکل جاتا ہے، جو شاید عاقد (عقد نکاح کرنے والے) کی سعی سے عمر بھر بھی نصیب نہ ہوگا۔

نیز اکثر جگہ اولیاء ... اپنے تجربہ اور شفقت سے جو تجویز کریں گے وہ مصلحت ہی ہوگی، اسی واسطے شریعت مقدسہ نے اپنے احکام وقواعد میں ان سب واقعات کا لحاظ کر کے مکمل قانون بنا دیا۔ اس لئے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں اور نہ کوئی عاقل یہ بات تجویز کر سکتا ہے کہ بالکل متناکحین کی رائے پر رکھ دو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اولیاء اپنے تجربہ و شفقت سے مصالح پر پوری نظر کر کے اس کے بعد بھی احتیاطاً و نظراً الی العواقب (احتیاط کے ساتھ نتائج پر غور کرتے ہوئے) اگر لڑکا لڑکی بالغ ہوں جو (بوجہ اس کے کہ اکثر بلوغ سبب ہوتا ہے ذی رائے ہونے کا، شرعاً ذی رائے قرار دیا گیا ہے،

نکاح سے قبل زوجین سے ان کی مرضی اور رائے معلوم کرنے کا احسن طریقہ

اس صورت میں قبل اس کے کہ باضابطہ ان کی رضا و اذن (رضامندی و اجازت) حاصل کی جائے، یعنی باکرہ بالغہ (بالغ کنواری) کو جس کے سکوت (خاموشی) کو معیار رضا قرار دیا جائے، اور نابالغ سے مجلس میں قاضی کہلوا دے کہ میں نے قبول کی، سو اس کے قبل بھی خاص طور پر ان کی رائے دریافت کر جائے، جس کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ جن سے وہ بے تکلف ہیں جیسے ہمدرد دوست

اور سہیلیاں ان کے ذریعہ سے اس طور پر کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ جانتے بزرگ ہم سے یہ دریافت کر کر
رہے ہیں ان کا مافی الضمیر معلوم کرلیا جائے۔ اور تجربہ کی بات ہے کہ اس طریقہ سے ضرور ان کے خیالات
معلوم ہو جاتے ہیں، اور بعض دفعہ تو بے دریافت کئے وہ خود ہی ایسے بے تکلف دوستوں سے اپنی
پسندیدگی یا ناپسندیدگی ظاہر کردیتے ہیں اور دلیا تک وہ خبریں پہنچ جاتی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں نکاح سے قبل مستانکین کی رائے معلوم کرلینا بہت ضروری ہے

غرض ظلم و ستم ہے کہ پھر بھی بعض جاہل موہوم مصلحتوں و فضول خیالی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے اس خیال کی پرواہ نہیں کی جاتی اور ان کو گھونٹ دب کر اس بلا میں پھنسا دیا جاتا ہے، خصوصاً اس
زمانہ میں کہ بیحد ہوشیاری کا وقت ہے اس کی بہت ضرورت ہے، بہت مقامات ایسے ہوئے ہیں
کہ ناپسندیدگی کی حالت میں نکاح کر دیا گیا، پھر ناکح صاحب نے عمر بھر اس منکوحہ کی خبر نہیں
لی اور فہمائش دے کہلوائی تو صاف جواب دیدیا کہ میں نے تو اپنی رائے ظاہر کر دی تھی جنہوں نے
اس پر بھی یہ عقد کیا ہے نفقات (اخراجات) کے وہ ذمہ دار ہیں۔

خلاف مرضی نکاح کردینے کے مفاسد

اب بتلایئے اس مصیبت کا کیا علاج، ان بوسیدہ عقل بزرگوں کی تو مصلحت ہوئی اور غریب مظلوم تمام عمر کے لئے قید غیر میعادی
(غیر معینہ) میں گرفتار ہوئی، کہاں ہیں یہ فرسودہ عقل؟ اب آئیں اور اس مظلومہ کی کچھ مدد
کریں، مگر وہ کیا کرتے، وہ تو اس وقت تک مرکھپ بھی گئے، اور زندہ بھی رہ گئے تو ذرا سٹے
تو دیکھئے یہ کہہ کر صاف الگ ہو گئے کہ صاحب کوئی کسی کی قسمت میں تو گھس ہی نہیں سکتا، ہم کیا کریں
اس کی قسمت، ہائے غضب، کیا غضب کا جواب ہے جس سے وہ مظلومہ تو درکنار غیر آدمی کے
تن بدن میں بشرطیکہ تھوڑا سا منصف ہو آگ لگ جاتی ہے، مجھے مانا کہ قسمت کی خبر نہیں تھی،
اس کی تو خبر تھی کہ خود صاحب معاملہ کانوں پر ہاتھ دھر رہا ہے جو ظاہر ہو چکا اس کی علامت
ہے کہ تقدیر میں بھی یوں ہی ہوگا کہ انجام اس کا پریشانی ہوگی۔

غلطی کرکے تمسک بہ تقدیر کا عذر غلط ہے۔

اور اگر ایسے ہی تمسک بتقدیر (تقدیر کو تھامنا) ہے تو بس کل کسی کو
قتل کر دیکھیو جب سزائے موت کے لئے پکڑے جاؤ تو کہدینا کہ مجھ تو
صرف ایک گولی ماری تھی، تقدیر کی کیا خبر تھی کہ ایک گولی سے مر ہی جائے گا، دیکھیں تو بھی اس
عذر سے تم کو کون چھوڑ دے گا خدا نخواستہ (خدا نہ کرے) اگر وہ مقتول تمہارا ہی کوئی لگتا ہو تو
دیکھیں گے کہ تم قاتل کا یہ عذر قبول کرلوگے، یہ سب بیہودہ باتیں ہیں، کاش! اگر بجائے اس کے

اس وقت اپنی غلطی کا اعتراف ہی کر لیتے تو مظلوم کی کچھ تو تسلی ہو جاتی۔ ان بیہودہ جوابوں سے تو گویا اس کے زخم پر نمک چھڑکا جاتا ہے کہ ایک تو بچہ کو پھنسایا پھر کیسی صفائی سے بری ہوتے ہیں۔

پسندیدہ زمانہ نکاح بعد بلوغ کے ہی ہے۔

اگر لڑکی منکوحہ نابالغ ہوں اور اچھا موقع فوت ہوتا ہو تو دوسری بات ہے اور اگر ایسی کوئی ضرورت و مصلحت نہیں ہے محض رسم ہی کا اتباع ہے تو خود یہ رسم مٹانے کے قابل ہے گو نکاح صحیح ہو جاتا ہے، انکار نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (النساء آیت ۶)

(اور تم یتیموں کو آزما لیا کرو یہاں تک کہ (وہ) نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں)

صاف مشعر ہے کہ پسندیدہ زمانہ نکاح کا بعد بلوغ کے ہے۔

قانونِ شرعیہ سے زیادہ جامع اور مراعیِ مصالح کوئی نہیں ہو سکتا۔

اور اس کوتاہی کے مقابل ایک غلو ہے جو اس وقت اکثر نو تعلیم یافتوں میں بڑھتا جاتا ہے، وہ یہ کہ خلافِ مرضی نکاح کے بعض واقعات مضرہ (نقصان دہ) انھوں نے احکامِ شرعیہ پر طعن اور ان احکام کے مقابلہ میں یورپ کے رسم و رواج کو ترجیح دینا شروع کیا۔ مجھ کو ان صاحبوں سے تعجب ہے کہ یہ حضرات اتباعِ فطرت و تحقیقِ واقعات (انسانی فطرت کی تفتیش اور واقعات کی چھان بین) کے ازحد مدعی ہیں، اور پھر ان کی نظر سے یہ واقعہ کیسے مخفی رہ گیا کہ ہر قسم کے مواقع پیش آتے ہیں جن کے لئے کوئی ایک کلیہ کافی نہیں ہو سکتا، اس کے لئے بڑے قانون کی ضرورت ہے، جو قانونِ شرعیہ سے زیادہ جامع اور مراعیِ مصالح (مصلحتوں کی رعایت کرنے والا) کوئی نہیں ہو سکتا، چنانچہ خود جن کی یہ لوگ تقلید کر رہے ہیں یعنی اہلِ یورپ وہ خود روز افزوں اس قانونِ شرعی کے استحسان کا اعتراف کرتے جاتے ہیں، پھر ان کی نظر سے یہ فطرت کیسے مخفی رہی جس کو اللہ تعالیٰ نے سلیم المزاج طبقۂ اناث (صحیح مزاج والی عورتوں کے طبقہ) میں ودیعت کر رکھا ہے، کہ حیا، ان کے لب پر مہرِ سکوت لگائے ہوتے ہے۔

عورتوں میں فطری طور پر ایک حیا کی شان پائی جاتی ہے

افسوس! ان صاحبوں نے اس امرِ فطری کی ذرا رعایت نہیں کی اور اگر ان کی نظر میں کوئی ایسی جماعت ہو جس میں یہ امرِ فطری نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے اس کے فطری ہونے میں شبہ ہو جائے، تو جواب یہ ہے کہ علامت فطری ہونے کی یہ ہوتی ہے کہ جو عوارض مرتفع ہوں وہاں اس کا ظہور ہو، سو اس معیار پر اگر تحقیق کیا جائے تو اناث میں اس سکوت کا فطری ہونا ثابت ہوگا۔

ایسا خاص طرز تعلیم جس سے عورتوں میں حیا کا نام و نشان باقی نہ رہے ان کے واسطے سخت مضر ہے۔

سبب اس کو خاص طرز تعلیم کا جو خود ہی اناث کے لئے نامناسب ورنہ ادنیٰ درجے کے لوگوں تک میں کہ جن میں نہ علم ہو نہ پردہ ہو ایک شان حیا کی پائی جاتی ہے

شریعت مقدسہ نے تمام روئے زمین کے انسانوں کے جذبات کی رعایت فرمائی ہے۔

قربان جائیے شریعت مقدسہ کے کہ تمام روئے زمین کے اصلی جذبات تک کی رعایت احکام میں فرمائی ہے۔ اہل علم میں سے بعض کی میں نے یہ حکایت سنی ہے کہ انھوں نے اپنی ناکتخدا کنواری لڑکی کے نکاح کے وقت علی رؤس الاشہاد (گواہوں کی موجودگی میں) اس سے پوچھا کہ فلاں شخص سے تمہارا نکاح کیا جاتا ہے، تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ خاموش رہی، اس پر جبر کیا کہ ہاں یا نہ کہو اور رائے ظاہر کرو مجبوراً بیچاری کو کہنا پڑا کہ ہاں میری مرضی ہے، سبحان اللہ کیا خوب صورتی سے رائے لی ہے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ کیوں صاحب کیا سچ مچ تمہارے نزدیک اس طریقہ سے اس کا اصلی مافی الضمیر معلوم ہو گیا؟ بس اسی عقل و دانش پر شریعت پر اعتراض کئے جاتے ہیں، اگر شریعت آپ سے قانون بنواتی تو بس ایسا ہی بناتا۔

زوجین میں نکاح کے وقت سب سے زیادہ قابل التفات چیز دین اور سب سے کم قابل التفات مال و جمال ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اس زمانہ میں مناکحت میں زیادہ تر جانبین کو نکاح کرنے والے بیبیوں زیادہ تر مال کو دیکھتے ہیں اور سب سے کم دین کو دیکھتے ہیں اور باقی اوصاف میں آرا مختلف ہیں، حالانکہ سب سے کم قابل التفات یہی مال و جمال اور سب سے زیادہ قابل التفات دین ہی ہے، اسی واسطے حدیث میں عورت کے باب میں ہے:

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِحَسَبِهَا وَلِمَالِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ،	یعنی عورت سے چار وجوہ سے نکاح کیا جاتا ہے، شرافت کی وجہ سے، مال کی وجہ سے، خوبصورتی کی وجہ سے اور دینداری کی وجہ سے، سو اے مخاطب تجھ کو دیندار عورت سے نکاح کرنا چاہئے (۱۲ اصلاح المتقی)۔

ملہ اس کے برعکس شریعت نے کنواری مستورہ کی خاموشی ہی کو رضامندی کے لئے کافی سمجھا ہے، زبان سے کہنے پر زور نہیں دیا۔ (احقر قریشی عفی عنہ)

بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۝ (العنکبوت، آیت ۲۵) | حال ہوگا کہ تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہوگا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا)

یہ علاقہ ذریعہ اس وقت بھی ختم نہ ہوگا، قال اللہ تعالیٰ:

اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝ (الزخرف، آیت ۶۷) | (تمام دنیوی دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے سوائے متقی لوگوں کے)

بغیر دین کے صرف مال وجمال بقاءِ محبت کے لئے کافی نہیں

خصوص مال وجمال کہ ان کی عمر تو بہت ہی کم ہے، مال تو ایک شب میں بے وفائی کرجاتا ہے، اور جمال ایک بیماری میں ختم ہوجاتا ہے، اور بعض امراض میں پھر عود (دوبارہ لوٹنا) ہی نہیں کرتا، جیسے آنکھ پھوٹ جائے، یا چیچک نکل آئے اور دماغ ضعیف ہوجائیں یا سر کے بال گرجائیں وغیرہ ذلک (اور اسی طرح دوسری بیماریاں)

پھر جب مقصود مال وجمال تھا اور وہ رخصت بلا عوض ہوگیا، تو تمام محبت و الفت بھی جو اس پر مبنی (قائم) تھی وہ بھی ختم ہوگئی، اور پھر زوجین میں ایک دوسرے کی نظر میں مبغوض (ناپسندیدہ) ہوگیا اور نباہ ہمیشہ کے لئے مشکل ہوگیا اور جیسے بعض اوقات اس کو بقاء ہی رہا تب بھی جہاں دین نہیں وہاں دیکھا ہے کہ مال وجمال بقائے محبت کے لئے کافی نہیں، کیونکہ جب دین نہیں اور ظاہر ہے کہ بددین آدمی کے نہ اخلاق درست ہوتے ہیں نہ اعمال، معاملات اور بداخلاقی، بدمعاملگی، و بداعمالی کی جس میں منافعت حقوق (حقوق ضائع کرنا) و خود پرستی وخود غرضی بھی آگئی، جو خاصہ ہے مبغوضیت پیدا کردینے کا، پس جب شب و روز ایسے اسباب برابر واقع ہوتے رہیں گے، تو کہاں تک ان میں محبت رہ سکتی ہے، بلکہ باہم کدورت ورنجش، و نااتفاقی و غیظ و طیش پیدا ہونا شروع ہوگا، حتیٰ کہ تمام مصالح زوجیت ضائع ہوجائیں گے، ہم نے خود دیکھا ہے بی بی حسن و جمال میں حور کا بچہ اور شوہر مال و منال میں قارون کے قدم بقدم مگر میاں کی بددینی سے تو اکثر اور کہیں بی بی کی بدخلقی و بد مزاجی یا بدچلنی کے سبب میاں بیوی میں بول چال تک نہیں، وہ اس کو دیکھ کر منہ پھیر لے یہ اس کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائے، یہ دوسری جگہ دل بہلاتے پھرتے ہیں، وہ باوجود مال ہونے کے الگ ایک ایک پیسہ کو ترسے، بعض جگہ تو ہم نے دیکھا ہے کہ بی بی نہایت نفرت کے سبب میاں سے پردہ کرتی ہے، یہ ثمرات ہیں بددینی کے باوجود مال وجمال ہونے کے، پس اس کا مقصود سمجھنا ہی حماقت ہے:

دین کے ساتھ اگر مال وجمال بھی جمع ہو تو نور علیٰ نور ہے

ہاں اگر دین کے ساتھ یہ بھی ہو تو نور علیٰ نور ہے جیسے بعض حدیثوں میں ہے أَمَّا مُعَاوِيَةُ فَصُعْلُوكٌ الخ (یعنی جواب میں کہ معاویہ کا تعلق ہو وہ مفلس ہیں) اور إِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَنْظُرَ إِلَيْهَا فَانْظُرْ، او کما قال، (اگر ہو سکے تو نکاح سے پہلے اس عورت کو دیکھ لینا) مشیر بھی ہے، اور ایک درجہ میں مال وجمال کی رعایت کی حرمت، لیکن غلو اس میں بھی بیشک مذموم ہے جیسے اوپر حدیث ہی سے ثابت ہے۔

نکاح سے قبل داماد کے مسلمان ہونے کی تحقیق ضروری کرنی چاہئے

اسی مضمون پر تفریع کے طور پر ایک یہ امر بھی قابل تنبیہ ہے کہ آجکل نو تعلیم یافتہ طبقہ میں بعضے لوگ ایسے آزاد اور بیباک پائے جاتے ہیں جو بلا تکلف بدولت تقلید ملاحدہ یا بطفیل ہوا پرستی و خود رائی قطعیات (یعنی یقینی عقائد و احکام) میں مخالفانہ کلام کرتے ہیں، کسی کو رسالت میں کلام ہے، کسی کو نماز روزہ کے احکام پر شبہ ہے کسی کو واقعات یقینیہ معاد و قیامت کے (یقینی واقعات) پر شبہات ہیں، سو خوب سمجھ لو کہ مِثْلُ ذٰلِكَ الرَّجُلِ كَافِرٌ وَإِنْ زَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ، (ایسا آدمی کافر ہے خواہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی سمجھتا ہو۔) اور مسلمہ کا نکاح کافر مرد سے نہیں ہوتا یا اگر مسلمان ہونے کے بعد کوئی ان امور میں سے کسی کا مرتکب ہوا تو کافر ہو جاتا ہے اور نکاح ٹوٹ جاتا ہے، اور عمر بھر حرام کاری ہوتی ہے، پس بہت ضروری ہے کہ نکاح کے قبل داماد صاحب کے رائے اور خیال کو اگر دیکھو تو اس کے مسلمان ہونے کی تحقیق کر لیا کرو، اور بعد نکاح ایسا امر پیش آئے تو توبہ کرا کر تجدید نکاح کرا دیا کرو، بہت مہتم بالشان (انتہائی اہمیت والا) امر ہے۔

ضرورت اور وسعت ہونے پر نکاح ثانی کرنا واجب ہے

ایک کوتاہی اس باب میں جو کہ سبب اول کوتاہی کے مقابل ہے یہ ہے کہ بعضے لوگ باوجود ضرورت کے اور باوجود وسعت کے نکاح ..... نہیں کرتے، بعضے تو اول ہی سے نہیں کرتے اور بعضے ایک بیوی کے مرنے یا طلاق دیدینے کے بعد پھر نہیں کرتے، سو خوب جان رکھو کہ جب ضرورت یعنی نفس میں تقاضا ہو اور وسعت بھی ہو گو اس قدر ہو کہ روز کے روز کماؤں گا اور کھلاؤں گا تو نکاح کرنا اس صورت میں واجب ہے، اور اس کے ترک سے گناہ گار ہوگا،

نکاح کس صورت میں فرض ہے

اور اگر وسعت کے ساتھ بہت زیادہ تقاضا ہے کہ بدون (بغیر) نکاح

کے بدون فعل حرام میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے تو نکاح کرنا فرض ہوگا۔

وَمِنَ الْفِعْلِ الْحَرَامِ النَّظَرُ الْمُحَرَّمُ وَالْاِسْتِمْنَاءُ بِالْكَفِّ۔ | (فعل حرام میں نظر حرام اور جلق بازی بھی شامل ہے۔)

نکاح کس صورت میں سنت ہے اور کونسی صورت میں ممنوع؟ اور اگر ضرورت کو درجہ نہیں لیکن قدرت ہے ادائے حق زوجیت پر بھی سنت ہے۔ البتہ اگر اندیشہ ہو کہ بیوی کے حق ادا نہ کر سکے گا تو ترک نفس خود ہر حال تو ایسے شخص کے لئے البتہ نکاح کرنا ممنوع ہے۔

صرف ضرورت ہو اور وسعت نہ ہو تب بھی نکاح ہی واجب ہے اور اگر ضرورت ہو اور وسعت نہ ہو اس میں اقوال مختلف ہیں۔ اصح قول وجوب کو راجح اور افضل سمجھتا ہے اور وسعت کی تدبیر محنت، مزدوری یا قرض سے کرلے جس کے ادا کی نیت مستحکم رکھے، اور ادا کی کوشش بھی کرے، اور اگر اس پر بھی ادا نہ کر سکا تو امید ہے حق تعالیٰ اس کے خصم (قرضخواہ) کو راضی فرما دیں گے کیونکہ اس نے دین کی حفاظت کے لئے نکاح کیا تھا اس میں مقروض ہو گیا تھا، مگر فضولیات کے لئے یہ قرض جائز نہیں، بلکہ صرف نان نفقہ کے لئے یا مہر کے لئے جہاں کہیں مہر کلاً یا بعض دیدینا یا اس کا کچھ حصہ فوراً دیا جاتا ہو۔ بہرحال اس مقام پر کلام اس میں ہے کہ جب ضرورت اور وسعت دونوں ہوں تو نکاح واجب یا فرض ہوگا، پھر بھی بعض لوگ نہیں کرتے جس کے اسباب مختلف ہیں۔

نکاح کا ترک فی نفسہ عبادت نہیں بعض تو نکاح نہ کرنے کو قربت و عبادت سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ احتمال رہبانیت اور بدعت فی الدین، دین میں نئی بات گھڑنا ہے۔ اصل میں مامور بہ شرعیہ (جس عمل کا شریعت نے حکم دیا ہے) نکاح ہی ہے، تو اس کا ترک فی نفسہ عبادت نہیں ہو سکتا۔ جیسے کہ ظاہر ہے، اور بعضے بیوی کے مرنے سے ...... بدول ہو کر زعم خود تارک دنیا بنتے ہیں، بہرحال یہ دونوں ترک دنیا کا قصد کرتے ہیں، ایک ابتداء ہی سے اور ایک بیوی کی وفات کے بعد سے۔

حالت ضرورت میں عدم نکاح سے فتن کثیرہ میں مبتلا ہوگا حالانکہ جب حاجت ضرورت کی ہے تو ترک نکاح سبب ہو جائیگا فتن کثیرہ اور بہت سے فتنوں کا، چنانچہ وساوس و خطرات کا ہجوم جو عبادات میں حلاوت و طمانیت و لذت اور اطمینان نہ ہو پانے کا ہی موجب ہو جائیگا، یہ تو ایک حالت مشترکہ ہے، اور بعض ان وساوس و خطرات سے متأثر ہو کر ان کے مقتضا پر عمل بھی

صدور ہوجاتا ہے اور بعض تو عورتوں سے مبتلا ہوجاتے ہیں، اور بعضے اپنے ظاہری تقدس کی حفاظت کے لئے عورتوں سے بچتے ہیں کہ اس میں آدمی جلد بدنام ہوجاتا ہے تو نوعمر لڑکوں سے مبتلا ہوجاتے ہیں،

نوعمر لڑکوں میں مبتلا ہونا فتنۂ عظیم ہے اور یہ اس سے بڑھ کر فتنہ ہے کیونکہ وہ کسی حالت میں تو محل ہے حلت کا (حلال ہونے کا مقام ہے) بخلاف اس کے محرم محض اور قطعی حرام ہے، پھر ان میں سے بعض تو اصل فعل سے بچے رہتے ہیں، مگر اس کے مقدمات میں مثل تقبیل و مس (بوسہ اور چھیڑ چھاڑ) وغیرہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں، جس میں دو سخت بدگمانیاں ہیں، ایک حق کہ خود متمتع (جس سے لذت اندوز ہو) کہ وہ اس کو نہ رکھنا شفقت پر محمول کرے گا، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (ہم اللہ سے تمام ظاہری و باطنی فتنوں سے پناہ چاہتے ہیں)۔

ترک دنیا سے ترک معصیت زیادہ ضروری ہے تو ترک دنیا اتنا ضروری نہیں جتنا ترک معصیت، لیکن ان لوگوں کی وہی مثل ہوئی کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، یہ اسباب تو مردوں کے ترک نکاح کے ہیں، خواہ نکاح اول ہو یا نکاح ثانی،

عورتیں بہ تقاضائے عمر بے نکاح رہنے کو ترجیح نہیں دیتیں اور عورتیں بھی بہت کم ہیں جو ایسی ہیں کہ باختیار خود ان سے بے نکاح بیٹھے رہنے کو ترجیح دیں، اور کسی عارض (معذوری) کے سبب نکاح کی صورت نہیں پڑے تو اور بات ہے، جیسے اس کو کوئی مرض ہے یا کوئی قبول نہیں کرتا یا رسوم و عادات کے سامان کا انتظار ہے، گو یہ انتظار مذموم ہے، مگر تاہم ان لوگوں نے ترک نکاح کو نفس نکاح پر ترجیح نہیں دی، لیکن

بعض عورتوں کا نکاح ثانی کو عیب یا ذلت کا موجب سمجھنا سخت قابل گرفت غلطی ہے ایسی عورتیں بکثرت ہیں جو نکاح ثانی کے ترک کو اس کے فعل پر ترجیح دیتی ہیں، جس کا سبب بکثرت تو یہی ہے کہ وہ نکاح ثانی کو عیب سمجھتی ہیں، اور بعض زبان سے بھی ایسی باتیں کہہ ڈالتی ہیں جن میں بعض باتیں تو حد کفر تک پہنچ جاتی ہیں، اور بعض عیب بھی نہیں سمجھتیں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ عورتیں بھی بے نکاح بیٹھے رہنے کو زیادہ عزت کا سبب سمجھتی ہیں، اور یہ بھی درحقیقت ایک چھپا چور ہے، جس کا درجہ اسی حد کفر میں داخل نہیں، مگر اس کے قریب، یعنی تو ضرور ہے ورنہ کوئی مسلمان کیا وجہ کہ خلاف سنت کو زیادہ اعزاز کا سبب سمجھے، اور بعض غریب ایسی بھی ہیں جو نکاح کو ہر طرح مستحسن سمجھتی ہیں، اس سے ذرا بھی انقباض نہ ناپسندیدگی نہیں، مگر جانتی ہیں

کہ بچے ضائع ہو جاتے تھے، یا یہ کہ کوئی اس کو قبول نہیں کرتا، یہ دونوں معذور ہیں، بلکہ یہیں تو ماجور (ثواب پانے والی) ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔

منکوحہ کے مال پر نظر رکھنا بڑی بے غیرتی ہے۔

ایک کوتاہی ناگہانی نکاح کرنے والوں میں یہ ہے کہ منکوحہ (جس سے نکاح کرنا مطلوب ہو) کے مال کو دیکھتے ہیں اور درحقیقت یہ حرص بھی بدتر ہے کہ منکوحہ یا اس کے اولیاء مرد کے مال کو دیکھیں، گو کہ یہ تو کسی درجہ میں اگر اس میں غلو نہ ہو تو معقول ہے کیونکہ مرد پر نفقہ و مہر عورت کا واجب ہوتا ہے، تو اس پر استطاعت رکھنے کو دیکھنا مضائقہ نہیں، بلکہ ایک قسم کی ضروری مصلحت ہے، البتہ اس میں ایک قسم کا غلو ہونا کہ اس کو اور ضروری اوصاف پر ترجیح دی جائے یہ مذموم ہے، لیکن عورت کے مالدار ہونے پر نظر کرنا محض اس غرض سے کہ ہم اس سے منتفع (فائدہ اٹھانے والے) ہوں گے یا ہم پر نفقات وغیرہ کا بار کم پڑے گا بڑی بے غیرتی اور بے حمیتی ہے ؎

چو باز باش کہ صیدی کنی و لقمہ دہی
طفیل خوردہ مشو چوں کلاغ بے پروبال

اس کے علاوہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مالدار عورت نادار مرد کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی، اس کو حقیر اور خادم سمجھتی ہے، اور ناکح کے والدین کا اس پر نظر کرنا کہ ایسی بہو کو بیاہ کر لائیں کہ جہیز بہت سا لائے اور بھی احمق ہیں، ان کی بھی وہی مثل ہے کہ ع

چو موش بر سر پُر کاہن رود تا خورسند

اول تو وہ جہیز ملک بہو کا ہے، کسی کو اس سے کیا، لیکن اگر یہ بھی سمجھا جائے کہ گھر میں رہیگا تو ہمارے بھی کام آئے گا، اس سے اول تو وہی بے حمیتی (بے غیرتی)، دوسرے اگر اس کو گوارا بھی کر لیا جائے تو اس خیال سے کہ ناکح کو تو کسی درجہ میں گنجائش ہے مگر ماں باپ کو کیا، سو آج صاحبزادہ صاحب اپنی رائے سے یا بیوی کے کہنے سے جدا ہو جائیں پس ساری امیدوں پر پانی پھر جائے۔

بچے برابر والوں سے تعلق نکاح قائم کرنے سے ہر قسم کے مفاسد محفوظ رہتے ہیں۔

البتہ اگر منکوحہ کے زیادہ مفلس نہ ہونے پر ایک مصلحت کی تحصیل کیلئے اور ایک مضرت کے دفع کے لئے نظر کی جائے تو وہ نازیبا نہیں، بلکہ مناسب ہے، وہ منفعت تو یہی ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مفلس محض میں دو امر کی کمی ہوتی ہے، ایک سلیقہ کی دوسری سیر چشمی کی، پس سلیقہ کی کمی سے اس میں خدمت کی لیاقت نہیں ہوتی، اور اس سے کلفت ہوتی ہے، اور سیر چشمی کی کمی سے بعض اوقات ضروری خرچ

میں تنگی کرتی ہے جس سے بعض اہل حقوق کے حقوق بھی ضائع ہوتے ہیں، اور بعض مقامات پر خرمستی کی بھی ہوتی ہے کسی مہمان کو روٹی کم دیدی، کسی سائل حاجتمند کو محروم کر دیا، اور اگر وہ بچپن سے کھانے پینے، دینے دلانے، کھلانے پکانے میں رہی ہوگی تو راحت اور انتظام کی زیادہ امید ہے۔ اور وہ مضرّت (نقصان) یہ ہے کہ بعض کو دیکھا گیا ہے کہ دفعتاً مال و دولت کو دیکھ کر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں اور اُچھلنے لگتی ہیں، اور سلیقہ ہوتا نہیں، اس لیے بے تمیزی سے اس کو اُڑانا شروع کر دیتی ہیں، چنانچہ اکثر نو دولتوں کو یا بخل کی بلا میں مبتلا پایا یا اسراف کی، ان میں اعتدال کم ہوتا ہے کیونکہ عادت نہیں تھی، مال سے منتفع ہونے کی جو اعتدال سکھتی۔ اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ خاوند کے گھر سے اس کو محبت نہیں ہوتی، نفرت الگ، بعض الگ کبھی ظاہر یا کبھی خفیہ، عجب کہ جس طرح بن پڑتا ہے اپنے میکے والوں کو بھرنا شروع کر دیتی ہے، اور عمر بھر یہی ترلہ بہتا رہتا ہے، اور اس سے گھر میں بے حد بے برکتی ہوتی ہے، مرد کما کما تھک جائے مگر وہ اُڑانے سے نہیں تھکتی، اس لیے مناسب یہ ہے کہ جب تک ہوسکے اپنے برابر والوں میں تعلق نکاح کرے تاکہ سب مصالح محفوظ رہیں، اور یوں کسی کی طبیعت ہی خاص رنگ کی ہو اس کا ذکر نہیں۔

چھوٹی عمر میں نکاح کر دینے کی خرابیاں

اور ایک کوتاہی بعض قوموں میں یا بعض لوگوں میں یہ ہے کہ اکثر بہت تھوڑی عمر میں شادی کر دیتے ہیں، کہ جس وقت اُن مناکحین کو کچھ بھی تمیز نہیں ہوتی کہ نکاح کیا چیز ہے، اور اس کے کیا حقوق ہوتے ہیں، اس میں بہت سی خرابیاں نکلتی ہیں، بعض اوقات لڑکا نالائق نکلتا ہے جس کو منکوحہ سیانی ہو کر یا اولیاء منکوحہ پسند نہیں کرتے، اب فکر ہوتی ہے تفریق کی، کوئی مسئلہ پوچھتا پھرتا ہے، کوئی بے مسئلہ پوچھے ہی دوسری جگہ نکاح کر دیتا ہے، کوئی تفریق یا خلع[1] کی دیوانی میں درخواست کرتا ہے، کوئی منکوحہ کو اختیارات فسخ حاصل ہونے کی تحقیق بلکہ کوشش کرتا پھرتا ہے، لڑکا ہے کہ برابر سرکشی نہ اس کے حقوق ادا کرتا ہے نہ اس کو طلاق دیتا ہے، غرض ایک بلا ہے جس کا درمان لاعلاج مصیبت!

---

[1] خلع: اگر میاں بی بی میں کسی طرح نبھ نہ ہوسکے تو عورت قاضی شرعی کی عدالت میں کچھ مال دے کر یا اپنا مہر معاف کر کے شوہر سے درخواست کرے کہ میری جان چھوڑ دے اور شوہر اس پر راضی ہو کر اس کے جواب میں کہہ دے کہ میں نے تیری جان چھوڑ دی ہے تو اس سے عورت پر ایک طلاق بائن پڑتی ہے جس کے بعد مرد کو اس عورت کو روک رکھنے کا اختیار نہیں ہوتا، عورت کے اس طرح اپنی جان چھڑانے کو شرع میں خلع کہتے ہیں، البتہ خلع کیلئے قاضی کی شرط ایک لازمی امر ہے۔ (احقر ترمذی غفرلہ)

ہو گئی۔ بعض اوقات دونوں بچپن میں ایک جگہ کھیلتے اور لڑتے ہیں جس کا نتیجہ بعض جگہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے شوہر کی وقعت (قدر و عزت) عورت کے دل میں نہیں ہوتی اور اس کی جو خرابیاں ہیں ظاہر ہیں اور بعض جگہ یہ ہوتا ہے کہ باہم تنافر و تباغض (آپس میں نفرت اور بغض) پیدا ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ ابتدا سے دونوں ساتھ رہے تو شوہر کو کوئی خاص میلان (کیفیت شوقیہ کے ساتھ) نہیں ہوتا جیسا کہ بلوغ کے بعد منکوحہ کے ساتھ ہونا متوقع و مظنون ہے۔ اور اس قلت میلان کا ثمرہ بھی ہر طرح خرابی ہی ہے۔

بڑی عمر کی لڑکی سے چھوٹے عمر کے لڑکے کا نکاح کرنے کے مفاسد اور خرابیاں

اور اس سے اقبح و اشنع (بہت زیادہ برا) یہ ہے کہ بعض جگہ بعض معتاد (مخصوص) نامناسب مصلحتوں سے (قطع نظر زوجین کے مصالح سے) ایسے ہی لڑکا چھوٹا اور لڑکی بہت بڑی۔ اب لڑکی تو پہلے ہی جوان ہو گئی، اور لڑکا ابھی گڑیوں پٹولوں کا بچہ ہے، بلکہ کہیں تو اتنا تفاوت (فرق) ہے کہ لڑکا اس کی گود کے کھلانے کے لائق ہے۔ ان بے عقلوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ آپس میں رشتہ ہو جائے گا یعنی اپنی بہن کی اولاد میں تعلق و ارتباط رہے، مگر یہ نہ دیکھا کہ ان سب تعلقات و ارتباطات کی اصل بنیاد زوجین کا توافق ہے، اور اس صورت میں تو اس کی امید نہیں، چنانچہ ایسے مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ لڑکی میں جوانی کو تقاضا پیدا ہو گیا اور لڑکا کسی قابل ہی نہیں۔ پس یا تو وہ دور کسی سے خراب و خستہ ہو گئی، یا گھٹ گھٹ کر مدقوق (تپ دق میں مبتلا) ہو گئی، اور پھر وہ اگر جوان بھی ہوا تو اس کے جوڑ کا نہیں، ابتدائی تنافر (باہمی نفرت) کا اثر موجود، اور اس پر مستزاد کی وقعت مفقود (شوہر کی عزت ختم)۔

بعض جگہ کم سنی میں منکوحہ (نکاح کرنے سے) یہ ہوا کہ بعد جوان ہونے کے وہ لڑکی اس لڑکے کو پسند نہیں، وہ اپنے لئے کہیں اور تلاش کر لیتا ہے۔ اور اس کی نہ خبر گیری کرتا ہے نہ طلاق دیتا ہے۔ خبر گیری کی نسبت تو عذر کر دیتا ہے کہ مجھ کو خبر ہی نہیں کہ میرا نکاح کب ہوا، جنہوں نے کیا وہ ذمہ دار ہیں، اور طلاق دینے کو عرفاً عار سمجھتا ہے، پس وہ عورت "لا ذات بعل ولا مطلقۃ"[1] کی مصداق ہو جاتی ہے۔ کیا ان خرابیوں سے بچنے کی کوشش کرنا ضروری نہیں؟

بعد بلوغ اور درستی عقل کے نکاح میں مصلحت ہے

جس کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ بعد بلوغ اور درستی عقل کے نکاح کیا جائے تاکہ جس کا معاملہ ہے وہ اس کو سمجھ لے۔

---

[1] یعنی وہ عورت ایک طرف سے دھتکاری گئی اور دوسری طرف سے چھوڑ دی گئی۔ ۱۲

بقولہ علیہ السلام مَا آتَاکَ مِنْ غَیْرِ اِشْرَافِ نَفْسٍ فَخُذْہُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْہُ نَفْسَکَ (کما قال)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کچھ تمہارے پاس بغیر اشراف نفس کے آجاوے لے لو اور جو تمہارے پاس نہیں آتا نفس کو اس کے پیچھے مت لے جاؤ ۱۲

عورت صرف سلیقہ سے اپنے شوہر کی خدمت نہیں کرسکتی بلکہ اس کے لیے اس میں خدمتگزاری وغیرہ کا مادہ ہونا ضروری ہے۔

اور اگر یہ مقصود ہو کہ ایسی عورت سلیقہ دار ہوگی ہم کو راحت زیادہ پہنچائے گی، سو خوب سمجھ لو راحت رسانی کے لئے صرف سلیقہ کافی نہیں، بلکہ اطاعت وخلوص وخدمت گزاری کے مادہ (جذبہ) کی اس سے زیادہ ضرورت ہے، اور سلیقہ میں کچھ کمی بھی ہو تو اس کو برداشت کر لیا جاتا ہے، اور گو کسی قدر وقتی کلفت ہوتی ہے لیکن وہ بہت جلد رفع ہوجاتی کہ اس کا اثر باقی نہیں رہتا، اور اگر نرا سلیقہ ہوا اور وہ اوصاف نہ ہوں تو اول تو وہ خدمت ہی کیوں کرے گی!

عورتوں کو انگریزی تعلیم دینے سے ان میں بہت سے اخلاق ذمیمہ پیدا ہوجاتے ہیں۔

کیونکہ تجربہ ہے اس تعلیم جدید کا اثر خاصکر اگر عورتوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ وہ فطرۃً ہی ضعیف العقل وضعیف القلب (کم عقل اور کمزور دل) ہوتی ہے جس کے لئے زیادہ تر بادرت آثر (اثر قبول کرنا) لازم ہے، یہ ثابت ہوا ہے کہ اس سے تکبر وخود غرضی وخود رائی و بے باکی و آزادی و بے حیائی وچالاکی ونفاق وغیرہ اخلاق ذمیمہ (بُرے اخلاق) جو تمام اخلاق ذمیمہ کی جڑ ہیں پیدا ہوتے ہیں، پس جب ان کا دماغ تکبر و نخوت سے بھرے تو وہ تمھاری خدمت ہی کیوں کرے گی! جس سے تم کو راحت پہونچے،

تعلیم یافتہ عورت بجائے شوہر کی خدمت کرنے کے اس سے خدمت لینے کی طالب ہوگی۔

بلکہ برعکس بوجہ خود غرضی کے وہ خود تم ہی سے اپنے حقوق کا علی الدوام مطالبہ کرے گی جس سے تمھاری عافیت (سلامتی) تنگ ہوجائے گی، غرض وہ خود تم ہی سے اپنی خدمت چاہے گی، اور اگر تم اس سے وہ خدمتیں چاہو گے بھی جو ایک شریف سادہ طبیعت کی عورت اس کو اپنا فخر سمجھتی ہے تو وہ تم کو ضابطہ کا جواب دیں گی کہ یہ کام ہمارے ذمہ نہیں، بلکہ جو اس کے ذمہ بھی قاعدہ سے ہوگا، اس میں بھی خلاف تہذیب ہونے کا یا محل صحت (صحت خراب کرنے) کا عذر کرکے ٹکا سا جواب دیں گی، اور اپنے حقوق تم سے پورے وصول کریں گی

تنخواہ تم سے کل رکھوا لیں گی، اور تین یا پانچ روپے منظور کر دو گے تو عدالت تک کھینچیں گی، اور اگر کہو کہ یہ بہت کم ہوتا ہے تو جواب میں عرض کریں گی کہ پھر وہ تعلیم یافتہ نہیں ہے، اور اگر یوں کہو ہم ایسی تعلیم یافتہ نہیں چاہتے تو خیر وہ بے شک اس قدر خطرناک نہ ہوگی، لیکن آزادی، بے حیائی، مکر و فریب، چالاکی، اور نفاق تو تمغۂ مشترک ہے سب کا مشترک اعزازی نشان ہے جو پوری دور دورہ تعلیم سب میں ہے، تو اس کے خطرات بھی ایک شریف اور غیور آدمی کے لئے کچھ کم نہیں ہو سکتے۔

اگر عورت میں سب ہنر ہوں اور حیا نہ ہو تو وہ حقیقی معنوں میں عورت نہیں

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر عورت میں کوئی ہنر نہ ہو لیکن حیا ہو تو وہ اور کچھ نہیں مگر عورت تو ہے، اور اگر سب ہنر ہوں لیکن حیا نہ ہو تو وہ سب کچھ ہے مگر عورت نہیں، اور نکاح کے مصالح کے لئے چاہئے عورت، جب وہ عورت ہی نہیں تو پھر اس سے مصالح نکاح کیسے حاصل ہوں گے پھر نکاح سے کیا فائدہ؟ بلکہ مصالح کے لئے جو مہذب تم دکھلاتے ہو تو آب ریزی اور شہوت کی ہوس پوری کرنے کے لئے اہل فرانس نے بہت سے طریقے ایجاد کر دیئے... اُن پر کفایت کرو، رہی اولاد سو وہ اختیاری سے خارج ہے، اس کی فکر ہی کیا؟ پھر وہ ہر بے ہنر عورت سے بھی حاصل ہو سکتی ہے، اس کے لئے اتنی کیوں اتنی جستجو اور تدوش ابکار ہے، اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ سب مصالح ایک ہی شخص سے حاصل ہوں، غرض نکاح میں مصالح نکاح کی رعایت سب سے مقدم ہے جو عورت کی حیا کے ہوتے ہوئے سب پر دہے۔

عورتوں میں دینی تعلیم کا ہونا ضروری ہے

البتہ اگر عورتوں میں دینی تعلیم ڈھونڈی جائے تو وہ علوم دینیہ کی تعلیم ہی ہوا نسان کو مہذب کامل بنا دیتی ہے بشرطیکہ اس پر عمل کرے، اور سبب یہ ہے کہ جب علم دین حاصل ہوتا ہے تو کبھی نہ کبھی عمل کی بھی توفیق ہو ہی جاتی ہے، سو اگر بے عمل سے فرضاً، فرض کرو، کچھ کلفت بھی ہوئی تو وہ دائمی نہ ہوگی، عارضی ہوگی، جو ایک منٹ میں ختم ہو سکتی ہے، غرض اصل تعلیم تو بالاہتمام تعلیم دینی ہے۔

دینی تعلیم سب ہنروں کی جڑ ہے

اور اس کے اساس التہذیب (تہذیبوں کی جڑ) ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کا خوف پیدا ہوتا ہے، اور جس کے قلب میں خدا کا خوف ہوگا وہ اس قدر جھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھے گا کہ اس سے احتمال ہی نہیں ہوگا کہ وہ کسی کا ذرا حق ضائع کرے، یا کسی کو اس سے تکلیف پہنچے، یا وہ اپنی غرض کو دوسرے کے حق پر

مقدم کرے یا کسی کی بدخواہی کرے یا کسی کو دھوکا دے، اور اس سے بڑھ کر کونسی تہذیب ہوگی؟

آجکل کی تہذیب تعذیب ہے: اور جس کا نام آجکل تہذیب رکھا گیا ہے جس کا حاصل تصنع و تلبیس (خداع و نفاق (بناوٹ، اپنا عیب چھپانا، دھوکہ دینا اور منافقت) ہے، وہ سراسر تعذیب (عذاب دینا) ہے، جس کا پایا جانا عورت میں اس کو اس شعر کا مصداق بنا دیتا ہے ؎

زنِ بد در سرائے مردِ نکو ٭ ہم دریں عالم است دوزخِ او

(بری عورت نیک مرد کے گھر میں بعینہ اس عالم میں اس کے لئے دوزخ ہے)

اس تقریر سے بعض اجزاء تعلیم نسواں کے متعلق بھی حل ہو گئے، اور مکمل بحث اس کی ایک مستقل تقریر میں بندہ نے لکھی ہے، جو القاسم شوال ۱۳۳۲ھ کے پرچہ میں شائع بھی ہو چکی ہے،

عورتوں کو علم دین گھر پر ہی پڑھانا چاہئے: جس کی روح دو امر ہیں، ایک یہ کہ ان کو صرف علم دین پڑھایا جاوے، دوسرے یہ کہ یہ تعلیم خاص طرز سے متفرق طور پر گھروں میں ہونا چاہئے، مدارس کے طرز پر مجتمع طور پر نہ ہونا چاہئے، کہ شریعت نے بلا ضرورت شدیدہ ان کے اجتماع و خروج عن البیوت (گھروں سے نکلنے) کو پسند نہیں کیا، اور واقعات نے بھی اس کے مفاسد ایسے دکھلا دیئے کہ بجز متعامی (قصداً اندھا بننے والے) کے اعمیٰ (اندھے) نے بھی ان کو دیکھ لیا، اور راز اس میں یہ ہو کہ اس اجتماع کو جس درجہ کی نگرانی کی ضرورت ہے وہ عورتوں سے بن نہیں پڑتی، کہ وہ خود مستتر (پردہ میں رہنے والی) ہیں، اور مردوں کے ذمہ میں وہ نگرانی بھی نہیں رہی، کہ اس نگرانی کا حاصل بھی عدم اختلاط بالرجال (مردوں سے میل جول نہ رکھنا) تو تھا ہی، تو نگرانی تو کم اور خروج عن البیت کے بعد مواقع فساد میں وسعت ہوگئی، دوسرے معلم اگر شریف و متدین و شفیق و ذی اثر و باوجاہت و بارعب ہو تو اس کا نوکر رکھنے کے لئے میسر ہونا قریب بہ محال اور جو نوکر رکھنے کے لئے مل سکتی ہے وہ ان اوصاف سے معریٰ (خالی) جس کی صحبت مردوں سے زیادہ خطرناک، خیر یہ جملہ معترضہ استطراداً (درمیان میں) بسبیل تذکرہ آ گیا، اصل بحث یہ ہے کہ منکوحہ میں تعلیم پر نظر کرنا کیسا ہے؟

تعلیم یافتہ ہونے سے عورت کا بے علم ہونا اچھا ہے: اصل بات یہ ہے کہ اگر اس میں علم دین ہو تو نور علی نور ہے، اور اگر علم دین نہ ہو تو اس کا بے علم ہونا یقیناً اس کے نئے علوم کے عالم ہونے سے اچھا (محفوظ تر ہے) اور بے خطر ہے، کیونکہ بے علم میں اگر اخلاق حمیدہ نہ ہوں گے تو وہ اخلاق رذیلہ جو جڑ ہیں تمام اخلاق رذیلہ اور افعال ذمیمہ کی وہ بھی نہ ہوں گے، تو اس معترضہ کا مضمون ہاتھ آ جائیگا.

ع "ترا بخیر امید نیست و بد مرساں"

(یعنی مجھے آپ سے بھلائی کی توقع اور امید تو نہیں ہے، لیکن بدی بھی تو نہ پہونچاؤ)

نکاح کے لئے اخبارات میں ناکح و منکوحہ کی اشتہار بازی مذموم ہے۔

آجکل تو یہ طوفان ہو گیا کہ اشتہاری دواؤں کی طرح ناکح و منکوحہ کے اشتہار بھی اخباروں میں چھپنے لگے ... کبھی ناکح صاحب اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ جائداد یہ نوکری یہ کمالات ہیں، اور ہم کو ان اوصاف کی منکوحہ چاہئے جس کو منظور ہو ہم سے خط و کتابت کرے، پھر اس کے جواب میں کوئی بی بی صاحبہ اخبار میں یا خاص طور پر جواب لکھتی ہیں اور اپنا جامع اوصاف اور حسین ہونا اپنے بے شرم قلم سے لکھتی ہیں، اور کچھ شرطیں کرتی ہیں، بس اسی طرح خط و کتابت ہو کر کبھی سودا بن جاتا ہے کبھی نہیں بنتا، کبھی نکاح سے پہلے ہی دو چار ملاقاتیں ہو جاتی ہیں، تاکہ تجربہ و بصیرت کے بعد نکاح ہو، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ... کیسی آفتیں نازل ہو رہی ہیں اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ (اے اللہ ہم تجھ سے فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو پوشیدہ ہیں)۔

عاقلہ بالغہ کا بلا ضرورت از خود نکاح کرنا مذموم ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ عاقلہ بالغہ خود اپنے نکاح کی بات چیت ٹھہرا لے اور ایجاب و قبول کرلے تو نکاح منعقد ہو جائے گا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا بلا ضرورت و بلا مصلحت معتدبہا ایسا کرنا کیسا ہے، سو یہ امر نہ شرعاً محمود و پسندیدہ ہے نہ عقلاً، شرعاً تو اس لئے کہ تخریج زیلعی میں دارقطنی و بیہقی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کیا ہے:

لَا تُنْکِحُوا النِّسَاءَ اِلَّا مِنَ الْاَکْفَاءِ وَلَا یُزَوِّجُھُنَّ اِلَّا الْاَوْلِیَاءُ وَلَا مَھْرَ اَقَلَّ مِنْ عَشَرَۃِ دَرَاھِمَ (دارقطنی و بیہقی)	"یعنی عورتوں کا نکاح نہ کرو مگر ان کے کفو میں اور ان کی شادی نہ کریں مگر ان کے ولی کی موجودگی میں، اور ان کا مہر دس درہم سے کم مقرر نہ کرو۔"

نیز بعد دوسری حدیث کے:

اَلْاَیِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِھَا مِنْ وَلِیِّھَا (رواہ مسلم و ابوداؤد و الترمذی والنسائی و مالک فی المؤطا لا یزوجھن)۔	"یعنی بالغ عورت اپنے نکاح کے معاملہ میں اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے"

کرنے کا لینا جو نفی تو نہیں ہے جو کہ مستلزم ہو عدم صحت کو لیکن نہی بھی تو علل ہی کے واسطے ہے اور کوئی باطنی راز ہے جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توسط اولیا کا تجویز فرمایا ہے، اگرچہ ہم کو اس کی لِم بھی معلوم نہ ہو

بزرگوں کے تجویز کردہ نکاح میں آثار برکت ہوتے ہیں:

مگر ہمارے پاس دلیل انی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات اس میں ضرور ہے، اور وہ دلیل انی یہ ہے کہ ہم نے جو آثار برکت کے بزرگوں کے تجویز کئے ہوئے نکاح میں دیکھے ہیں وہ اس نکاح میں نہیں دیکھے جو براہ راست خود زوجین کر لیتے ہیں، باقی خاص خاص مواقع ضرورت مستثنیٰ ہوا ہی کرتے ہیں، اور عقلاً اس کو محمود نہیں کہا ظاہر ہے کہ بلا ضرورت شدیدہ خود نکاح کی بات چیت یا خط و کتابت کرنا دلیل اسکی وقاحت (بے حیائی) کی ضرور ہے

وَاِذَا فَاتَكَ الْحَيَاءُ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ

(یعنی جب تم میں حیا کا مادہ نہ رہا تو پس جو چاہے کرو ع بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن) کے موافق قلیل الحیا آدمی سے جو رذیلہ بھی صادر ہو جائے بعید نہیں، عاقل آدمی کو ایسی عورت سے بچنے کے لئے یہی علامت کافی ہے کہ وہ بے حیا ہے،

متقی آدمی کو بازاری عورت سے نکاح کرنا خلاف احتیاط ہے

اس جگہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ جو لفنگے آدمی بازاری عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں گو نکاح بھی ہو جاتا ہے، اور بلا وجہ اس پر بدگمانی بھی نہ چاہئے کہ یہ اب بھی بے قید و آوارہ ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ متقی آدمی کے لئے خلاف احتیاط ضرور ہے، اسی واسطے شریعت غرا نے ایک درجہ اس کو نامناسب قرار دے کر قانون مقرر فرمایا ہے،

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (نور آیت ۳)

(یعنی زانی نکاح بھی کسی کے ساتھ نہ کرے بجز زانیہ یا مشرکہ کے اور اسی طرح زانیہ کے ساتھ اور بھی کوئی نکاح نہ کرے بجز زانی یا مشرک کے اور یہ (یعنی ایسا نکاح) مسلمانوں پر حرام اور (موجب گناہ) کیا گیا ہے ۱۱)

گو عموم نصوص و اطلاق دلائل سے یہ تحریم نفی کے درجہ میں نہیں کہ نکاح منعقد ہی نہ ہو بلکہ نہی کے درجہ میں ہے، اور نہی بھی بالذات نہیں کہ یہ نکاح معصیت ہو بلکہ لغیرہ لعارض لازم

ونوشیت کے ہے، اور اسی لئے یہ تحریم اس صورت میں ہے کہ اس نے توبہ نہ کی ہو، اور توبہ کی صورت میں یہ تحریم وغیرہ بھی نہیں، لیکن جب کہ اس کی ناپسندیدگی کا مدار اس کا زانیہ ہونا ہے، سو وہ جہاں یقینی ہوگا وہاں ناپسندیدگی اقوی درجہ میں حرمت ہوگی، اور جہاں محتمل ہوگا وہاں ناپسندیدگی تحت درجہ خلاف اولیٰ میں ہوگی، اور حدیث:

تَخَيَّرُوْا لِنُطَفِكُمْ | میں اس کی صریح تائید ہے، کہ کسی نبی کے واسطے اللہ تعالیٰ نے ایسی عورت بھی پسند نہیں فرمائی جو اس میں کبھی بھی ملوث ہوئی ہو گو توبہ بھی کرلی ہو، اور یہی معنی ہیں اس آیت شریفہ کے:

وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ ..... | (پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں)

البتہ اگر توبہ خالص کرے جس سے وہ احتمال نہ رہے اور اس کو کوئی قبول نہ کرے تو اس کی عفت کی حفاظت کے لئے یا جبکہ اس شخص کو اس سے تعشق (عشق و محبت) ہو تو یہ محل اس سے مستثنیٰ ہے بعموم قولہ علیہ السلام:

لَمْ يُرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلُ النِّكَاحِ

نکاح سے متعلق بعض ایسی کوتاہیاں جن کا تعلق مسائل فقہیہ سے ہے

اب نکاح کے متعلق بعض وہ کوتاہیاں مذکور ہوتی ہیں جن سے زیادہ تر مسائل فقہیہ کا تعلق ہے

خفیہ نکاح خلاف سنت ہے | ان میں سے ایک کوتاہی گو درجۂ ترک واجب میں نہیں یہ ہے کہ بعض لوگ بمصلحت نفسانیہ خفیہ نکاح کرلیتے ہیں، جس میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ یہ سنت کے یقیناً خلاف ہے

حدیث میں مصرح ہے:

اَعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ .... | اس نکاح کا اعلان کرو .....

اور جن ائمہ کے نزدیک اعلان شرط نکاح ہے ان کے نزدیک ایسا نکاح منعقد ہی نہ ہوگا، تو ان کے نزدیک واجب کا بھی ترک ہے جو ترک سنت سے بھی اشد ہے، اور گو ہمارے نزدیک اس نکاح کا انعقاد ہو جاتا ہے جبکہ اس میں ضروری شہود (گواہ) ہوں، یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت، مگر تاہم علماء کے اختلاف میں بلا وجہ پڑنا خود ناپسندیدہ ہے خصوص معاملہ فروج (شرمگاہ) میں کہ اس میں (شرمگاہ میں) اصل حرمت ہے، تو یہ دوسری خرابی ہوگی، اور تیسری خرابی یہ ہے کہ ایک مفسدہ عظیمہ (بہت بڑی خرابی) کی طرف مفضی (پہنچانے والا) ہے، یعنی یہ طریقہ اگر معمول ہو

کے مصداق بن رہے ہیں۔ اور وہ امر جو یہ ہے کہ نکاح بلا شہود تنہائی میں اس شرط پر کر لیتے ہیں کہ صحبت وغیرہ کچھ نہ ہوگی، خالی نکاح کر لیتے ہیں، تاکہ تنہائی میں بیٹھنا، ایک دوسرے کو دیکھنا، باہم ہنسنا بولنا یہ امور جائز ہو جائیں اور صحبت سے مجتنب رہیں، تو ان لوگوں کے اعتقاد میں گویا نکاح کے دو درجے ہیں، ایک وہ جس سے صحبت حلال ہو جائے اس درجہ کے تحقق و وجود کے لئے تو شہود شرط ہیں، اور دوسرا درجہ وہ جس سے صحبت حلال نہ ہو لیکن خلوت و مس و نظر و تنہائی و چھونا اور دیکھنا وغیرہ حلال ہو جائیں اس درجہ کے تحقق کے لئے شہود شرط نہیں، صرف مرد و عورت کا بجائے قبول اور تراضی یا باہم رضامندی ہی کافی ہے، اس جہل میں ایک بدعت، ضلالت و گمراہی کی بھی آمیزش ہے، یہ تصرف فی حکم الشرعی و شریعت کے حکم میں دخل اندازی ہے، نیز یہ لوگ ایسے نکاح کے معاصی لازمہ کو معاصی بھی سمجھتے تھے، اور اس نکاح کے بعد خلوت وغیرہ کو حلال سمجھنے لگے، معصیت کو حلال سمجھنا کتنی بڑی سخت بات ہے، سو خفیہ نکاح میں اس بلا کے لئے بھی گنجائش اور دلیل پکڑنا یہ بہت بُری بات ہے۔ اور یہ سب احتمالات وہمی یا اختراعی نہیں ہیں بلکہ یہ سب واقعات معلوم ہوئے ہیں۔

خفیہ نکاح کے دعوے سے عورت پر صریح ظلم ہو سکتا ہے۔

نویں خرابی یہ ہو کہ اس دعوے کے ذریعہ سے کسی ایسی عورت پر ظلم ہو سکتا ہے جس سے یہ شخص نکاح کی خواہش رکھتا ہو اور وہ قبول نہ کرتی ہو پھر کسی وقت اگر اس کو شیطان اغوا کر دے تو دو شخصوں کا نام لے کر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُن کے سامنے اس سے خفیہ نکاح ہو گیا تھا، اور اس دعوے کے بعد دو جھوٹے گواہوں کی اعانت و مدد سے اس پر جبر و زیادتی کرے اور عام لوگ اس شبہ میں خاموش رہیں کہ نکاح عورت پر قبضہ کرنے کا حق ہے ہم کیوں تعرض کریں۔

خفیہ نکاح کی دسویں خرابی

دسویں خرابی یہ کہ کسی منکوحہ عورت کی نسبت بھی دعویٰ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کے قبل کی تاریخ میں ہمارے ساتھ خفیہ نکاح ہو چکا تھا، چنانچہ ان ایام میں ایک ایسا ہی حادثہ قونیا (ایک شہر) میں واقع ہوا ہے جس کے واقعات سن کر رونگٹے کھڑے ہوتا ہے۔

خفیہ نکاح کے انسداد کے لئے شریعت نے اعلانِ نکاح کا حکم فرمایا ہے

اور عجب نہیں کہ انہی مفاسد کے انسداد کے لئے شریعت نے اعلان کا حکم فرمایا ہو۔ اور بعض ائمہ نے اس حکم کو انہی وجوہ سے وجوب و واجب ہونے پر محمول کیا ہو، مگر اکثر علماء نے سنیت (سنت ہونے)

پھر اس لئے محسوس کیا ہے کہ:

بعض اوقات بوجہ عذر شرعی خفیہ نکاح جب تو ہوگا۔

بعض اوقات عذر شرعی سے بھی اس کی ضرورت واقع ہوتی ہے مثلاً ایک بیوہ عورت۔ نکاح ثانی کسی سے کرنا چاہتی ہے، مگر اعلان میں اپنے جاہل ورثہ سے اس کو اندیشۂ عظیم یا ہلاک ہے، دوسری جگہ جاکر نکاح کرنے میں سفر میں کوئی محرم[1] نہیں ہے، اس لئے اس نے خفیہ نکاح کرلیا، پھر اسی کے ساتھ اس میں دوسری جگہ چلی گئی، اسی لئے میں نے شروع مضمون میں بمصلحت نفسانیہ کی قید لگائی تھی۔

نکاح خواں کو ایجاب کے وقت منکوحہ کا بلند آواز سے نام لینا ضروری ہے

ایک کوتاہی وہ بھی خفیہ نکاح کے ساتھ ملحق (ملی ہوئی) ہے یہ ہے کہ اکثر جاہل نکاح خواں ایجاب کے وقت منکوحہ کا نام بہت ہی آہستہ آواز سے لیتے ہیں، صرف ناکح تو سن لیتا ہے، لیکن آس پاس والے بالکل نہیں سنتے، تو ایسا نکاح بھی بلا شہود ہوگا، کیونکہ شہود کا صرف مجلس نکاح میں حاضر ہونا کافی نہیں، بلکہ صحت نکاح کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ ایجاب و قبول کے الفاظ کو بھی صاف صاف سنیں، سو جب انھوں نے منکوحہ کا نام ہی نہ سنا تو یہ شرط صحت کی نہیں پائی گئی، اس واسطے نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ نکاح خوانوں کو اس کا بہت لحاظ رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ناواقفی سے ایسا کریں تو اہل مجلس کو خصوصاً ناکح و منکوحہ کے سرپرستوں کو چاہئے کہ نکاح خواں سے دوبارہ ایجاب و قبول کرائیں، اور تاکید کریں کہ بلند آواز سے منکوحہ کا نام لے۔

بضرورت شرعیہ عورت کا نام مردوں کی مجلس میں لینا شرم و حیا کے خلاف نہیں۔

بعض لوگ اپنے نزدیک اس میں بڑا حق شرم کا ادا کرتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اوّل تو بضرورت شرعیہ عورت کا نام مردوں کی مجلس میں ظاہر کرنا کچھ شرم کے خلاف نہیں، پھر مجلس کے اکثر حاضرین اہل تعلق ہوتے ہیں جن کو منکوحہ کا نام بھی معلوم ہوتا ہے، البتہ اس معلوم ہونے سے نکاح منعقد نہیں ہوسکتا، تاوقتیکہ صیغۂ ایجاب میں اس کا نام نہ سنیں، سو جب معلوم ہے تو نکاح خواں کی زبان سے سننے میں کونسی نئی بات ہوگی جو موجب شرم ہے، علاوہ اس کے اگر نام سننا بے حیائی ہے تو نکاح صحیح نہ ہونے کی صورت میں جو عمر بھر بلا نکاح استمتاع میں مبتلا رہیں گے کیا اس سے بڑھ کر بے حیائی نہیں ہے؟ دیکھا تو یہی جاتا ہے کہ شریعت کو چھوڑ دینے سے عقل بھی چھوٹ جاتی ہے۔

---

[1] عورت کا قریبی رشتہ دار جس سے نکاح ناجائز ہو ۱۲

اِصلاحِ بعض اغلاط
متعلق بہ تحلیلِ حرام و تحریمِ حلال

اب بعض کوتاہیاں (تحلیل بعض محرمات (بعض حرام چیزوں کو حلال کرنے) اور تحریم بعض محللات (بعض حلال چیزوں کو حرام کرنے) کی مذکور ہوتی ہیں :

یعنی احکام شرعیہ کی ناواقفی یا تجاہل سے بعض ایسی عورتوں سے جو کہ حرام ہیں نکاح کر لیا جاتا ہے، اور بعض ایسی عورتوں سے جو کہ حلال ہیں نکاح کرنے کو ناجائز سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ خبر متواتر سے سنا گیا ہے کہ ایک مدعی تحقیق نے اپنی علاتی (سوتیلی) بہن سے نکاح کیا، لوگوں نے جو ملامت کی کہ یہ تو بنص قرآنی حرام ہے، کما قال اللہ تعالیٰ :

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ ، (النساء، آیت ۲۳)	(تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں)

تو جواب دیا کہ آیت میں اخوت سے مراد حقیقی بہنیں ہیں یہ علاتی بہن کو شامل نہیں، (استغفر اللہ من الجرأۃ فی الدین (میں اللہ تعالیٰ سے دین کے معاملہ میں ایسی جرأت کرنے سے پناہ مانگتا ہوں) اگر کسی شخص کو بلا دلیل شرعی ایسی تقییدات کا اختیار حاصل ہو تو دوسرا شخص یہ کہہ دے گا کہ علیکم میں ضمیر خطاب کی ہے، اور اصل مقتضا خطاب کا مخاطب کا موجود عند التکلم (بولنے کے وقت موجود) ہونا ہے، اور ہم نزول آیت کے وقت موجود تھے نہیں، پس اس کے مخاطب خاص اسی زمانے کے حضرات ہیں، ہم کو یہ خطاب ہی نہیں، اور اس لئے وہ شخص حقیقی بہنوں کو بھی حلال سمجھے، اسی طرح (امہات و بنات (ماؤں اور بیٹیوں) کو بھی حلال سمجھے، تو

اس متجری فی الدین (دین میں جرأت کرنے والے) سے سوال ہے کہ تمھارے پاس اس شخص کے دعوی کے ابطال کی ایسی کونسی دلیل ہے جو تمھارے فعل کے کرنے والے کے پاس نہ ہو؟ اگر تمھاری وہ دلیل اس کے مقابلہ میں کافی ہے تو تمھارے منکر کی بھی دلیل تمھارے مقابلہ میں کافی ہے اور اگر تمھارے منکر کی دلیل کافی نہیں تو تمھاری دلیل بھی کافی نہیں۔

اجتہاد بالکل عام ہو تو شریعت کا ایک جزو بھی باقی نہیں رہ سکتا۔

حضرت اجتہاد ایسا عام اور نعمت بازاری نہیں ہے ورنہ شریعت کا ایک جزو بھی باقی نہ رہے، اس کے خاص شرائط ہیں، اس کے خاص محل (مواقع) ہیں جہاں اجتہاد مجتہد جامع شرائط کا مقبول ہے اور اس محل کے غیر میں کسی کا اجتہاد مقبول نہیں، اور محض حرف شناسی (کتابی علم) سے اس کی اہلیت و معرفت نہیں ہو سکتی ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(یعنی ہر خوب صورت شخص کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو، اور ہر وہ شخص جو آئینہ بناتا ہو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو)

ایک مدعی اجتہاد کا جد حقیقی کی منکوحہ سے فتوی جواز نکاح

ایک دوسرے مدعی اجتہاد کا فتوی منقول دیکھا گیا کہ جد حقیقی (حقیقی دادا) کی منکوحہ (بیوی) سے نکاح حلال کر دیا گیا اور حجت یہ نص قرآنی پیش کی:

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ (النساء آیت ۲۲)	(اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ (دادا یا نانا) نے نکاح کیا ہو)

تو جواب میں کہہ دیا کہ یہ آباء (والدین) کے منکوحات کے لئے ہے، اور آباء میں اجداد (دادا) داخل نہیں، نعوذ باللہ من الاجتراء فی القرآن المبین (ہم قرآن پاک میں اپنی رائے دینے سے اللہ تعالے کی پناہ مانگتے ہیں)۔

تفسیر بالرائے کی چند سنگین مثالیں

یہاں بھی مثل سابق کے معروض ہے کہ اگر ایسی تفسیر مقبول ہو دیں تو دوسرا شخص کہہ دے گا کہ جدہ (دادی) سے نکاح حلال ہے، کیونکہ قرآن سے امہات (ماؤں) کی حرمت ثابت ہے اور امہات میں

جدات (دادیاں نانیاں) نہیں تو اس حدیث کے پاس بجز اطلاق لفظ امہات کے (لفظ امہات کے اطلاق کے علاوہ) اشتمال جدات کی کوئی دلیل ہو، سو ویسا ہی اطلاق لفظ آباء کا اشتمال اجداد (لفظ آباء کا دادا نانا کو شامل ہونے) ... کی بھی دلیل ہے، اور جمع بین الاختین (دو بہنوں کا جمع کرنا) کی آفت تو حد احصار (حد شمار) سے خارج ہے، یعنی بے شمار مواقع پر جہلا اس کا ارتکاب کر رہے ہیں، اور گو وہ اس کے حلال ہونے کا شاید شدت سے دعویٰ نہ کرتے ہوں، لیکن بیباکی، استخفاف (ہلکا سمجھنا) اور اصرار اور اس کو عیب نہ سمجھنا اور منع کرنے والوں کو بے پروائی سے جواب دینا بلکہ ان سے رنج و نزاع (جھگڑا) کرنا ایسا ہی ہے کہ اس کو استحلال (حلال سمجھنا) کہہ سکتے ہیں، جس میں زوالِ ایمان (ایمان جاتے رہنے) کا قوی اندیشہ ہے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک صاحب فارغ عن الدرسیات کہلا او اکثر بار درسیات کی تحصیل یا بیشتر کتابوں کے فارغ التحصیل) کی نسبت اپنے حقیقی ہمشیرزادہ کی دختر (حقیقی بہن کی پوتی) پر زنا کا وقوع ہوا اور ان کو اس کی حلت (حلال ہونے) کا بھی احتمال ہوا، مگر کچھ تردد (شک) ہونے سے مجھ سے سوال کیا بجز اس کو حرمت کا فتویٰ دیا گیا، یہ بھی حیرت انگیز قصہ ہے، قرآن مجید میں بنات الاخت (بہن کی بیٹیاں) اپنے اطلاق سے اجماعاً بنت ابن البنت (نواسے کی بیٹی) کو بھی شامل ہے، فقہاء نے اس کے محرمات (نکاح کے لئے حرام ہونے والیوں) میں سے ہونے کی تصریح کی ہے، پھر ان کو گنجائش کا احتمال ہوا، اللّٰہم احفظنا من الزیغ والہویٰ۔

یہ سب خرابیاں قلت مناسبت علم دین وغلبہ اتباع آراء و ہویٰ (علم دین سے تعلق کی کمی اور اپنی رائے و نفسانی خواہش کے غلبہ کی وجہ) سے ہیں، اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْنَا عَلَی الْحَقِّ اِلَی الْمَوْتِ وَالْیَقِیْنِ الْقَوِیِّ (اے اللہ ہمیں مرتے دم تک حق پر اور کامل یقین پر ثابت قدم رکھ)۔

حرمت مصاہرت سے متعلق چند کوتاہیاں

حرمت مصاہرت (رشتہ دامادی) کے متعلق بعض واقعات ہیں: بعضے لوگ ایک عورت سے ایک مدت تک ناجائز تعلق رکھتے ہیں، جب وہ دل سے اتر جاتی ہے اور اس درمیان میں اس کی کوئی لڑکی سیانی ہو جاتی ہے اس کی طرف میلان ہوتا ہے، اور اپنے نزدیک گناہ سے بچتے ہیں کہ اس لڑکی سے نکاح کر لیتے ہیں، حالانکہ حرمت مصاہرت کے قاعدہ سے اس شخص پر اطلاق مدلول :-

وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِہِنَّ	(اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں جو کہ تمہاری پرورش میں رہتی ہیں اُن بیبیوں سے کہ

(النساء آیت ۲۳) | کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو۔

میں داخل ہونے سے حرام ہے، اور بعضے دونوں ماں بیٹی کو استعمال میں رکھتے ہیں، حالانکہ بیٹی سے منقطع (علیحدہ) ہونے کے بعد اس کی ماں سے نکاح تک حرام ہو گیا، اور بلا نکاح تو دو حرمتیں جمع ہو گئیں، ایک وطی بلا نکاح (بغیر نکاح کے ہمبستری) دوسری امہات نسائکم سے استمتاع،

بیوی کی ماں یا بیوی کی بیٹی پر شہوت سے ہاتھ پڑ جانے سے بیوی حرام ہو جاتی ہے۔

بعضے عمداً تو اسباب حرمت کے مرتکب نہیں ہوتے، مگر احیاناً غلطی سے بیوی کے دھوکہ میں اس بیوی کی ماں پر یا اس بیوی کی بیٹی پر شہوت سے ہاتھ پڑ جاتا ہے اور بعد تنبہ کے فوراً دست کش ہو جاتا ہے، لیکن اس سے بھی اس شخص کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے، اس میں بہت لوگوں کو کلام ہوتا ہے کہ عمداً (جان بوجھ کر) تو اس فعل کا ارتکاب نہیں کیا گیا،

مذکورہ حرمت کا مدار سزا نہیں بلکہ اس فعل کا خاصہ ہے۔

سو یہ کلام کرنا غلطی ہے، اس حرمت کا مدار سزا نہیں ہے جو یہ سوال کیا جائے بلکہ جس طرح بعض اعیان (چیزوں) میں بعض خواص ایسے ہوتے ہیں کہ بلا قصد (بغیر ارادہ) کے بھی اُن کے تناول سے وہ خواص ظاہر ہوتے ہیں، جیسے سنکھیا کھانے سے ہلاک ہو جانا اور اس کو اطباء اور کبھی بعض عوام بھی جانتے ہیں، اسی طرح بعض افعال میں بھی بعض خواص ایسے ہوتے ہیں کہ بلا قصد ان کے صدور سے وہ خواص واقع ہوتے ہیں اور اس کو شارع علیہ السلام اور ماہران شریعت بارشاد شارع جانتے ہیں، پس ان اسباب حرمت مصاہرت میں یہ خاص اسی قبیل (قسم) کا ہے، البتہ آخرت میں جو مضار (نقصانات) بعض افعال کے واقع ہوں گے وہ سزا ہیں، وہ عمد و قصد (جان بوجھ کر اور ارادہ کے ساتھ کرنے) پر موقوف ہیں،

جو بیہودہ شرارت ہاتھ ڈالنے سے وہ اپنے بیٹے پر بھی حرام ہو جائے گی۔

اسی طرح بعض ایسے ہی دھوکہ میں یا براہ شرارت کوئی شخص اپنے بیٹے کی بیوی پر ہاتھ ڈال دیتا ہے تو یہ بیوی اپنے شوہر یعنی اس شخص کے بیٹے پر حرام ہو جاتی ہے، اس میں عوام کو پہلے سے زیادہ کلام ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں تو جس شخص پر حرمت ہوتی ہے اس کی اتنی کوتاہی تو تھی کہ اس نے تحقیق کرنے میں بے احتیاطی کی، مگر یہاں جس شخص پر حرمت ہوتی ہے اس بیچارے کی کیا خطا اور اس کا کیا دخل جو اس پر سختی کی گئی، اس کا جواب بھی اوپر کی تقریر سے ہو چکا کہ یہ سزا نہیں ہے، اس فعل کے خاصہ کا ظہور ہے، اور خاصہ ہونا دلیل شرعی سے ثابت ہے اور گو یہ مسئلہ حرمت مصاہرت بدون النکاح کا مجتہدین میں مختلف فیہ ہے،

کسی مسئلہ میں محض نفس پرستی کے لئے کسی دوسرے امام کی تقلید دین سے مذاق ہے۔

مگر جو شخص ایسے مجتہد کی تقلید کا التزام کئے ہوئے ہو جو حرمت کے قائل ہوں اس شخص کا محض اتباع ہوی بصورت نفسانی خواہش کی پیروی سے اس حرمت پر عمل نہ کرنا نفس پرستی و لعب فی الدین و دین کو کھیل بنانا ہے۔ اور اس مسئلہ میں کچھ شرائط و تفصیلات بھی ہیں جن کا محل کتب فقہ ہیں۔ ان سے یا علما سے وقوع حوادث کے وقت تحقیق کرنا ضروری ہے۔ تاکہ حرمت کی جگہ حلت اور حلت کی جگہ حرمت نہ سمجھی جاوے کہ اول میں حقوق شرع کا اتلاف (ضیاع) اور دوسری میں حقوق زوجہ کا اتلاف ہے۔

بلا قصد بھی حرمت مصاہرت ہو جاتی ہے

اور چونکہ یہ مسئلہ بہت نازک ہے اور بعض صورتوں میں بلا قصد بھی حرمت ہو جاتی ہے۔

بیوی سے مباشرت سے قبل تحقیق احتیاط کی ضرورت ہے

اس لئے اس کی حفاظت کا بہت ہی اہتمام رکھے یعنی اول تو جہاں بیوی سوئی ہو اس کی ماں یا بیٹی وہاں نہ ہونا چاہئے اسی طرح وہاں اپنے بیٹے کی بیوی یا باپ کی بیوی نہ ہونا چاہئے اور اگر کسی ضرورت سے ایسا ہو تو جب تک بیوی کو پکار کر اس کی آواز نہ سن لے اور خوب پہچان نہ لے اس کو ہاتھ نہ لگائے۔

اسی طرح ان مذکورہ عورتوں کے ہاتھ سے اگر کوئی چیز لے تو اس کا بہت خیال رکھے کہ اس کے ہاتھ کو ان کا ہاتھ نہ لگ جائے۔ نفس کا کیا اعتبار، اگر ہاتھ لگنے کے وقت ذرا بھی دل میں حرکت ہوگئی ولو ادنیٰ شہوت کا اثر ہو گیا تو حرمت مصاہرت کا طوق گلے میں پڑ گیا۔ پھر بعض اوقات تو ایک کو دوسرے کی کیا خبر کہ اس وقت اس کے نفس میں کیا کیفیت تھی، جب خبر ہی نہیں تو حرمت پر عمل کیسے کرے گا اور اگر اپنے نفس کی خبر بھی ہو گئی تو دنیا کی شرم یا غیرت سے زبان سے نکالنا مشکل، تو تمام عمر ارتکاب حرام، یا یہ شخص مباشر یا مسبب (یعنی خود کرنے والا یا سبب بننے والا) ہو گیا، کتنی مصائب جمع ہو گئیں۔

حرمت رضاعت کے متعلق کوتاہی

ایک کوتاہی حرمت رضاع کے متعلق ہے کہ وہ بھی مثل حرمت مصاہرت کے کثیر الوقوع (اکثر واقع ہونے والی) ہے۔ اکثر لوگ تو بوجہ دنیوی وغیرہ مشغول ہونے ... اس کے مسائل سے باوجود علم رضاع بے احتیاطی کرتے ہیں مثلاً بعض عوام کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر ایک لڑکا اور لڑکی ایک ہی عورت کا دودھ پئیں لیکن ایک ہی زمانہ میں نہ پئیں بلکہ چار پانچ سال کے فرق سے پئیں تو یہ بھائی بہن نہیں بنتے، حالانکہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے۔ اور مثلاً بہت لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اگر ایک شخص کی ایک بی بی نے ایک لڑکے کو دودھ پلایا اور ایک ہی زمانہ میں یا دوسرے زمانہ میں اس شخص کی دوسری بی بی نے کسی

لڑکی کو دودھ پلایا تو بہتوں کو معلوم نہیں کہ یہ لڑکا لڑکی آپس میں بہن بھائی ہوگئے، اور ان کا نکاح بھی باہم ناجائز ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی عورت کا ہو بلکہ دونوں کا دودھ چونکہ ایک ہی مرد کے سبب سے ہے اس لئے دونوں کا دودھ بحکم ایک ہی دودھ کے ہے۔

انا کا دودھ بلا ضرورت پلانا خلاف احتیاط ہے

اور بعض اوقات خود رضاعت ہی کی تحقیق نہیں کرتے، اور ایسی غلطی ان مقامات پر ہوتی ہے جہاں مائیں دودھ کم پاتی ہیں، انائیں نوکر رکھ کر یا ویسے دودھ پلواتی ہیں، جیسے شہروں کے امراء میں، اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ اول تو انا کا دودھ بلا ضرورت پلانا خلاف احتیاط ہے، اور اگر ایسا اتفاق ہو تو اس کو خوب مشہور کر دینا چاہئے۔ اس کا سہل راستہ اور طریقہ یہ ہے کہ جس انا کا دودھ پلوائے اس سے بھی تحقیق کرلے کہ تو نے کہاں کہاں دودھ پلایا ہے اور اس کی یادداشت لکھ کر اپنے خاندان میں محفوظ رکھے، تاکہ رشتہ ناطے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا آسان ہو، اور بعض جگہ سب سے بڑھ کر یہ غضب ہوتا ہے کہ اولاً رضاع کا علم نہ ہونے سے نکاح ہوگیا، اور پھر بعد میں معتبر طریقہ سے علم بھی ہوگیا، لیکن اب تفریق سے عار آتی ہے کہ لوگ ہنسیں گے، اور طعن کریں گے کہ ان لوگوں نے کیا حماقت کی تھی اور بھائی بہن میں مثلاً نکاح کر دیا تھا، اس لئے بھی وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ رضاع کسی طرح ثابت نہ ہو، اور کہیں دفع حرمت کے حیلے نکالتے ہیں، بعض دوسرے علماء کے اقوال کی تلاش کرتے ہیں، حتی کہ کل جن غیر مقلدوں کو برا بھلا کہتے تھے آج ان سے استفتاء کرکے ان کے جواب کا سہارا ڈھونڈتے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر رضاعی بہن بھائی کے نکاح میں ایسی ہی غلطی ہوگئی، جب علم ہوا تو بہت پریشان ہوئے، مجھ سے سوال کیا، میں نے حرمت کا فتویٰ دیا، کہنے لگے صاحب اب تو بڑی بدنامی ہوگی، میں نے کہا اول تو حکم شرعی کے ماننے میں اگر بدنامی بھی ہو تو کچھ پرواہ نہ کرنا چاہئے،

حکم شرعی ماننے میں بجائے بدنامی کے نیک نامی ہوتی ہے

دوسرے بدنامی بھی نہ ہوگی بلکہ نیک نامی ہوگی کہ ایسے حق پرست دیندار لوگ ہیں کہ جب غلطی کا علم ہوا فوراً تدارک کر دیا، البتہ بدنامی اس سے ہے کہ کیسے بے حیاء اور بے دین ہیں کہ باوجود علم ہو جانے کے بھی بھائی بہن حرام کرتے ہیں، جب یہ بات نہ چلی تو کہنے لگے کہ اس لڑکے نے اس لڑکی کی ماں کا دودھ ایک ہی بار پیا تھا، میں نے کہا تب بھی حرمت ثابت ہوگئی، کہنے لگے کہ صاحب وہ تو اگلی ہی قے کے ذریعہ باہر نکال بھی دیا تھا، میں نے کہا، تب بھی حرمت باقی رہی، کہنے لگے، خدا کے واسطے کوئی صورت تو حلت کی نکالو، میں نے کہا دیوانے ہو کیا احکام شرعیہ میں تحریف کردوں، غرض مایوس ہوکر چلے گئے۔ ایک مقام پر ایک اہل حدیث بھی

کسی نے کہہ دیا کہ پانچ گھونٹ سے کم میں حرمت نہیں ہوتی، بس فوراً انھوں نے سوال گھڑ لیا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا تو کیا حکم ہے؟ اور اسی قائل کے کسی ہم مشرب نے جواب لکھ دیا کہ حرمت نہیں ہوتی بس فتوی لے کر بے فکر ہو گئے، حالانکہ اوّل تو یہ لوگ (اہل معاملہ) ان مفتیوں کو اس دن تک اہل حق میں سے بھی نہ سمجھتے تھے، پھر یہ کہ مرضعہ (دودھ پلانے والی) عورت کو زمانہ دراز ہو گیا اب یہ کس طرح معلوم ہوا کہ پانچ گھونٹ سے کم پیے تھے، اس کو بجز دین کو دنیا کے تابع بنانے اور دین کو دنیا کے لئے بدلنے کے کیا کہا جائے گا، اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا، اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا کرنے سے بچائے۔

مخطوبہ (یعنی منسوبہ لڑکی) قبل نکاح بالکل حرام ہے۔

بعض لوگوں کو اس میں مبتلا پایا کہ مخطوبہ (منگنی کی ہوئی عورت) کے ساتھ جو کہ قبل نکاح حرام ہے مثل منکوحہ کے معاملہ کرتے ہیں یوں سمجھتے ہیں کہ یہ جب عنقریب حلال ہونے کو ہے تو ابھی سے حلت شروع ہو گئی، اس کا بطلان (باطل ہونا) عقلاً وشرعاً ظاہر ہے، اور شاید کسی کو اس سے شبہ واقع ہو کہ مخطوبہ کو قبل خطبہ کے دیکھ لینا جائز ہے، تو یہ بھی ایک قسم کا استمتاع (حصول لذت) ہے، اور استمتاع سب برابر ہیں، سو جواب اس شبہ کا خود ہی سوال میں موجود ہے، یعنی خطبہ کے قبل ہی تو دیکھ لینا جائز ہے جس سے مقصود استمتاع نہیں بلکہ اس کا اندازہ کرنا ہے کہ اس عورت میں جو وصف حسن وغیرہ میں نے سنا یا سمجھا کر اس کے استمتاع کے حلال ہونے... یعنی انعقاد نکاح کی تجویز سوچی ہے آیا وہ وصف اس میں ہے یا نہیں ہے، چونکہ نہ ہونے کی صورت میں سوء معاشرت کا خوف تھا شریعت نے محض اس غرض کے لئے ایک بار چہرہ دیکھ لینے کی اجازت دیدی، سو اس نظر ضروری پر جو کہ بغرض استمتاع نہیں ہے دوسری نظر غیر ضروری بعد الخطبہ کو اور اسی طرح مس وغیرہ کو جو کہ محض بغرض استمتاع بلا ضرورت ہیں کیونکہ وہ ضرورت ایک بار دیکھنے سے مرتفع ہو چکی ... کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے۔

محصنات کے بارے میں چند کوتاہیاں

منجملہ محرمات (جن عورتوں سے نکاح حرام ہے) کے بنص قرآنی محصنات یعنی شوہر والی بیبیاں ہیں، اور شریعت میں شوہر والی کا مفہوم عام ہے، یعنی کسی کے نکاح میں ہو وہ بھی اور جو کسی کی عدت میں ہو وہ بھی اس میں داخل ہے، اس میں بھی بکثرت حدود سے تجاوز کیا جاتا ہے، چنانچہ بعضے تو مدت خاوند کی مدت تک خبرگیری نہ کرنے سے اور بعضے عورت کے اپنے خاوند کو چھوڑ کر نکل آنے سے اور بعضے عورت کے فاحشہ (بدکار) ہو جانے سے اور ایک مدت .... اسی حالت میں گزر جانے سے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اب نکاح نہ رہا ہوگا، بس بے تکلف اس سے نکاح کر لیتے ہیں، اور بعضے عدت کے اندر یہ سمجھ کر کہ جب شوہر نے

طلاق دیدی یا وہ مرگیا، تو نکاح تو رہا نہیں، اور عدت[1] ویسے ہی ایک امر زائد ہے تو اس میں نکاح کرلینے سے کونسا امر مانع ہے، معتدہ (عدت گزارنے والی عورت) سے نکاح کرلیتے ہیں، سخت افسوس ہے ایسے لوگ نص کے مقابلہ میں اپنی رائے چلاتے ہیں،

ایام عدت نکاح کے بقیہ آثار میں سے ہیں

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ عدت بھی بقیہ آثار اسی نکاح کا ہے، خواہ شوہر نے طلاق دیدی ہو یا مرگیا ہو، اور یہ بقیہ آثار احکام تحریم کے ہیں کہ غیر زوج کے ساتھ نکاح حرام ہونے میں بعینہ مثل نکاح کے ہے، پس ایسا نکاح اصلاً منعقد نہیں ہوتا، اور تمام عمر حرام ہوتا ہے، اور بعضے یہ غضب کرتے ہیں کہ نکاح کو تو جائز نہیں سمجھتے مگر اس لئے کرتے ہیں کہ یہ عورت دوسری جگہ نکاح نہ کرے، اس کے مفاسد بعض بعض وجوہ سے اور بھی شدید ہیں. ایک تو دھوکہ دینا جو صریح گناہ ہے، دوسرا جہلاء وعوام کو صحت نکاح کا گمان ہونا جس سے ان کا اعتقاد اور ایسے ہی موقع پر ان کا عمل بھی فاسد ہوتا ہے، تیسرے بعض جگہ یہ دیکھا گیا ہے کہ پھر نکاح ہی نہیں کرتے جب کبھی غلبۂ نفس میں اس سے استمتاع کرنے لگے تو وہ بجائے صحت نکاح کے انکار نہیں کرتی جس سے ایک اور فعل معصیت (گناہ میں پڑنا) لازم آیا، بعض جگہ انکار کرنے پر ظلم بھی کیا گیا اور دوسرے لوگ اس مظلومہ کی اس لئے نصرت (مدد) نہیں کرتے کہ اس کو منکوحہ سمجھتے ہیں اور اس پر زوج (خاوند) کو حق جبر (مجبور کرنے کا حق) حاصل ہے،

مفقود یعنی گم شدہ کے متعلق چند کوتاہیاں

اور ایک کوتاہی اس نکاح محصنات (شوہر والی بیبیوں سے نکاح کرنے) کے متعلق بعض خواص میں ہورہی ہے کہ مفقود (گم شدہ) کی بی بی کے بزعم خود امام مالکؒ کے مذہب پر چار برس کے بعد حکم بالموت (موت کا حکم کرنے) کے لئے قضاء قاضی کے اشتراط کی کتب مالکیہ میں تصریح ہے، اور اگر ان کے نزدیک اس کی تصریح بھی نہ ہوتی تب بھی ہمارے فقہاء نے اس اشتراط (شرط ہونے) کی تصریح کی ہے، باقی یہ شبہ کہ ہمارے فقہاء نے مالکیہ کے قول پر عمل کو جائز کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بجائے نوے سال کے چار سال کی مدت کو لے لینا جائز کہا ہے، باقی یہ اشتراط مطلق ہے، کسی حال میں اس کے استثناء کی کوئی دلیل نہیں.

---

[1] عدت: اگر کسی کا شوہر طلاق دیدے تو اس عورت کو اگر حاملہ نہیں تو تین حیض آنے تک شوہر کے گھر میں رہنے کا حکم ہے، اور گھر سے نہ دن کو نکلنے کی اجازت ہے اور نہ رات کو، یہ عدت پوری ہونے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے، اور شوہر کی موت واقع ہونے پر چار مہینے دس دن تک عدت بیٹھنے کا حکم ہے.
(محمد قریشی غفرلہ)

پھر دارالاسلام میں تفریق جو بحکم تطلیق الطلاق ہے واقع نہیں ہوتی، پھر اس تفریق کے بعد عقدِ جدید میں اختلاف ہیں اور احوط و زیادہ احتیاط اختلاف سے بچنا ہے، واللہ اعلم، واکثر مفید کو اس کا زیادہ یاد رکھنا چاہئے،

نکاحِ موقت اور متعہ بالاتفاق حرام ہیں،

بعضے پڑھے لکھے لوگوں پر افسوس ہے کہ نکاحِ موقت (معینہ مدت کے لئے نکاح) کے حرام ہونے میں اور نکاحِ موقت کے قیاس پر متعہ کے حرام ہونے میں مشتبہ کرتے ہیں، ہماری کتبِ فقہ میں دونوں کی حرمت کی تصریح ہے، اور نکاحِ موقت میں جو بعض کا اختلاف منقول ہے دراصل ان بعض علماء نے اس نکاح کو موقت ہی قرار نہیں دیا، بلکہ تصریحاً فرمایا کہ یہ توقیت باطل ہے، اور نکاح تا ابد (ہمیشہ کے لئے) صحیح رہے گا، باقی جو عقد موقت ہوگا وہ بالاتفاق باطل ہے، چنانچہ متعہ کو تمام اہلِ حق نے باطل کہا ہے، خود وہ موطأ میں اس کی تحریم (حرام ہونے) کی حدیث لاتے ہیں، اور ان کے مذہب کی جس کتاب میں وہ نسبت واقع نہیں ہوئی، ہیں یقیناً غلط ہے،

خریدی ہوئی عورتیں یا لڑکیاں شرعاً کنیز لونڈی کی مصداق نہیں

بعض لوگ ایسی خریدی ہوئی عورتوں یا لڑکیوں کو جن میں کنیز ہونے کے شرائط شرعیہ نہیں پائے جاتے، حلال سمجھتے ہیں، ان سے جبراً خدمت لیتے ہیں، اور بعضے ان سے صحبت کرتے ہیں، یہ بھی تحلیلِ حرام میں داخل ہے،

تین طلاق کے بعد بدون حلالہ اس عورت سے نکاح درست نہیں

بعضے لوگ بی بی کو تین طلاق دے کر پھر اس کو نکاح میں داخل سمجھتے ہیں یا بلا حلالہ[1] اس سے تجدیدِ نکاح کر لیتے ہیں، بعض کو بعض روایات سے شبہ ہو گیا ہے، لیکن یہ مسئلہ اپنے مقام پر حل ہو چکا ہے کہ تینوں طلاق خواہ مجتمعاً (ایک ساتھ اکٹھی) دے، خواہ متفرقاً تینوں واقع ہو جاتی ہیں، گو ایک جلسہ میں ایسا کرنا معصیت (گناہ) ہے، لیکن طلاقِ مغلظہ[2] ہو جائے گی، اور بدون حلالہ نکاحِ جدید درست نہ ہوگا، البتہ جس سے صحبت یا خلوتِ صحیحہ[3] نہ ہوئی ہو اس کی

---

[1] حلالہ: عورت اگر تین طلاق ہو جانے کے بعد پھر اسی شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرے اور اس کے ساتھ ہمبستری بھی کرے (صرف نکاح کافی نہیں) بلکہ شوہر ثانی کے ساتھ اس کی وطی ہونا بھی ضروری ہے، پھر اس شوہر کے مر جانے یا طلاق دینے پر پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، اس کو حلالہ کہتے ہیں۔ [2] طلاقِ مغلظہ: یعنی ایسی طلاق جس کے دینے کے بعد میاں بیوی اگر دونوں بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر حلالہ کے نکاح نہ ہو سکے، ایسی طلاق کو طلاقِ مغلظہ کہتے ہیں جس کے بعد مرد و عورت کو رجوع کا حق نہیں ہوتا۔ [3] خلوتِ صحیحہ: یعنی میاں بیوی کا ایسی تنہائی میں یکجا ہونا جس میں صحبت ممکن ہو، ۱۲ قریشی

تین طلاق متفرق قائل (طلاق مدخولہ) ہے، اس طرح کہ تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، اس صورت میں ایک پہلی ہی واقع ہوگی، دو لغو ہوں گی، باقی سب صورتوں میں تینوں طلاق واقع ہو جائیں گی۔

بیک وقت چار عورتوں سے زائد نکاح درست نہیں

ایک کتاب اسی تحلیل محرمات سے متعلق ہے کہ بعض لوگ خصوصاً اہل امارت و ریاست چار سے زائد عورتیں نکاح میں جمع کر لینے کو حلال سمجھتے ہیں چنانچہ ایک صاحب کو میں نے دیکھا جن کے پاس سات منکوحہ بیک وقت جمع تھیں، انھوں نے کسی کا فتویٰ مجھ سے نقل کیا، وہ اٹھارہ تک جمع کرنے کو حلال بتلاتے تھے، میں نے اس فتویٰ کی تغلیط کی اور ان کو سمجھایا، جس سے وہ ساکت (خاموش) ہو گئے، باقی یہ تحقیق نہیں کہ زائد علی الاربع (چار عورتوں سے زائد) کو انھوں نے چھوڑ دیا یا نہیں، خدا بچائے ایسے خوشامدی بدنام کنندہ علماء سے جو دنیوی اغراض کی تکمیل و تحصیل کے لئے امراء کی خوشامد میں اس طرح دین فروشی کرتے ہیں، گو یہ قول بعض کی طرف کتب میں بھی منسوب دیکھا گیا ہے، لیکن بالیقین غلط ہے، اور بالیقین اس غلطی کا سبب وہاں تدلیس (دھوکہ) ہی تھا اور اس وقت اس کا بالاجماع (باتفاق) اس قائل پر منکشف (ظاہر) بھی نہ تھا اور اب تو بعد وضوح حق (حق واضح ہونے) کے جو ایسا کرے وہ اَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ کے مصداق ہے۔

مسئلہ مصاہرت کے متعلق ایک محرف فی الدین کا فتویٰ

ایسے ہی ایک محرف فی الدین (دین میں تحریف پیدا کرنے والے) کا لکھا ہوا بندہ نے فتویٰ مسئلہ مصاہرت (دامادی بنانے) کے متعلق دیکھا ہے، اس شخص نے سائل سے ایک ہزار روپیہ لے کر ایک تاویل باطل سے ساس کے ساتھ نکاح کی اجازت دیدی، وہ سائل اپنی ساس پر فریفتہ (عاشق) ہو گیا تھا، اس مفتی نے ترکیب یہ لکھی کہ ساس وہ ہے جو منکوحہ کی ماں ہو تو کسی عورت کا ساس ہونا موقوف (منحصر) ہوا منکوحہ کے ماں ہونے پر، اور یہ منکوحہ جاہل ہے، اور جاہلوں کے اکثر اقوال و افعال شرکیہ و کفریہ صادر ہوا کرتے ہیں، اور نکاح پڑھنے کے وقت کسی نے منکوحہ کو تجدید ایمان نہیں کرائی، اور مرتدہ (دین سے پھر جانے والی) کا نکاح مسلم سے صحیح نہیں، پس یہ نکاح نہیں ہوا، اس لئے نہ وہ منکوحہ ہوئی، اور نہ اس کی ماں ساس ہوئی، رہی حرمت مصاہرت بمحض الوطی (صرف ہمبستری کے سبب دامادی رشتہ سے حرام ہونا) یہ صرف امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے، سائل پر فرض نہیں کہ ان کی تقلید کرے، پس اس لئے وہ ساس سائل پر حلال ہو گئی۔

افسوس اس شخص نے ایک شخص کی دنیوی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لئے بلکہ اپنی ایک رقم سیدھی کرنے کے لئے ایک مسلمان عورت کو کافر بنایا اور اتنی مدت تک زوجین (میاں بیوی)

کو مرتکب زنا اور زنا کرنے والے) قرار دینا، پھر محض اتباع ہویٰ (نفس کی خواہش کی پیروی) کے لئے ایک مقلد مذہب معین (ایک معین مذہب کی تقلید کرنے والے یعنی حنفی مسلمان) کو اجازت ترک تقلید وارتحال الی مذہب الغیر (تقلید کو چھوڑ کر اجازت دوسرا مذہب اختیار کرنے کی) دینا، جس کے خطرناک ہونے کے متعلق ایک حکایت...... عنقریب عرض کروں گا۔ اس طرح پھر بیچارہ (محرّمہ (جس سے نکاح حرام تھا) کو حلال کیا ایسے لوگوں میں اور علماء یہود کا تمون الحق وتلبسون الحق بالباطل (حق کو چھپاتے اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کرنے والوں) میں کیا فرق ہے؟

وہ حکایت موعودہ (جس کا وعدہ کیا گیا)... یہ ہے:

حکی ان رجلا من اصحاب ابی حنیفۃ خطب الی رجل من اصحاب الحدیث ابنته فی عهد ابی بکر الجوزجانی فابی الا ان یترك مذهبه فیقرأ خلف الامام ویرفع یدیه عند الانحطاط ونحو ذلك فاجابه فزوجه فقال الشیخ بعد ما سئل عن هذه واطرق رأسه النکاح جائز ولکن اخاف علیه ان یذهب ایمانه وقت النزع لانه استخف بمذهبه الذی هو حق عنده وترکه لاجل جیفة منتنة کذا فی الشامیة عن التاتارخانیة قبیل کتاب السرقة

(حکایت ہو کہ ابوبکر جوزجانی رح کے زمانہ میں ایک شخص نے جو امام ابو حنیفہ رح کے متبعین میں تھا ایک اہل حدیث کی بیٹی سے نکاح کا پیغام دیا۔ اس اہل حدیث نے چند شرائط پر منظور کیا: وہ یہ کہ اپنا حنفی مذہب چھوڑ دے، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے، اور رفع یدین کرے، اس حنفی نے ان شرائط کو قبول کر لیا اور نکاح ہو گیا۔ جب شیخ ابوبکر جوزجانی رح سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اپنا سر جھکا لیا، پھر فرمایا کہ نکاح تو صحیح ہو گیا لیکن مجھے خوف ہے کہ کہیں نزع کے وقت اس کا ایمان نہ چلا جائے کیونکہ اس نے ایک بدبودار مردار کے لئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر جو اس کے نزدیک حق تھا)

چند ٹکوں کی خاطر ایک شخص کی اپنی حقیقی ہمشیرہ کو زانیہ قرار دینے کی کوشش۔

اسی کی نظیر (مثال) ایک اور قصہ میرے سامنے پیش ہوا تھا کہ اس میں بھی ایک شخص نے محض ایک نفسانی غرض سے ایک منکوحہ کو زانیہ قرار دیا یہ قرآن کے خلاف ہوا اور وہ منکوحہ اس شخص کی بہن تھی، اس کو زانیہ کہنا بے حیاء و غیرت کے خلاف ہوا۔ وہ قصہ یہ ہے کہ ایک سنی شخص کی سگی بہن کا نکاح ایک شیعی

مرنے سے ہوا، اور وہ عورت لاولد مرگئی اور روپیہ کا ترکہ چھوڑ کر مرگئی۔ تو شرع سے اس کے دو ہی وارث تھے ایک زوج (شوہر) کہ نصف اس کا تھا، دوسرا یہ بھائی کہ نصف اس کو تھا، یہ بھائی بڑا چاہتا تھا کہ زوج کو کچھ نہ ملے، سب میں ہی لے لوں، تو اس کے متعلق اس ترکیب سے سوال لکھا کہ چونکہ سنیہ کا نکاح شیعہ سے حسب فتویٰ کثیر من العلماء (بہت سے علماء کے فتویٰ کے مطابق) صحیح نہیں ہوتا، اس لئے وہ مرد اس کا زوج ہی نہیں لہٰذا وہ وارث نہ ہونا چاہئے، صرف ایک بھائی وارث ہے، تو اس طرح کل ترکہ اس کو ملے گا۔

میں نے کہا، افسوس! اول تو جس وقت یہ نکاح ہوا تھا اس وقت تم کہاں سوتے تھے، کیوں ہونے دیا تھا؟ یہ مسئلہ اور غیرت کہاں گئی تھی! پھر ہو جانے کے بعد شوہر پر عمل کیوں نہیں کیا، اتنے دنوں زنا ہوتا رہا، اس کو گوارا کیا۔ پھر بیان سے کہو کہ اگر اتفاق سے ترکہ شوہر چھوڑ کر مرجاتا، اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتا اور تم کو یہ توقع ہوتی کہ اگر میری بہن کو بوجہ فتویٰ رذی الذ (جن کے) حسب عدم وارث کے یہ کل ترکہ مل جائیگا تو بوجہ اس کے لاولد ہونے کے پھر سب کچھ کو مل سکتا ہے، تو کیا اس وقت بھی تم اس نکاح کے غیر منعقد وغیر ثابت (منعقد اور ثابت نہ) ہونے کے لئے کرتے؟ یا اگر کوئی ایسا فتویٰ بھی سناتا تو کہتے کہ نہیں صاحب سب کا فتویٰ اس پر نہیں ہے، اور جواز (جائز ہونے) کا فتویٰ زیادہ معتبر اور صحیح ہے۔ اور میں نے کہا کہ شیعی سنی کے تناکح (شیعہ سنی سے نکاح کرنے) کا مسئلہ وہ ایک مستقل بحث ہے، میں اس وقت اس میں گفتگو نہیں کرتا، مجھ کو تم سے صرف یہ استفسارات (چند سوال دریافت) کرتا ہوں، تاکہ تم کو اس کوشش کا مبنیٰ (بنیاد) معلوم ہو، غرض بالکل لاجواب ہو کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ یہ صورت مذکورہ مختصر نمونہ تھا تحلیل محرمات کا جن میں لوگ بکثرت مبتلا ہیں۔

اُن عورتوں کا بیان جن سے شرعاً نکاح درست ہے۔

اب اس کے مقابل ایک دوسری فہرست ان کوتاہیوں کی جو تحریم بعض محللات (نکاح کے لئے بعض شرعاً حلال عورتوں سے نکاح کو حرام سمجھنے) کے متعلق ذکر ہوتی ہیں۔ یعنی احکام شرعیہ کی ناواقفی سے بعض عورتوں کو جو شرعاً حلال ہیں حرام اعتقاد کر لیا گیا ہے، مثلاً بہت سے عوام حالانکہ بچی ہے۔ اسی طرح پیرانی اور استانی سے، اسی طرح شاگردنی اور مریدنی سے نکاح کرنا حرام سمجھتے ہیں۔ اسی طرح رضاع (دودھ پلانے) کا ایک مسئلہ بڑھا دیا کہ ایک برتن میں میاں بی بی کے دودھ کھانے کو موجب حرمت رضاع و فساد نکاح سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ایک حکم مصاہرت میں بڑھا دیا، کہ سوتیلی ساس یعنی بیوی کی سوتیلی ماں سے نکاح کو حرام سمجھتے ہیں، اور اگر کوئی ایسا کر لیتا ہے تو اس پر بے حد طعن و ملامت کرتے ہیں، یہ سب زیادت فی الدین (دین میں زیادتی کرنا) ہے۔ البتہ سوتیلی ساس کو زندہ بی بی کے ساتھ جمع کی

سوتیلی بیٹی سے نکاح میں جمع کرنا اس کو بعض علماء نے منع کیا ہے، سو اس میں اگر احتیاط کرے تو افضل ہے، اور باقی صورتیں بالاجماع حلال ہیں، گو پردہ ہی کی بات ذکر نا اس نیت سے کہ لوگ طعن کرکے گنہگار ہوں گے احسن ہے، اور ان تعلقات کو محرمات میں داخل سمجھنے پر علاوہ فساد اعتقاد کے ایک اور عمل مفسدہ مرتب ہوتا ہے، وہ یہ کہ مسئلہ سب کا سنا ہوا ہے کہ محرمات سے پردہ نہیں ہے پس بے تکلف ان رشتوں میں بے محابا (بے پردگی) اختیار کی جاتی ہے، خصوصاً مریدنی تو اگر پردہ کرنے لگے، بعض اقالیم الجہالت (جہالت کے علاقوں) میں اس کی بڑی گت بنتی ہے، بلکہ بعض تو بے شرع پیر بھی بُرا مانتے ہیں، سو ذرا دیکھو ان سب تعلقات سے محرمیت شرعیہ (شرعی حرمت) نہیں ہوتی، اس لئے پردہ واجب ہوگا،

سالی کو بھی پردہ کرنا واجب ہے

اسی طرح سالی کو اپنی بہن کے بقاء نکاح (نکاح کے باقی رہنے) تک حرام ہے، مگر محرم ابدی (ہمیشہ کے لئے حرام) نہیں، اس لئے بھی پردہ واجب ہے،

بیک وقت چار سے زائد نکاح کو حرام سمجھنا امر ضلالت ہے

ایک مخترع (ایجاد کردہ) نئی صورت، اس تحریم حلال کی اس وقت ملاحدہ کی تقلید کو (بے دینوں کی اندھی تقلید سے) پیدا ہوئی، یعنی بعض مدعیان تہذیب نے بعض اقوام یورپ کی دیکھا دیکھی دعویٰ کیا ہے کہ ایک عورت سے زیادہ دوسری تیسری چوتھی عورت سے نکاح جائز نہیں، اور یہ غلطی پوری مقابل ہے، فہرست سابق کی بالکل آخیر غلطی کی کہ وہاں چار سے زائد کو حلال کیا گیا، یہاں ایک سے زائد چار تک کو بھی حرام کہا گیا: اور منشاء تو اس قول کا استحسان ہے آراء واہواء اہل یورپ کا، لیکن چونکہ اپنے کو اسلام کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں، اس لئے اس دعوے کو زبردستی قرآن میں بھی ٹھونس دیا، کہ دو جگہ سے دو آیتیں لیں اور ہر ایک کے معنی میں تحریف کی، اس طرح سے اپنا مطلب پورا کیا، چونکہ یہ علمی مضمون ہے، اور اس کے جواب سے احقر اپنی تفسیر[1] میں فارغ ہو چکا ہے، اسی لئے یہاں اسی قدر پر اکتفاء کیا گیا، یہ صورتیں تو تحریم حلال (حرام کو حلال کرنے) کی اعتقاداً (عقیدے کے اعتبار سے) تھیں،

---

[1] احقر نے یہ تفسیر بیان القرآن سے کتاب ھٰذا کے رسالہ "المطلوب لمذہب المقلوب المنیب" کی ذیلی سرخی .... "تعدد ازواج میں عدل نہ ہونے کا احتمال قوی اور غالب ہے" کے حاشیہ میں من وعن نقل کر دی ہے جسے آپ آگے ملاحظہ فرمائیں گے۔ (بندہ احقر قریشی عفی عنہ)

شوہر سے فسخ نکاح کی خاطر مرتد ہونے سے نکاح باطل نہیں ہوگا

ایک صورت اس کی بھی ایجاد کی گئی ہے، وہ یہ کہ کسی عورت کو خود یا کسی ناجائز تعلق کے سبب شوہر کے پاس رہنا منظور نہ ہوا اور وہ طلاق وغیرہ دیتا نہیں، نعوذ باللہ وہ مرتد ہوگئی جس سے نکاح فسخ ہوگیا، پھر مسلمان ہوکر آزاد رہنے لگی، یا اس ناجائز موقع پر نکاح کرلیا، (اللہ تعالیٰ جاہل شیطان و شیطان کے پھندے سے) محفوظ رکھے ہمارے فقہاء نے ایک قانونِ شرعی سے اس کا خوب انتظام فرمایا ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد (خواہ اپنی رضا سے ہوجائے ورنہ جبر کرکے مسلمان کیا جائے گا) اس کے بعد جبراً شوہرِ اول ہی سے نکاح کرایا جائے گا، اور ایک روایت یہ ہے کہ ایسے ارتداد سے وہ نکاح سے خارج ہی نہ ہوگی۔

(کذا فی الدر المختار و رد المحتار ج ۲ ص ۲۹۳)

جوش میں تین طلاق کی قسم کھانے سے تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں

بعضے لوگ کسی جوش میں قسم کھا بیٹھتے ہیں کہ میں اگر فلاں عورت سے نکاح کرلوں تو اس کو تین طلاق، اور اس حلف کے بعد پھر وہ نکاح کرتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہیے کہ اس منکوحہ پر تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی، اور اس مسئلہ میں زائد تفصیل ہے، اس سب کے لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اگر کسی نے ایسی حرکت کی ہو اس کو چاہیے کہ درمختار کی کتاب الحدود سے قبل کی یہ عبارت حلف لا یتزوج فزوجہ فضولی فاجاز بالقول یحنث (یعنی کسی نے قسم کھائی کہ میں شادی نہیں کروں گا کسی اور نے بغیر اس کی اطلاع کے اس کا نکاح کرلیا اور اس نے اس کی اجازت دیدی تو وہ حانث ہوگا[1] اور اس کے متعلق رد المحتار (شامی) کا حاشیہ کسی عالم محقق کے پاس جاکر تحقیق کرے۔

اولاد کی تعداد تین تک پہونچ جائے تو جاہل عوام کے اعتقاد کے مطابق نکاح ٹوٹ جاتا ہے

ایک صورت تحریم حلال کی عوام سے اور بھی گھڑی ہے، وہ یہ کہ جس عورت کے تین اولاد ہوجائیں، اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے، محض غلط اور باطل ہے۔

متبنّیٰ کی بی بی سے نکاح حرام نہیں

اور بعض متبنّیٰ (منہ بولے بیٹے) کی بی بی سے نکاح کو بھی مذموم سمجھتے ہیں، یہ فرد تحریم حلال کی خاص اس جاہلیت کا مسلک ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس امر میں طعن کیا تھا، اور حق تعالیٰ نے اس رسمِ جاہلیت کے ابطال کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کا مامور فرمایا۔

---

[1] حانث سے مراد یہ ہے کہ نکاح کے ہوتے ہی اس کی منکوحہ کو طلاق ہوجائے گی ۱۲ مجیب

بیوہ کے نکاح کے انکار میں | آخر میں ایک جزئیہ اس کلیہ کا جس میں اعتقاد تو نہیں عملاً و حالاً عوام
تشبہ وارد کیا گیا ہے | سے خواص تک اور نیم مردوں عورتوں سے بہت زیادہ عورتیں اس کے سبب
ہی مبتلا ہیں الا من شاء اللہ بشر وہ کہ جسے اللہ چاہے اور وہ بیوہ عورت کا نکاح ہے کہ گو اعتقاد سے
تو سب اس کو حلال ہی سمجھتے ہیں مگر اس سے اس قدر عار رکھتے ہیں کہ بعض اوقات اس کے انکار
میں کفر تک لازم آجاتا ہے چونکہ اس کا مضمون بالکل مشہور متفق ہے اس لئے تطویل کلام کی
حاجت نہیں ۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ
بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ۔

"اے اللہ ہمیں راہ حق دکھلا اور اس پر چلنے کی توفیق بخش اور راہ باطل
واضح کیجئے اور اس سے محفوظ رکھ"

ضمیمہ فہرست بالا

ایک صورت تحریم حلال کے قبیل سے جو جہلاء کا مذموم ہے
یہ ہے کہ عنین یعنی نامرد سے نکاح کو منعقد نہیں سمجھتے۔

نامرد کے ساتھ نکاح بالکل صحیح ہو جاتا ہے۔

یعنی اس کو مثل عورت کے سمجھ کر عورت کے ساتھ اس کے نکاح کو باطل سمجھتے ہیں، سو یہ بالکل ہی غلط ہے، صریح دلیل نقلی اس کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ اس صورت میں منکوحہ کے مطالبہ پر اس کو علاج کے لئے مہلت دی جاتی ہے، اور اگر شفاء ہو جاوے تو اسی نکاح سابق پر اکتفا کیا جاتا ہے، نکاح جدید کا حکم نہیں کیا جاتا، معلوم ہوا کہ پہلا نکاح منعقد و صحیح ہو جاتا ہے۔

نامرد کو خود نکاح کرنا گناہ ہے

البتہ ایسے شخص کو جبکہ اس کو علامات سے اپنا عاجز ہونا معلوم ہو تو خود نکاح کرنا ہی گناہ ہے، تو تحریم بمعنی گناہ تو واقع ہے مگر تحریم بمعنی عدم انعقاد نکاح (یا نکاح صحیح نہ ہونا) واقع نہیں، اسی لئے اس کے لئے احقر نے اوپر یہ عنوان تجویز کیا ہے "تحریم حلال کے قبیل سے" (حلال کو حرام سمجھنے کی قسم سے) کیونکہ یہ ایک وجہ سے تحریم ہے ایک وجہ سے نہیں،

نامرد کے پیچھے نماز پڑھنے سے نماز صحیح ہو جاتی ہے ۱۲

اور اس شخص کے اس الحاق بالنساء (عورتوں میں شامل ہونے) کے خیال پر ایک دوسری غلطی جو کہ اس باب سے نہیں ہے، جہلاء مبتلا ہیں، یعنی اس شخص کے پیچھے نماز کو ناجائز یا مکروہ سمجھتے ہیں جس کی کچھ اصل نہیں،

خصی اور ہیجڑے کی امامت مکروہ ہے۔

اور یہی حکم ہے خصی و مجبوب کا، یعنی جس کے بیضے نکال دیئے گئے ہوں جس کو خوجہ یا خواجہ سرا کہتے ہیں، یا جس کا خاص اندام (عضو مخصوص) قطع کر دیا گیا ہو جس کو ہمارے محاورہ میں مخنث یا ہیجڑا کہتے ہیں، وہ بھی مرد ہے اور اس کا حکم مردوں کا سا ہے، گو بصورت اس کے فاسق ہونے یا اس سے جماعت کی نفرت کرنے کے اس کی امامت مکروہ ہے، اوّل صورت میں تحریماً دوسری میں تنزیہاً۔

نامرد، مخنث اور ہیجڑے وغیرہ سے بھی پردہ واجب ہے
انہی احکام ..... میں سے یہ بھی ہے کہ اُن سے عورتوں کو پردہ بھی واجب ہے، جس طرح عام مردوں سے، اس میں بھی ناواقف بکثرت مبتلائے غلطی ہیں،

عنینیت مرض ہے اور قطع خصیہ سخت گناہ ہے
اس میں اور خصی میں اتنا فرق ہے کہ عنینیت مرض ہے جس میں کوئی گناہ نہیں، اور قطع عضو سخت گناہ ہے، اگر خود کسی نے اپنے لئے ایسا تجویز کیا وہ فاسق ہے جب تک توبہ نہ کرے، اور جو اس کے بلا علم یا بلا اختیار کسی اور نے کیا ہے وہ فاسق ہے،

مخنث بھی مردوں میں شامل ہیں
اور اسی کے ساتھ حکم سمجھنا چاہئے ایسے شخص کا جس کی چال ڈھال یا بول چال میں نزاکت ہو! اس کو ہمارے محاورے میں زنانہ کہتے ہیں، سو وہ بالکل مرد ہے، البتہ اگر اس کی یہ مشابہت بالنساء خلقی (عورتوں سے مشابہت قدرتی) ہے تو وہ معذور ہے، اور اگر قصداً زنانہ پن کرتا ہے جس کو تشبہ کہتے ہیں تو حدیث[1] میں ایسے شخص پر لعنت آئی ہے،

نامرد سے عورت کی تفریق کرانے کا خاص قانون ہے
اور ایک غلطی عنین کے متعلق کم واقفیت لوگوں کو واقع ہوتی ہے، کہ وہ تحلیل حرام کی فہرست میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کے نکاح کو تو منعقد سمجھتے ہیں، مگر شوہر سے اس کی تفریق کر دینے کو عورت یا برادری کے اختیار میں سمجھتے ہیں، کہ جب چاہا دوسری جگہ اس کا نکاح کر دیا گیا، سو یہ بھی شریعت کے خلاف ہے، اس کی تفریق کا ایک خاص قانون ہے جو کتب فقہ میں مفصلاً مذکور ہے، اور احقر نے بہت عام فہم اور سلیس عبارت میں اس کو تتمہ امداد الفتاوی[2] ص ۳۳ ج ۲ مطبوعہ مجتبائی میں لکھ دیا ہے، اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

---

[1] چنانچہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعن اللہ المتشبہین من الرجال بالنساء والمتشبہات من النساء بالرجال (یعنی اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت بناتے ہیں اور ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت بناتی ہیں) احقر [illegible] غفرلہ

[2] احقر ناکارہ کے پاس امداد الفتاوی کی ذکر کردہ جلد نہیں، اس لئے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی ہی تصنیف "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" کے رسالہ "المرقومات للمظلومات" سے وہ قانون نقل کرتا ہوں جو عام فہم بھی ہے اور مفصل بھی، وہو ھذا۔ (رشید احمد [illegible] غفرلہ) "زوجہ عنین کے لئے تفریق کی صورت یہ ہے کہ عورت اپنا معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش کرے، قاضی واقعہ کی تحقیق کرے، یعنی اول خاوند سے دریافت کرے

مرض رتقا ۔ والی عورت کا نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی ایک غلطی اسی قسم کی اس عورت کے متعلق ناواقفوں کو ہوتی ہے جس میں بوجہ حائل (آڑ) ہو جانے کسی ہڈی یا جلد وغیرہ کے خاص موقع پر ہمبستری کی صلاحیت نہیں ہے جس کو عربی میں رتقا کہتے ہیں، اس کو ملحق بالرجال

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اگر وہ خود اقرار کرے کہ بیشک میں اس عورت سے ہمبستری پر قادر نہیں تو اس کو ایک سال کی مہلت علاج کے لئے دیدے، اور اگر یہ اقرار نہ کرے بلکہ جماع کا دعویٰ کرے تو اس وقت یہ تفصیل ہے کہ اگر عورت باکرہ ہونے کا دعویٰ نہ کرے تب تو مرد سے حلف لیا جائے گا، اور اگر اس نے حلف کر لیا تو عورت کو تفریق کا حق حاصل نہ ہوسکے گا، اور اگر شوہر نے حلف سے انکار کر دیا تو اس کو ایک سال کی مہلت بغرض علاج دیدی جائے گی، اور اگر عورت باکرہ ہونے کی مدعی ہو تو قاضی عورتوں سے اس کی بیوی کا معائنہ کرائے، ایک عادل تجربہ کار عورت کا معائنہ بھی کافی ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ دو عادل عورتیں معائنہ کریں۔ آگے بعد معائنہ کے دو صورتیں ہیں، (۱) ایک صورت یہ کہ عورتیں یہ بیان کریں کہ یہ عورت باکرہ یعنی کنواری نہیں رہی، تب تو خاوند سے اس بات پر حلف لیا جائے کہ اس نے جماع کیا ہے، اور اگر وہ حلف کرے تو اس کا قول معتبر ہوگا، اور عورت کو تفریق کا حق باقی نہ رہے گا، اور اگر شوہر حلف سے انکار کرے تو تاجیل یعنی ایک سال کی مہلت کا حکم کر دیا جائے، (۲) اور دوسری صورت یہ ہے کہ عورتیں یہ بیان کریں کہ ابھی تک یہ لڑکی باکرہ (کنواری) ہے، تو پھر قاضی بدون کسی سے حلف لئے ہوئے شوہر عنین کو ایک سال کی مہلت علاج کے لئے دیدے۔ ——— خلاصہ یہ کہ جب کسی دلیل سے متحقق ہو جائے کہ عورت باکرہ نہیں بلکہ ثیبہ ہے، خواہ ثیبہ ہونا اس طرح معلوم ہو کہ وہ بیوہ ہو اور شوہر اول سے اولاد ہو چکی ہو یا خود عورت کے اقرار سے یا عورتوں کے معائنہ سے، ان تینوں حالتوں میں مرد کا قول حلف کے ساتھ قبول کیا جائیگا کہ وہ ہمبستری کر چکا، اور عورت کو علیحدگی کا حق نہ دیا جائے گا، اور اگر تینوں حالتوں میں مرد حلف سے انکار کرے تو عورت کا دعویٰ درست مان کر مرد کو ایک سال کی مہلت دیدیں، اور اگر عورتوں کے معائنہ سے زوجہ کا باکرہ ہونا ثابت ہو تو بدون حلف ہی ایک سال کی مہلت دیدی جائے، اور اس مدت کے لئے ظاہر الروایۃ میں قمری سال کا اعتبار کیا گیا ہے، لیکن روایت حسن میں شمسی سال کو لیا ہے، اور بعض اصحاب ترجیح نے احتیاطاً اسی کو اختیار کیا ہے اور علامہ شامی رحمہ اللہ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے، اور اب بھی عام اہل فتویٰ کا یہی معمول ہے، اور یہ سال حاکم کی مہلت دینے کے وقت سے شروع سمجھا جائے گا، اس سے پہلے خواہ کتنی ہی مدت گذر چکی ہو معتبر نہ ہوگی، پھر ایک سال بھر کے عرصہ میں اگر شوہر کسی طرح علاج کرا کے تندرست اور

زنانیوں کے مشابہ)، بعض لوگ اس سے بھی نکاح کو منعقد نہیں سمجھتے، یہ بھی محض غلط ہے،

خنثیٰ کا کسی سے نکاح نہیں ہو سکتا

البتہ انسان کی ایک خاص قسم ہے جس میں مشابہ الحاق بالنساء بھی (عورتوں کے مشابہ ہونے) کا بھی ہے، اور الحاق بالرجال (مردوں کے مشابہ ہونے) کا بھی، اس کو شریعت کی اصطلاح میں خنثیٰ کہتے ہیں کہ اس میں تمام علامات ذکورت و انوثت کے (مردوں اور عورتوں کی پوری علامتیں) برابر درجہ میں متعارض ہیں، سو اس کا نکاح کسی سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جماع پر قادر ہو گیا اور ایک مرتبہ بھی ہمبستری کر لی تو عورت کو فسخ نکاح کا حق جاتا رہا بلکہ ہمیشہ کے لئے اس کا حق باطل ہو گیا۔ اب کبھی علیحدگی کا مطالبہ نہیں کر سکتی، اور اگر اس عرصہ میں ایک مرتبہ بھی جماع نہ کر سکا تو عورت کے دوبارہ درخواست کرنے پر قاضی تحقیق کرے۔ اگر خود شوہر نے اقرار کر لیا کہ ایک سال میں قادر نہیں ہوا تب تو عورت کا دعویٰ بلا عذر صحیح ہو گیا، اس صورت میں قاضی عورت کو اختیار دیدے کہ اگر علیحدگی درکار ہو تو طلب کرو، ورنہ اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کو گوارا کرو، اس پر وہ اگر اسی مجلس میں علیحدگی چاہے تو خاوند سے طلاق دلوا دی جائے، اگر وہ انکار کرے تو قاضی تفریق کر دے، جیسا کہ آئندہ عنقریب آئے گا، اور اگر خاوند اقرار نہ کرے بلکہ جماع ہو چکنے کا دعویٰ کرے تو اس وقت یہ تفصیل ہوگی کہ مہلت دینے کے وقت اگر عورت کا ثیبہ ہونا ثابت ہو چکا تھا یا اب عورت اقرار کرے کہ کسی طرح بکارت زائل ہو چکی ہے مگر ہمبستری نہیں ہوئی، تب تو خاوند سے حلف لیا جائے، اگر وہ قسم کھالے کہ میں نے جماع کیا ہے تو مرد کا قول معتبر ہوگا اور تفریق نہ ہو سکے گی، اور اگر شوہر نے اس وقت بھی حلف سے انکار کر دیا تو عورت کو طلب فرقت کا اختیار دیا جائے گا، اور اگر مہلت دینے کے وقت سے عورت کا باکرہ ہونا ثابت ہوا تھا اور اگر اب دوبارہ معائنہ سے بھی باکرہ ہونے کی تصدیق ہو تب بھی عورت سے بدون حلف لئے ہوئے قاضی عورت کو اختیار دیدے کہ اپنے خاوند کے نکاح میں رہے یا تفریق کا مطالبہ کرے، اور جن صورتوں میں قاضی عورت کو اختیار دے چکا ان میں حکم یہ ہے کہ عورت اگر اسی مجلس میں تفریق چاہے تب تو تفریق ہو سکتی ہے ورنہ نہیں، پس اگر عورت نے اسی مجلس تخییر یعنی اختیار دئیے جانے والی مجلس ہی میں یہ کہہ دیا کہ میں اس شوہر سے علیحدہ ہونا چاہتی ہوں تو قاضی اس کے شوہر سے کہے کہ اس عورت کو طلاق دیدے، اس پر اگر خاوند نے طلاق دیدی تو طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی، اور اگر وہ طلاق دینے سے انکار کرے تو قاضی خود تفریق کر دے یعنی مثلاً یہ کہہ دے کہ میں نے تجھ کو اس نکاح سے الگ کر دیا، یہ تفریق بھی شرعاً قائم مقام طلاق بائنہ کے واقع ہو جائے گی۔ (الحیلۃ الناجزۃ، ص ۱۳۶ تا ۱۳۹)

جائز نہیں، نہ مرد سے کیونکہ شاید وہ بھی مرد ہو اور نہ عورت سے کیونکہ شاید وہ بھی عورت ہو اور کہیں دوسرے خنثیٰ مشکل سے کیونکہ شاید دونوں مرد ہوں یا دونوں عورت ہوں اور اس کے تمام احکام میں دونوں جہتوں کا لحاظ کرکے بے حد رعایت کی گئی ہے جس سے فقہائے اسلام کی باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے اور فقہ میں اس کا ایک مستقل باب منعقد کیا ہے اگرچہ ایسے شخص کا وجود بہت ہی نادر ہوا اس لئے اس کے احکام[1] کا بیان یہاں ضروری نہیں سمجھا گیا۔

ولد الزنا سے نکاح بھی ہو جاتا ہے ایک صورت تحریم حلال کی بعض عوام سے سنی گئی کہ ولد الزنا و حرامی اولاد کے نکاح کو بھی باطل سمجھتے ہیں، سو یہ بھی غلط ہے، اپنے کفو سے بھی درست ہے اور غیر کفو سے بھی، جہاں کفاءت کا شرط ہونا شرعاً ضروری نہ رہے وہ بھی درست ہے، جس کی تفصیل کے لئے فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

نان و نفقہ کی خبرگیری نہ کرنے سے از خود نکاح باطل نہیں ہوتا ایک صورت تحلیل حرام کی عوام نے ایک اور اختراع کر رکھی ہے، یعنی جو مرد نان و نفقہ کی خبرگیری نہ کرے یا مقدور و طاقت نہ رکھے اس کے نکاح کو از خود منفسخ و ختم سمجھ کر اس کا نکاح دوسری جگہ کر دیتے ہیں، اسی طرح جو عورت شوہر کے گھر سے نکل کر بدکاری کرنے لگے یا شوہر اس کو نکال کر ایک عرصہ دراز تک اس سے تعلق نہ رکھے اس کو بھی نکاح سے خارج سمجھ کر نکاح ثانی کی اجازت دیتے ہیں، یہ سب بالکل غلط در غلط ہے، البتہ تفریق معسر (بنا برناداری کے باعث تفریق) میں امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ مسلمان حاکم جس کو سلطنت نے ایسے مقدمات کا باضابطہ اختیار دے دیا ہو، اعسار (ناداری) کی حالت میں نکاح فسخ کر دیگا، اور بدون اس شرط کے وہ بھی از خود منفسخ نہیں کہتے جیسا عوام نے غلط سمجھ رکھا ہے، جس طرح مفقود کی تفریق نکاح میں امام مالکؒ کے مذہب پر قضاء قاضی شرط ہے جس کو بندہ نے اوپر بھی لکھا ہے، اسی طرح اس کا کتب مالکیہ میں بھی تصریح ہے، (اس وقت اس کا پتہ بھی عرض کئے دیتا ہوں، زرقانی مالکیؒ نے شرح مؤطا میں ایک ہی عبارت میں دو جگہ اس کی تصریح کی ہے، بندہ کے تتمہ ثانیہ امداد الفتاویٰ ص ۱۰۹ میں وہ عبارت بعینہٖ منقول ہیں، ضرور ملاحظہ فرمائیں) بہرحال حلت و حرمت میں سخت احتیاط درکار ہے۔

یہ ضمیمہ ختم ہوا۔ ۲۴ ربیع الاول [illegible]ھ

---

[1] جہاں ایسے مسائل کی ضرورت پڑے تو علماء محققین یا کسی معتبر دار الافتاء سے رجوع کیا جاوے۔ (محمد رفیع)

ضمیمۂ ثانیہ

در نقل رسالہ

الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ

متعلق بعض اغلاط متعلقہ تعزیۂ متعارفہ

کہ خط یکے از   کا ناقص است!

برادر عزیزم سلمہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آں عزیز کے متعدد خطوں کی رسید اور تعجیل (جلدی) جواب نہ ہو سکنے کا عذر جس کے آنے تھے، ان کو آئے ہوئے تقریباً پچیس روز ہو گئے ہوں گے۔ ایک کارڈ پر لکھ چکا ہوں گو مجھ کو بفضلہ تعالیٰ بخار سے نجات ہو گئی ہے، لیکن ضعف ونقاہت سے کسی معمولی سے معمولی کام کی بھی ہمت نہیں ہوتی، مگر ساتھ ہی آں عزیز کے انتظار کے تصور سے اضطراب اور خود اس جواب کا بھی غالباً بعض مضامین مفیدہ کو متضمن ہونا شامل ہونا، یہ دونوں امر مقتضی تھے کہ بنام خدا جواب شروع تو کر ہی دوں، باقی تمام قبضۂ قدرت الٰہیہ میں ہے، اس لئے اختصار کے ساتھ مگر قدرے ضروری تفصیل کے ساتھ جواب خط لکھتا ہوں۔

آں عزیز نے لکھا ہے کہ اتنا معلوم ہوا کہ اس جدید تعلق سے بھائی صاحب کی حالت میں بہت تغیر ہو گیا ہے، اور آپ کو بھی کچھ باعث مسرت نہ ہوا۔

عزیزمن! یہ دونوں امر صحیح ہیں، اس تفصیل کی تو حاجت نہیں کہ کیا تغیر ہوا؟ اور اس تغیر کے سبب مجھ کو کیا تکدر ہوا؟ کیونکہ اول تو اس کی حقیقت معلوم ہونا مشاہدہ پر موقوف ہے، دوسرے کم شخص ایسے ہوں گے جنہوں نے اس کے تغایر کا مشاہدہ نہ کیا ہو، اس لئے یہ تفصیل بیکار ہے۔

تغیر کے اسباب

البتہ قابل تحریر بات اس تغیر کے اسباب کی تحقیق ہے، جس کی تقریب سے خود تغیر تک ذہن پہنچ جائے گا، اور ممکن ہوا آخر میں اس کی کچھ تصریح بھی کر دی جائے۔ سو ان اسباب کا مجموعہ راجع ہے دو امر کی طرف۔ ایک حد سے زیادہ جاہل ہونا خصوصاً اناث (عورتوں) کا، خواہ جہل علمی یعنی ناواقفی شرائع و علمی جہالت یعنی شریعت سے ناواقفیت ہونا، خواہ جہل عملی جس کو بہاری محاورہ میں جہالت کہتے ہیں، جس کے شعبوں میں زیادہ تر شعبہ بدگمانی و بدزبانی و کبر

شوہر کے نکاح ثانی کر لینے پر عقلاء کے نزدیک اس کی پہلی بیوی کو تلقین صبر کرنا دلیل ہے

اپنے نزدیک تو صاحب معاملہ کے ساتھ ہمدردی کی جاتی ہے مگر یہ طریقہ
نہیں کہ اس سے تو اور دونا غم کو مشتعل ہوتا ہے، ایسے وقت میں سخت
ضرورت تسلی دینے کی ہوتی ہے جس کا طریقہ عام عقلاء کے نزدیک تو
صبر دلانا ہے، اور جو جو شبہات آئندہ کے متعلق صاحب معاملہ کو واقع ہوں مثلاً یہ کہ (۱) میرے ساتھ
التفات نہ رہے گا، (۲) میرے حقوق ضائع کر دیئے جائیں گے، (۳) جدیدہ کی چغلیوں سے مجھ کو تکلیف
دی جائے گی ان سب شبہات کو خوبصورتی سے رفع کرنا، اور میرے نزدیک ایسے موقع پر تسلی کا
طریقہ یہ ہے کہ اس کو مصیبت ہی تسلیم نہ کیا جائے کہ صبر کی ترغیب دی جائے، اور یہ جو میں نے کہا کہ
"ایسے موقع پر تسلی کا طریقہ یہ ہے" مراد ایسے موقع سے وہ موقع ہے جہاں اس کا تعدد ہونا بھی ثابت
کر سکے، جیسے ۔

حضرت حکیم الامت کا طریق عمل

بفضلہ تعالیٰ اس ناکارہ کی حالت یہی رہی وہ یہ کہ میں نے قدیمہ (یعنی
پہلی بیوی) کی دلجوئی میں بہ نسبت (پہلے سے بہت زیادتی) کر دی گو میں نے کوئی گناہ کا یا
عیب کا کام نہ کیا تھا، لیکن اُن کے بعض زبانِ شکایت (شکایت کے دوران غم کا جوش) ہا ہے؛
میں اُن کے تجاوز عن التہذیب (تہذیب کی حد سے گذرنے) کو غلبۂ حال پر محمول کر کے ان کو معذور
قرار دیا، اور اس طرح سکون و سکوت و ضبط سے کام لیا جیسے کوئی عیب کر کے خجل و شرمندہ ہوتا ہے
اور تمام تر جوش و خروش کا جواب ان الفاظ سے دیا کہ خیر میں نے دل سے سب معاف کیا، اللہ تعالیٰ
تمہاری اصلاح فرمائے، میں بوجہ مشغولی و کثرت مشاغل خدمت خلائق ان سے بالکل بے فکر ہو گیا تھا
بعض اوقات دن دن بھر گھر جانے کی نوبت نہ آتی تھی ہمیشہ کتابیں پڑھ کر سو رہتا، بات کی بھی
فرصت نہ ملتی تھی مگر اب اُن کی دلجوئی کا خاص اہتمام شروع کر دیا، ذرا ذرا ... بات میں ان کی رعایت
ملحوظ رکھنے لگا، چونکہ میرا مزاج فطرۃً تیز ہے اور عورتوں میں کچھ رعایتیں لازم ہیں، کسی میں کم کسی
میں زیادہ، اکثر جب کبھی ایسا موقع پیش آتا تھا اس میں تحمل (برداشت) نہ کرتا تھا فوراً زبان سے بھی
تیز الفاظ کہتا، اور عملاً بھی، بعض اوقات کھانا چھوڑ کر گھر سے مدرسہ میں چلا آتا تھا، ایسا اتفاق
بکثرت ہوتا تھا، جب سے یہ واقعہ ہوا اُس برتاؤ کا نام و نشان نہیں رہا، اور باوجود کتنی ہی بھی ہوئی ہو
سے بہت زیادہ نرمی اور راستی و سیدھا پن برتی گئی، خلاصہ یہ کہ اس قدر نرم برتاؤ اختیار کیا گیا
کہ بعض لوگ تو مجھ کو بے غیرت کہنے لگے، بعضے بیوی سے ڈرنے والا، دبنے والا کہنے لگے، بعض نے یہ
رائے قائم کی کہ یہ نرمی ہی سبب ہے دوسری جانب کی دلیری کا، البتہ یہ تو ہوا کہ جب کبھی شریعت پر

اعتراض پہنچنے لگا کہ صاحب اعتراض کو اس کا احساس نہیں ہوا ، بیہودگی کو زیادہ استمرار ہونے لگا ، اول تو نرمی سے فہمائش کر دی ، اگر بے جا اصرار ہوا تو دوبارہ فہمائش دکھلانے میں قدرے آواز بلند ہوگئی ، مگر اس میں بھی الفاظ خشن و درشت اور تیزی سے زبان کو نہایت تکلف کے ساتھ روکا

غرض یہ خلاصہ تھا اور ہے میری حالت کا ، تو اس میں غور کرکے ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ میرا برتاؤ پہلے سے زیادہ اچھا ہوگیا ، اور یہ سبب ان کی دل شکنی کے احتمال پر دلجوئی اور اس دلجوئی کا سبب یہی واقعہ جدیدہ ، تو اس صورت میں کیا شک رہا ، کہ اس واقعہ کا قدیمہ کے حق میں نعمت ہونا بھی نہایت آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے ، یہ تشریح تسلی کا یہ تھا ، اور اگر یہاں تک تو بات پہنچتی تو غنیمت ہی کی تعلیم دی جاتی ، اگر دو چار عاقل عورتیں بھی اس طرف توجہ کرتیں تو ان کے رنج و غم کی یہاں تک نوبت نہ پہنچتی ، مگر ہوا یہ کہ ان کے خیالات کی جن میں اکثر خیالات بالکل لغو اور بے بنیاد تھے تصدیق ہی کر لی گئی ، کسی نے تکذیب نہیں کی ، الا ماشاء اللہ ، اور تصدیق بھی سر خوشامد میں ، اور اس مصلحت سے کہ یوں نہ کہیں کہ فلاں کو میرے ساتھ ہمدردی نہیں ، بس اس تصدیق سے ان کے اوہام اور خیالات اور پک گئے ، اور وہ مثال ہو گئی جیسے کسی مولوی کو اس کے مکتب کے لڑکوں نے باہم متفق ہو کر بیمار بنا دیا تھا کہ ہر آنے والا کہتا ہے خیر ہے ، چہرہ اترا کیوں ہے ؟ آخر بیچارہ بیمار پڑ گیا :

جو شخص اپنی اصلاح خود نہ چاہے نبی بھی اس کی اصلاح نہیں کر سکتے :

میں نے اس دلجوئی کے علاوہ اصلاح باطن کے طریقوں سے اس قدر کام لیا کہ شاید بیس پچیس برس کی مدت میں کسی کے لئے نہ لیا ہوگا ، ان میں بعض طریقے منقول تھے اور بعضے بزرگوں کے کلام سے مستنبط کئے ہوئے اور ایسے لطیف لطیف کہ اگر ان کی کوئی قدر کرتا تو ضبط کر لیتے تو ایک بے نظیر رسالہ ہو جاتا ، اور عمل کرنے سے انسان کامل بن جاتا ، مگر تجربہ سے معلوم ہوا اور پہلے سے بھی معلوم تھا مگر اب اور زیادہ معلوم ہو گیا کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے اس کی اصلاح کوئی مخلوق نہیں کر سکتا حتیٰ کہ نبی بھی ،

اپنے مصلح کے ساتھ اصلاح کے لئے اعتقاد اور انقیاد ہونا ضروری ہے :

دوسرے یہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ اصلاح کے لئے معلم و اصلاح کرنے والے پیر و مرشد کے ساتھ اعتقاد و عظمت و ہمت شرط ہے ، اور شوہر کے ساتھ یہ دونوں امر ضعیف ہیں ، بہر حال میں نے تھک کر حق تعالیٰ سے التجا اور دعا شروع کی ہے ، اور حضرت زکریا علیہ السلام کے قول کے موافق ۔

وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (مریم ، آیت ۴)

اور اس کے قبل کبھی میں آپ سے مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں

امید قبول رکھتا ہوں اور غالباً پہلے کی نسبت سکوت و سکون دونوں کی رفتار ترقی پر ہے، اور جیسا عرض کیا روز افزا انحطاط ہوا امید قوی زوال صحت کی ہی ہوتی ہے، یہ تو خلاصہ تھا اُن کے ہم اور اس غم میں اُن کے ساتھ میرے معاملہ کا۔

اللہ تعالیٰ معرفت نصیب کرے تو کلفت بھی مسرت ہے

اس سے آنعزیز کے اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو گیا کہ آپ کو بھی کچھ باعث مسرت نہ ہوا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کیا مسرت ہو سکتی ہے، جبکہ سب اسباب مسرت پر اسباب کلفت غالب ہوں، مگر یہ نفی مسرت کی جو میں نے تسلیم کر لی یہ ظاہری مسرت کے اعتبار سے ہے، ورنہ باطناً تو اگر اللہ تعالیٰ معرفت نصیب کرے یہ کلفت بھی مسرت ہے، کیونکہ مسرت کے جو منافع ہیں اس کلفت میں اس سے کم نہیں بلکہ بہت زیادہ حاصل ہیں، گو اس زیادہ پر نظر کر کے کلفت کی تمنا کرے اور نہ اس کے رفع کی دعا کو ترک کرے، حق تعالیٰ سے ہر بار عافیت مانگتا رہے۔ لیکن جب تک عافیت ظاہری نہ ہو اس میں مصلحتیں و حکمتیں سمجھ کر دل سے راضی اور ثواب کا متوقع (امیدوار) رہے، چنانچہ الحمد للہ کچھ کچھ اس پر عمل ہے، جس سے زخم پر مرہم رکھا جا رہا ہے، ورنہ ؎

جل بودے اگر این مرہم نبودے

اسباب تغیر حالات اور محبت بھی

ہاں میں نے اسباب تغیر میں ایک امر جہل بتلایا تھا، دوسرا امر محبت بی بی کو شوہر کے ساتھ مسرت کے جواب سے اس کو ترتیب میں مقدم لکھنا چاہیے تھا، مگر چونکہ امر اول کا ذکر ابھی دور نہیں ہوا، گویا دوسرا اس اول کے ساتھ مذکور ہے۔ اس امر ثانی کی سببیت اس طرح ہے کہ جو بی بی کو شوہر سے خصوصاً ہندوستان میں یہاں کی آب و ہوا کی خاصیت سے محبت زیادہ ہوتی ہے، اور خاصہ محبت کا یہ ہے ؎

با سایہ ترا نمی پسندم ؎ عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہیں، اسی لئے محبوب کے سایہ کے ساتھ بھی کسی کا ساتھ رہنا عاشق کو پسند نہیں)۔

پس اس سے یہ شرکت کہ اس کے شوہر میں دوسری آ کر حصہ دار ہو جائے سخت ناگوار ہوتی ہے، اور گو یہ شرکت دوسری کو بھی کسی قدر ناگوار ضرور ہے لیکن پھر دونوں میں یہ فرق ہے کہ دوسری تو اول ہی سے شرکت کو گوارا کر کے آتی ہے، اور پہلی مدتوں انفراد و اختصاص کی حالت میں رہ چکی ہے، اس کو خلاف

ارادہ وخلاف توقع وخلاف رضا یہ شرکت پیش آتی ہے، اس لئے اس کو زیادہ صدمہ ہوتا ہے، اور اس کا خلافِ ارادہ وخلافِ رضا ہونا تو ظاہر ہے، باقی خلافِ توقع اس لئے کہ ہندوستان میں اس کا رواج اتنی قلت کا ہے گویا کہ ہے ہی نہیں،

رسم کو جذبات میں بڑا دخل ہے

اور رسم کو جذبات میں جیسا دخل ہوتا ہے، اور یہاں تک دخل ہوتا ہے کہ جو امر خلافِ ارادہ وخلافِ رضا بھی نہ ہو مگر خلافِ رسم ہونے کے سبب خلافِ ارادہ و . . . . رضا ہونے کا بھی اثر نہیں رہتا، چنانچہ بعض جگہ مسئلہ یہ ہے کہ منکوحہ اولیٰ خود ہی دوسری کو اپنی رغبت و کوشش سے لائی، لیکن پھر آنے کے بعد ناگواری یا اس درجہ تک پہنچ گئی جیسے اس کی لائی ہوئی نہ ہوتی، بہرحال یہ محبت بھی اس کا سبب ہے،

امر طبعی میں انسان معذور ہے

اور اگر اس درجہ سے کہ محبت امر طبعی ہے تو اس کا مسبب یعنی ناگواری بھی امر طبعی ہوگا، اور امر طبعی میں انسان معذور ہے، اس لئے منکوحہ اولیٰ نفسِ ناگواری میں معذور ہے، لیکن اگر محبت کے ساتھ علم ہوتا تو یہ ناگواری حدِ اعتدال سے نہ بڑھنے پاتی اور بلاشک وہ غایت مقالہ ہوتی

شہوت وغضب وحسد وکبر کا صدور رذائل کے سبب ہے

لیکن چونکہ محبت کے ساتھ مجموعہ سبب کا ایک جزو جہل بھی ہے جو کہ اختیاری ہے، یا بایں معنی کہ اس کا ازالہ اختیاری ہے، اور پھر شرعاً وعقلاً مذموم ہے اس لئے اس مجموعہ سبب پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں ان میں جس قدر آثار جہل کے حصہ کے ہیں اس میں مطلق وحقیقۃً معذوری نہیں ہوگی، اس لئے یہ رائے کہ علی الاطلاق ان امور میں سوتیا ڈاہ (سوتن) ہونے کا عنوان کے سبب معذور سمجھا جائے محض غلط ہے، ورنہ اس کیفیت غیظ وغضب کی حالت سے زیادہ اکثر اوقات کیفیاتِ شہوت وغضب وحسد وکبر جن سے صدورِ معاصی کا ہوتا ہے غالب ہوتی ہیں، تو چاہئے کہ کوئی گناہ کوئی چیز ہی نہ ہو اور بطلان (غلط ہونا) اس کا ظاہر ہے، یہ تحقیق تھی ناگواری کے دونوں پہلوؤں کی، اب اسی تقریر سے ان اسباب کے متعلق جو بات تجویز ہے وہ بھی معلوم ہوگئی،

منکرات اور جذبات کی اصلاح تعلیم دینی اور تربیت روحانی سے ہو سکتی ہے،

پس امر اول کے متعلق تو وہ بات یہ ہے کہ تعلیم و اصلاح نفس کی کمی جب سبب ان پریشانیوں کا ہے جن کا واسطہ در واسطہ . . . پہنچتا ہے تو اس کا تدارک سب عقلاء کو متفق ہو کر کرنا چاہئے، مگر یہ جان لینا چاہئے کہ تعلیم و تہذیب سے مراد تعلیم دینی و تربیت روحانی ہے نہ کہ تعلیم و تہذیب جدید کہ اس کو ملکات وجذبات وعادات وخصائل کی اصلاح میں جس کی کہ ضرورت ہے کوئی دخل نہیں، چنانچہ ظاہر ہے بلکہ وہ تو اس میں بالعکس مضر ہے، چنانچہ تجربہ شاہد ہے اگر عورتوں کو علم دین وحالِ باطنی ہو چکا،

طریقہ سے ترغیبات دینی و حالات اہل اللہ پر غور اور وقتاً فوقتاً ان ناقصات العقل (کم عقل رکھنے والیوں)
کے اقوال و افعال پر درگذر کرتے رہنا ہے، تو ان بیہودہ اقوال میں سے ایک قول زبان پر تو کیا
قلب میں بھی نہ آنے پائے، اور یوں حزن طبعی ہونا عجیب نہیں، تو اگر اس میں اعتدال ہو تو موجب
اجر ہے، اور صبر کرنے سے بتدریج (آہستہ آہستہ) خود سکون بھی ہو جاتا ہے:

اور مرد ثانی کے متعلق وہ بات یہ ہے کہ حالت موجودہ میں بدون اضطرار شدید (بغیر سخت ضرورت
کے جس کا فیصلہ نفس سے نہ کرنا چاہئے، بلکہ عقل سے کرنا چاہئے، بلکہ عقلاء کے مشورہ سے کرنا چاہئے،
بدون اضطرار کے ہرگز نکاح ثانی نہ کرنا چاہئے، خصوصاً پختگی سن کے بعد کہ منکوحہ اولیٰ کو مصیبت فکر
ہو چکنے کے فکر میں ڈالنا ہے، اور چونکہ اس کا لازم حال ہے وہ اپنا رنگ لائے گا اور اس رنگ کے
پھیلنے سے نہ تم بچو گے نہ منکوحہ ثانیہ بچے گی، خواہ مخواہ دریائے غم میں بلکہ دریائے خون میں سب
غوطے لگائیں گے، خصوصاً جبکہ مرد بھی عالم اور متحمل نہ ہو،

تعدد ازواج والے عموماً ظلم و ستم کے معاصی میں مبتلا ہیں

عالم نہ ہونے سے وہ حدود عدل کو نہ سمجھ سکے گا، اور متحمل نہ ہونے سے ان حدود
کی حفاظت نہ کر سکے گا۔ اس وجہ سے وہ ضرور ظلم میں مبتلا ہوگا، چنانچہ
عموماً اکثر ازواج متعددہ (کئی بیویوں) والے جور و ظلم (ظلم و ستم) کے معاصی میں مبتلا ہیں، کیونکہ
حقوق اس حد تک (ایک سے زیادہ ہونے) کے اس قدر نازک ہیں کہ ہر ایک کا نہ وہاں ذہن پہنچ سکتا
اور نہ ان کی رعایت کا حوصلہ ہو سکتا ہے،

تعدد ازواج کی صورت میں باہم عدل رکھنے کے چند فقہی مسائل

چنانچہ باری باری شب کو رہنے میں اور ملبوس و ماکول (لباس، اور کھانے
پینے) میں برابر رکھنے کا وجوب (واجب ہونا) سب جانتے ہی ہیں، مگر
اس تک کا اہتمام نہیں، باقی ان مسائل کا تو کون خیال کرتا ہے، کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایک
بیوی کے پاس بعد مغرب آجاتا ہے اور دوسری کے پاس بعد عشاء، تو اس نے عدل کے خلاف کیا،
اور لکھا ہے کہ ہر ایک کی باری میں دوسری سے صحبت جائز نہیں، اگرچہ دن ہی ہو، اور لکھا ہے کہ
ہر ایک کی باری میں دوسری کے پاس جانا بھی نہ چاہئے، اور لکھا ہے کہ اگر مرد بیمار ہو گیا اور اس وجہ سے
دوسری کے پاس نہیں جا سکتا اس لئے ایک ہی کے پاس رہا تو بعد صحت کے اتنی مدت دوسری کے پاس
رہنا چاہئے، اور رہنے بیٹھنے میں برابری کرنے کی جزئیات بھی اس قدر دقیق (باریک) ہیں کہ ان کی
رعایت ہر شخص کا کام نہیں،

تعدد ازدواج میں عدل نہ ہونے کا احتمال قوی اور غالب ہے

مجھ کو اس قدر دشواریاں اس میں پیش آئیں کہ اگر علم دین اور تحقیق توفیق حق تعالیٰ نہ عطا فرماتے تو ظلم سے بچنا مشکل تھا، سو ظاہر ہے کہ اس مقدار علم اور اس قدر اہتمام کا عام ہونا بعید بلکہ ابعد (زیادہ دور) ہے، نیز ہر شخص کو نفس کا مقابلہ کرنا بھی کارے دارد، دشوار کام ہے، اب تعدد ازدواج بجز اس کے کہ صاحب حق کا حق ضائع کر کے عاصی و گنہگار ہو کیا نتیجہ ہو سکتا ہے،

اور یہ تو حقوق واجبہ تھے، بعضے حقوق مروت کے ہوتے ہیں گو واجب نہیں ہوتے، مگر ان کی رعایت نہ ہونے سے دل شکنی ہوتی ہے جو کہ حقوق رفاقت کے خلاف ہے، ان کی رعایت اور بھی دقیق اور نازک ہے، غرض کوئی شخص ہر وقت کے واقعات و معاملات کے جزئیات کو خیال رکھے اور مستحضر رکھے، پھر ان واقعات کے احکام علماء سے پوچھے، پھر ان پر عمل کرے تو نانی یاد آجائے گی، اور تعدد ازدواج سے توبہ کرے گا، اِلَّا اَنْ تُسْتَکْمَلَ اِلٰی ذٰلِکَ بِوَجْہٍ مِّنَ الْوُجُوْہِ الْقَوِیَّۃِ، مگر کوئی شخص کسی قوی سبب سے مجبور ہو، دوسری بات ہے، اسی لئے حق تعالیٰ نے اجازت تعدد کے بعد اس احتمال کو معترضاً ارشاد فرمایا،

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً،	پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو۔

خود حق تعالیٰ کا اس کو اس طرح فرمانا صریح دلیل ہے کہ یہ احتمال بہت ہی غالب اور قوی ہے، پھر اکتفاء علی الواحدہ (ایک پر کفایت کرنے) کی نسبت اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا فرمانا یہ اس احتمال کی جانب وجود کو جانب عدم پر صاف ترجیح دے رہا ہے، اس لئے ع

اگر خواہی سلامت بر کنار است

کا اختیار کرنا اسلم ہے، نتیجہ مقصود جس کو میں بعد ذکر اسباب کے ذکر کرنا چاہتا تھا اور جس پر کچھ مزید زور دینا چاہتا ہوں، اور کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ خود کیوں اس مشورہ کے خلاف کیا، بات یہ ہے کہ خلاف کرنے ہی سے یہ مشورہ سمجھ میں آیا، ع

من نکردم شما حذر بکنید

میں نے طبقہ اناث سے وعدہ کیا تھا کہ میرے فعل کو تم سبب نہ سمجھنا مردوں کی جرأت کا تعدد ازدواج پر، میں اپنے فعل کے نتائج بتلا کر اس فعل کو سبب بنا دوں گا مردوں کے رک جانے کا تعدد ازدواج سے، کیونکہ اس فعل سے مجھ کو تجربہ ہو گیا، اور تجربہ کار کا قول زیادہ ماننے کے قابل ہے۔

پس میں اپنے تجربہ کی مدد سے اپنے احباب اور بھائیوں کو اس تعدد سے مشورۃً منع کرتا ہوں اگر میں گذر میں اس تعدد کو اختیار نہ کرتا تو میرے اس منع کی زیادہ وقعت اس وقت ہوتی خواہ آپ ترک نہ کرتے تو بعید نہ تھا لیکن اب اس ممانعت کی خاص وقعت اور اس ممانعت پر عمل کرنا چاہیے۔ مگر ساتھ ہی احکام شرعیہ میں تحریف نہ کی جائے۔

بعض نے آیت فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً "اگر تم کو احتمال ہو اس کا کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو" اور وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ "اور تم سے یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں برابری رکھو" میں اقتضاء کو جمع کر کے معنوی تحریف کی ہے جس کی تفسیر بیان القرآن میں کر دی گئی ہے[1]:

تعدد ازواج اختیار نہ کرنا ہی اسلم ہے۔

بہر حال حکم شرعی تو یہی ہے کہ تعدد ازواج میں نکاح تو منعقد ہر حال میں ہو جاتا ہے خواہ عدل ہو یا نہ ہو لیکن عدم عدل و انصاف نہ کرنے کے وقت گناہ ہوگا اس لئے اسلم یہی ہے کہ تعدد اختیار نہ کیا جائے، ایک ہی پر قناعت کی جائے اگرچہ ناپسند ہو

فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (النساء، آیت ۱۹)

"اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔"

الا اضطراری مستثنیات من قید اگر اضطراری حالت نے اس سے قبل کے بیان میں مستثنیٰ کر دی۔

---

[1] یہاں اس تفسیر کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوا وھو ہذا: بعض ہوا پرستوں نے دنیوی غرض سے آیات الٰہیہ کے مضمون میں تحریف کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت باطل کرتی ہے تعدد ازواج کو، اس طرح سے کہ بیان فرمایا کہ جب عدل نہ ہو سکے تو ایک پر اکتفا کرو اور دوسری آیت میں فرما دیا کہ تم سے کبھی عدل ہی نہ ہو سکے گا۔ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ، دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ جائز نہیں، تو یہ محض مغالطہ ہے کیونکہ دونوں آیتوں میں عدل جدا جدا معنی میں ہے اس آیت میں تو عدل فی الحقوق الواجبہ ہے جس کی تصریح بھی کر دی اور یہ قدرت میں ہے اور اس کے اعتبار سے واحد و کثیر کے اختیار میں تفصیل فرمائی ہے اور اس آیت میں عدل فی المحبت ہے اور وہ عادتاً قدرت میں نہیں اس لئے اس کی نفی فرمائی۔ پس اس ہوا پرست کے دعویٰ سے اس کو اصلاً مس نہیں، بلکہ اس آیت میں بعد نفی عدل کے ارشاد ہے فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ جس کا حاصل یہ ہے کہ گو ہم جانتے ہیں کہ عدل فی المحبت نہ ہو سکے گا، مگر قلب تو ایک طرف میلان نہ ہوگا اور اس میلان پر

حضرت حکیم الامتؒ کے نکاح ثانی کے اسباب

آگے آنعزیز لکھتے ہیں کہ بنائے کار کی بابت معلوم ہوا کہ مشیت پر مبنی تھا اور چند مصلحتیں بشری بھی تھیں، ورنہ ضرورت کا سوال نہ تھا، عزیز من یہ دونوں بالکل صحیح ہیں، لیکن عنوان ان کا مجمل ہے، تفصیل نہ ہونے سے محبین و معتقدین کے غلو کا احتمال ہے، کیونکہ اس کے یہ معنی سمجھے جائیں گے، کہ کوئی الہامی حکم ہوا ہوگا، اس وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا جو غلو فی تقدس بھی ناپسندیدہ ہے، پھر تلبیس (ملاوٹ) اس میں اور بھی زیادہ مذموم ہے، اس لئے میں نے اصلی حالت کو منکشف (ظاہر) کرتا ہوں،

سب سے اول اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ میرا یہ فعل کسی مصلحت کی نیت سے یا کسی اشارۂ غیبیہ پر عمل کرنے کے قصد سے نہیں ہوا، سبب قریب اس کا محض طبیعت کا تقاضا تھا، مگر اس تقاضے میں کسی امر غیبی کو دخل ہوا ہو تو بعید نہیں، پھر اس پر بہت سی مصلحتیں بھی مرتب ہو گئی ہیں، بلا تشبیہ (بغیر مشابہت کے) ایسی مثال جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طور پر تشریف لے جانا بہ قصد عطائے نبوت (نبوت عطاء ہونے کا ارادہ) نہ تھا، آگ کی ضرورت پر طبعی تقاضا تھا، مگر وہاں جانے پر خاص عطاء مرتب ہو گئی،

قصہ اس کا یہ ہے کہ میں نے مدت ہوئی ایک خواب دیکھا تھا کہ مجھ سے نکاح کے لئے کہا جا رہا ہے میں بطور تردد کے یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر میں کا کیا حال ہوگا؟ تو اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ وہ قرآن شریف پڑھا کریں گی، میں بیدار ہوا تو قرآن شریف پڑھنے کے معنی تو یہ سمجھا کہ ایسے مشاغل دینیہ میں مشغول ہو کر اس غم کو بھول جائیں گی (چنانچہ اس کا سامان بھی ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے)، لیکن خواب کو کچھ زیادہ باوقعت نہیں سمجھا، بلکہ اس کے اتباع کا خیال تو کیا کرتا، اس کی کوشش کی کہ ایسا موقع نہ ہو، چنانچہ اپنے بھتیجے سے پہلا نکاح کر دیا گیا، اور طبیعت خالی ہو گئی، خدا کی قدرت وہ بیوہ ہو گئی، تو اس کی کوشش کی کہ اس کا کہیں نکاح کر دیا جائے، چنانچہ متعدد مواقع پر اس کی تدبیر و تحریک کی گئی، لیکن کہیں سامان نہ ہوا، نیز میں نے بڑی تدبیروں سے اس کو اپنے سے پردہ کرا دیا، اپنے مکان میں تدبیر لطیف (نرم تدبیر) سے اس کی آمد و رفت و بود و باش اس قدر کم کرا دی کہ قریب منقطع کے کر دی، تاکہ وہ احتمال بالکلیہ مدفوع و مسدود (ختم) ہو جائے، نیز میں اس امر کو خود اپنی مصلحت کے خلاف بھی سمجھتا تھا، کہ میرا زمانہ ان باتوں کا نہیں رہا، آزادی کے بعد پابندی سخت امر ہے، اور منکوحہ اولیٰ کی مصلحت کے خلاف بھی سمجھتا تھا، کہ ان کی سخت دل شکنی و دل آزاری بھی ہو گی، اور اس منکوحہ ثانیہ کی مصلحت کے

خلاف بھی سمجھتا تھا کہ اس کی عمر کو ضائع کرنا ہے، اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا، اس اثنا میں ایک ذاکر
مزاج و مکشوف رشتہ دار ہوا، کہ حضرت کو حضرت عائشہ رض آئی ہیں، انھوں نے مجھ سے کہا میرا ذہن
منشا س طرف منتقل ہوا، اس مناسبت سے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض سے نکاح
کیا، حضور کا سن شریف بھی اس سے زیادہ تھا اور حضرت عائشہ رض بہت کم عمر تھیں، وہی قصہ یہاں ہو
مگر میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، پھر میرے ایک دوست نے ایک بہت بڑے شیخ کامل کو
جو اس وقت افادہ خلائق و مخلوق کو فائدہ پہنچانے میں مشغول ہیں، خواب میں دیکھا کہ وہ میری
آمدنی کی تقسیم کا ایک خاص طریقہ بتلا رہے ہیں، کہ جس طرح کا خاکہ میرے ذہن میں بطور احتمال خطور
کیا کرتا تھا کہ اگر ایسا امر ہوا تو آمدنی کو اس طرح تقسیم کیا کروں گا، اور میں نے اس کا کسی سے ذکر بھی
نہیں کیا تھا، تو خواب میں سادہ ہی طریقہ یا اس کے قریب قریب مدت گزرنے سے ایسی طرح بتایا!
وہ بزرگ بتلا رہے ہیں، ان دوست نے جو عالم ہیں مجھ سے ذکر کیا، میں اس سے بھی وہی واقعہ تھا، مگر
باوجود ان سب منامات و مکاشفات صلحاء و نیک لوگوں کے خواب اور کشف کے میں نے اس قصہ کو
اپنے دل میں زیادہ جگہ نہیں دی، اور اس کی مدافعت و روک تھام کی کوشش کی، یہاں تک کہ اس
رمضان مبارک ۱۳۹۰ھ کے نصف کے بعد پھر میں نے خواب دیکھا کہ خواب اور ان سے زیادہ موثر ذریعہ ہے؛
عنوان سے مجھ کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ منکوحہ اولی سے
ڈر لگتا ہے،

اس خواب کے بعد طبیعت میں وہی تقاضا جو دبا دیا گیا تھا یا دبا دیا گیا تھا پہلے سے بہت زیادہ
قوت کے ساتھ پیدا ہوا، اور وہ اپنی قوت سے ایسا غالب آیا کہ میں اس کی مخالفت نہ کر سکا، اور سب
مصالح و موانع، مصلحتیں اور رکاوٹیں، مغلوب ہو گئے، یہاں تک کہ میں نے ایک عزیز کو اس پیام
لے جانے کے واسطے تجویز کیا، اور ان سے ذکر کیا، انھوں نے ایک بڑے شیخ کا جو کہ ظاہری و باطنی
افادہ میں بفضلہ تعالیٰ مشغول ہیں نام لیا کہ انھوں نے مجھ سے تصریحاً فرمایا تھا کہ ایسا ہو جائے تو بہتر ہے
مگر لحاظ اس کے اظہار سے مانع رہا تھا، اس کو ظاہر کر دیا، چونکہ اہل اللہ کے قلب میں بوجہ نورانی
ہونے کے اکثر امر صواب وارد ہوتا ہے، اس سے کسی قدر اپنے خوابوں کا اور دوسرے صلحاء کے
مکاشفات وغیرہ کا محض اضغاث احلام (پراگندہ خواب) نہ ہونا راجح ہونے لگا، آخر اس عزیز کا
پیام لے کر روانہ کر دینا طے کر لیا گیا، ہنوز (ابھی) وہ روانہ ہوئے تھے، میں ایک بار خلوت میں
بیٹھا تھا دفعۃً (اچانک) خیال آیا کہ ظاہر میں یہ معاملہ بے ربط سا معلوم ہوتا ہے معلوم نہیں

اس قدر تعب میں اس کا تقاضا کیوں ہو، فوراً ہی قلب میں بیساختہ یہ وارد ہوا کہ جیسے درجات موقوف ہیں مقبولِ جادہ ہونا کی پر حزن سے اب تک محروم ہے کیونکہ تیرا جادہ ہر حیلے سے انتہا کو پہنچ گیا ہے پس اس واقعہ میں حکمت یہ ہے کہ تو رنجیدہ ہوگا اور حق تعالیٰ وہ درجات عطا فرماویں گے، بس یہی تھی وہ مشیت خاص جس پر یہ قصہ بھی تھا اور یہ تھیں وہ خاص مصلحتیں جو اس ..... قصہ پر مرتب تھیں۔

خلاصہ یہ کہ میری تحریک تو طبیعت کے تقاضے سے تھی باقی یہ تقاضا خود ان واقعات ہی سے ہوا اور پھر اس میں حکمتیں بھی ہوں، غرض وہ پیام منکوحہ کے اور اس کے والدین کے پاس گیا۔ اس کے والد نے سنتے ہی اپنے خواب اس کے متعلق بیان کرنے شروع کر دیئے۔ اور بعد نکاح مجھ کو معلوم ہوا کہ پیام سے ایک روز قبل خود اس نے بھی خواب دیکھا تھا اور وہ پیام باوجود مخالفتِ عرف کے نہایت خلوص اور رضا مندی سے منظور کر لیا گیا۔ اتفاق سے منکوحہ کے باپ یہاں آئے تھے، ان سے درخواست کی گئی کہ مجھ کو رمضان میں سفر سے بچا لیا جائے، انہوں نے بوجہ اس کے کہ اس عزیز پیام رساں کی معیت میں تحصیلِ رضا حاصل کر لیا تھا نکاح پڑھوا دیا۔ یہ خبر گھر پہنچی تو ہوا جو کچھ ہوا جس کا اثر قلب پر اس درجہ تھا کہ اس وقت مجھ کو موت محبوب معلوم ہوتی تھی۔ ادھر گھر میں کا صدمہ نہ دیکھا جاتا تھا، ادھر کچھ علاج نہ تھا۔ گھر میں کے ساتھ سختی کرنا اس لئے گوارا نہ تھا کہ ضبط سے اندیشہ امراض صعبہ روشوار بیماریوں کا تھا اور نرمی سے شکایت کا لہجہ حد تہذیب سے گزر جاتا تھا۔ ان اسباب سے بے حد تنگی معلوم ہوتی اس وقت دین کی قدر معلوم ہوئی کہ،

دل کو سنبھالنے والی چیز سوائے دین کے کچھ نہیں

بجز دین کے کوئی چیز اس وقت دل کو سنبھالنے والی نہ تھی، اور منجملہ ان مصالح کے جو اس واقعہ میں مضمر و پوشیدہ تھیں اور بعد میں ظاہر ہوئیں، وہی کے اس اثر کا مشاہدہ تھا جو پہلے سے علم الیقین کے درجہ میں تو تھا مگر اب عین الیقین ہو گیا۔

حضرت حکیم الامتؒ کو نکاح ثانی سے موت کی محبوبیت نصیب ہونا

ایک مصلحت یہ بھی ظاہر ہوئی کہ اس کے قبل موت کی محبوبیت کی دولت مجھ کو نصیب نہ تھی، عقلاً تو محبوب تھی مگر طبعاً محبوب نہ تھی، بلکہ ایک گونہ (ایک طبعی) حیات سے دل چسپی تھی۔ الحمد للہ کہ اس واقعہ سے یہ دولت بھی نصیب ہوئی، اور گو ابتداء اس کی دل تنگی کے سبب ہوئی مگر الحمد للہ کہ پھر باوجود رفع سبب (یا باوجود وجہ ختم ہو جانے کے) بھی وہ مسبب باقی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو باقی رکھے۔

نکاح ثانی سے حضرت حکیم الامتؒ کو آخرت کی رغبت بڑھ جانا

ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ مجھ کو ثواب آخرت سے طبعاً رغبت کم تھی، امتثال اور ادائے حق کو جنت سے بھی افضل سمجھتا تھا، مگر اس کے بعد میں

ثواب کا تصور کم ہوتا تھا صرف رضائے حق وطلب نجات مرکز خیال تھا اور اب معلوم ہوا کہ یہ ایک قسم کی کمی تو ضرور تھی استحضار کی، الحمد للہ کہ اس کوتاہی کا بھی تدارک ہو گیا، اور تنگی کے پیش آنے کے وقت ہر احکام کے ضروری ہونے کے خیال نے طبیعت میں قوت بخشی، استحضار ثواب نے پورا کام دیا۔۔۔
والحمد للہ علیٰ ہذہ النعمۃ۔

نکاح ثانی سے حضرت حکیم الامتؒ کو صبر اور رضا بالقضاء، تفویض الی اللہ کی حقیقت کا مشاہدہ کرنا

ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ مجھ کو اس وقت تک صبر اور رضا بالقضاء و تفویض الی اللہ (صبر اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے اور اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے سپرد کرنے) کی حقیقت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا، الحمد للہ ان مجبوریوں کا عملی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

نکاح ثانی سے حلم و تحمل کی دولت نصیب ہونا

ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ حلم و تحمل کا مجھ کو ذوق نہ تھا، خدا تعالیٰ کا احسان ہے یہ کام بھی مجھ سے بوجہ احسن (اچھے طریقے سے) لیا گیا جس سے آئندہ بھی کام لے سکنے کی امید توکلاً علی اللہ رکھتا ہوں۔

نکاح ثانی سے رسم جاہلیت کا ابطال ہونا

ایک مصلحت یہ بھی ہوئی کہ رسم جاہلیت کا ابطال ہو گیا۔

نکاح ثانی سے تعدد ازواج کی حکمتوں کا انکشاف

اسی ضمن میں خود تعدد ازواج کی بعض حکمتیں بھی ظاہر ہوئیں، مثلاً صفت عدل کا استعمال بطرز عجیب، تفصیل اس کی یہ ہے کہ کوئی کسی پر حاکم ہی نہ ہو یا حکومت سے استعفاء دیدے، جس کو اس صفت کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، دوسرے یہ کہ حاکم ایسے لوگوں پر ہو جن کے ساتھ استعمال عدل میں سیاست و ضابطہ کا برتاؤ کر سکے، یہ بھی آسان ہے، اس لئے کہ اس شخص کو صرف ایک حکومت کا حق ادا کرنا پڑتا ہے جس میں کوئی امر مزاحم و روکنے والا نہیں۔

دو بیویوں کے مابین عدل کرنا سلطنت میں عدل کرنے سے مشکل ہے۔

بخلاف صاحب ازواج متعددہ کے، کہ اس کے ماتحت ایسے دو محکوم ہیں جو اس کے محبوب بھی ہیں، اور اس محبوبیت کے سبب ایک درجہ میں معنیً اس پر حاکم بھی ہیں، پھر محکوم بھی کیسے جن میں انصاف و عدل کرنا صرف سیاسی حالت کے ساتھ خاص نہیں جبکہ ان دونوں میں جھگڑا واقع ہو بلکہ اگر وہ خود بھی نہ جھگڑیں تب بھی اس حاکم پر ہر وقت کے برتاؤ میں ان میں برابری رکھنا واجب ہے، پھر جب جھگڑا اٹھے اس وقت بڑی کشمکش ہوگی کہ ان کی محکومیت کے حق ادا کرتا ہے تو محبوبیت کے حقوق فوت ہوتے ہیں

سقوط جاہ اور بدنامی میں بہت سے درجات موقوف ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کچھ مصلحتیں خاص اس نکاح میں ظاہر ہوئیں جو پہلے سے قلب میں واقع ہوئی تھیں جن کو مختصر میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ بہت سے درجات موقوف ہیں سقوط جاہ پر الی قولہ توکل علی اللہ رکھتا ہوں، اور کچھ مصلحتیں مطلق تعدد ازواج میں ظاہر ہوئیں، ان مصالح میں سے مصلحت سقوط جاہ کی بہت مجمل مذکور ہوئی اب اس کو کسی قدر تفصیل کرتا ہوں کیونکہ اعظم مصالح اس واقعہ میں یہی ہے،

سو بیان اس کا یہ ہے کہ وہ قصی بدنامی اور ملامت واقعہ میں اس قدر ہوئی کہ شاید تمام عمر بھی اگر میں خدانخواستہ واقعی عیب کرتا تب بھی اس قدر نہ ہوتی، اس واقعہ کے تین مواقع تھے، ہر موقع پر میری قسمت میں یہ دولت لکھی تھی، چنانچہ اول موقع نکاح کا تھا اس میں جو کچھ ہوا اس کا مختصر بیان بعض اقوال جہلاء کے اوپر کر چکا ہوں، دوسرا موقع یہ ہوا کہ جب گھر کے لوگوں نے پریشانی زیادہ دیکھی، دور اندیشہ ہوا کہیں زیادہ نوبت نہ پہنچے اور خود اپنے قلب کو تحمل سے عاجز پایا، آخر تنگ آکر ایک مختصر مجمع احباب عقلاء سے مشورہ کرکے اس عزیزہ کو قطع تعلق پر اعانت صریحہ، ایک طلاق نامہ کہ قطع تعلق کرنے کا مضمون اسی عزیزہ کے ہاتھ جو نکاح کا پیام لے کر گئے تھے بھیجا، اس فعل سے گھر میں مجھ کو رنج ہوا کا بھی، مگر میں نے یہ سمجھا کہ بدون اس کے اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں۔

ادھر میں مردوں سے مشورہ کر چکا تھا عورت کی رائے کو میں نے نہ تعرض مجھ کو بھی عمل نہ کیا۔

اس تحریر و پیام کا جو اثر دوسری طرف ہوا اس کو سن کر دوسرا صدمہ پہنچا مگر بجز برداشت کرنے کے اس کا کوئی علاج میرے ہاتھ میں نہ تھا، اب یہ دوسرا موقع ہوا بدنامی و ملامت کا۔ کسی نے کہا خواہ مخواہ دل شکنی کی، کسی نے کہا بیوی سے اتنا دبنا نہ چاہئے، کسی نے کہا یہ جو تو کیا تھا، اول موقع پر عوام نے زیادہ بدنام کیا تھا اس دوسرے موقع پر اہل فہم و سمجھدار لوگوں نے زیادہ بدنام کیا۔

اب تیسرا موقع سب سے زیادہ عجیب ہوا کہ جب وہ عزیزہ پیام بھیجا کر واپس آگئے تو اب متوجہ ہو کر یہ خیال غالب ہوا کہ افسوس میرے سبب انھوں نے اپنے ایک رغبت کے معاملہ کو قطع کیا اب ان کو عمر بھر قلق و رنج رہے گا، اور مجھ کو سخت ندامت و منفعل رہے گی، اور لوگ بھی یہی سمجھیں گے کہ اس کے سبب ایسا ہوا، غرض ان خیالات نے اس قدر غلبہ کیا کہ اصل واقعہ سے زیادہ صدمہ کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور ارادہ کیا کہ اب میں خود جا کر پھر نکاح کی تجدید رشتے مرے سے نکاح کرنے میں کوشش کروں، جیسا نے انجام سوچ کر ہر چند منع کیا، اپنے ایک مخلص دوست صالح عالم کے

بطور وعظ کے بنامش بھی کرائی، مگر ان کا یہ خیال قوی ہوتا گیا حتیٰ کہ خود وہاں جاکر سب کو راضی رضا
کر کے مجھ کو یہاں سے بلا کر تجدید کرا دی، اس تجدید میں تو بہت قوی رکاوٹیں پیش آئیں، کہ جن میں بعض کا یہ کہ
بانٹ ڈالنے کی تجویز بھی تھا، جس کو میں برداشت کرنا پسند نہ کرتا تھا، اور بدون اس کے ظاہراً تجدید دشوار
تھی۔ اس وقت بیساختہ میرے قلب میں آیا کہ اب تک تو منامات و مکشوفات زوجۂ ثانیہ کو تشفی آخرت کی
دلیل دیا کرتے تھے کہ یہ من الغیب (غیبی) ہے، مگر میرے قلب میں ان چیزوں کا زیادہ اثر نہ تھا
اب میں اس کے من الغیب ہونے نہ ہونے پر اسی سے استدلال کرتا ہوں کہ میں کسی شرط نامہ کو قبول
نہ کروں گا، اگر پھر بھی اس کا وقوع ہو گیا تو میں من الغیب سمجھوں گا، ورنہ اس سے بچا رہوں گا۔
چنانچہ باوجود اس کے حق تعالیٰ نے سب کے قلوب کو دفعۃً ایسا پھیر دیا کہ سب خرخشے محذورات
ختم ہو گئیں اور تجدید ہو گئی، مزاحمات کا اس طرح بلا کوشش رفع ہو جانا میرے نزدیک ایک
باوقعت دلیل ہے، اور اس سے بڑھ کر دلیل خود حرام کا کوشش کرنا یعنی منکوحۂ اولیٰ کا اس طرح
سعی کرنا ہے، اب اس سے ان منامات و مکاشفات کا صدق راجح ہوتا ہے۔

یہ تیسرا موقع تھا اس میں بھی بے حد ملامت کی گئی، کسی نے کہا طلاق کے بعد بلا حلالہ تجدید
کہاں جائز ہے، کسی نے کہا واحدہ صریحہ (ایک صریح طلاق) میں تجدید کی کون حاجت تھی، کسی نے کہا
یہ مسئلے مولویوں کے قبضہ میں ہیں جس چیز کو دل چاہا اس کو درست کر لیا، کبھی نکاح کو کبھی طلاق کو
وغیر ذلک من الجہالات۔

غرض تینوں موقعوں پر مختلف عنوانات سے ظرافت و مزاح میں تک لگنے کا سا غل تھا جس کو
دیکھئے یہی قصہ یہی چرچا کہ کانوں پر یہی تذکرہ، نشست گاہوں (بیٹھکوں) میں یہی مشغلہ، کوئی میرے
احباب کو چھیڑتا ہے، کوئی احباب ہونے کے دعوے کے بعد شبہات و اعتراض کر کے اپنے درست
ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

نکاح ثانی میں حضرت حکیم الامت کی بفضلہ تعالیٰ منجملہ موافقت سنت کی بہت سی باتیں ہوئیں

ان کے مقابل اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت اہل فہم کی بھی قائم کر دی، جو ان سب واقعات کو سنت کے موافق سمجھ رہے تھے اور ان کی محبت زیادہ بڑھتی جاتی تھی، چنانچہ سب سے پہلا واقعہ خواب کا تھا، اس میں سنت کی موافقت یہ ہوئی کہ اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صورت ایک حریر کے ٹکڑے پر دکھلائی گئی کہ یہ آپ کی زوجہ ہیں
دوسرا واقعہ بھانجے کی بیوی سے نکاح کرنے کا تھا، اس میں سنت کی موافقت یہ تھی کہ اسی طرح

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جو آپ کے متبنّیٰ (منہ بولے بیٹے) کی بیوی تھیں اُن کے طلاق دینے کے بعد نکاح فرمایا۔ تیسرا واقعہ یہ تھا جو جہلا کے اقوال میں یہ قول نقل کیا گیا کہ ابھی معلوم ہوتا ہے ان میں پہلے سے ساز باز ہوگا اسی طرح نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا گیا کہ یہ تو بہ حضرت زینبؓ پر عاشق ہو گئے تھے، استغفراللہ۔

چوتھا واقعہ تفاوت عمر میں نکاح تھا، اس میں موافقت سنت کی یہ ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر میں اور حضرت عائشہؓ کی عمر میں اس سے زیادہ تفاوت تھا، پانچواں واقعہ منکوحہ اوّل کی دلجوئی کیلئے ثانیہ کو جواب دینے کا تھا، اس میں سنت کی دو موافقتیں ہوئیں، ایک وجہ اس آیت میں مذکور ہے:-

یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ

(التحریم، آیت ۱)

"یعنی اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر) اس کو اپنے اوپر کیوں حرام فرماتے ہیں (پھر وہ بھی) اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے۔"

دوسری وجہ اس آیت کا شانِ نزول ہے:-

یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (الطلاق، آیت ۱)

"یعنی اے پیغمبر آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب تم لوگ (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے لگو۔"

یعنی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو آپ نے ایک طلاق دیدی تھی، پھر بحکم الٰہی آپ نے رجعت فرمائی، کذا فی الدر المنثور عن ابی حاتم وابن المنذر۔

چھٹا واقعہ تجدید نکاح کا تھا، اس میں سنت کی موافقت (جس مذکور ہوئی کہ حضرت حفصہؓ سے بعد طلاق کے رجعت فرمائی تھی۔

ساتواں واقعہ مہر کے خفیف (کم) ہونے کا تھا، اس میں موافقت سنت قولاً و عملاً ظاہر ہے۔ غرض اہل علم کو خدا تعالیٰ نے اس طرح سمجھا دیا، میں یہ جھوٹا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے یہ سب کام اتباع سلف کی نیت سے کئے ہیں، مگر یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے کہ اضطراراً سنت کی موافقت ہو جائے جس سے زیادہ برکت کی امید ہوتی ہے، چنانچہ امید برکت کی مزید تائید دو واقعوں سے اور ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس واقعہ کی خبر سن کر ایک شیخ کامل نے جن کا میں نے اوپر اس عنوان

ذکر کیا ہے کہ اس وقت افادۂ خلائق میں مشغول ہیں مجھ کو خط لکھا اس میں یہ تھا کہ حق تعالیٰ اس عقد کو موجب ترقی درجاتِ سامیہ (بلند درجات کی ترقی کا سبب) فرمائے۔

دوسرا یہ کہ ایک دوسرے شیخ کامل نے جن کا میں نے اوپر اس عنوان سے ذکر کیا ہے کہ ظاہری وباطنی افادہ میں بفضلہ تعالیٰ مشغول ہیں میری اس درخواست کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اس میں برکت فرما دیں، یہ فرمایا کہ ہم کو تو برکات کی توقع ہے۔

بس یہ خلاصہ ہے مضمون مشیت اور مصلحتوں کا جس کا بنا بکار معلوم ہوتا آنعزیز نے لکھا کہ

حضرت حکیم الامت نے نکاح ثانی اولاد ہونے کے خیال سے نہیں کیا؛

اسی سے آنعزیز کے اس سوال کا جواب بھی نکل آیا کہ اس زمانہ میں جب تمام اعزا اس کی تمنا تھی کہ اولاد ہو اور اس کے سبب زور دیا کہ نکاح ثانی ہو جائے، تو آپ نے دبایا جب اس کی عمر تھی، اور طبعاً اولاد کی خواہش ہو گی لیکن وہ زمانہ گذر گیا، تو اب کیا وقت تھا، تقریرِ جواب کی ظاہر ہے کہ اس وقت بھی میں نے اولاد کے خیال سے نہیں کیا، ورنہ اقتضائے عمر کے تقاضا سے کیا، اسباب مذکورۂ بالا سے طبیعت میں ایک قوی تقاضا پیدا ہوا جس میں بلا قصد (بغیر ارادے کے) بہت سے دقیق مصالح بھی پیدا ہو گئے، اور عجب نہیں کوئی اولاد بھی ہو جائے، چنانچہ میں نے اس تقاضے کے قلب میں آنے کے وقت دعائے استخارہ کے ساتھ دینی کتابوں سے تفاؤل (نیک فال کا حصول) بھی کیا، گو میں تفاؤل کو مؤثر نہیں سمجھتا، اور نہ ایسا سمجھنا جائز ہے، مگر محض تقریبِ رجاء (تقریبِ امید) کے لئے تفاؤل چند بار کیا، اس آیت کا مضمون ہر بار میں نکلا۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ (الانبیاء، آیت)

اے میرے رب مجھ کو لاوارث مت رکھیو یعنی مجھ کو فرزند دیجئے کہ میرا وارث ہو، اور سب وارثوں سے بہتر آپ ہی ہیں۔

واللہ اعلم، اتفاقی بات ہے، یا اشارہ ہے عطائے اولاد کی طرف، چنانچہ اس کے بعد کی تحریر میں آنعزیز کو اس بات کا احساس ہو گیا چنانچہ لکھا ہے، لیکن ان شرعی مصلحتوں اور حکم خداوندی کی بار یکیوں کو دنیاوی امور پر ترجیح دینا بڑا کام ہے جو دنیاداروں سے اور خاص کر مستورات سے ممکن نہیں، چنانچہ اس میں احساس جواب کے ساتھ دنیاداروں اور مستورات کی ایک درجہ میں معذوری بھی بیان کی ہے، اس کی نسبت یہ ہے کہ درجۂ حال میں ترجیح دینے کا کسی کو مکلف بھی نہیں بنایا، یہ تو ایک موہبت الٰہیہ (اللہ تعالیٰ کی عطا) ہے جس کو عطا ہو۔

حدودِ شرعیہ میں قولاً و فعلاً تجاوز نہ کرنے کا سبب کو حکم ہے

لیکن اس تقریر کا سبب کو مکلف بنایا ہے کہ حدودِ شرعیہ سے قولاً و فعلاً تجاوز نہ کریں، اور تجربہ سے ثابت ہے کہ اس تحفظِ حدود میں حق تعالیٰ نے یہ اثر دیا ہے کہ حزن و تشویش طبعی و طبعی فکر و غم بھی اس قدر ضعیف ہو جاتا ہے کہ بالکل کالعدم ورنہ وہ کمبخت برابر یہی تان توڑتا چلا جاتا ہے، جہلاء اس نکتہ کو نہیں سمجھتے اور تجاوز عن الحدود شرعی کو بڑھنے اگر اپنے مرض کا علاج سمجھتے ہیں، جو ان اشعار کا مصداق ہوتا ہے ؎

ہرچہ کردند از علاج و از دوا ٭ رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

بے خبر بودند از حالِ دروں ٭ استعیذ اللہ مما یفترون

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ٭ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

(یعنی ہر قسم کی دوا اور علاج کیا مگر رنج و مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، وہ باطنی حال سے غافل ہیں، اللہ کی پناہ جو وہ جھوٹ بولتے ہیں، کہا کہ انھوں نے ہر قسم کی دوا دارو کی ہے مگر اس بیماری کو ختم نہیں کیا، ان طبیبوں کے نزدیک یہ مرض لاعلاج نہیں ہے۔)

حضرت حکیم الامتؒ کا نکاح ثانی سے اہلیہ کو مطلع نہ کرنے کا سبب

آگے آنعزیز نے لکھا ہے "تاہم جس قدر حالات زنانہ عزیزہ کی تحریر سے معلوم ہوئے، میری ناقص رائے میں اتنی کسر رہ گئی ہے کہ ان امور کو اول اگر بھائی صاحبہ کے سامنے پیش کر دیا جاتا تو شاید ان کو اتنا خیال نہ ہوتا، اب جو ہونے والا تھا ہو گیا" آپ کا اگر یہ مطلب ہے کہ ان واقعات کی جو کہ بنا نکاح ہیں ان کو خبر دی جاتی، سو یہ تو میں چند موقعوں پر کرتا رہا جس کا اُن پر ہمیشہ کچھ اثر ہوا، کیا میں نے ان سے اپنا پہلا خواب کہہ دیا تھا ایک بزرگ کا مکاشفہ متعلق مضمون حضرت عائشہؓ وہ بھی کہہ دیا تھا، باوجود یکہ انھوں نے تعبیر میں میرے ساتھ اختلاف کیا، مگر پھر بھی اُن پر کسی کسی ما تک اثر رہا جس کو دیکھ کر میں نے یہی بات دل کی کہہ دی کہ میرا اس وقت تو بالکل سنّۃً بھی ارادہ نہیں، یہاں تک کہ میں نے کہا اللہ میں عمر بھر کے لئے ایسی قسم کھالوں کہ نکاح ہی نہ ہو سکے، لیکن مجھ کو تقدیر کی خبر نہ تھی، میرے قبضہ میں ہے کہ حق تعالیٰ نے اگر دل کو بدلنا ہے تو بدلنے نہ دوں، انھوں نے ایسی قسم کھانے سے اسی بنا پر ہمیشہ منع کیا، کہ خدا جانے تقدیر میں کیا لکھا ہے، بہرحال اُن کو یہ احتمال ہمیشہ ستاتا رہا، اور میں اپنے ارادہ کے موافق اطمینان دلاتا رہا اور واقعی میرا ارادہ کوسوں بھی دو تھا، اور اگر یہ مطلب ہو کہ ارادہ ہو چکنے کے بعد ان کو ارادہ کی اطلاع نہ کی، اور بہت سے اہل الرائے بھی

یہ کہتے ہیں، سو اس میں میرا یہ خیال ہوا اب خواہ وہ غلط ہو یا صحیح کہ یہ قیامت تک موافقت کریں گی اور صریح مخالفت (کھلی مخالفت) کے بعد پھر مجھ کو مناسب نہ ہوگا، کلامیں زیادہ دل شکنی ہے اور اگر بلا اطلاع کر لیا تو آخر مجبور ہو کر ساکت و ساکن (خاموش) ہو جائیں گی، بس اس خیال سے میں نے اپنے ارادہ کی اطلاع نہیں کی۔ اور بعد کے واقعہ تجدید سے تو یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ اطلاع تو کیا معنی اگر مشورہ و اجازت بھی حاصل کر لیتا تب بھی کچھ نفع نہ ہوتا چنانچہ خود سعی کرنا تو بجائے خود اجازت دینے سے بڑھ کر اس رضا و سکون میں موثر ہے، مگر کوئی اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ اب تو آنعزیز کا یہی جملہ تسلی بخش ہو سکتا ہے کہ جو ہونے والا تھا ہو گیا۔ اس کے ساتھ اتنے اضافہ کی اور ضرورت ہے کہ دعا و التجا آخری علاج ہے اور اکسیر علاج ہے۔

تجدید قلب کے بعد پریشانی اور رنج و غم کہاں!	آنعزیز نے اپنی محبت سے لکھا ہے "لیکن مجھ کو اس کا صدمہ ہوتا کہ جب مجھ کو یہ معلوم ہو کہ آپ کے عیش و آرام میں فرق پڑ گیا"

یہ آنعزیز کی محبت کا مقتضا ہے اور ہونا بھی چاہئے، اور حقیقی بھائی کے ساتھ تو کیوں نہ ہوتا، ہر نوعی بھائی کے ساتھ ہونا چاہئے۔

چو از محنت دیگراں بے غمی　　٭　　نشاید کہ نامت نہند آدمی

"یعنی اگر دوسروں کے رنج و غم سے تم بے خبر ہو تو مناسب نہیں کہ تمہارا نام آدمی رکھیں"

مگر میں آنعزیز کو بے فکر اور مطمئن کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اس عیش سے زیادہ مجھ کو عیش عطا فرمائی (یعنی وہ عیش دنیا کا تھا) اور واقع میں مجھ کو اس سے ایک گونہ دلچسپی ہو گئی تھی، اور کبھی کبھی سوچ کر ڈرتا تھا کہ خدا نہ کرے اس آیت کا مضمون تو مجھ پر صادق نہیں آنے لگا۔

رضوا بالحیٰوۃ الدنیا واطمانوا بہا (یونس آیت ۷)

"اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے، اور آخرت کی فکر اصلا نہیں کرتے، اور اسی میں جی لگا بیٹھے (آخرت کی کچھ فکر نہیں)"

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان واقعات نے اس حدیث کے معنی سمجھا دیئے۔

اللھم لا عیش الا عیش الاخرۃ

"اے اللہ آخرت کے عیش کے سوا کوئی عیش نہیں"

اول اول ذرا جی گھبرایا مگر حق تعالیٰ نے دکھلا دیا۔

درد از یار است و درمان نیز ہم　　٭　　دل فدائے او شد و جان نیز ہم

لہ درد دوست کی طرف سے ہے اور اس کا علاج بھی انہی کے پاس ہے دل و جان ان پر قربان ہے۔

اور اس آیت کے معنی دکھلا دیئے:

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ ۚ

(التغابن آیت ۱۱) "کوئی مصیبت بدوں حکم خدا کے نہیں آتی، اور جو شخص اللہ پر پورا ایمان رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو صبر و رضا کی راہ دکھاتا ہے۔"

بس ہدایت قلب کے بعد پریشانی کہاں، کہاں رنج و غم، باقی طبعی اثر خفیف رہ گیا سو کسی وقت ہو جاتا ہے پریشانی نہیں ہوتی سو اس سے کوئی خالی نہیں، تیسرے وہ خود علاج ہے بہت سے امراض کا جن میں نفوس مبتلا ہیں، اس حیثیت سے وہ سب رحمت ہیں، اس لئے میں الحمدللہ پہلے سے زیادہ عیش میں ہوں اور بفضلہ تعالیٰ اب تو ظاہراً بھی سکوت و سکون پہنچتے رہنے سے پہلے رنگ کا عیش بھی مع شئے زائد کے عود و واپسی کرتا آتا ہے۔

خط کے جواب میں مکمل رسالہ لکھنے کا سبب

آگے آں عزیز کے خط کے خاتمہ کا جملہ ہے: "اس لئے اپنے اطمینان خاطر کے لئے میں التجا کرتا ہوں کہ اپنے قلم سے اس کے مفصل حالات تحریر فرمائیں، زیادہ نیاز مندی فقط۔" میری بدنی حالت اس وقت بوجہ نقاہت (کمزوری) کے اتنی تفصیل کی متحمل (برداشت کرنے والی) نہ تھی، نیز واقعات کے ساتھ علوم کا انضمام (شامل کرنا) شاید یہ بجائے تفصیل کے تطویل (طول) ہونا معلوم ہو، مگر آں عزیز کے تعلق طبیعت و اثر محبت نے قلب میں ایک جوش پیدا کر دیا جس سے جو جو مضمون قلم میں آتا گیا، پھر اس مجموعی مضمون کی نافعیت (فائدہ مند ہونے) پر نظر کر کے کہ اس کو ایک رسالہ قرار دے کر اس کا ایک بامناسبت نام بھی رکھ دوں، چنانچہ یہ نام خیال میں آیا "الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ" یعنی وہ واقعات جو خدا کی طرف رجوع ہونے والے قلب کو گداختہ اور نرم کر دیں۔

تعدد ازدواج سے بچنے ہی میں سلامتی ہے

اب میں اپنے اس خط کو ایک مناسب مقام و مفید دستور العمل پر ختم کرتا ہوں جس کے تین جزو ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ تو پہلے اصل خط میں مشورہ دے چکا ہوں کہ تعدد ازدواج ایک پرخطر مسلک ہے، جس طرح قضاء یعنی حکومت کے قبول کرنے میں حدیث میں نہایت تہدید (دھمکی) ہے، یہ بھی اس سے کم نہیں، بلکہ میں نے جو وجہ مصلحت حصول صفت عدل کے متعلق بیان کی ہے اس سے یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ بعض وجوہ سے یہ قضاء سے بھی اشد ہے، جب اس سے تحذیر (ڈرانے) کا حکم وارد ہے تو اس کی جرأت کب زیبا ہے، اور مکرر کہتا ہوں کہ میرے اختیار کرنے سے دھوکہ نہ کھایا جائے، اس اختیار کرنے سے تو پورا پتہ چل گیا

ضمیمہ متن مکررہ شاملۂ فصل یکصد

لیکن جو شخص اس مشورہ سے قبل اس زنجیر میں پھنس چکا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پورے حقوق ادا کرے، اسی طرح ان متعدد بیبیوں پر بھی واجب ہے کہ نفس کا اتباع چھوڑ کر شریعت کو اپنا رہبر بنائیں، احکام شرعیہ کی تفصیل تو علماء کی مراجعت سے معلوم کرنا چاہئے، اس مقام پر میں مشورہ کے درجہ میں ایک دستور العمل جو بعد تفصیل کے تین دستور العمل یعنی تینوں شخصوں کے لئے لکھتا ہوں۔

پہلا دستور العمل شوہر کے لئے: (۱) ایک بی بی کا راز دوسری سے نہ کہے (۲) دونوں کا کھانا اور دونوں کا رہنا الگ الگ رکھے، ان کا اجتماع آگ اور بارود کے اجتماع سے کم نہیں (۳) ایک سے دوسری کی شکایت ہرگز نہ سنے (۴) ایک کی تعریف دوسری سے نہ کرے (۵) غرض ایک کا تذکرہ نہ دوسری سے کرے نہ دوسری سے سنے، اگر ایک شروع بھی کرے فوراً روک دے کہ اور کچھ بات کرو (۶) اگر ایک دوسری کی کوئی بات پوچھے ہرگز نہ بتلائے، مگر خشونت (سختی) نہ کرے، لطف سے منع کر دے (۷) دینے لینے میں پوشیدہ نہ ہونے دے کہ ایک کو زیادہ دیا ہو اس کو صاف صاف ظاہر کر دے (۸) باہر سے آنے والی عورتوں کو سختی سے روک دے کہ وہ دوسری جگہ کی حکایات یا شکایات بیان نہ کریں (۹) اور نہ خوشامد میں ایک سے کم محبتی کا دعویٰ دوسری کے سامنے کریں (۱۰) اگر موقع ہو ایک ایسی روایت کر دے کہ دوسری تمہاری تعریف کرتی تھی (۱۱) لطف سے اس کی تدبیر ہو سکے تو مفید ہے کہ ایک دوسری کے پاس ہدیہ وغیرہ بھی بھیجا کریں۔

دوسرا دستور العمل زوجۂ قدیمہ کے لئے: (۱) جدیدہ پر حسد نہ کرے (۲) اس پر طعن و تشنیع نہ کرے (۳) بے تکلف جدیدہ کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرے، تاکہ اگر اس کے دل میں محبت نہ ہو تو عداوت بھی نہ ہو (۴) شوہر سے کوئی ایسی بے تکلف گفتگو نہ کرے کہ شوہر کو اس جدیدہ کے سامنے اس کا ہونا اس لئے ناگوار ہو کہ اس کو یہ احتمال ہو کہ یہ جدیدہ بھی ایسی بے تمیزی نہ سیکھے، (۵) شوہر سے جدیدہ وغیرہ کا کوئی عیب بیان نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے محبوب کا عیب گو کسی خصوص رقیب کی زبان سے پسند نہیں کرتا، (۶) جدیدہ سے ایسا برتاؤ رکھے کہ اس کی زبان اس قدیمہ کے سامنے ہمیشہ بند رہے (۷) شوہر کی اطاعت و خدمت و ادب میں اور بیش از بیش اضافہ کر دے تاکہ اس کے دل سے نہ اتر جائے (۸) اگر شوہر سے ادائے حقوق میں کچھ کمی بھی ہو جائے تو جو کمی حد تکلیف تک نہ پہنچے اس کو زبان پر نہ لائے اور اگر حد تکلیف ہو تو جس وقت مزاج خوش پائے ادب سے عرض کر دے،

(۹) جدیدہ کے اعزہ و رشتہ داروں سے خوش اخلاقی و مدارات و حسن سلوک کا برتاؤ رکھے کہ جدیدہ کے دل میں محبت ہو (۱۰) گاہ گاہ کبھی کبھار اپنا دن جدیدہ کو دیدیا کرے تاکہ شوہر کے دل میں قدر رہے

تیسرا دستور العمل منکوحہ جدیدہ کے لئے

(۱) قدیمہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسے اپنے بڑوں کے ساتھ کرتے ہیں (۲) شوہر پر زیادہ ناز نہ کرے اس گمان سے کہ میں زیادہ محبوب ہوں خوب سمجھ لے کہ قدیمہ سے جو تعلقات رفاقت ہیں جو کہ دل میں جاگزیں ہو چکے ہیں یہ نیا جوش اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا (۳) شوہر سے خود جدا رہنے کی درخواست نہ کرے (۴) اگر شوہر جدا رکھنے لگے تب بھی گاہ گاہ قدیمہ سے ملنے جایا کرے۔ قدیمہ کو دعوت وغیرہ کے لئے بلا لیا کرے (۵) شوہر کی کمائی رکھ کر قدیمہ سے بے پروائی نہ کرے (۶) اگر قدیمہ کچھ سختی یا طعن وغیرہ کرے تو اس کو ایک درجہ میں معذور سمجھ کر معاف کر دے اور شوہر سے ہرگز شکایت نہ کرے (۷) قدیمہ کے عزیزوں کی خوب خدمت کرے (۸) قدیمہ کی اولاد سے بالخصوص ایسا معاملہ رکھے کہ قدیمہ کے دل میں اس کی محبت و قدر رہے (۹) ضروری امور میں قدیمہ سے مشورہ کرتی رہے کہ اس کے دل میں قدر بھی ہو اور اس کو تجربہ بھی زیادہ ہے (۱۰) اگر اپنے میکے میں جائے قدیمہ سے خط و کتابت بھی رکھے۔

اشعار:۔

ما نصیحت بجائے خود کردیم — روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس — بر رسولاں بلاغ باشد و بس

ترجمہ:۔ ہم نے اپنی جگہ نصیحت کر دی اور اسی طرح اپنی زندگی بسر کر دی
اگر کسی کو اس میں رغبت نہ ہو تو مضائقہ نہیں کیونکہ قاصد کے
ذمہ صرف پہنچانا ہے اور بس۔

والسلام من اتبع الھدیٰ واللہ اعلم ومن ورق الھویٰ ردانا الحقیر

[illegible]

[illegible] ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۳ھ

دوسرا ضمیمہ ختم ہوا

تیسرا ضمیمہ

فہرست تحلیل بعض محرمات

اس سے پہلے کے دو ضمیمے تحریم بعض محللات کے تھے، یہ تیسرا ضمیمہ اس کے مقابل کی فہرست یعنی تحلیل بعض محرمات (یعنی بعض شرعاً حرام ہونے نکاح کو حلال سمجھنے) کا ہے، منجملہ ان کے ایک یہ صورت ہے کہ بعض لوگ رضاعی بھائی بہن خاص انہی کو سمجھتے ہیں جو ایک زمانہ میں ایک عورت کا دودھ پئیں اور مختلف زمانوں میں دودھ پینے والے بچوں کو ایک دوسرے کے لئے حلال سمجھتے ہیں،

سو یہ اعتقاد بالکل باطل ہے، اس حرمت کے لئے زمانے کا اتحاد و اختلاف سب برابر ہے،

منجملہ ان کے ایک یہ صورت ہے کہ اکثر لوگ لاوارث لڑکیوں کو جن کا کوئی ولی شرعی نہیں ہے، پرورش کرکے ان کے بلوغ سے قبل اپنی ولایت سے ان کا نکاح کر دیتے ہیں، سو یہ نکاح اصلاً منعقد نہیں ہوتا،

تیسرا ضمیمہ ختم ہوا

بعض جزئیات انقلاب مع اصلاح

اصلاح معاملہ متعلق ولایت نکاح

ولایت نکاح سے متعلق چند کوتاہیوں کا بیان

اس ولایت نکاح (نکاح کا اختیار ہونا) میں بھی مختلف کوتاہیوں کا وقوع شائع ہے، اس لئے مختصراً ان پر متنبہ کرنا ضروری ہے وہ کچھ بطور نمونہ یہ ہیں :-

لاوارث نابالغ لڑکی کا نکاح کردینا

ایک کوتاہی تو وہی ہے جو ابھی قریب اوپر ضمیمہ نمبر ۸ میں لاوارث نابالغ لڑکی کے نکاح کردینے کے مضمون میں مذکور ہو چکی ہے۔

ماں کا حق ولایت اس وقت تک ہے جب عصبات میں سے کوئی نہ ہو

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ اتباع رسم وعرف کے سبب ولی اقرب (نزدیک کے ولی) کو ولی ابعد (دور کے ولی) کے سامنے بیکار سمجھتے ہیں مثلاً ایک نابالغ لڑکی کا ایک بالغ بھائی ہے، اور ایک چچا، تو چچا اپنے کو بڑا سمجھ کر اس بھائی کا کچھ دخل نہیں سمجھتا اور اپنے کو مختار مستقل سمجھ کر اپنی ولایت سے اس کا نکاح کردیتا ہے، اور اس سے اجازت حاصل نہیں کرتا، بلکہ بعض جگہ اس کی ناراضی کی حالت میں بھی جبراً نکاح کردیتا ہے، حالانکہ شرعاً اس صورت میں بدون بھائی کی صریح اجازت کے نکاح درست نہیں ہوتا خصوصاً اس رسم کا اثر لڑکی کے نکاح کے بارے میں ماں پر خاص طور پر ہوتا ہے، کہ خود ماں اپنے سامنے کسی کو مختار نہیں سمجھتی خصوص عصبات (خاص طور پر شوہر کے ددھیالی رشتہ داروں) کو اور چونکہ اس کے حق میں ماں پر شرعاً مقدم ہیں، یہ جاہل ماں اپنے سے مقدم تو کیا شریک بھی نہیں سمجھتی یعنی ان کا بالکل حق ہی نہیں سمجھتی، تو سمجھ لینا چاہئے کہ ماں کا حق ولایت اس وقت ہے جب عصبات (ددھیالی رشتہ داروں) میں سے کوئی نہ ہو۔

نابالغ بچی کی پرورش نہ کرنے کے باوجود باپ کا حق ولایت باقی رہتا ہے۔

ایک کوتاہی جس میں بعضے نیم ملا بھی گرفتار ہیں یہ ہے کہ باپ کی ولایت کو اس کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں کہ وہ اس نابالغہ کی خدمت اور پرورش کرتا ہو، ورنہ اگر وہ کسی عذر سے بچی کے ساتھ ناچاقی (نااتفاقی

کی وجہ سے اس کی پرورش میں کوتاہی کرے تو اس کی ولایت کو ساقط سمجھتے ہیں، گو بلا عذر اولاد کا حق ضائع کرنا معصیت (گناہ) ہے، لیکن معصیت سے ولایتِ نکاح تو سلب نہیں ہوتی، (چھینی نہیں جاتی) اور سوءِ اختیار (بُرے اختیار) کی صورت جو مختار نے لکھی ہے وہ اور روایات ورکا ہر کوتاہی اس سوءِ اختیار میں داخل نہیں، ہمارے وطن میں ایک زاعم علم (خود ساختہ عالم) نے عجیب مضمون لکھا تھا اور لطف یہ ہے کہ ایک مجمع میں اس کا اعلان بھی کیا، مگر لفظ ردّ سے سُنا گیا، اور یہ لکھا تھا کہ جب معصیت سے ولی اقرب کی ولایت زائل ہو جاتی ہے تو ولی النکاح کی ولایت کیوں زائل نہ ہو جائے گی، یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ دیکھو نماز ایک تعلق ہے عبد (بندہ) اور رب کے درمیان میں اور نقضِ وضو (وضو کے ٹوٹنے) سے باطل ہو جاتی ہے، تو نکاح جو کہ ایک تعلق ہے عبد اور عبد میں تو وہ نقضِ وضو سے کیوں کر باطل نہ ہو جائے گا، یاد رکھنا چاہئے کہ دین کے لئے محض رائے کافی نہیں، حجتِ شرعیہ (شرعی دلیل) کی حاجت ہے، اور اس تقریر کا حجتِ شرعیہ نہ ہونا ظاہر ہے۔

سوتیلے باپ کو حقِ ولایت نکاح کسی صورت حاصل نہیں

ایک کوتاہی اس سے بڑھ کر یہ کہ جس شخص کو کبھی اور کسی درجہ میں بھی حقِ ولایت نہیں وہ اپنے کو ولی النکاح سمجھتا ہے، چنانچہ اکثر جگہ سوتیلے باپ کو ولایتِ نکاح کا دعویٰ کرتے ہوئے (بلکہ اسی ولایتِ مزعومہ کی بناء پر نابالغ کا نکاح کرتے ہوئے) دیکھا گیا ہے، حالانکہ یہ شخص ولی اَبعد بھی نہیں، البتہ اگر کسی صورت میں ماں کو حقِ ولایت ہو یعنی جبکہ عصبات میں سے کوئی نہ ہو اور ماں اپنی طرف سے اس شوہر کو وکیل نکاح کر دینے کا بنا دے، تو یہ وکالت کی بناء پر البتہ اس کو اس نکاح کا اختیار حاصل ہو جائے گا، اور بدون اس کے یہ کوئی چیز نہیں۔

ولی کے جبراً نکاح کرا دینے سے نکاح درست نہیں ہوتا۔

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کو ولایتِ نکاح تو حاصل ہے، مگر ولایتِ جبریہ (زبردستی کے اختیار کی ولایت) نہیں ہے، مثلاً یہ ولایت ہے کہ اس کے استیذان (اجازت مانگنے) پر باکرہ کا سکوت (خاموشی) اذن (اجازت) سمجھا جاتا ہے، یعنی لڑکی بالغہ ہے، مگر یہ شخص جبراً اس کا نکاح کر دیتا ہے، یعنی وہ تصریحاً انکار اور رد کرتی ہے، مگر اس کی پرواہ نہیں کی جاتی اور ظلم اور زور کرکے اس کو بیوی بناتا ہے اور عمر بھر حرام کاری ہوتی ہے، اور افسوس کہ عام لوگ بناء بر جہل (جہالت کی وجہ سے) ان ظالموں کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی عاقبت برباد کرتے ہیں، لوگوں کے خیال میں نکاح کے چند الفاظ ہیں موثر بالذات

رکھنے والے ہیں کہ ان کی تاخیر کی کوئی شرط نہیں،

بالغہ باکرہ کا سکوت ہی اذن ہے ایک کوتاہی جو کہ بہت ہی عام ہے خاص ولی جائز سے صادر ہوتی ہے، وہ یہ کہ مسئلہ شرعیہ ہے کہ باکرہ لڑکی جب بالغہ ہو تو اس سے استیذان یعنی اجازت لینا صحت نکاح کے لئے ضروری ہے، اتنا فرق ہے کہ اگر ولی جائز یا اس کا وکیل یا اس کا رسول یعنی جس کو اس نے بھیجا ہو یہ لوگ اس بالغہ سے اذن چاہیں تب تو اس کا سکوت اذن ہے، اور اگر کوئی اور شخص اذن چاہے تو جب تک وہ زبان سے اجازت نہ دے محض اس کا سکوت (خاموش رہنا) اذن نہ ہوگا، البتہ اگر قبل اذن ولی نے نکاح کر دیا اور بعد نکاح اس منکوحہ بالغہ کو خبر ہوئی تو اگر یہ خبر بھیجنے والا ولی کا فرستادہ (بھیجا ہوا) ہو یا اگر فرستادہ نہیں تو وہ خبر پہنچانے والا اگر ایک ہو تو عادل اور دیندار ہو یا کم از کم دو شخص ہوں، اگرچہ ثابت العدالت (عادل ثابت) نہ ہوں مگر مستور الحال ہوں، (جن کا حال چھپا ہوا ہو) تو اس صورت میں بھی اس کا سکوت اذن ہوگا، اور اگر ایک شخص غیر عادل ہو تو اس وقت اُس کا سکوت کافی نہ ہوگا، (کذا فی الدر المختار و رد المحتار ج ۲ صفحہ ۲۸۹، ۲۹۰)

اور جن صورتوں میں اذن نہیں ان صورتوں میں صحت نکاح اُس وقت ہوگی جبکہ وہ زبان سے اجازت دے یا اس سے کوئی فعل صادر ہو جو اس کی رضا پر دلالت کرے مثلاً وہ اپنا مہر یا نفقہ مانگنے لگے یا ہمبستری کے وقت انکار نہ کرے، اور جب تک یہ امور نہ پائے جائیں نکاح موقوف (رکا ہوا) رہے گا،

نکاح موقوف کے احکام نکاح موقوف کے احکام میں سے یہ امور ہیں:۔

(۱) اگر قبل نفاذ نکاح کے احد الزوجین (میاں بیوی میں سے کوئی ایک) مر جائے نکاح باطل ہو جائے گا، نہ مہر واجب ہوگا اور نہ ایک کی میراث دوسرے کو پہنچے گی (۲) قبل نفاذ نکاح کے اس عورت سے بوس و کنار یا صحبت کرنا حرام ہے، کیونکہ نفاذ خود ان افعال سے متعلق (علت والا) ہے، تو یہ افعال نفاذ پر مقدم ہوئے، اور ظاہر ہے کہ بدون نکاح کے یہ افعال حرام ہیں، اگرچہ پھر انہی افعال سے نفاذ ہو جائے، کذا فی رد المختار (عن البحر ج ۲، ص ۲۱۱ سطر ۱۵ قولہ وتقبیلھا الخ) یہ تو مسئلہ کی تفصیل ہوئی،

قبل نکاح باکرہ منکوحہ سے اذن نہ لینے سے نکاح موقوف رہے گا، اب اس کوتاہی کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اس وقت عرفاً عادت ہو کہ قبل نکاح باکرہ (کنواری کے نکاح سے پہلے) منکوحہ سے اذن نہیں لیا جاتا، اور بعض اوقات خبر بھی بطریق مذکور اس کو نہیں پہونچتی اور وہ اسی

جانب سے رخصت کردی جاتی ہے، تو یہ رخصت ایسی حالت میں ہوتی ہے کہ اس کا نکاح نافذ نہیں ہوتا موقوف رہتا ہے، پھر جب شوہر کے ساتھ اس کی خلوت ہوتی ہے اور وہ اظہار ناراضی کا نہیں کرتی تب نکاح نافذ ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں بوس وکنار یا ہمبستری سب حرام ہوتا ہے تو اس کے بعد نکاح صحیح ہوجاتا ہے، اور پھر یہ سب افعال حلال ہوتے ہیں، مگر اول بار کا بوس وکنار وغیرہ سب حرام ہوا جس میں زوجین تو مبتلا ہوئے ہی مگر وہ ولی صاحب بھی جو سبب اس ارتکاب محرم (حرام کاری) کے ہوئے اس ذیل میں شریک ہوئے ۔

نکاح سے قبل منکوحہ سے اذن حاصل کرنا ضروری ہے۔

اور اس کا بہت آسانی سے انتظام ہو سکتا ہے، کہ قبل نکاح اذن حاصل کریں یا نکاح کرکے فوراً خود جاکر اطلاع کردیں، نیز اگر اتفاق سے زوجین میں سے کوئی مرگیا تو مہر اور میراث کے احکام میں بوجہ جہل کے اختلال واختلاف (جہالت کی وجہ سے خرابی اور اختلاف) ہوگا، گو ایسا واقعہ کم پیش آتا ہو مگر پیش آتا بھی ہے ۔

نکاح موقوف کی صورت میں شب زفاف میں عورت اظہار ناراضی کردے تو نکاح نافذ ہی نہیں ہوگا

اور ہمبستری کی حرمت (حرام ہونے) کی خرابی تو سب ہی جگہوں پر پیش آتی ہے، اور اگر ایسی صورت میں کہ نکاح نافذ نہ ہو ہمبستری کے وقت بھی ناراضی ونفرت کا اظہار کرے جیسا کہ زفاف (پہلی مرتبہ کی ہمبستری) کے وقت بعض عورتیں کرتی ہیں تو پھر نکاح نافذ بھی نہیں ہوتا اور تمام عمر حرام ہوتا رہتا ہے، انہی وجوہ سے بہت ضروری ہے کہ کم از کم نکاح خواں قاضی (نکاح پڑھانے والا قاضی) عالم ہونا چاہئے تاکہ ان امور کا انتظام اپنے طور سے کرے ۔

بارہ برس کی عمر کی لڑکی کی اجازت معتبر نہیں

ایک کوتاہی مسئلہ ولایت کے متعلق یہ ہوتی ہے کہ عموماً لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں لڑکا اور لڑکی بالغ ہوجاتے ہیں، پس بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی بارہ برس کی ہے اور واقع میں وہ نابالغ ہے، اور ولی قریب موجود ہے مگر باوجود اس کے ولی بعید یا اجنبی غیر ولی اس لڑکی کو بالغ سمجھ کر اس کے منہ سے اجازت لے کر اور اس کو کافی سمجھ کر کہیں اس کا نکاح کردیتا ہے، حالانکہ بوجہ نابالغ ہونے کے اس کی اجازت اصلاً معتبر نہیں، اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ بارہ برس میں بالغ ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس کا بالغ ہونا حیض کے آنے سے ہے، البتہ اگر پندرہ برس پورے ہو کر بھی حیض نہ آئے تو پھر اس کے بلوغ (بالغ ہونے) کا حکم کردیا جائے گا ۔

اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح باپ دادا کے علاوہ کسی ولی جائز نے کر دیا ہو تو بعد بلوغ لڑکی کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

ایک کوتاہی ولایت کے متعلق ایک ضرور میں ہوتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر بجز باپ اور دادا (باپ کے باپ) کے علاوہ کوئی دوسرا ولی جائز نابالغ لڑکی کا نکاح کفو سے مہر مثل[1] پر کر لے تو نکاح تو صحیح ہو جاتا ہے، لیکن اس لڑکی کو بالغ ہونے کے وقت جبکہ اس کو پہلے سے خبر نکاح کی ہو یا بعد بالغ ہونے کے جب اول بار اس کو نکاح کی خبر ہو اختیار ہے اس نکاح کے فسخ (ختم) کردینے کا اور یہ خیار فسخ دخول (ہمبستری) کے بعد بھی باقی رہتا ہے، لیکن اس میں اتنی تفصیل ہے کہ یہ لڑکی اس وقت تک باکرہ ہو تب تو اس فسخ کی شرط ہے کہ بالغ ہونے کے ساتھ ہی یا خبر پہنچنے کے ساتھ ہی زبان سے کہے کہ میں اپنا نکاح فسخ کرتی ہوں، اگر فوراً نہ کہا تو یہ اختیار باطل ہو گیا، اور اگر یہ ثیبہ (غیر کنواری) ہے خواہ تو اس نکاح سے پہلے ہی ثیبہ تھی مثلاً یہ نکاح ثانی تھا یا اس نکاح کے بعد اس کے ساتھ دخول ہو، ہو تو یہ اختیار اس وقت تک باقی رہے گا کہ صراحۃً رضامندی سے (زبان سے) رضا ظاہر کرے یا دلالۃً رضا پائی جائے مثلاً مس و قبلہ (چھونے اور بوسہ لینے) وغیرہ پر انکار نہ کرے۔

خیار فسخ کے مؤثر ہونے میں قضاء قاضی شرط ہے

اور ایک شرط اس خیار فسخ کے مؤثر ہونے میں اور بھی ہے کہ قضاء قاضی (شرعی حاکم کا فیصلہ) اس کے ساتھ متصل ہو یعنی یہ عورت قاضی یعنی حاکم مسلم کے یہاں دعویٰ فسخ کا کرے، اور وہ حاکم تفریق کا حکم کردے تب نکاح فسخ ہوگا، ورنہ نہیں، یہ تو مسئلہ کا بیان تھا۔

نکاح فسخ ہونے کی چند شرائط

اب کوتاہی اس میں یہ ہوتی ہے کہ ناواقف مسئلہ صرف عورت کے اس کہہ دینے کو کہ میں نے نکاح فسخ کیا ہر حال میں کافی سمجھتے ہیں، خواہ وہ مجلس بلوغ و مجلس وصول خبر (بالغ ہونے اور خبر پہنچنے کی مجلس) کے بعد ہی کہے اور اگرچہ اس کے ساتھ قضاء قاضی نہ ہو، تو یہ سخت غلطی ہے، اور اس کے علاوہ اور بھی بہت مسائل ہیں جن میں قضاء قاضی شرط ہے جن کو اس کا علم نہیں، ان کو تو یہ بڑی ضرر ہوتا ہے کہ وہ بدون قضاء قاضی کے ان احکام کو نافذ

---

[1] مہر مثل یعنی خاندانی مہر یعنی اس عورت کے باپ کے گھرانے میں دوسری عورت جو اس کے مثل ہو یعنی وہ عورت عمر، خوبصورتی، کنوارے پن، مالداری، وطن، دینداری، ہوشیاری اور سلیقہ شعاری میں اس عورت کے مانند ہو، اس عورت کا مہر مقرر ہوا تھا اس کے برابر مہر مثل کہلاتا ہے۔ منہ احمد قریشی عفولہ

سمجھتے ہیں اور جن کو اس کا علم ہے ان کو ان بلاد میں یہ دشواری مضر ہے کہ قاضی مسلم نہ ہونے کے سبب ان کو ان دقتوں سے نجات پانے کا بجز اس ذریعہ کے نہیں، اس لئے احقر کی رائے مدت سے یہ ہے کہ اگر عامۂ اہل اسلام گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ہر ضلع میں ایک عالم با انتخاب (ایک عالم کو منتخب کر کے) اہل اسلام ایسے مقدمات کی سماعت و فیصل (ایسے مقدموں کو سننے اور فیصلہ کرنے) کے لئے مقرر کر دیئے جائیں اور ان کی تنخواہ کے انتظام کے لئے مالگزاری کے ساتھ فی سینکڑہ کچھ مختصر سی رقم مسلمان زمینداران سے وصول کر لی جایا کرے کیونکہ جمہور اہل اسلام کو اس کا نفع پہونچیگا تو جن مسائل میں قضاء قاضی شرط ہے ان میں مسلمانوں کو آسانی ہو جائے۔

بعض مقامات پر ولی اقرب کا لڑکی کے ساتھ ظلم عظیم

ایک کوتاہی ولایت کے باب میں یہ ہے کہ بعض اوقات ولی اقرب اپنے اختیارات کے زعم (گمان) میں لڑکی کو بہت دق (تنگ) کرتا ہے کبھی سالہا سال بے نشان (لاپتہ) ہو جاتا ہے، کبھی اس انتظار میں نکاح نہیں کرتا کہ بہت سا روپیہ ہو جس سے سامان تفاخر (فخر کا سامان) کیا جائے تب نکاح کروں، کبھی اچھی بھی جگہ کے پیغاموں کو رد کر کے ترفع (خوشحالی) کی طلب میں غلو کرتا ہے، اور ان افعال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی یوں ہی بیٹھی رہتی ہے، بعض جگہ ننگ و ناموس (عزت و وقار) برباد ہو گیا، بعض جگہ نہایت صبر و ضبط (بہت زیادہ صبر و ضبط) کرنے سے لڑکی کو امراض صعبہ (پیچیدہ امراض) لاحق ہو گئے، یہ ولی صاحب سمجھے ہوئے ہیں کہ میرے سامنے کوئی با اختیار نہیں ہے، سو جس طرح چاہوں گا کروں گا، اس کا ظلم عظیم ہونا تو معلوم ہی کیا ہے، لیکن اس شخص کے اس خیال کا غلط ہونا بھی معلوم ہونا ہے کیونکہ دار و مدار ہے۔

غیبت منقطعہ ہونے سے ولایت ولی ابعد کی طرف منتقل ہو جاتی ہے

سو سمجھ لینا چاہئے کہ ان دونوں مذکورہ صورتوں میں یعنی جب کہ وہ بے نشان ہو جائے اور بہت دور دراز چلا جائے اور مدتوں تک نہ آئے اور نہ کسی بات کا جواب دے، یہ بھی بے نشان ہونے کے حکم میں ہے، اس کو غیبت منقطعہ (مستقل غائب ہونا) کہتے ہیں، پس جب وہ بغیبت منقطعہ غائب ہو جائے، یا باوجود اچھا موقع ملنے کے محض جاہلانہ خیالات کی وجہ سے ٹالتا ہو تو ان دونوں صورتوں میں ولایت اس ولی اقرب سے ولی ابعد کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اور اس ولی ابعد کو اس لڑکی کے نکاح کر دینے کا مثل ولی اقرب کے اختیار حاصل ہوتا ہے، پھر ولی اقرب کچھ نہیں کر سکتا۔

بالغ لڑکی ولی کی غفلت اور لاپرواہی کی صورت میں خود نکاح کرسکتی ہے

اور اگر وہ لڑکی بالغ ہو تو پھر خود وہ لڑکی اختیار رکھتی ہے کہ مناسب موقع پر اپنی زبان سے اجازت دے کر نکاح کرلے، البتہ غیر کفو میں نہ کرے کہ اس میں ایک قول میں ولی کو حق فسخ حاصل ہے بشرط القضاء، اور ایک قول میں نکاح ہی صحیح نہیں ہوتا، اس لئے غیر کفو میں کرنے سے ممانعت کی جاتی ہے،

یہ مختصر بیان ہے ولایت کے متعلق کوتاہیوں کا۔

اصلاح معاملہ متعلقہ بہ کفاءت

شریعت نے کفاءت (برابری) میں چند اوصاف کا اعتبار کیا ہے جن میں ایک نسب بھی ہے، اس کے متعلق خاص ہندوستان میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں:۔

کفاءت نسب میں ماں کا کچھ اعتبار نہیں،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ نسب میں ماں کا بھی اعتبار کرتے ہیں یعنی اگر ماں کسی کی نجیب (شریف) نہ ہو تو اس کو نجیب نہیں سمجھتے، اور اسی لئے اس کو اپنا ہمسر نہیں جانتے، حالانکہ شریعت نے کفاءت نسب کے باب میں ماں کا کچھ اعتبار نہیں کیا، اسی طرح دوسرے احکام نسبیہ میں بھی ماں کا اعتبار نہیں کیا، مثلاً ایک شخص کی ماں صرف بنی ہاشم میں سے ہو اس کو زکوٰۃ حلال ہے، پس صرف نجیب الاب ہمسر ہے نجیب الطرفین کا۔

ماں کی طرف سے سیادت نسبیہ صرف حضرت فاطمہؓ اور اُن کی اولاد کے لئے ثابت ہے

البتہ اس کلیہ سے صرف ایک جزئیہ مستثنیٰ (الگ) ہے جو ملحوظ ہے، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت نسبیہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے بھی ثابت ہو کر آپ کی اولاد میں جو لوگ ہیں وہ بھی سید ہیں اور افضل ہیں دوسرے بنی ہاشم سے، حتیٰ کہ جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں بھی ہوں مگر حضرت فاطمہؓ کے بطن سے نہ ہوں وہ سید نہ ہوں گے، بلکہ علوی ہوں گے، اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض نسب جو بعض علویوں کے ناموں کے ساتھ "سید" ملا ہوا ہے یہ صحیح نہیں، اور علویوں کا دعویٰ سیادت محض غلط ہے، البتہ بنی ہاشم میں سے ہیں، اور بنی ہاشم کے جو فضائل ہیں وہ ضرور ان کے لئے حاصل ہیں۔

نسب میں فخر کی کوئی بات نہیں ہے،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ نسب پر فخر کرتے ہیں اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، حالانکہ نسب کوئی فخر کی بات نہیں، البتہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے جس پر شکر کرنا چاہئے نہ کہ کبر و تحقیر (تکبر اور دوسروں کو حقیر سمجھنا) جو کہ بوری ناشکری ہے، خصوصاً جبکہ خود اس پر کوئی دلیل کافی نہیں کہ یہ مفتخر بہ (فخر کرنے والے) جس

جو دوسرے اکابر کی انساب منسوب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دعویٰ صحیح بھی ہے، بلکہ بعض حضرات کی روایات سے اس کے خلاف کا شبہ ہوتا ہے چنانچہ ایک شبہ احقر نے بعض بڑے بڑے مجامع (مجلسوں) میں جہاں ایسے حضرات کا اجتماع تھا بیان کیا، وہ یہ کہ اکثر جگہ لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ اپنے صحابہؓ کی طرف اپنے کو منسوب کرتے ہیں، مثلاً حضرات خلفائے اربعہ، حضرت عباسؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ۔

ہندوستان کے نسب ناموں میں ایک قوی اشکال اب غور طلب امر یہ ہے کہ ہندوستان میں فتوحات وغیرہ کے لئے خاص انہی حضرات کی اولاد منتخب ہو کر آئی یا اوروں کی نسل منقطع ہوگئی، ظاہر ہے دونوں امر مستبعد (ناممکن) ہیں، اس سے صاف یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید دوسروں نے انہی حضرات کی طرف افتخار (فخر کرنے) کے لئے منسوب کر دیا ہے، تو ایسے شبہ کے ہوتے ہوئے اس قدر فخر کرنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے؟[1]

شرافت نسبیہ کا شریعت نے اعتبار کیا ہے ایک کوتاہی اس کے مقابلہ میں بعض لوگوں میں یہ پائی جاتی ہے کہ وہ لوگ عرفاً شریف نہیں ہیں، مگر زبردستی اپنے کو اصطلاحی شریفوں میں داخل کرتے ہیں اور اپنے لئے نسب غیر معروف وغیر ثابت بلا دلیل کا محض مجازفت (تخمینہ اور اٹکل) سے دعویٰ کرتے ہیں، حدیث میں ایسے مدعی کو (دعویٰ کرنے والے پر) لعنت آئی ہے، ان عرفی غیر شریفوں میں سے بعض نے اپنے اوپر ایک اور طریق سے یہ دھبہ دھونا چاہا ہے، وہ یہ کہ شرافت نسبیہ ہی کی سرے سے نفی کرنے لگے کہ سب ہی آدم برابر ہیں، کسی کو کسی پر نسباً شرف نہیں، سو اس کا اگر یہ مطلب ہو کہ ایسا شرف نہیں جس پر دوسروں پر فخر کیا جائے یا اس کو اخروی نجات میں کچھ دخل ہو تو ٹھیک ہے، اور اگر یہ مطلب ہو کہ شرف نسب میں تفاوت (فرق) کا بالکلیہ کسی حکم میں اعتبار نہیں تو محض غلط ہے، خود شریعت نے نکاح میں کفاءت کا اعتبار کیا ہے، امامت کبریٰ میں قریشیت کو شرط ٹھہرایا ہے، امامت صغریٰ میں شرافت نسبیہ (خاندانی شرافت) کو مرجحات (ترجیح ہونے) میں سے کہا ہے۔

---

[1] حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔ (الحجرات: آیت ۱۳) یعنی اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے، واقعی صحیح بات یہ ہے بندہ محض شرعی ترتیب نسب کی بنا پر کہ وہ [illegible] فلاں ابن فلاں [illegible] ہے، [illegible]

شرافتِ نسب میں بد نسبیوں کو رذیل اور ذلیل سمجھنا صحیح نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض قصباتی و دیہاتی لوگ تمام بد نسبیوں کو رذیل اور ذلیل سمجھتے ہیں، گویا ان کے نزدیک شرافت محصور و بند ہے چند قوموں و جنسوں میں، جس پر کوئی دلیل نہیں، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص باہر سے کوئی نکاح کر کے لے آتے، برادری کی عورتیں ہرگز اس کو اپنے برابر نہیں سمجھتیں، پھر اس کی اولاد کی شادی برادری میں مصیبت ہو جاتی ہے،

کفاءتِ نسبیہ میں افراط و تفریط مذموم ہے

دو کوتاہیاں اس باب میں کفاءتِ نسبیہ میں اور وقوع میں آتی ہیں، ایک افراط، دوسری تفریط، افراط (حد سے آگے بڑھنا) تو یہ کہ بعضے لوگ خصوصاً پرانے زمانے کے اس کو اس قدر مہتم بالشان سمجھتے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ ناکح کے کسی وصف کو نہیں دیکھتے، نہ لیاقت کو، نہ دین کو، نہ صحت کو، نہ عمر کو، نہ وسعتِ مالیہ کو، اور اپنے اس خیال پر اس عنوان سے افتخار کرتے ہیں کہ میاں ہڈی ہونی اچھی ہونا چاہئے، کسی ظریف نے اس عنوان کا جواب نہایت لطیف دیا ہے کہ ہم کتے نہیں جو فقط ہڈی ہوئی کو دیکھیں، اور واقعی اس خیال کا لغو ہونا ظاہر ہے، نکاح سے جو اصل مقصود ہے یعنی مصالحِ خانگی، اس کے لئے سب ہی امور پر نظر کرنے کی ضرورت ہے، نہ کہ صرف ایسے وصفِ اضافی (زائد خوبی) پر جو کہ خود ناکح کے کسی وصفِ حقیقی کی طرف راجع نہیں، محض آباء و اجداد کی طرف انتساب اس کا منشا ہے، اس پر مفاسد یہ مرتب ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ناکح محض نالائق، بد دین، یا مریض، بے کار یا بہت بوڑھا، یا بالکل بچہ یا نا قدر دان ہوتا ہے، اور منکوحہ کے لئے عمر بھر کا جیل خانہ ہو جاتا ہے،

اور تفریط (کمی کرنے والے) یہ کہ بعضے لوگ خصوصاً نئے زمانہ کے دوسرے اوصاف کے ہوتے ہوئے نسب کا ذرا لحاظ نہیں کرتے، کہیں محبتِ دین (دین کی محبت) کے غلبہ کے سبب اور کہیں محبتِ دنیا (دنیا کی محبت) کے غلبہ کے سبب، امر ثانی تو کثیر الوقوع (اکثر واقع ہونے والا) ہے، امر اول کا بھی ہم نے ایک واقعہ تحقیق دیکھا ہے، کہ دو نوجوانوں میں دوستی تھی جو کہ دونوں نیک بخت، دیندار تھے، جن میں ایک عالی نسب سید زادہ (اچھے خاندان کے سید کا لڑکا) اور دوسرا برہمن زادہ نومسلم (برہمن کے بیٹے نو مسلم) تھے اور وہ سید زادہ اپنی ہمشیرہ کا عقد اس اپنے دوست سے کرنے کی فکر میں تھے، اور وہ دوست اپنے لئے اس امر میں کچھ کوشاں (بے انتہا کوشش کرنے والے) تھے، مجھ کو اطلاع ہوئی، چونکہ دونوں شخصوں کو مجھ سے دینی خصوصیت تھی میں نے دونوں کو خصوصاً طالب (نکاح کا پیغام دینے والے) کو بہت سختی کے ساتھ روکا،

اور کہہ دیا کہ اگر وہ لڑکی بالغہ ہے تب تو کو بھائی کے جو مستبدان (بھائی کے اجازت حاصل) کرنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا، لیکن حمیت و مصلحت (غیرت اور مصلحت) کے خلاف ہے کہ شریفہ کو فراش (بیوی) بنا یا جاتا ہے (دل) ذکم مرتبہ ولے بھلا نیز اکثر ایسے موقع پر عورت کی نظر میں لروج (خاوند) کی وقعت بھی نہیں ہوتی جس سے تمام مصالح نکاح فوت ہو جاتے ہیں، اور اگر وہ نابالغ ہے تو چونکہ نکاح کرنے والا باپ اور دادا نہیں اس لئے یہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا: (کذا فی الدر المختار و رد المحتار ج ۲ ، ص ۵۰۰) چنانچہ بفضلہ تعالیٰ ایک مدت کے بعد دونوں اس خیال سے باز آ گئے، البتہ اگر نکاح کرنے والا باپ دادا ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے،

عجمی عالم بھی عربیہ کا کفو نہیں

چنانچہ ابھی تازہ ایک واقعہ ہوا ہے کہ ایک غریب شیخ زادہ نے اپنی نابالغ دختر کا نکاح ایک ذی وسعت عجمی النسل مگر دیندار شخص کے فرزند سے کیا ہے، اور گو بعض نے عجمی عالم کو عربیہ کا کفو کہا ہے، مگر در مختار میں تصریح ہے:

العجمی لا یکون کفوا للعربیۃ	(عجمی مرد عربی عورت کا کفو نہیں ہو سکتا
ولو کان العجمی عالما او سلطانا	اگرچہ وہ عجمی عالم اور بادشاہ ہی کیوں نہ ہو
وھو الاصح فتح عن الینابیع	اور یہ زیادہ صحیح ہے جسے فتح القدیر نے ینابیع
وادعی فی البحر انہ ظاہر الروایۃ	سے نقل کیا ہے اور ظاہر روایت پر بحر الرائق کا
(ج ۲ ص ۵۲۹)	اظہار کیا ہے)۔

کفو کا اعتبار مرد کی جانب سے ہوگا عورت کی جانب سے نہیں

اور بعض نے اس افراط و تفریط کے درمیان بزعم خود اپنے گمان کے مطابق ایک معتدل فیصلہ اختراع (وضع) کیا ہے، وہ یہ کہ کم ذات کو تو اپنی لڑکی دیدے مگر کم ذات کی لڑکی لے نہیں، اور اپنے ذہن میں اس کا مبنیٰ ایک نکتہ نکالا ہے، وہ یہ کہ اگر کم ذات کی لڑکی آئی اور اس سے اولاد ہوئی تو اپنے خاندان کی نسل بگڑتی ہے، اور اگر کم ذات کے گھر لڑکی چلی گئی تو اس کی نسل سنورتی ہے، اس شخص نے خود حکم میں بھی اور اس کی بناء میں بھی شریعت کے ساتھ مزاحمت کی ہے، حکم میں ..... پس مسئلہ فقہ یہ ہے کہ:

الکفاءۃ معتبرۃ من جانبہ ای	(کفارت اس کی طرف سے یعنی مرد کی جانب
الرجل لان الشریفۃ تابیٰ ان	سے معتبر ہے کیونکہ شریف عورت کم درجہ
یکون فراشا للدنی ولا تعتبر من	کے مرد کی فراش (بیوی) بننے سے انکار
جانبہا لان الزوج مستفرش	کرتی ہے اور اس عورت کی طرف سے

فلا تغیّرہ وبنات الفواحش وہنّ عند الشکل فی الصحیح الخ

معتبر نہیں کیونکہ خاوند صاحب فراش ہے تو وہ فراش کے استعمال میں مزاحمت نہیں کرتا اور یہی صحیح ہے سب کے نزدیک۔

البتہ بعض نے نکاح صغیر میں اس کا اعتبار کیا ہے کما فی رد المحتار تحت القول المذکور ج ۲ ص ۳ اس فیصلہ کنندہ (فیصلہ کرنے والے) نے خلاف شریعت منکوحہ کا وضع (حمل) ہونا تو جب تک نہ رکھا، اور نکاح سے وضع (حمل) ہونے کو جائز رکھا، اور اس حکم کی بنا میں شریعت کے ساتھ یہ مزاحمت کی کہ اس شخص نے نسب میں ماں کا اعتبار کیا ہے، دوسری مزاحمت یہ کی کہ اصل حکمت اس اعتبار کفاءت کی وہ ہی جو در مختار کی عبارت بالا میں مذکور ہے لان الشریف تأبی الخ اور اس شخص نے اس کے مقابلہ میں خود ایک غلط بنا گھڑی، پس اس شخص کا یہ فیصلہ ہر طرح بناء الفاسد علی الفاسد (فاسد کی بنیاد فاسد پر) ہے، یہ تو قانون شرعی کی تفصیل تھی جس کی تحقیق لوگوں کی کتب میں بیان مذکور ہے۔

غیر کفو کی منکوحہ لانے سے اس کیلئے چند دشواریاں: بلکہ اقرب الی المصلحت (مصلحت کے زیادہ قریب) یہ ہے کہ منکوحہ بھی اپنی ہی کفو کی لائے کیونکہ غیر کفو کے اخلاق و عادات اکثر باہم موافق نہیں ہوتے، تو ہمیشہ باہم ناچاقی رہتی ہے، نیز وہ منکوحہ مرد کے خاندان میں بے قدر رہتی ہے، تو ایک مسلمان عورت کو بے وجہ ذلت العمر کے لئے بے قدر رکھنا کیا ضرور، نیز عرفاً اس کی اولاد کی شادی میں دشواریاں پیش آتی ہیں، تو بلا ضرورت ان مخمصوں میں کیوں پڑے، یہاں تک تو اوصاف معتبرہ عند الشرع (شریعت کی نظر میں اعتبار کی گئی خوبیاں) میں سے کفاءت نسبیہ کا بیان تھا۔

شریعت نے کفاءت میں دین کا بھی اعتبار کیا ہے: دوسرا منجملہ اوصاف کے جن کا شرع نے کفاءت میں اعتبار فرمایا ہے، ایک دین بھی ہے اور اس میں بھی مثل کفاءت فی النسب (خاندان میں برابری) کے عورت کا مرد سے کم ہونا مضر نہیں، مرد کا عورت سے کم ہونا مضر ہے، اس میں بھی مختصر کرکے بیان ہوتی ہیں جو ایک تحقیق کے ضمن میں مذکور ہوئی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ:-

مرد کی بد دینی کی تین قسمیں: مرد کی بد دینی تین طرح کی ہے، ایک اعتقادی اصولی، دوسری اعتقادی فروعی، تیسری اعتقادی عملی۔

قسم اول: جیسے عورت مسلمان ہو اور مرد غیر مسلم ہو خواہ کتابی ہو مثل یہودی و نصرانی کے خواہ غیر کتابی ہو مثل مجوسی و بت پرست و دہری کے، اس کا حکم تو ظاہر ہے کہ نکاح صحیح نہ ہوگا

البتہ مرد اگر مسلم اور عورت کتابیہ ہو تو نکاح درست ہو جاتا ہے، مگر مناسب نہیں، وجہ مناسب نہ ہونے کی یہ ہے کہ اختلاط کا فرو کا (کافر عورت سے میل جول) لازم آتا ہے، اور یہ درست ہونا بھی جب ہے کہ عورت باعتبار عقائد کے یہودی یا عیسائی ہو اور اگر صرف قوم کے اعتبار سے ہو جیسے آجکل بہت نام کے عیسائی ہیں اور عقیدہ میں دہریے، اس کا حکم کتابی کا سا نہیں، ایسی عورت سے نکاح اصلا درست نہیں، اور اگر عورت غیر کتابیہ ہو تو بھی نکاح درست نہیں،

قسم ثانی: ۔ جیسے عورت سنیہ ہو اور مرد مبتدع جیسے شیعی وغیرہ ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کی بدعت حد کفر تک پہنچ جاوے، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت لگانا یا وحی لانے میں جبرئیل علیہ السلام کو غلطی کی طرف منسوب کرنا و نحوہا (اور ایسے ہی جیسے دوسرے عقائد) یا اس زمانہ میں مرزا کی نبوت کا قائل ہونا،[1] تو اس شخص کا حکم بھی مثل قسم بالا کے ہے: یعنی ایسے شخص سے سنیہ کا نکاح جائز نہیں، اور اگر اس کی بدعت حد کفر تک نہیں پہنچی، تو وہ شخص مسلمان تو ہے، لیکن سنیہ کا کفو نہیں، اس عورت کا نکاح اگر ایسے مرد سے کیا جاوے تو اس کا حکم بوجہ غیر کفو کے ساتھ نکاح ہونے کے ویسا ہی ہے جیسا اوپر غیر کفو نسبی کے بیان میں ذکر کیا گیا، اس عبارت میں کہ "اگر وہ لڑکی بالغ ہے تب تو بھائی کے ولی ہونے کی صورت میں ... اگر نکاح کرنے والا باپ یا دادا ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔" فقط،

بعض مبتدع فرقوں کے کفر میں اختلاف ہے	ایک صورت اس میں اور ہے وہ یہ کہ بعض مبتدع (بدعتی) فرقوں کے کفر میں علماء کا اختلاف ہے، جیسے شیعہ کے باب میں فتووں کا مختلف

ہونا مشہور ہے، سو مکفرین (کافر قرار دینے والوں) کے نزدیک تو سنیہ کا نکاح ایسے شخص سے باطل ہے، اور غیر مکفرین (کافر نہ کہنے والوں) کے نزدیک یہ نکاح غیر کفو میں ہے، اس لئے اس میں وہی تفصیل ہے جو ابھی غیر کفو کے ساتھ نکاح ہونے میں مذکور ہوئی، اور احقر کا معمول اس صورت مختلف فیہا (اختلاف والی) میں یہ فتوی دینے کا ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوا ہو بطلان نکاح (نکاح باطل ہونے) کے قول پر عمل لازم ہے، کہ اس میں احتیاط ہے، کہ یک خوش اعتقاد (اچھے عقیدہ والی) عورت ایک بد اعتقاد (غلط عقیدہ والے) مرد سے اور

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مجدد ماننے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اس کا نکاح کسی مسلمان عورت سے نہیں ہو سکتا، ۱۲ حقر ظہیر عفی عنہ

بداعتقادی بھی ایسی کہ جس کی بداعتقادی بعض کے نزدیک حدِ کفر تک پہنچی ہے، اور جب نکاح ہو چکا تو صحتِ نکاح کے قول کو اختیار کرنا (نکاح کے صحیح ہونے کو لینا) لازم ہے کہ اسی میں احتیاط ہے کیونکہ اس صورت میں اگر بطلان (باطل ہونے) کا قول لیا گیا، اور اس بنا پر دوسرے شخص سے نکاح کر دیا جائے تو احتمال (شبہ) ہے کہ واقع میں وہ پہلا نکاح صحیح ہو گیا ہو تو یہ دوسرا عقد ہمیشہ کے لئے زنا ہو جائے گا، تو ایک مسلمہ (پرہیزگار عورت) کا عمر بھر مبتلائے زنا ہونا لازم آئے گا، اور صحتِ نکاح کے قول پر اس احتمال کا اعتبار نہیں کیا گیا کہ اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی (یعنی اسلام غالب آتا ہے مغلوب نہیں ہوتا)

قسم ثالث: — فاسق مرد عورت صالحہ کا کفو نہیں۔ جیسے عورت صالحہ ہو اور بقول بعض فقہاء دخترِ شخصِ صالح (نیک آدمی کی بیٹی) بھی بحکم صالحہ ہے، اور مرد فاسق ہو اور بقول بعض فقہاء معلن (جس کا فسق علانیہ ظاہر ہو) ہونا بھی شرط ہے، تو یہ مرد اس عورت کا کفو نہیں، ہو اور غیر کفو کے ساتھ نکاح نہ ہونے کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے۔

غرض یہ تین قسمیں ہیں غیر کفو کی، ان میں جو کوتاہیاں ہیں ان کا مختصر بیان یہ ہے کہ:۔

بلادِ یورپ کی لامذہب عورت سے نکاح صحیح نہیں: بعضے لوگ بلادِ یورپ سے ایسی عورت نکاح کر کے لاتے ہیں جو عورت قوم کے اعتبار سے عیسائی ہوتی ہے اور مذہب کے اعتبار سے محض لامذہب، سو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسی عورت سے ہرگز نکاح صحیح نہیں ہوتا، بعضے گو لاتے ہیں عیسائی ہی عورت مگر اس سے اس قدر مغلوب ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اپنے مذہب سے محض اجنبی ہو جاتے ہیں، اور اس کا واجب الاحتراز (پرہیز کا ضروری) ہونا بھی ظاہر ہے۔

خاندانی مصالح موہومہ سے بدعقیدہ یا بدعمل مرد کے نکاح کرنا ظلم عظیم ہے: بعضے لوگ محض طمعِ مال یا جاہ میں یا بوجہ کم شفقتی بجائے اولاد (اپنی اولاد کے حال پر کم شفقت کرنے) یا دیگر خاندانی مصالح موہومہ (خاندان کی خیالی مصلحتوں کے گمان) کے سبب اپنی لڑکیوں کا کسی بدعقیدہ یا بدعمل مرد سے نکاح کر دیتے ہیں، تو وہ بداعتقادی حدِ کفر تک پہنچی ہوتی ہو تو عمر بھر کے لئے علاوہ ظاہری کلفت کے بحالت عدم توافق فی الدین (دینداری میں موافقت نہ ہونا) لازم ہے، یہ خرابی ہوتی ہے کہ ارتکابِ زنا لازم آتا ہے، پھر اگر اولاد ہوئی وہ بھی حرامی اور اگر حدِ کفر تک بھی نہ پہنچے تب بھی ہر وقت کا سوہانِ روح (روحانی عذاب، سخت پریشانی) رہتا ہے۔

نکاح سے قبل ناکح کے عقائد کی اچھی طرح تحقیق اور جانچ کر لینا ضروری ہے

اس باب میں سخت احتیاط لازم ہے بالخصوص اس کی تحقیق قبل نکاح نہایت ضروری ہے کہ ناکح کسی فرقہ ضالہ (گمراہ فرقہ) سے عقائد کا تو نہیں، اور قدیم گمراہ فرقوں میں سے نہ ہونے پر بھی قناعت نہ کی جائے آجکل روز انئے نئے فرقے نکل رہے ہیں اور زمانہ آزادی کا ہے، اس لئے اس شخص کی ان نئے فرقوں میں سے نہ ہونے کی مستقل تحقیق ضروری ہے، اسی طرح اگر وہ انگریزی خواں ہے تو دیکھ لیا جائے کہ جدید تعلیم کے اثر سے اس کی آزادی استخفاف دین (دین کو ہلکا سمجھنے) یا انکار ضروریات دین تک تو نہیں پہونچ گئی، ورنہ اگر ایک کلمہ بھی کفر کا منہ سے نکل گیا تو بدون تجدید اسلام و تجدید نکاح (نئے سرے سے اسلام لانے اور نکاح پڑھانے) بغیر حرام کا ارتکاب ظاہر ہے جس کو نہ غیرت انسانی قبول کرتی ہے نہ حمیت اسلامی،

یہ بیان ہے کفاءت دینیہ کے بارے میں کوتاہیوں کا،

ایک اہم علمی فائدہ

اوپر ابھی کفاءت فی الدین کے شروع میں بیان ہوا ہے کہ عورت کا مرد سے (مرتبہ و نسب میں) کم ہونا مضر نہیں، یعنی نکاح ہو جائیگا، اور مرد کا عورت سے (مرتبہ و نسب میں) کم ہونا مضر ہے، یعنی بعض صورتوں میں نکاح نہ ہوگا، سو آجکل چونکہ قرآن مجید کا ترجمہ ایسے عوام بھی (جو کہ اس کے سمجھنے کے اہل نہیں) دیکھتے ہیں ایسے لوگوں کو آیت سے احکام مذکورہ میں شبہ واقع ہونے کا احتمال تھا، اس لئے اس کو رفع کرنا مناسب معلوم ہوا، وہ آیت یہ ہے،

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ
مُشْرِكَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ
اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ
عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ۔

اس کے ظاہر ترجمہ سے شبہ ہوتا ہے کہ زانیہ اور زانی سے علی الاطلاق (مطلقاً) نکاح جائز نہیں، اور اس عدم جواز (ناجائز ہونے) میں زانیہ و زانی کا مشرکہ اور مشرک کے ساتھ جمع ہونا قرینہ (دلیل) ہے کہ یہ عدم جواز بمعنی بطلان و عدم صحت (باطل ہونے اور درست نہ ہونے کے معنی میں) ہے، اور یہ تحقیق بالا کے خلاف ہے، اور جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں تحریم عام ہے بطلان

اور معصیت کو یعنی مشرک و مشرکہ سے نکاح تو باطل ہے، اور زانیہ و زانی سے نکاح گو منعقد ہو جاتا ہو
مرد عفیف (پاکباز مرد) کا زن غیر عفیفہ (بدکار عورت) سے علی الاطلاق (مطلقاً) اور زن عفیفہ
(پاکباز عورت) کا مرد غیر عفیف (بدکار مرد) سے علی التفصیل (کچھ شرائط کی تفصیل کے ساتھ) لیکن
جبکہ مقصود محض آب ریزی (شہوت رانی) ہو اور تحصین (عزت کی حفاظت) مقصود نہ ہو حتی کہ
اگر دوسری جانب سے بدون نکاح ہی کے باوجود قیام مانع یعنی شرک کے رضامندی ہو جاتی
تو نکاح بھی نہ کیا جاتا، اور اب نکاح کے بعد اس کے ارتکاب زنا کی پرواہ نہ ہو، اور یہی مراد ہے
آیت میں تو اس مقصود کے لئے نکاح کرنا بنا بر قاعدہ "العزم علی الحرام حرام" والرضاء
بالحرام حرام ومعصیۃ (جیسے امر حرام کا ارتکاب حرام ہے، اسی طرح کسی حرام کے ارتکاب
پر رضامندی بھی حرام اور گناہ ہے) اب دونوں شبہے زائل ہو گئے، اور اگر بسط (تفصیل)
کا شوق ہو میری تفسیر (بیان القرآن) دیکھ لیجئے۔

کفاءت سے متعلق ایک عمدہ بحث

اختلافِ جنس ہونے کی صورت میں نکاح صحیح نہ ہوگا

جب باوجود اتحاد فی النوع (نسل اتحاد) کے بعض اختلافات اصناف یا اوصاف (قسموں یا صفتوں کے اختلاف) سے بعض صورتوں میں کفاءت ایسی فوت ہو جاتی ہے جس سے نکاح صحیح نہیں ہوتا، تو اختلافِ نوع کی حالت میں جس کو فقہاء اختلافِ جنس کہتے ہیں کفاءت کیوں نہ مفقود ہو جائے گی، اور نکاح کیسے جائز ہوگا کیونکہ جو عدمِ کفاءت فی الوصف (صفت میں ہم مثل نہ ہونا) مانع صحتِ نکاح ہے یہ عدمِ کفاءت فی الجنس (نسل میں ہم مثل نہ ہونا) اس سے بدرجہا اقویٰ ہے بمصداق محلی الوقوع اس قاعدہ کا نکاح ہے۔ درمیان جن مرد اور انسان عورت کے یا درمیان انسان مرد اور جنی عورت کے جس کو ہمارے فقہاء نے اسی اختلافِ جنس کی بنا پر ناجائز قرار دیا ہے چنانچہ درمختار میں ہے:

خرج الذکر والخنثی المشکل والوثنیة لجواز ذکورته والمحارم والجنیة وانسان الماء لاختلاف الجنس واجاز الحسن بشهود قنیة

اس سے مذکر نکل گیا اور خنثیٰ مشکل نکل گیا، کیونکہ وہ مذکر ہو، اسی طرح جنیہ نکل گئی، اور دریائی انسان مختلف جنس ہونے کی وجہ سے نکل گیا (یعنی ان سے نکاح جائز نہ ہوگا) اور

امام حسنؒ نے مرد جن کی موجودگی میں جنیہ کا نکاح جائز قرار دیا ہے، جسے قہستانی و درمختار نے نقل کیا ہے،

ردالمحتار میں ہے:

لان قوله تعالیٰ والله جعل من انفسکم ازواجا بین المراد من قوله فانکحوا ما طاب لکم من النساء وهو الانثی من بنات آدم فلا یثبت حل غیرها بلا دلیل،

(ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں بنائیں، یہ آیت مذکورہ بالا آیت فانکحوا کی تفسیر ہے، اس میں نساء سے مراد آدم کی بیٹیاں ہیں۔)

یہ تو دلیل نقلی سے استدلال کیا تھا، اور اس کے بعد ایک لطیف دلیل عقلی سے استدلال کیا ہے:

ولان الجن یتشکلون بصور شتی فقد یکون ذکرا تشکل بشکل انثی (یعنی)، وفیه بعد اسطر الاشباه عن السراجیة لا تجوز المناکحة بین بنی آدم والجن وانسان الماء لاختلاف الجنس اھ و مفاد المفاعلة ان لا یجوز للجنی ان یتزوج انسیة ایضا وهو مفاد التعلیل

(اس لیے کہ جن مختلف شکلوں میں متشکل ہوتے ہیں تو کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ نر جن مؤنث کی شکل میں متشکل ہو جاتا ہے، اس کے چند سطروں بعد اشباہ والنظائر میں سراجیہ سے نقل کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی اولاد، جنات اور دریائی انسان کا آپس میں نکاح جائز نہیں، جنس کے اختلاف کی وجہ سے، اور (اشباہ میں) باب مفاعلہ ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جن کا نکاح بھی انسان عورت سے جائز نہیں، اور علت بیان کرنے کا بھی فائدہ یہ ہے۔)

پھر چند سطر کے بعد حسنؒ کے قول مذکور کے مقابل نقل کیا ہے:

عن شرح الملتقی عن زواهر الجواهر الاصح انه لا یصح نکاح آدمی جنیة کعکسه لاختلاف الجنس فکانوا کبقیة الحیوانات،

(شرح الملتقی نے زواہر الجواہر سے نقل کیا ہے کہ صحیح قول یہی ہے کہ انسان مرد کا نکاح جن عورت کے ساتھ صحیح نہیں، جیسا کہ اس کے برعکس ہے (یعنی جن مرد کا نکاح انسان عورت سے درست نہیں) اختلاف جنس کی بنا پر جنوں کا حکم وہی ہے جو دیگر حیوانات کا ہے۔)

جن عورت کا انسان مرد سے اور جن مرد کا انسان عورت سے نکاح صحیح نہیں۔

(اور ہر چند یہ صورت نادر الوقوع (کبھی کبھار واقع ہونے والی) ہے لیکن ممتنع الوقوع (واقع ہونے میں ناممکن) نہیں ہے، اور حکم اس کا عوام میں مشہور و معلوم کم ہے، تو امکان وقوع ... (واقع ہونے کا) ... احتمال تھا کہ شاید کسی کا اتفاق پڑتا، اور وہ حکم معلوم نہ ہونے سے اس میں مبتلا ہو جاتا، جیسا کہ چند سال ہوئے ایک طالب علم جن کو احقر نے بھی دیکھا تھا ایک مدرسہ سے غائب ہو گیا تھی روز

کے بعد تجار بحیرہ کے جنگل میں پایا گیا، اس نے اپنا سارا قصہ بیان کیا کہ مجھ کو کچھ لوگ جو جن ہیں اٹھا کر لے گئے اور کسی اجنبی جگہ پہنچا دیا، وہاں ایک نفیس شاہانہ مکان میں ایک لطیف الوضع (یعنی پریاں) مجمع تھا، اور ایک جوان لڑکی بھی موجود تھی جس سے اپنا تعشق (عشق ہونا) اس نے ظاہر کرکے نکاح کی درخواست کی، اس نے مسئلہ کی بنا پر تو نہیں کیونکہ اس کو معلوم ہی نہ تھا بلکہ محض توحش (گھبرانے) کے سبب رونا شروع کردیا، آخر وہ لوگ اس کو پھر ہوا میں اڑا کر سہارنپور کے جنگل میں چھوڑ گئے، تو بہت ممکن تھا کہ اگر اس کو یہ توحش نہ ہوتا تو مسئلہ معلوم نہ ہونے کے سبب نکاح پر راضی ہو کر قبول کرلیتا، خصوص جس شخص کے کان میں ایسے قصے پڑے ہوں کہ حضرت بلقیس کے باپ آدمی اور ماں جنیہ تھیں، یا جیسا جہلا نے مشہور کیا ہے کہ حضرت محمد بن علی کی والدہ خولہ حنفیہ جنیہ تھیں، تو ایسے قصے سن کر کچھ عجب نہیں کہ کوئی شخص ایسے موقع پر ایسے نکاح کو جائز ہی سمجھ جائے، اس لئے اس پر تنبیہ کردی گئی،

جنیہ سے صحت نکاح کے سلسلہ میں بلقیس کے قصہ سے استدلال صحیح نہیں،

رہا استدلال (دلیل لانا) مذکورہ قصوں سے، سو گو پہلے قصہ میں احتمال صحت کا بھی ہے، لیکن اول تو ان لوگوں کا کسی شرع کا تابع ہونا ثابت نہیں بلکہ بلقیس کے اول شمس پرست (پہلے سورج کی پوجا کرنے والی) میں سے ہونے سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ طریقہ ان کا آبائی ہو، پھر اس سے قطع نظر یہ ضرور نہیں کہ سب شریعتوں کے احکام فرعیہ (فروعی احکام) یکساں ہوں تو ان کا فعل ہمارے لئے حجت نہیں ہو سکتا،

بنی حنفیہ کی بنو جنیہ کی طرف نسبت من گھڑت ہے

اور دوسرا قصہ تو بالکل ہی غلط ہے، وہ تو قبیلہ بنی حنیفہ سے ہیں، جو یمامہ میں سکونت رکھتا تھا، میں نے اپنے استاذ[۱] (علیہ الرحمہ) سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ یہ خاندان کرم اور شجاعت میں ممتاز ہونے کے سبب محاورۂ عرب کے موافق بنو جنیہ کہلاتا ہوگا، عوام نے اس کا حقیقی ترجمہ کرکے ان کی طرف منسوب کردیا،

احقر کہتا ہے کہ جس طرح ایک شاعر نے کسی قبیلہ کی مدح کی ہے ؎

بنو جنية ولدت سيوفا

(ایک جنیہ عورت کی اولاد ہیں جنہوں نے تلواریں جنی ہیں)

---

[۱] یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، پہلے صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جواہرات یعقوبی حصہ اول صفحہ ۸ مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ہارون آباد ضلع بہاولنگر،

مانی نفس الامر (تو) میں اس کو مؤثر سمجھا گیا ہے، لیکن بقاء نکاح میں اس کو مانع (روکنے والا) نہ سمجھا جس کا راز یہ ہے کہ قوالب مختلفہ (مختلف شکلیں) روح کے لئے ایسی ہیں جیسے البسۂ مختلفہ (مختلف لباس) انسان کے لئے پس اگر کسی مرد کا لباس پہن لے یا سحر یا جادو سے مرد کی شکل بن جائے، پھر خواہ وہ شکل واقع میں ہو جائے یا محض تخییل (خیالی) ہو جائے کیونکہ سحر میں دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں تو نکاح باقی رہتا ہے، اسی طرح ... فیہ (جس میں) زیر بحث مسئلہ میں کہا جائے، رہا اس کا مقتضا کہ حدوث نکاح میں بھی مانع نہ ہو تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس وقت ہم لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ متشکل بشکل مرد (آدمی کی شکل اختیار کرنے والا) واقع میں جنیہ انثیٰ (جن عورت) ہے، تو نکاح کا محل (موقع) ہونا ہی مشکوک ہے، اور پہلے سے نکاح معدوم (غیر موجود) ہے فلا ینعقد بالشک، (پس شک کی وجہ سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا) اور ایک بار جب حدوث ہو چکا تو تبدل شکل (شکل تبدیل کر لینے) سے تیقن انعقاد (منعقد ہونے کے یقین) کے بعد زوال (زائل ہونا) مشکوک ہو گیا۔ فلا یزول بالشک (پس شک سے زائل نہیں ہوتا)۔

جنس مخالف سے نکاح کے مسئلہ میں احتیاط کی راہ اور ایک شبہ کا ازالہ

اور احقر کا وجدان ان احکام مذکورہ کے منشاء کے باب میں یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان تمام احکام میں دلائل متعارض (ایک دوسرے سے ٹکرانے والے) ہیں ...... جیسا کہ ظاہر من تقریرنا فی کل مسئلہ (جیسا کہ ہر مسئلہ میں ہماری تقریر سے ظاہر ہے) پس ہر مسئلہ میں احتیاط پر عمل کرنا چاہئے چنانچہ غسل کے باب میں احتیاط وجوب میں ہے، اور نکاح کے باب میں احتیاط عدم جواز (جائز نہ ہونے) میں ہے، ہذا و ہو اقرب والصواب ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس قول جمہور یعنی مانعیت اختلاف الجنس عن التناکح (نکاح میں اختلاف جنس کے مانع ہونے) پر جنت میں حوروں سے نکاح ہونے پر شبہ نہ کیا جائے کہ وہ بھی جنس میں مخالف انسان سے مختلف ہیں، تو ان سے نکاح اور استمتاع (بہرہ ور) ہونا کیسے حلال ہوگا جس کی خبر قرآن مجید میں فرمائی گئی ہے:

"اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں (یعنی حوروں) سے بیاہ کر دیں گے۔"	وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ط (الطور، آیت ۲۰)

دنیا اور آخرت کے احکام متناسب نہیں

جواب شبہ کا ظاہر ہے کہ دنیا و آخرت کے احکام کا متناسب (یکساں) ہونا ضروری نہیں، یہاں مردوں کے لئے حریر جائز ہے، اور جنت

میں جائز ہوگا، اور راز اس میں یہ ہے کہ احکام دنیویہ کی جو علت (بنیاد) ہے وہ وہاں مرتفع (ختم) ہوجاوے گی، چنانچہ حریر و حلیہ (ریشم و زیور) کی نہی کی علت تفاخر (فخر کرنا) ہے، سو جنت میں اس رذیلہ کا مادہ ہی منقطع (ختم) ہوجاوے گا، اسی طرح ممکن ہے کہ یہاں اختلاف کا مانع من النکاح ہونا معلل (نتیجہ) ہو علت عدم توافق (عدم تناسب) (مزاج اور مناسبت میں یکساں نہ ہونے) سے جس کے سبب مصالح زوجیت فوت ہوجائیں گے، اور یہ علت جنت میں اس لئے مرتفع ہوجاوے گی کہ وہاں خود انسان میں خواص بشریہ کی جگہ خواص ملکیہ (فرشتوں کے خواص) پیدا ہوجائیں گے، پس خواص میں سب اور حوریں متکافی (باہم برابر) ہوں گے، اس لئے عدم توافق کا احتمال بوقت نہ ہوگا، شک نہ رہے گا، البتہ جو امور قبیح لعینہ (اپنی اصل کے اعتبار سے برے) ہیں وہ جنت میں بھی نہ ہوں گے کیونکہ ان کا قبح (برائی) ذاتی ہے، ان سے کسی موطن وجود (عالم وجود) میں منفک (علیحدہ) نہ ہوگا مثلاً مردوں کو جس غرض سے انعام میں حوریں ملیں گی اسی غرض سے عورتوں کو غلمان (لڑکے) دیئے جانے، تو یہ انعام کے درجہ میں قبیح لعینہ (اپنی اصل کے اعتبار سے برا کام) ہے کیونکہ انعام میں اکرام ہوتا ہے، اور فراش بننا اپنے مفعول (کمتر) کا اہانت ہے، اور مومنین و مومنات (بلکہ حوریں) غلمان سے درجہ میں مطلقاً افضل ہیں، اسی راز کے سبب زوج کا کفاءت میں کم ہونا شرعاً جبر کو اور عورت کا کم ہونا معتبر نہیں، اس لئے اکرام کے موقع میں اہانت قبیح لعینہ (تو ہین اپنی اصل کے اعتبار سے برائی) ہے، اور انسیہ (انسانی عورت) کا انسان کے لئے فراش بننا اہانت نہیں کیونکہ وہ من کل الوجوہ مفعول (ہر اعتبار سے کمتر) نہیں،

جنت میں لواطت نہ ہوگی اسی تقریر سے جنت میں لواطت کا نہ پایا جانا بھی محقق ہوگیا، اور بعض معتزلہ کا خلاف کرنا قابل التفات نہیں،

كما نقل في رد المحتار عن ابي علي
بن الوليد المعتزلي ونقل ايضا
الرد عليه عن ابي يوسف القزويني
بقوله الميل الى الذكور عاهة
وهو قبيح في نفسه لانه محل
لم يخلق للوطئة ولهذا لم يبح
في شريعة بخلاف الخمر منه۲۲

جیسا کہ رد المحتار میں ابو علی ابن الولید معتزلی سے نقل کیا ہے، اور امام ابو یوسف قزوینیؒ سے اس کا رد بھی ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ مردوں کی طرف میلان ایک آفت ہے، اور وہ فی نفسہ ایک برا کام ہے کیونکہ لواطت کے لئے یہ محل پیدا نہیں کیا گیا، اسی وجہ سے شراب کے برعکس اس کو کسی

وفی الدر المختار عن البحر حرمتها اشد من الزنا لحرمتها عقلا وشرعا وطبعا والزنا لیس بحرام طبعا وتزول حرمته بتزوج وشراء بخلافها۔

شریعت میں بھی مباح قرار نہیں دیا گیا (ص ۲۴۲ ج ۳) اور در مختار میں بحر الرائق سے منقول ہے کہ لواطت کی حرمت زنا سے زیادہ سخت ہے کیونکہ لواطت طبعاً، شرعاً اور عقلاً حرام ہے، اور زنا طبعی حرام نہیں اور اس (زنا) کی حرمت نکاح کے ذریعہ یا لونڈی خرید لینے سے زائل ہو جاتی ہے، بخلاف لواطت کے کہ اس کی حرمت کسی حال میں زائل نہیں ہو سکتی۔

اور اس عبارت سے جنت میں انتفاء لواطت (لواطت کے نہ ہونے) کا ایک اور طریق سے بدلالۃ النص بھی ثابت ہوا یعنی یہ وزنا سے اشد ہے، اور جنت میں زنا نہ ہونا یقینی ہے تو جو حرمت میں اس سے شدید ہے وہ بدرجۂ اولیٰ منتفی (زنا سے بدرجہ) ہوگا۔

یہ ایک تفریع تھی اس قاعدہ پر جس سے جنت میں مرد کو حوریں دیئے جانے کا عورت کو غلمان دیئے جانے کے لئے مستلزم نہ ہونا ثابت ہے، اور اصل مقصود جنیہ سے نکاح کے عدم جواز سے حوروں سے نکاح ہونے پر شبہ کا دفع کرنا ہے، یہ ہے تحقیق قول جمہور کی متعلق مسئلہ عدم جواز نکاح جنیہ کے (جن عورت سے نکاح کے ناجائز ہونے کی)۔

قرآن پاک کو ماننے والا شخص کسی طرح جن کا انکار نہیں کرسکتا۔

اور ہماری یہ تمام بحث شاید ان صاحبوں کو فضول معلوم ہو جو تعلیم جدید کے غلبہ سے خود جنات کے وجود ہی سے منکر ہیں، لیکن جو شخص قرآن مجید کی تصدیق کرے گا، اور روایت ثقات کثیر العدد (بے شمار انتہائی معتبر روایت کرنے والوں) کی بھی تکذیب نہ کرے گا، اس کو وجود جن کے قائل ہونے سے چارہ نہیں، پس اس حالت میں اس بحث کو فضول کہنا بناء الفاسد علی الفاسد (ایک غلط کی بنیاد دوسرے غلط پر رکھنا) ہے، ہمارے فقہاء نے بھی اس کو محسوس کر کے اس سے تعرض بھی فرمایا ہے:

کما فی رد المحتار وما قیل من ان من سأل عن جواز التزوج بها یصفع لجہلہ وحماقتہ لعدم تصور ذلک بعید لان التصور ممکن لان تشکلہم ثابت بالاحاد۔

(جیسا کہ رد المحتار میں ہے اور جو یہ منقول ہو کہ بعض لوگوں کا اس (جنیہ کے) نکاح کے جواز کا سوال کرنا اپنی جہالت و کم فہمی کے باعث اس لئے ہو کہ ان کے نزدیک کوئی شکل اختیار کر لینا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ ان کا متشکل ہونا ممکن

والاثار والحکایات الکثیرۃ وفی
بیت المنتہی من قتل بعض الحیات
کما مر فی مکروہات الصلوۃ ص ۲۲۳ ج ۲

. . . .
اور ..... بہت سے حکایات صحابہؓ
حدیث سے جنات کا مختلف شکلیں اختیار
کرنا ثابت ہے۔ اسی وجہ سے بعض اقسام کے سانپوں کو مارنے کی ممانعت وارد ہوئی
ہے جیسا کہ باب مکروہات صلوٰۃ ج ۲ ص ۲۲۳ میں مذکور ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

کیا تجانس امامت میں بھی شرط ہے؟

جس طرح تجانس یعنی باہم ایک ہی جنس ہونا نکاح میں شرط ہے تو شاید امامت میں بھی اس کو شرط قرار دیا جائے۔ اور اسی بناء پر جن کی امامت کو ناجائز سمجھا جائے، سو تحقیق یہ ہے کہ امامت میں اس کے شرط ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جن کا اقتداء کرکے نماز پڑھنا اور اس پر آپ کی تقریر (یعنی اس پر آپ کا انکار نہ فرمانا اور باقی رہنے دینا) دلیل عدم اشتراط (شرط نہ ہونے) کی ہے، ورنہ عدم تجانس حاصل ہے سب اور اس سے جواز اقتداء بملائکہ (فرشتوں کے پیچھے نماز پڑھنے کے جائز ہونے) کا شبہ نہ کیا جائے، کہ جبرئیل علیہ السلام فرائض میں امام بنے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیونکہ یہ امامت بعد فرضیت (فرض ہونے) کے ہوئی ہے۔

جواب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام پر بوجہ مامور بحکم خداوندی کا پابند ہونے کے خود ان دو یوم کی نماز فرض ہو گئی تھی تو وہ بھی مثل انس وجن (انسانوں اور جنوں) کی طرح اس کے مکلف (پابند) ہو گئے تھے اور اقتداء مفترض (فرض ادا کرنے والے) کی مفترض کے پیچھے ہوئی اور مطلقاً ملائکہ پر نماز فرض نہیں، اس لئے وہ متنفل (نفل پڑھنے والے) ہوں گے جو مانع اقتداء مفترض (..... فرض پڑھنے والے) کی اقتداء کے لئے مانع ہے۔

مسئلہ زیر بحث میں ایک عجیب نکتہ

منکوحہ جنیہ کی اولاد کو جن وہ مشہور آدمی کی ذریت کو کس کہیں گے۔

اس تحقیق کا حاصل یہ تھا کہ تناکح انسان اور جن میں جائز نہیں لیکن یہ امر قابل تحقیق باقی رہا کہ اگر کسی نے باوجود ناجائز سمجھنے کے یا بوجہ مسئلہ معلوم نہ ہونے کے ایسا کرلیا اور اس نکاح سے اولاد پیدا ہو گئی تو

ظاہر ہونے طب سے مستبعد مگر عقلی اعتبار سے ناممکن ہے تو آیا بریں تقدیر شرعی اصولوں کے مطابق اس کو انسان کہا جائے گا یا جن، مثلاً خود ایسی اولاد کا نکاح آدمی و آدمیہ سے جائز ہوگا یا نہیں؟

سو حکم اس کا قواعد کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولاد نسباً باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے، لیکن اوصاف و احکام (صفات اور نسل) میں تابع ماں کے ہوتی ہے، مثلاً اگر مرد آزاد ہو اور عورت مملوکہ (لونڈی) ہو اور ان میں نکاح ہو کر اولاد ہو تو وہ مملوک (غلام) ہوگی یا مثلاً نر ہرن اور مادہ بکری سے بچہ پیدا ہو تو وہ بکری ہی سمجھی جائے گی مثلاً قربانی اس کی صحیح ہوگی وعلیٰ ہذا۔

پس اس قاعدہ کا مقتضا یہ ہے کہ اگر منکوحہ جنیہ ہے تو اولاد کو جن کہیں گے اور اس کا نکاح آدمی سے درست نہ ہوگا اور اگر ناکح جن ہے اور منکوحہ آدمیہ تو اولاد کو آدمی کہہ کر اس کے احکام جاری ہوں گے، واللہ اعلم۔

ایک علمی نکتہ

کسی پر غلبۂ جن آنے کے وقت دوسری عورتوں کو پردہ کرنا چاہئے

اگر کوئی جن غلطاً کسی عورت کے پاس آتا ہو اور وہ اس کے دفع پر کسی تدبیر مثل تعویذ و عمل وغیرہ سے قادر نہ ہو تو وہ مجبور ہونے کے سبب معذور ہے، لیکن دوسری عورتوں کو جبکہ اس مظلومہ کے خبر دینے سے یہ اطلاع ہو کہ اس وقت وہ جن آیا ہوا ہے اس کے ساتھ مثل اجنبی مرد کے معاملہ کرنا واجب ہوگا یعنی اس کے سامنے بے پردہ ہونا درست نہ ہوگا، البتہ اگر مظلومہ کی اعانت یا دفع وحشت (دور کرنے یا خوف دور کرنے) کی ضرورت سے وہاں رہنا ہو تو بجز وجہ و کفین و قدمین (سوائے چہرے، دونوں ہتھیلیوں اور دونوں پاؤں) کے باقی تمام بدن ڈھانکنا واجب ہوگا یعنی سر و بازو گردن و ساق (پنڈلی) کا ظاہر کرنا درست نہ ہوگا۔ نقد رساکہ عورتیں بھی اس مسئلہ سے غافل ہیں۔

واللہ اعلم والحمد للہ الملہم الملجئ علی تحقیق مثل ہذہ اللطائف التی لعلک لاتجدہا فی موضع واحد۔

(اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے، ان علمی نکات کی تحقیق پر جن کا ایک ہی جگہ اس طرح ملنا مشکل ہے اللہ بزرگ و برتر کے لئے ہی سب تعریفیں ہیں)

کتبہ اشرف علی (نور اللہ مرقدہ)

اصلاحِ انقلاب متعلق مہر

اس باب میں بھی متعدد مختلف کوتاہیاں ہوتی ہیں (بعضہا اشد من بعض (جن میں سے بعض بعض سے زیادہ سخت ہیں)۔

مہر بعض شارع حق واجب اور لازم ہے۔

ایک کوتاہی جو بعض وجوہ سے سب سے زیادہ سخت ہے، یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگ مہر ادا کرنے کا ارادہ ہی دل میں نہیں رکھتے، پھر خواہ جانب ثانی (یعنی بیوی) بھی وصول کا ارادہ نہ کرے، اور خواہ کسی سبب عارض (پیش آنے والا واقعہ یعنی طلاق یا موت سے وہ (بیوی) یا اس کے بعد اس کے ورثہ وصول کرنے کی کوشش کریں، لیکن ہر حال میں زوج (شوہر) کی نیت ادا کی نہیں، سو لوگوں کی نظر میں یہ نہایت سرسری امر (معمولی معاملہ) ہے حتیٰ کہ اس کا سرسری ہونا ان کی تصریحات سے بھی معلوم ہو جاتا ہے، چنانچہ قلت و کثرت مہر (مہر کے کم زیادہ ہونے) کی گفتگو میں بے دھڑک (بلا جھجک) کہہ دیتے ہیں کہ میاں کون لیتا ہے اور کون دیتا ہے، غرض یہ بھی ایک بات ہے تو یہ لوگ اپنے اس اعتقاد کا صریح اقرار کرتے ہیں کہ مہر محض نام کرنے کو ہوتا ہے، دینے لینے کو اس سے کوئی تعلق نہیں، سو اول تو فی نفسہٖ بھی یہ دعویٰ غلط اور باطل ہے، مہر بحیثیت شارع حق واجب اور لازم ہے، اور مثل دیگر دیون مفترض الاداء (دوسرے ان قرضوں کی طرح ہے جن کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے) جب تک کہ کوئی مسقط (گرانے والا یعنی ختم کرنے والا) اس کا نہ پایا جائے، مثل ابراء (معافی) یا اس کے جزو یا کل کا زوج کو میراث میں پہنچ جانا یا طلاق قبل الدخول (ہمبستری سے پہلے طلاق) نصف مہر کے لیے وغیرہ ذلک من الاسباب المذکورۃ فی کتب الفقہ (اور اسی طرح کے دوسرے اسباب جو کتب فقہ میں مذکور ہیں)

بہرحال وہ فی نفسہٖ (اپنی ذات میں) واجب الاداء ہے، دوسرے موقع پر خود یہ مدعی (دعویٰ کرنے والے) ہی اپنے فعل سے اس قول کی تکذیب کرنے لگتے ہیں، یعنی جب ان کی منکوحہ کا جبکہ وہ معلقہ یا مطلقہ (ویسے ہی ترک تعلق کر رکھا ہو یا طلاق یافتہ ...) ہو جائے کوئی معاملہ جھگڑا ہو

تو سب سے اوّل یہی مدعی اس مہر کے لزوم (ضروری ہونے) کے مدعی بن جاتے ہیں۔

بہرحال اس کے سرسری ہونے کا دعویٰ تحقیقاً والزاماً (تحقیق اور لازم ہونے کی رو سے) ہر طرح غلط ہے، مگر پھر بھی بجز اسے یقولون بافواھھم ما لیس فی قلوبھم (اپنے منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں) عام طور سے اس کا سرسری ہونا زبان زد (مشہور) ہو گیا ہے۔

دل میں مہر ادا نہ کرنے کی نیت ہو تو وہ شخص زانی ہو کر مرے گا

سو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو سرسری سمجھنا اور ادا کی نیت نہ رکھنا اتنی بڑی سخت بات ہے کہ حدیث شریف میں اس پر بہت ہی بڑی وعید آئی ہے، چنانچہ کنز العمال میں بروایت ابو یعلیٰ و طبرانی در افعی و ابن النجار و ابن عساکر و بیہقی کے حضرت صہیبؓ سے بروایت ابن مندہ کے میمون بن جابان البصری عن ابیہ سے باختلاف بعض الفاظ یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اس کا کچھ مہر ٹھہرائے پھر یہ نیت رکھے کہ اس کے مہر میں سے اس کو کچھ نہ دے گا یا اس کو پورا نہ دے گا تو وہ شخص زانی ہو کر مرے گا اور اللہ تعالیٰ سے زانی ہو کر ملے گا (جلد ۸ صفحہ ۲۴۸)

سو ملاحظہ کیجئے کہ کتنی بڑی سخت وعید ہے کہ باوجود صورتِ نکاح پھر اس شخص کا شمار زانیوں میں ہوا تو کیا اب بھی یہ کوتاہی قابل عار کے (ترک کے قابل) نہیں ہے، اور ہر چند کہ عمل میں لفظ وعید میں وجہ تعلق معلوم کرنے کی ضرورت نہیں لیکن تبرعاً (بطور تفضل) ایک ظاہری وجہ پر متنبہ بھی کرتا ہوں، اس سے پہلے دو مقدمے جاننا چاہئے۔

نکاح اور زنا میں فرق

ایک یہ کہ بتصریح حدیث نکاح اور زنا میں مابہ الفرق (فرق کرنے والے) یہ امور ہیں، ولی بعض صورتوں میں اور دو گواہ اور مہر جلوۃ فی الروایات مصر حاکمانی کنز العمال ج ۸ ص ۲۴۴، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۷ و ۲۹۳ و ۲۹۶ و ۲۹۷ فی شہادۃ رجل و امرأۃ ابطلہا عمر

کوئی عمل شرعی بدون نیت عند اللہ معتبر نہیں

دوسرا یہ کہ مہر مقرر کرنا ایک عمل ہے اور جب نیت دینے کی نہ ہو تو یہ مقرر کرنا معتبر نہ ہوا، المقدمۃ الثانیۃ (اس دوسرے مقدمہ کی رو سے) پس گویا مہر مقرر ہی نہیں ہے، اور مہر مقرر نہ کرنا خاصہ زنا کا ہے، المقدمۃ الاولیٰ (مقدمہ اول کے اعتبار سے) پس اس حیثیت خاص سے یہ نکاح مشابہ زنا کے ہوا، اس لئے ناکح کو زانی فرمایا گیا، مراد

لہ گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ؛ گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وعید کے مصداق بننے سے گریز کرنے کی پوری کوشش کرنا چاہئے ۔ احقر زبیری۔

بمنزلہ زانی کے ہے جس کی وجہ ابھی مذکور ہوئی لہذا اس تقریر سے وجہ وعید بھی معلوم ہوئی، سو یہ بھی اس حدیث کی شرح اور توجیہ بھی ہو گئی۔

مہر ادا نہ کرنے کی نیت رکھنے والا خائن اور چور بھی ہے۔

نیز اسی حدیث مذکور میں ایک جزء اور بھی ہے، وہ یہ کہ اگر کسی سے کچھ مال خریدے اور اس کی قیمت ادا کرنے کی نیت نہ رکھے یا کسی کا کچھ دین ذمہ میں واجب ہو اور وہ اس کے ادا کی نیت نہ رکھے، یا کسی سے کچھ قرض لیا ہو اور اس کو ادا نہ کرنا چاہتا ہو، تو وہ شخص موت کے وقت اور قیامت کے روز خائن (خیانت کرنے والا) اور چور ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ مہر ایک دین ذمہ میں واجب الاداء ہے جب اس کے ادا کی نیت نہ ہوئی تو حدیث کے اس دوسرے جزو کے اعتبار سے یہ شخص خائن اور چور بھی ہوا تو ایسے شخص پر دو جرم قائم ہوئے، زانی ہونے کا بجزو اول (پہلے جزو کی رو سے) اور خائن و سارق ہونے کا بجزو ثانی (دوسرے جزو کے اعتبار سے) اور اس عمل میں اور اس کی وعید میں وجہ تعلق اول کی طرح مخفی (پوشیدہ) نہیں، بلکہ ظاہر ہے کیونکہ کسی کے حق مالی کو ضائع کرنا ظاہر ہے کہ خیانت و سرقہ (چوری) ہی ہے جب ایک ہی وعید کے ترتب و مرتب ہونے میں نے اوپر کہا ہے کہ کیا اب بھی یہ کوتاہی قابل تدارک نہیں؟ اب تو دو وعیدوں کا ترتب ثابت ہو گیا۔ اب زیادہ زور کے ساتھ کہا جائے گا کہ کیا اب بھی یہ کوتاہی قابل تدارک نہیں!

اپنی وسعت سے زیادہ مہر مقرر نہیں کرنا چاہیے۔

سو اس کا تدارک ظاہر ہے کہ ادا کرنے کی مصمم نیت رکھی جائے مگر تجربہ اور وجدان شاہد ہے کہ بعادت اکثر لوگوں کی عادت کے مطابق یہ مصمم نیت اسی عمل کی ہو سکتی ہے جس پر عادۃً قدرت ہو ورنہ نیت کا محض تخیل (خیال) ہوتا ہے تحقق (وقوع) نہیں ہوتا، اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو سو روپے دینے کی قدرت نہ ہو وہ عادۃً لاکھ سوا لاکھ بلکہ دس بیس یا پانچ ہزار دینے پر بھی قادر نہیں جب قادر (ادائیگی کی طاقت رکھنے والا) نہیں تو بحکم مقدمہ مذکورہ (مذکورہ مقدمہ کے مطابق) وہ اس کے ادا کی بھی نیت نہ رکھے گا پس اگر ایسے شخص کا اتنا مہر مقرر ہوا تو وہ ادا کی نیت نہ رکھنے کے سبب لامحالہ (ضرور) اس وعید کا محل (موقع) بنے گا، پس نیت ادا کے تحقق کی صورت یہی ہے، بر تقریر مذکورہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وسعت سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، اور چونکہ وسعت اکثر لوگوں کو اکثر زمانوں میں قلیل رقم ہی کی ہے، اس لئے اسلم واحوط طریقہ (زیادہ سلامتی والا اور احتیاط کا طریقہ) یہی ٹھہرا کہ مہر قلیل ہو۔

احادیث میں مہر زیادہ مقرر کرنے کی کراہت اور کم مقرر کرنے کی ترغیب آئی ہے۔

پس مہر کا کثیر تعداد میں مقرر کرنا ایک کوتاہی ہے جس پر پہلی کوتاہی یعنی التزام عادی (عام طور پر پائی جانے والی)

مرتب ہوتی ہے ، اسی واسطے حدیثوں میں مہر زیادہ ٹھہرانے کی کراہت و ناپسندیدگی ، اور کم ٹھہرانے کی ترغیب اور پسندیدگی کی طرف توجہ آئی ہے ، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا کہ مہروں میں زیادتی مت کرو کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت کی بات یا اللہ کے نزدیک تقوے کی بات ہوتی تو سب سے زیادہ اس کے مستحق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے ، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کسی بیوی کا اور اسی طرح کسی بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں ہوا ، (ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے اور ایک درہم تقریباً چار آنہ چار پائی کا) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کا مبارک ہونا یہ بھی ہے کہ اس کا مہر آسان ہو ۔

اخرجہما فی کنز العمال عن عب ط و والحمیدی ص وابن سعد وابی عبید فی الغریب ش حم والعدنی والدارمی د ت ہ وقال صحیح ن ہ حب ک وقط فی الافراد حل ق ، ص ۲۹۰ والثانی عن حم ک ھق ، ص ۲۲۱

اور ایک حدیث میں ہے کہ اچھا مہر وہ ہے جو آسان اور قلیل ہو (کنز العمال ص ۲۲۸) اور حدیث میں ہے کہ آسانی اختیار کرو مہر میں (کنز ۲۲۹) اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت پر کسی کو عجوزہ (بڑھیا) کے معارضہ مشہورہ (مشہور اعتراض) کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رجوع کا شبہ ہو تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ رجوع اس کی ترجیح یا اس کی ضد کی کراہت سے نہیں ہے ، بلکہ پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے ہو گئی تھی کہ اس کو ایک قانون بنا دیں ، کہ مقدار خاص سے زیادہ مقرر کرنا باطل قرار دیا جائے ، اور اس کو واجب الرد کہا جائے ، سو اس سے آپ نے رجوع فرمایا ، یعنی ایسا قانون نہیں بنایا ، اس توجیہ میں روایات صریح ہیں ، یہ روایات ان نمبروں کی کنز العمال میں مذکور ہیں [illegible] ، [illegible] ، [illegible] ، [illegible] وغیرہا ص ۲۹۰ ج ۸)

اپنی ہمت سے زیادہ مہر قبول کرنا شرعاً منع ہے ۔

غرض دلائل صریحہ مرفوعہ و موقوفہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے اقوال) سے نیز قواعد شرعیہ سے تحمل ما لا یطیق (اپنی طاقت سے بڑھ کر بوجھ اٹھانے) سے ممانعت آئی ہے ، کما فی حدیث :

روی الترمذی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ یُذِلُّ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی مومن کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے ، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول وہ اپنے آپ کو کس طرح ذلیل

نَفْسَهُ قَالَ يَتَحَمَّلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَا لَا يُطِيقُهُ۔

کرتا ہو؟ ارشاد فرمایا ایسی مصیبت کو اٹھانا جس کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا!!

تحمل سے زیادہ مہر کے التزام و مقرر کرنے کا اور اس کی تقلیل (کم ہونے) کا مطلوب شرعی ہونا ثابت ہوگیا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے

اب یہ کلام باقی رہا کہ اس تقلیل کی بھی کوئی حد ہے یا نہیں؟ سو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو حد کوئی مقرر نہیں قلیل سے قلیل مقدار بھی مہر ہو سکتی ہے بشرطیکہ مال متقوم (قیمت والا مال) ہو، خواہ ایک ہی پیسہ ہو، اور احادیث کثیرہ (بہت سی حدیثوں) کے ظاہر الفاظ اس کے موافق ہیں، مثلاً (تزوج[1] بنعلین) (وکتبوا[2] اور (ولو بسوط[3]) اور (ولو[4] بخاتم من حدید) اور (ملا[5] کفیہ برا او سویقا او تمرا او دقیقا) اور (اَو[6] ...) اور (ما[7] تراضی به الاھلون ولو قضیبا من اراک) اور (ملا[8] بین یدیہ طعاما) (کنز العمال ج ۸ ص ۲۴۰ و ۲۴۱) اور (تزوج[9] علی نعل ص ۲۹۹) اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس قلیل کی حد دس درہم ہیں یعنی اس سے کم مہر جائز نہیں، حتیٰ کہ اگر تصریحاً بھی اس سے کم مقرر کیا جائے گا تو بھی دس درہم واجب ہوں گے، اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں یہ حدیثیں مع تضعیف (ضعف کے ساتھ) مشہور ہیں،

عن جابر لا صداق اقل من عشرة دراهم قط و ضعفاه وعن علی قال ادنی ما یستحل به الفرج عشرة دراهم قط وضعفه وعن علی قال لا صداق دون عشرة دراهم قط وضعفه:

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ وہ مہر نہیں جو دس درہم سے کم ہو اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ فرمایا کم از کم جس سے فرج حلال ہوتی ہو دس درہم ہیں اس روایت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے اور حضرت علیؓ سے ہی مروی ہے کہ دس سے کم مہر نہیں اسے بھی ضعیف قرار دیا گیا ہے

۱؎ نکاح کرے کم یا زیادہ مہر کے ساتھ۔ ۲؎ خواہ ایک کوڑا ہو۔ ۳؎ خواہ لوہے کی انگشتری ہو۔
۴؎ خواہ دونوں ہتھیلیوں میں گندم یا ستو یا کھجور یا آٹا بھرا ہو۔ ۵؎ یا ایک درہم ہو۔
۶؎ خواہ اس کے قبضہ میں پیلو کے درخت کا پھل ہو۔ ۷؎ خواہ دونوں ہاتھ کھانے سے بھرے ہوں۔
۸؎ یا جوتے پر مہر مقرر کرکے شادی کی۔

اور دس درہم نصاب سرقہ مذاہب بھی وجہ تائید (عقلاً تائید کرنے والا معلوم ہوتا ہے ۔ قول امامؒ کا کیونکہ اس سے ایک عضو یعنی ہاتھ کی قیمت کا کم از کم دس درہم ہونا معلوم ہوا، تو بضع زوجہ عورت کے عضو مخصوص کی قیمت بھی اس سے کم نہ ہوگی، ولفظہ لصاحب الہدایہ فی الہدایہ، پھر مسائل احتیاط ہے سے بہت اس سے کم نہ کرنے کو متفق ہوں گے لیکن یہاں تک تو کمی کرنے کا بالاتفاق اختیار ہے، پھر زیادتی پر کیا مجبوری ہے؟

مہر زیادہ مقرر کرنے کی خرابی مختصراً بیان

اور یہ تو بیان تھا کثرت مہر کی دینی خرابی کا کہ فی نفسہ (اپنی ذات میں) بھی خلاف سنت ہے، اور پھر وہ سبب ہو جاتا ہے عدم قصد ادا (دلوا نہ کرنے کا ارادہ) جس پر اس شخص کو گناہ میں زانی سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اس کے علاوہ اس میں جو دنیوی خرابیاں ہیں وہ آنکھوں سے نظر آتی ہیں، مثلاً بہت جگہ موافقت نہیں آتی اور زوجہ کے حقوق نہیں ادا کئے جاتے، مگر طلاق اس لئے نہیں دیتے کہ مہر زیادہ ہے، یہ لوگ دعوی کر کے پریشان کریں گے۔ پس کثرت مہر جائے اس کے کہ زوجیت کی مصلحت کا سبب ہوتا الٹا اس کی مخالفت کا سبب ہو گیا، بعض عقلاء اس کثرت میں یہی مصلحت سمجھتے ہیں کہ چھوڑ نہ سکے گا، مگر یہ نہیں سمجھتے کہ چھوڑ نہ سکنا ہر جگہ تو مصلحت نہیں، مثلاً اس صورت مذکورہ میں اس میں کیا مصلحت ہوئی، اور مثلاً بہت جگہ بعد طلاق یا موت دعوی ہوا ہے، اور چونکہ تعداد میں لاکھوں تک ہوا ہے تمام جائداد سب کی نذر ہو جاتی ہے، اور زوج یا اس کے ورثاء اس کی بدولت نان شبینہ (رات کے کھانے تک) کے محتاج ہو جاتے ہیں، پس دینی و دنیوی خرابیوں کے مجموعہ سے یہ مضمون صادق آتا ہے:

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ (حج آیت ۱۱)	(دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا یہی کھلا خسارہ ہے)

اور یہ سب خرابیاں تو کثرت مہر کی اس وقت ہیں جب ادا نہ کیا جائے یا ادا کا ارادہ نہ ہو، اور اگر مرد پر خدا کا خوف غالب ہوا اور حقوق العباد (بندوں کے حقوق) سے اس نے سبکدوش (فارغ) ہونا چاہا اور ادا کا قصد کیا، تو اس وقت یہ مصیبت پیش آتی ہے کہ اتنی مقدار کا ادا کرنا اس کے تحمل سے زیادہ ہوتا ہے تو اس پر فکر اور تردد کا بار عظیم پڑتا ہے۔ اور کما کر ادا کرتا ہے مگر مقدار زیادہ ہونے سے وہ ادا نہیں ہوتا، اور تمام عمر اس کا ذخیرہ اسی میں کھپتا چلا جاتا ہے اور طرح طرح کی تنگی برداشت کرتا ہے، پھر اس سے دل میں تنگی اور پریشانی ہوتی ہے، یہ تو مرد کی تکلیف ہوئی، پھر چونکہ سبب اس تمام تر تکلیف کا وہ عورت ہے اس لئے انجام کار (نتیجہ)

اس مرد کے دل میں اس سے انقباض (کھنچاؤ) پھر انقباض سے تنفر (نفرت)، پھر عداوت (دشمنی) پیدا ہو جاتی ہے، پس جو نکاح کہ موضوع تھا مصالح زوجین اور اتحاد باہمی کے لئے وہ بالواسطہ اس کے ایک جز خاص یعنی مہر کے اس طریق پر سبب ہو گیا اس کے ضد یعنی عداوت و کدورت و دشمنی اور نفرت کا، پس یہ صریح قلب موضوع (الٹا معاملہ) ہے جس کا سبب کثرت مہر کی ہے، پس قلب موضوع جب قبیح (خرابی) ہے اس کا سبب بھی قبیح (خراب) سے خالی نہ ہوگا۔ اس حدیث کا یہی مطلب ہے:۔

تیاسروا فی الصداق فان الرجل لیعطی المرأۃ حتی یبقی ذلک فی نفسہ علیھا حسیکۃ (عب، الطبرانی عن الزہری عن ابن حسین مرسلاً) کنز العمال ج ۸ ص ۲۴۳

(مہر کے اندر آسانی (کمی) اختیار کرو اس لئے کہ مرد عورت کو زیادہ مہر دے دیتا ہے، حتی کہ اس دینے سے اس کے نفس کے اندر عورت سے متعلق دشمنی باقی رہ جاتی ہے) (کنز العمال ص ۲۴۳)

اور اوپر جو خطبہ حضرت عمرؓ کا گزرا اس میں یہ بھی ہے:۔

ان احدکم لیغلی صدقۃ امرأتہ حتی یکون لھا عداوۃ فی نفسہ الخ

(تم میں سے کوئی عورت کا زیادہ مہر ادا کرتا ہے، یہاں تک کہ مرد کے دل میں عورت کے لئے عداوت بیٹھ جاتی ہے)

چنانچہ خود مجھ کو اس کا اندازہ ہوا کہ میری ایک اہلیہ کا مہر پانچ ہزار اور دوسری کا پانچ سو تھا، بفضلہ تعالیٰ دونوں ادا کئے گئے۔ مگر اول مہر کے ادا میں جو کچھ گرانی ہوتی اگر والد صاحب مرحوم کا ذخیرہ اس میں اعانت نہ کرتا تو وہ گرانی ضرور کدورت کی صورت پیدا کرتی، اور دوسرا مہر صرف فتوحات یومیہ کی آمدنی سے بہت آسانی سے ادا ہو گیا، اس کا کوئی معتد بہ (قابل ذکر) بار قلب پر نہیں پڑا، پھر اگر اس کوشش پر بھی ادا نہ ہو سکا، تو نفس میں ایک دوسری کم ہمتی جو خلاف غیرت ہے پیدا ہوتی ہے، وہ یہ کہ عورت سے معاف کرایا جائے یعنی اس سے درخواست کی جاتی ہے، سو اول تو اس درخواست کا پورا کرنا اس کے قبضہ میں ہے، اگر وہ پورا نہ کرے اس کو اختیار ہے، اور خود درخواست بھی ذلت سے خالی نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے جہاں برأت و سبکدوشی ہونے کی دو صورتیں فرمائی ہیں:۔ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (البقرۃ آیت ۲۳۷)

(مگر یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق ہے)

اس کے بعد ہی دوسری صورت کی ترجیح کی تصریح ہے؛

وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۔ | (اور تمہارا معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔)

اور اس کے ساتھ ہی پہلی صورت کی اباحت (جائز ہونا) بھی عام مفہوم سے ارشاد فرمادی ہے:

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ | (اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت مت کرو۔)

جس کے مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ پہلی صورت باوجود مباح ہونے کے مرجوح (ناپسندیدہ) ہے لکونہ البعد من الغیرۃ (کیونکہ یہ غیرت کے خلاف ہے) تو دیکھئے یہی کثرت بعض صورتوں میں اخلاقی کمزوری کا بھی سبب بن گئی، جو کہ پسندیدہ نہیں سمجھی گئی، اور یہ بھی اس وقت تک ہے کہ جبکہ مرد اس طلب معافی میں حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا لحاظ رکھے فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا ۔

معافی مہر میں طیب نفس سے معاف ہونا شرط ہے۔

(یعنی طیب نفس (دل سے راضی ہونے) کی رعایت کرے، ورنہ اگر غیرت کے ساتھ خشیت (خوف خدا) بھی مفقود ہے تو نہ صرف لفظی معافی کی ناجائز تدبیریں نکالے گا یعنی یا عورت کو دھوکہ دے گا یا اس کو دھمکا لے گا، اس پر جبر کرے گا، جس سے وہ معاف کر دے، مگر یاد رہے کہ ایسی معافی عند اللہ ہرگز معتبر و مقبول نہیں، اس صورت میں یہ عند اللہ علی حالہ مشغول الذمہ (اللہ کے نزدیک اپنی ذمہ داری کے بوجھ تلے) رہے گا، اور اگر اس کو غیرت بھی ہوئی اور خشیت بھی ہوئی مگر وسعت نہ ہوئی تو اس کی پوری مصیبت ہے کہ تمام عمر اسی میں گھلا کیا کہ میں کس طرح اس حق سے سبکدوش (فارغ) ہوں، دیکھئے اس کثرت سے کیسے پھل پھول نکلتے ہیں، مگر اس صورت میں اگر یہ نیت مصمم (پکی) رہی کہ جب ہوگا اور جتنا ہوگا ضرور دے گا اور تھوڑا تھوڑا دیتا بھی رہا مگر پورا ادا نہ ہو سکا، تو آخرت میں امید ہے کہ مواخذہ نہ ہوگا لیکن اس بے چارے کی دنیوی زندگی تو تلخ ہو گئی، اور جب شوہر کی زندگی تلخ ہے تو بیوی ہی کی زندگی کیا بالطف ہو سکتی ہے، غرض اس میں ہر طرح کی خرابی ہی خرابی ہے۔

زیادہ مہر مقرر کرنے کے سب مصالح مرجوح ہیں

اگر کسی شخص کو وسوسہ ہو کہ بعضے مفاسد (کچھ خرابیاں) قلیل میں ہیں، اور بعضے مصالح (کچھ مصلحتیں) کثیر میں ہیں، مثلاً اگر مہر قلیل ہو تو شوہر پر کوئی بار نہیں پڑتا اس کو کوئی امر اس سے مانع نہیں ہوتا کہ اس کو چھوڑ کر دوسری کر لے، تو کثرت میں ذرا رکاوٹ رہتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہمارا یہ مطلب نہیں کہ بہت ہی قلیل ہو، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اتنا کثیر (زیادہ) نہ ہو جو اس کی دینی و دنیوی تباہی کا سبب بن جائے، عدم ادا کی نیت میں بھی ادا کی کوشش میں بھی، اور ادا (بری ہونے) کی تدبیر میں بھی، بلکہ اس میں اعتدال ہو جس میں تمام مصالح محفوظ رہیں۔ دوسرے جس شخص کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو تو کوئی مہر کسی اثر سے نہیں روک سکتی، کیا ایسے واقعات پیش نظر نہیں ہیں کہ بڑے بڑے مہروں کے مدیون (مقروض) ہیں اور باوجود اس کے منکوحہ کا کوئی حق ادا نہیں کرتے اور نہ دوسری طرف معلقہ (منجدھار) ہونے سے روکتے ہیں خواہ وہ حلال ہو یا حرام، ایسے ظالموں کا کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا، خواہ اس وجہ سے کہ وہ صاحب وجاہت (بارعب شخصیت) ہے، اس سے ڈرتے ہیں، خواہ اس وجہ سے کہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں، اور نرا جیل خانہ کرانے سے کیا ملتا ہے، بجز اس کے جیل جانے سے اپنی بیٹی کو کیا آرام ملا۔

کثرت مہر محض رسم پرستی ہے، جس میں کوئی مصلحت نہیں۔

بعضے لوگ اس میں مصلحت یہ بیان کرتے ہیں کہ قلت میں ذلت ہے اور کثرت میں عزت، سو اول تو مہر قلت میں جب کہ وہ بقدر اعتدال ہو ذلت نہیں۔ دوسرے اگر یہ مصلحت بھی ہو، مگر مفاسد بے تعداد (بے شمار) ہوتے تو وہ مصلحت کب قابل تحصیل (حاصل ہونے کے قابل) ہوگی، تیسرے اگر تحصیل مصلحت تفاخر کے ساتھ قدرت علی الاداء (اطمینان کے ساتھ ادا کرنے کی قوت) کی کچھ بھی رعایت نہ ہو تو بقول میرے استاذ؎ علیہ الرحمۃ کے پھر اسی مقدار پر کیوں بس کی جاتی ہے، اگر تکلیف مطلوب ہی ہے زیادہ تفاخر ہو تو بہتر ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت کا خراج بلکہ اس کا بھی مضاعف (دو چند) یا اضعافاً مضاعفۃً (چند در چند) مقرر کیا جائے کیونکہ نہ دینا نہ لینا، صرف نام ہی نام تو اچھی طرح سے کیوں نہ نام کیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رسم پرستی ہے ورنہ واقع میں مصلحت کچھ نہیں اور مفاسد متنوع (خرابیاں قسم قسم کی) ہیں، لہٰذا اس کے واجب الاصلاح (اس کی اصلاح ضروری) ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا، پس رسم کو چھوڑو اور عقل و شریعت کا اتباع کرو، البتہ جن صورتوں میں مہر مثل سے کم کا مقرر کرنا ولی کو جائز نہ ہو جیسا فروع فقہیہ (فقہی احکام و مسائل) میں مذکور ہے، وہاں اس پر عمل کی یہ صورت ہے کہ سب متفق ہو کر اپنے عرف کو بدل لیں، جس سے خود قلیل ہی مہر مثل بن جائے، بہرحال یہ صورت بھی اشکال کی نہیں جس سے کوئی فہیم شبہ کرسکے۔

؎ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ (المتوفی ۱۳۰۲ھ) (دیکھئے حالات یعقوب و قاسم) [illegible]

مہر مقرر کرتے وقت مقدار کا تعین کرنا ضروری ہے:

ایک کوتاہی مہر کے بارے میں یہ ہے کہ بعضے لوگ بدون ذکر مقدار کے محض شرع محمدی کے عنوان سے مہر ٹھہراتے ہیں، اور پھر اس کے مفہوم کی تعیین میں کوئی اصطلاح بھی بیان نہیں کرتے، تو اس طرح کا ٹھہرانا مجہول ہونے سے نہ ٹھہرانے ہی کے حکم میں ہے اور مہر نہ ٹھہرانا گناہ ہے، جیسا اوپر مذکور ہوا کہ نیت نہ ہونے میں مشابہ زنا کے قرار دینے کی تقریر ہو چکی ہے پس یہ گناہ کے مرتکب ہوئے، پھر اگر کسی وقت وصول کے لئے نزاع (جھگڑا) ہوا تو یہ مقدار ادا کی جائے گی، اور چونکہ قوم کی قوم میں یہی رسم ہے اس لئے مہر مثل کی تحکیم (فیصلہ) بھی دشوار ہے پس اس ابہام میں یہ خرابیاں ہیں، البتہ اسی قبیل (قسم) سے یہ رسم جو بعض نواح (نزدیکی علاقوں) میں معلوم ہوئی ہے کہ سوا سیر کوڑیوں کے عنوان سے مہر ٹھہراتے ہیں جس کی شرح تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوئی کہ سوا سیر کوڑیوں کی جس قدر شمار ہو اتنے شمار سے روپے ہوں، سو ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین (مقررہ) شمار نہیں ہے، اگر سوا سیر کوڑیوں کے دو انبار (ڈھیر) ہوں یقیناً ان کے شمار میں تفاوت بھی ہوگا، پس یہ بھی مبہم رہا، اور اس میں بھی مذکورہ خرابیاں ہوں گی، اور علاوہ ان کے کثرت مقدار کی خرابی مزید برآں (اس سے علاوہ) ہے۔

مہر مقرر کرنے کے لئے مال ہونا شرط ہے:

اور ان سب سے بڑھ کر بعض جگہ یہ بیہودگی سننے میں آئی ہے کہ مہر میں مصحف اور سپارہ اور مصلیٰ کی کئی کئی تھے ٹھہراتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ پھر ایسا مہر کہ اس کے ادا کی بھی ضرورت ہی نہ ہو، سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر کے لئے مال ہونا شرط ہے، یہ چیزیں جب مال نہیں ہیں تو واجب فی الذمہ (ذمہ میں واجب) بھی نہیں ہوتیں، ان کا ذکر و عدم ذکر (ذکر کرنا یا نہ کرنا) برابر ہے، اور تغییر شرع (شریعت کو بدلنے) کا گناہ الگ رہا۔

بعد وفات شوہر زوجہ کو مہر میں تمام اشیاء منقولہ و غیر منقولہ پر قبضہ کرنا شرعاً صحیح نہیں:

ایک کوتاہی دربارۂ مہر کے زوجہ کی طرف سے یہ ہے کہ اکثر بعد وفات زوج کے اس کی تمام اشیاء منقولہ و غیر منقولہ میں سے جس جس پر قبضہ ہو سکے سب پر قبضہ کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتی ہیں کہ یہ سب میں نے اپنے مہر میں رکھ لیا، اگرچہ وہ قیمت میں مہر سے کئی حصے زیادہ ہو، سو سمجھنا چاہئے کہ جب یہ اشیاء جنس مہر سے نہیں ہیں تو اس کو خود مہر میں لگا لینا جائز نہیں، بلکہ اس کے لئے یا تو حکم حاکم کی ضرورت ہے اور یا دوسرے ورثاء کی رضامندی کی بشرطیکہ ان میں کوئی نابالغ نہ ہو، اور اگر کوئی نابالغ ہو تو اس میں خاص نابالغ کے حصے کے اعتبار سے پھر بھی شرط ہے کہ جو تعداد قیمت میں مہر سے اس قدر زیادہ نہ ہو کہ اس کو سب مقومین (قیمت لگانے والے) زیادہ بتلاتے ہوں، البتہ جہاں دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں کہ

نہ حاکم سے رجوع کرنے کا سامان ہی ہو، اور حق رضا اس کا حق رہنا چاہئے تھا، اس خاص صورت میں اگر اس کو ضرورت ہو جاوے تو اور مہر میں لگا سکتی ہے، بشرطیکہ جائیداد مہر کے برابر ہو۔ اصل میں یہ مسئلہ قریب ہے ظفر بغیر جنس سے اپنا حق لے لینے کی بحث میں یہی تفصیل ہے۔

مہر کے متعلق شوہر کی کوتاہی ایک کوتاہی اس کے مقابل زوج (شوہر) کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ اپنی رائے سے زوجہ (بیوی) کو کوئی چیز خواہ قسم زیور سے یا پارچہ و متاع (کپڑے اور سامان) سے یا مکان اور زمین بی بی کو دے بیٹھے اور اس کے نام کر دے اور خود ہی نیت کر لے کہ میں مہر میں دے چکا، اور مہر ادا کر دیا، سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر کے عوض (بدل) میں یہ چیزیں دینا بیع (خرید و فروخت) ہے اور بیع میں تراضی جانبین مطلقاً شرط (دونوں طرف سے مکمل رضامندی شرط) ہے، اور بعض میں تساوی مقدار (مقدار میں برابری) بھی شرط ہے، پس اگر ان چیزوں کا دینا مہر میں منظور ہے تو زوجہ سے صریح الفاظ میں جیسے پوچھا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مہر میں یہ چیزیں دیتے ہیں، آیا تم رضامند ہو، پھر اگر وہ رضامند ہو تو اگر وہ چیز جنس مہر سے نہیں ہے مثلاً مہر روپیہ تھا اور یہ چیز مکان یا کپڑا ہے تو بلا شرط قلیل و کثیر کے رضامندی سے یہ مبادلہ جائز ہے، اور اگر وہ چیز جنس مہر سے ہے مثلاً روپیہ تھا یہ چیز چاندی کا زیور ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ دونوں کی مقدار برابر ہو، مثلاً مہر اگر سو روپیہ ہوا اور زیور پچاس روپیہ کے برابر ہوا تو یہ مبادلہ جائز نہیں، البتہ دو صورتیں درست ہوں گی، ایک یہ کہ پچاس ہی میں زیور لگا دے، اور پچاس معاف کرا دے، دوسرے یہ کہ مصالحت کے طور پر لے لے تو اس کے معنی شریعت خود یہ تجویز کرتی ہے کہ پچاس میں زیور لے لیا، اور پچاس معاف کر دیئے۔

عورت اپنے مرض الموت میں مہر معاف نہیں کر سکتی ایک کوتاہی مہر کے بارہ میں یہ ہوتی ہے کہ اگر عورت اپنے مرض الموت میں مہر معاف کر دیتی ہے اور اس معافی سے زوج بالکل بے فکر ہو جاتا ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ معافی وصیت للوارث کی فرع (وارث کے لئے وصیت کی ایک صورت) ہے، اور یہ بدون رضا دوسرے ورثہ کے ناجائز ہے، پس اس معافی سے مہر معاف نہ ہوگا، البتہ زوج کو جس قدر میراث میں پہنچے گا وہ بے شک معاف ہو جائے گا، باقی اس کے ذمہ واجب الادا رہے گا جو دوسرے وارثوں کو دیا جائے گا، البتہ اگر سب ورثہ اس معافی کو جائز رکھیں تو کل معاف ہو جائے گا اور اگر بعض نے جائز نہ رکھا یا بعض نابالغ ہوں تو ان کے حصہ کے قدر معاف نہ ہوگا۔

شوہر کو مرض الموت میں عورت کو مہر معاف کرنے کی رائے نہیں دینا چاہئے ایک کوتاہی اس بارے میں یہ ہے کہ زوج کے مرض الموت میں عورت مہر معاف کر دیتی ہے، اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر

خوشی سے معاف کر دے معاف ہو جاتا ہے، اور اگر عورتوں کی زبردستی تھپڑ کھیدی سے معاف کرے (تو عند اللہ تعالیٰ کے نزدیک) معاف نہیں ہوتا اور پروالوں کو ایسے موقع پر اس طرح مجبور کرنا چاہئے بلکہ بعض مواقع پر معاف کرنا مصلحت بھی نہیں ہوتا مثلاً میراث کا حصہ زوجہ کا اس کی لیسر کے مطے کافی نہیں اور دور رشتے بھی امید رعایت وکفالت (اخراجات برداشت کرنے) کی نہیں ایسے موقع پر تو بجائے ترغیب معافی (معاف کرنے کی رغبت دلانے) کے معاف نہ کرنے کی رائے دینا مناسب ہے۔

زوجۂ متوفیہ کی اولاد کا حصہ میں زوج کو تصرف کرنا حرام ہے

ایک کوتاہی مہر کے بارے میں یہ ہے کہ اگر زوجۂ متوفیہ (فوت شدہ بیوی) کے ورثہ اس کے ماں باپ یا بھائی وغیرہ ہوتے ہیں تب تو اُن کے مطالبہ پر زوج ان کا حصہ مہر دے دیتا ہے، اور اگر خود اسی زوج کے اولاد وارث ہوں تو چونکہ وہ مطالبہ کر نہیں سکتے یہ اُن کا حق ادا نہیں کرتا۔ یہ فعل سراسر ظلم اور خیانت ہے، ان کا حق امانت ہے اس اولاد کے نام سے جمع رکھنا چاہئے، اور خاص ان کے مصالح میں صرف کرنا چاہئے، خود صَرف کرنا (خرچ کرنا) حرام ہے، اسی طرح اُن بچوں کو جو مال سے میراث میں پہنچے ہوں ان سب کی حفاظت اس کے ذمہ فرض ہے، اس میں بے جا تصرف (بلاوجہ خرچ کرنا) حرام ہے۔

نکاح یا رخصت سے قبل مصارف شادی کے لئے شوہر سے کچھ لینا حرام ہے

ایک کوتاہی بعض علاقوں (علاقوں) میں باپ مہر میں یہ ہے کہ زوج سے قبل نکاح یا قبل رخصت کچھ روپیہ اس غرض سے لے لیتے ہیں کہ مصارف شادی (شادی کے اخراجات) میں خرچ کریں گے، اور جب اُن کو منع کیا جاتا ہے کہ یہ رشوت اور حرام ہے تو یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم نے مہر میں لیا ہے، اگر یہ واقعی مہر ہے تو اس کی مالک عورت ہے، اور کسی کے مال میں بدون اس کے اذن بطیب خاطر (بغیر دلی رضامندی) کے تصرف کرنا حرام ہے۔ سو ان لوگوں نے عورت سے کب پوچھا ہے اور اس نے کب خوشی سے اجازت دی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اذن لاحق (بعد میں اجازت دینا) بھی مثل اذن سابق (پہلے اجازت دینے) کے ہے، اور اذن دلالۃً بھی مثل اذن صراحۃً کے ہے (یعنی عرف عام کے اعتبار سے جس کو اجازت سمجھا جائے وہ بالکل واضح طور پر اجازت دینے کے مانند ہوتا ہے) تو جواب یہ ہے کہ یہ بالکل مسلّم ہے (تسلیم شدہ ہے)، لیکن اذن کی حقیقت کا تو پایا جانا ضروری ہے کیونکہ اور حقیقت اس کی وہاں ہوتی ہے جہاں عدم اذن (اجازت نہ دینے) پر بھی قدرت ہے، سو ظاہر ہے کہ یہاں بوجہ اتباع رسم کے (رسم ورواج کی پیروی کی وجہ سے) اس کے روکنے یا اس کا ضمان (جرمانہ) اور بدل لینے کی عورت کو قدرت ہی نہیں، پس اذن کہاں پایا گیا؟ خلاصہ یہ کہ اگر

یہ مہر نہیں تو رشوت ہے، اور اگر مہر ہے تو غصب ہے، اور دونوں حرام ہیں۔

نابالغ زوجہ کے مہر کی معافی شرعاً معتبر نہیں

ایک کوتاہی اس بارہ میں یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہی یا طلاق دینے کے وقت نابالغ زوجہ سے مہر معاف کرا لیتے ہیں، سو یہ معافی معتبر نہیں لان تبرع الصغیر باطل (تحقیق بچہ کا صدقہ وغیرہ کرنا باطل ہے)، بلکہ بعض جگہ اس سے بڑھ کر ہوتا ہے کہ ولی زوجہ نابالغہ کا طلاق کا مطالبہ زوج سے کرتا ہے، اور وہ ولی ہی مہر معاف کر دیتا ہے، سو اس صورت میں اگر زوج نے طلاق دیدی تو طلاق تو واقع ہو جائے گی، مگر مہر ساقط نہ ہوگا۔

عورتوں کا مہر مانگنا شرعاً کوئی عیب کی بات نہیں

ایک کوتاہی کہ وہ محض غلطی ہے اس بارہ میں یہ ہے کہ عورتیں مہر مانگنے کو یا لے لینے کو عیب سمجھتی ہیں، اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس کو بدنام کرتی ہیں، سو اپنے حق واجب کا مانگنا یا وصول کر لینا جب شرعاً کچھ عیب نہیں تو محض اتباع رسم سے اس کو عیب سمجھنا گناہ سے خالی نہیں۔

مہر اور نان ونفقہ دونوں علیحدہ علیحدہ حقوق ہیں

ایک کوتاہی کہ وہ علمی غلطی ہے یہ ہے کہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ اگر ہم نے مہر لے لیا تو پھر ہمارا کوئی حق خاوند کے ذمہ نہ رہے گا، یعنی نان ونفقہ اور دیگر حقوق معاشرت سب ساقط ہو جائیں گے، سو یہ اعتقاد محض غلط ہے، سب حقوق الگ الگ ہیں، ایک حق دوسرے پر مبنی نہیں، مہر لینے سے دوسرا کوئی حق ساقط نہیں ہوتا، اور اس اعتقاد باطل کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ شوہر مہر ادا کرتا ہے اور عورت نہیں لیتی، اور نہ معاف کرتی ہے، ایسی صورت میں اگر زوج پر ادائے حق کا غلبہ ہوا اور مسائل سے ناواقف ہوا تو بے حد پریشان ہوتا ہے، کہ اب میری برأت وسبکدوشی (ذمہ داری سے فراغت) کی کیا صورت ہو سکتی ہے، اس لئے اس کا مسئلہ بتلایا جاتا ہے کہ اس صورت میں اگر شوہر مال مہر کا زوجہ کے سامنے اس طرح رکھدے کہ وہ اس کے قبضہ پر قادر ہو اور رکھ کر یہ کہدے کہ یہ تمہارا مہر ہے، اور یہ کہہ کر اس مجلس سے اٹھ جاوے تو مہر ادا ہو گیا خواہ عورت اٹھالے یا نہ اٹھاوے، پھر اگر اس نے نہ اٹھایا اور دوسرا کوئی لے گیا تو وہ زوجہ کا گیا اور اگر بخیال ضائع ہونے کے خاوند اٹھالے گا تو وہ اس کے پاس زوجہ کی امانت رہے گا، شوہر کی ملک نہ ہوگا۔

دَین مہر مانع وجوب زکوٰۃ نہیں

ایک کوتاہی کہ وہ بھی علمی غلطی ہے کہ بعض لوگ دَین مہر کو مانع وجوب زکوٰۃ (زکوٰۃ کے واجب ہونے کو روکنے والا) سمجھتے ہیں، یعنی جس شخص کے ذمہ مہر واجب ہو وہ یوں سمجھتا ہے کہ چونکہ میں اتنے کا قرضدار ہوں اس لئے مجھ پر اتنے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں، اگر اس مسئلہ میں کسی قدر

اختلاف بھی ہوا ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ وہ مانع نہیں، یعنی مہر کے لازم ہوتے ہوئے بھی کل مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی چنانچہ شامی نے بعد نقل اقوال کے کہا ہے:۔

زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح انہ غیر مانع (محیط)	(قہستانی نے جواہر سے یہ اضافہ کیا ہے اور صحیح یہی ہے کہ وہ مانع نہیں)

خصوص جبکہ ادا کی نیت بھی نہ ہو، تو پھر مانع ہونے کے کوئی معنی نہیں، کیونکہ عازم ادا (ادا کرنے کا ارادہ رکھنے والا) جب کسی بار کا التزام ہی نہیں کرتا پھر اس کی رعایت بے وجہ ہے،

مہر کے وصول ہونے تک عورت کے ذمہ زکوٰۃ واجب نہیں

ایک اور کوتاہی کہ وہ بھی علمی غلطی ہے، اور وہ عوام کو تو ملتفت الیہ بھی نہیں (یعنی عوام اس طرف توجہ نہیں دیتے) اُن سے تعرض کر خواص کو پیش آئی ہے وہ یہ کہ جس طرح اموالِ تجارت میں تاجر کے ذمہ مثل عین یعنی نقد موجود مال کے دَین (جو روپیہ دوسروں کے ذمہ ہے اس) میں بھی (یعنی اُن حقوق میں جو کہ لوگوں کے اس کے ذمہ واجب ہیں مثلاً اس کا قرض چاہتا ہے یا اُدھار سودا لینے والوں کے ذمہ دام چاہتے ہیں) زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح عورت کا جو دین مہر زوج کے ذمہ ہے اس میں بھی زوجہ کے ذمہ زکوٰۃ ہے یا نہیں؛ سو عوام کو اس طرف التفات ہی نہیں ہوا، جس کی وجہ عدم اہتمام دین و دین کی طرف توجہ کا نہ ہونا ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی یہ مسئلہ ہی نہیں پوچھا، حالانکہ تردد کی اور پوچھنے کی بات تھی، کیونکہ آخر یہ بھی تو ایک قرض ہے، البتہ خواص کو تردد ہوا سو اُن میں جو غیر محقق تھے وہ قیاس سے وجوب زکوٰۃ واجب ہونے کے معتقد ہو بیٹھے، اور پھر یہ فکر ہوئی کہ اس وجوب میں تو تمام مہر زکوٰۃ ہی کی نذر ہو جائے گا، اس لئے انھوں نے اپنے نزدیک ایک دانائی سے کام لیا کہ مہر میں بجائے روپیوں کے تانبے کے ٹکڑوں کی رسم تجویز کی، کہ ٹکے اموال زکوٰۃ سے نہیں ہیں، چنانچہ ہمارے قصبات میں اس رسم کی یہی اصل ہے، (کذا سمعت استاذی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (جیسا کہ میں نے اپنے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ سے سُنا ہے) اور جو محقق تھے انھوں نے فقہ سے رجوع کیا، سو تحقیق سے ثابت ہوا کہ جو دَین بدل تجارت ہے یا قرض ہے وہ دَین قوی ہے، اور مہر دَین ضعیف، اس کا قیاس اس پر جائز نہیں، دَین قوی میں زکوٰۃ فرض ہے، اور دَین ضعیف میں نہیں ہے، جب تک وصول نہ ہو جائے، اور وصول ہونے کے بعد بھی زمانہ گذشتہ کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، تازہ زکوٰۃ ہوگی، کذا فی الدر المختار، خلاصہ خیر کے دو مسئلوں کا یہ ہوا کہ مہر نہ مانع زکوٰۃ ہے اور نہ موجب زکوٰۃ

بیاہ حضرتی اللان فی باب المہر

ٹکوں میں جو تقرر کرتے وقت چند غور طلب باتیں | کہ اس میں کمی کوتاہی کی جاتی ہے، اس کے سمجھنے کے لئے ایک تمہید کی حاجت ہے جو مرکب ہے چند مقدمات سے۔

ایک مقدمہ یہ ہے کہ ہمارے قصبات میں عرف عام و عادت رواج یہ ہے کہ مہر ٹکوں سے ٹھہراتے ہیں جس کی بنا اور اس بنا کا ضعیف ہونا اوپر لکھ چکا ہوں،

دوسرا مقدمہ یہ کہ ہمارے زمانہ میں ٹکے دو قسم کے پائے جاتے ہیں۔ ایک منصوری جو موٹے موٹے پیسے ہوتے ہیں، دوسرے ڈبل یعنی انگریزی سکہ کے پیسے،

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ مسئلہ فقہیہ ہے کہ اگر کسی وقت ایک نام کے کئی سکے چلتے ہوں اور معاملہ میں اس سکہ کا نام لیا جاوے تو اگر یہ رواج میں سب برابر ہیں تو ان میں قید لگانے کی ضرورت ہوگی بدون اس کے محض نام لینا کافی نہ ہوگا، اور اگر کوئی زیادہ چلتا ہے کوئی کم تو اطلاق (مطلق ذکر کرنے کے وقت) وہی زیادہ چلنے والا مراد ہوگا جیسے پہلے زمانہ میں منصوری پیسے زیادہ چلتے تھے اور اب ڈبل پیسے زیادہ چلتے ہیں۔ پس پہلے زمانہ میں جب مہر ٹکوں سے ٹھہرایا جاتا تھا، منصوری ٹکے مراد ہوتے تھے، اور اب جب اس عنوان سے مہر ٹھہرایا جاوے گا ڈبل پیسے مراد ہوں گے،

چوتھا مقدمہ یہ مسئلہ ہے کہ اگر معاملہ کے وقت کسی قسم کے پیسوں کا رواج تھا اور قبل ادا کرنے کے پیسے (کا رواج جاتا رہا) تو اب صاحب حق اسی مقررشدہ کا مطالبہ کر سکتا ہے، رائج حال (یعنی اس موجودہ وقت چلنے والے پیسوں) کا مطالبہ نہیں کر سکتا، کذا فی رد المحتار کتاب البیوع، فصل القرض من قولہ استقرض من الفلوس الرائجۃ،

پانچواں مقدمہ، جو پیسے واجب ہیں اگر وہ نہ مل سکیں تو دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی سے ان کی قیمت بھی لینا جائز ہے، مگر صاحب حق زمانہ وجوب (واجب ہونے کے زمانہ) کی قیمت جبراً لے سکتا ہے، جب یہ پانچوں مقدمے ممہد (مکمل) ہوگئے تو۔

ٹکوں سے مقرر کردہ پیسوں کے وصول میں چند کوتاہیاں | اب سمجھئے کہ ایک غلطی یہ ہے کہ جن عورتوں کے نکاح ان منصوری اسی ہزار ٹکوں پر ہوئے جن کی قیمت اس وقت ڈبل پیسے سے تقریباً پونے پیسے تھی: اور اب آدھا پیسہ یعنی ایک دھیلا ہوگیا ہے، بعض جگہ دیکھا گیا کہ عورت یا اس کے اولیا یا ورثہ زوج سے اسی ہزار کے ڈبل پیسے یا انہی ڈبل ٹکوں کی قیمت لگا کر ان منصوری ٹکوں کی جو قیمت اب ہے یعنی فی ٹکہ ایک پیسہ ڈبل، اس سے زیادہ مطالبہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس میں زیادہ نزاع

کرے تو زوج کو شرعاً جائز ہے کہ اسی منصوری پیسے کے اسّی ہزار گنے خرید کر حوالہ کرے، صاحب حق اس کے لینے سے انکار نہیں کر سکتا، یہ ہے وہ غلطی، البتہ جو نکاح اب ہوں گے جس وقت کہ زر مہر رائج ڈبل پیسوں کا ہے اس وقت بھی ڈبل پیسے واجب ہوں گے، پس اس کی قیمت سے روپیوں کا حساب ہو گا، یہ بیان تو غلطی کا تھا،

پھر بھی دوسری جنس کی قیمت لگانے کا طریقہ

اب ایک اور عام مسئلہ اس قیمت لگانے کے متعلق معلوم کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اگر واجب ایک چیز ہو اور لینے کے وقت اس کی قیمت لگا کر لی جائے دوسری چیز، تو یاد رکھنا چاہئے کہ جس قدر حق اس وقت وصول کیا جاتا ہے، اسی حق کا کرنا چاہئے، یہ جائز نہیں کہ پورے کا حساب دوسری جنس سے کر لیا جائے، پھر اس دوسری جنس کے حساب لیا جائے کچھ دوسرے وقت، بلکہ بقایا حق کا حساب اگر دوسرے وقت اسی جنس سے کیا جائے، تو اس دوسرے وقت کے نرخ وغیرہ کا اعتبار ہو گا، وقت سابق کے نرخ پر صاحب حق مجبور نہیں کر سکتا مثلاً ایک شخص نے منصوری پیسہ کے رواج کے وقت چالیس پیسے قرض لئے تھے، جو اس وقت آٹھ آنے کے تھے، اور اب پانچ آنے کے ہیں، اور ان میں سے نصف اب وصول کرتا ہے، تو یہ جائز نہیں کہ اب حساب کر کے اس کے ذمہ پانچ آنے ٹھیرا دے، اور ڈھائی آنے اب لے لے، اور ڈھائی آنے پھر، بلکہ اس وقت بیس ہی پیسوں کا حساب کیا جائے، پھر بیس کا دوسرے وقت کرے،

اگر فرض کیجئے اس وقت نرخ منصوری کا ڈبل کے چار ہو گیا، تو اس دوسرے وقت میں پانچ ڈبل لے سکتا ہے، پہلے حساب سے دس نہیں لے سکتا، اسی طرح غلہ کے عوض روپے لینے میں اس کا خیال رکھنا واجب ہے،

مثال: ایک کاشتکار کے ذمہ ٹھیکہ کا غلہ گندم چالیس سیر چاہئے، پھر اس سے یہ اقرار پایا کہ اچھا اس کے دام نقد سے لگا کر حساب کر لیا جائے، اور حساب کے وقت نرخ گندم کا روپیہ کا دس سیر ہے، اور اس حساب سے چالیس سیر غلہ چار روپیہ کا ہوا، سو اگر اسی جلسہ میں چاروں روپے وصول ہو جاتے تب تو پورے غلہ کا حساب کر لینا جائز ہے، اور اگر فرض کیجئے کہ اس کو دو روپے وصول ہوں گے تو اس وقت یہ چاہئے کہ صرف بیس ہی سیر غلہ کا حساب کرے، اور اس کے دام اسی وقت وصول کر لے، اب اس کاشتکار کے ذمہ بیس سیر غلہ باقی واجب رہے گا، اس وقت عموماً زمینداروں کی عادت ہے کہ پورے چالیس سیر غلہ کا حساب روپیوں سے کر کے کاشتکار کے ذمہ مثلاً چار روپے کر دیتے ہیں، پھر اگر اس وقت دو روپے وصول ہوئے تو آئندہ اس کے ذمہ دو روپے باقی

سمجھ کر روز روپے کا مطالبہ کرتے ہیں، سو یہ جائز نہیں، حدیث میں جو بیع الکالی بالکالی کی ممانعت آئی ہے، اس کا یہی مطلب ہے، پھر جب موافق مسئلہ مذکورہ کے جس سیر غلہ اس کے ذمہ واجب ہوا، سو جب اس کا حساب ہوگا اس وقت پہلے حساب کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ نیا حساب ان دونوں کی رضامندی سے ہوگا، مثلاً اس وقت نرخ سولہ سیر کا ہوا تو باقی غلہ ڈھائی روپیہ کا ہوگا، پس پہلی صورت میں زمیندار دو روپیہ جبراً نہیں لے سکتا، اور دوسری صورت میں کاشتکار دو روپیہ جبراً نہیں دے سکتا،

اسی طرح اگر گیہوں واجب تھے اور تراضی جانبین سے وصول کرنے نخود (چنا) تو جس قدر نخود اس وقت ملتا ہے اتنے ہی گندم کا اس وقت حساب کیا جائے، بقیہ اس کے ذمہ گندم رہیں گے، آئندہ وصولی کے وقت ان کا حساب بھی رضامندی سے جس طرح بھی ہو جائے۔ یہ نہیں کہ آئندہ اس کے ذمہ نخود رہے، اس کا بقایا نکالا جائے، خوب سمجھ لینا چاہئے۔
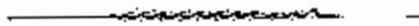
اصلاحِ انقلاب

متعلق بعدل بین الزوجتین:

دو بیویوں میں عدل وانصاف نہ کرنے کی کوتاہیاں

اس باب میں جس قدر کوتاہیاں ہوتی ہیں تو مثل دیگر ابواب کے ان کی بھی فہرست بتلائی جاتی۔ یہاں تو بالکل کوتاہی ہی کوتاہی ہے، عدل کا نام ونشان بھی نہیں، اس کی طرف التفات ہی نہیں، الا ما شاء اللہ وکالمعدوم، یعنی ایسا عدل بہت کم پایا جاتا ہے جو بدنام ہونے کے ڈر سے ہو، جو بڑا سبب اس بے التفاتی کا اس کے متعلق احکام نہ جاننا ہے اس لیے بجائے بے شمار کوتاہیوں کے اس باب کے احکام بتلا دینا کافی ہے؛

عدل نہ کر سکنے کی امید ہو تو دوسرا نکاح کرنا ہی گناہ ہے

مسئلہ نمبر ۱۔ سب سے اول یہ ہے کہ بلا ضرورت دوسری زوجہ سے نکاح نہ کرے، اگرچہ عدل کی امید ہو، مگر خیال سے ترک کر دے گا کہ پہلی کو غم نہ ہو تو ثواب ہوگا (۲)؛ اور اگر عدل کی امید نہ ہو تب تو دوسرا نکاح کرنا بالکل گناہ ہے؛ بقولہ تعالیٰ۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

(پس اگر تم کو اندیشہ اس کا ہو کہ عدل نہ کرو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر اکتفا کرو۔)

نفقات اور شب باشی میں عدل واجب ہو

مسئلہ نمبر ۲؛ نفقات (اخراجات) میں اور بغرض تعلق و دلجوئی رات کے شب باشی میں عدل واجب ہے اور ہمبستری میں نہیں؛

سلہ یہاں سے یہ وہم نہ ہو کہ باوجود قدرت کے اگر کسی ایک منکوحہ سے ہمیشہ ترک ہمبستری کئے رہے، اور اس منکوحہ کو حاجت بھی ہمبستری کی ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں؛ کیونکہ یہ خیال بالکل غلط ہے، اور نہ اس عبارت کا مقصود ہے، عبارت کا مقصود تو یہ ہے کہ عورت کے ساتھ ہمبستری کے باب میں زیادتی جائز ہے۔

رغبت اور نشاط غیر اختیاری ہو | **مسئلہ نمبر:** لیکن اگر جمیع اختیاریات میں مثل ہمبستری و بوس و کنار وغیرہ میں برابری کرے تو مستحب ہی گو واجب نہیں۔

مسئلہ نمبر ۳: اور یہ عدم وجوب اس وقت متفق علیہ ہے کہ جب رغبت اور نشاط نہ ہو اس صورت میں معذور رہیگا، لیکن اگر رغبت اور نشاط ہے مگر دوسری کی طرف زیادہ ہے اور اس کی طرف کم مگر ہے تو اس صورت میں ایک قول یہ ہے کہ داخل تحت القدرۃ (قدرت میں داخل) ہے، اس لئے اس میں برابری واجب ہے، اور غالباً یہ غیر حنفیہ کا مذہب ہے (ش)

تبرعات اور تحائف میں بھی عدل واجب ہے | **مسئلہ نمبر:** باقی تبرعات و تحائف (عطیات اور تحفے) جو کہ غیر لازم ہیں، ان میں عدل واجب ہے یا نہیں، ظاہر اطلاق اقوال حنفیہ کا وجوب ہے، اور بعض مالکی نے بحث (دلیل طور پر) عدم وجوب کیلئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہدایا بھیجنے میں نوبت میں عائشہ رضی اللہ عنہا میں یعنی حضرت عائشہ کی باری میں حضور اکرم کو ہدیہ بھیجنے سے استدلال کیا ہے (ف ج ۵ ص ۲۱۰) لیکن یہ استدلال چند وجوہ مخدوش (قابل چند وجوہ سے صحیح نہیں) ہے۔

اول ممکن ہے کہ وہ حضرت عائشہ کی ملک کی جاتی ہوں، اور اس کا یہ جواب دینا اگر ایسا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے کہ میں اس ہدیہ کا مالک نہیں، اس لئے ضعیف ہے کہ ازواج کی رنجش تقسیم پر نہ تھی، بلکہ ہدیہ (دینے بھیجنے والوں) کے اس قصد پر کہ تخصیص (کسی کے لئے خاص) نہ کریں۔

ثانیاً ممکن ہے کہ آپ کی ملک ہو، مگر آپ تقسیم فرما دیتے ہوں، اور اس پر یہ شبہ ہو کہ اگر ایسا ہوتا تو شکایت کیوں ہوتی؟ اس طرح مدفوع ہے کہ ایسے موقع پر بھی تو ناگوار ہوتا ہے کہ ایک کے گھر سے سب جگہ پہنچے۔

ثالثاً حنفیہ کے نزدیک آپ پر یہ عدل واجب ہی نہ تھا تو اس پر دوسروں کا قیاس نہیں ہو سکتا، اور اس پر یہ شبہ ہو کہ پھر آپ نے کیوں نہ فرما دیا، اس لئے معتدبہ (قابل ذکر) نہیں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دیانۃً حکم یہ ہے کہ عورت کی حاجت اور ضرورت کے موافق ہر زوجہ سے ہمبستری کرنا مرد پر واجب ہے اگر اس کو ادا نہ کرے تو قضاءً عورت کے ترک کرنے کا مواخذہ ہوگا، ہاں اگر کسی وجہ سے خود مجبور ہو یا عورت اپنا حق معاف کر دے یا عورت کی خواہش ہی نہ ہو تو پھر گناہ نہ ہوگا، اور اگر یہ شخص معذور ہو اور عورت اپنا حق معاف نہ کرے اور اسے خواہش جماع کی ہو اور طلاق چاہے تو دیانۃً زوج کو طلاق دینا واجب ہوگا۔ (تحقیق حق)

آپ باوجود عدم وجوب کے اس کے ساتھ معاملہ وجوب کا سا فرماتے تھے،

بہر حال ابن بطال کا استدلال مخدوش ہے، اور ظاہر اطلاق دلائل سے وجوب ہی ہے،

ازواج میں سے سفر میں کسی کو ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ اندازی افضل ہے،

مسئلہ نمبر: برابری شب باشی (رات گذارنے) میں حضر (گھر میں رہنے) میں ہے، اور سفر میں اختیار ہے جس کو چاہے ساتھ لے جائے، لیکن رفع شکایت (شکایت دور کرنے) کے لئے قرعہ ڈال لینا افضل ہے، اور ظاہر یہ اس صورت میں ہے جب تک قرار (سکون) سے قیام نہ ہو ورنہ حالت قیام کا حکم مثل حکم حضر کے ہوگا، دوسرے علماء سے بھی تحقیق کر لیا جائے،

مسئلہ نمبر: یہ برابری شب باشی میں اس شخص کے لئے ہے جو شب میں فارغ ہو، اور جس کی رات ہی کی نوکری ہو جیسے چوکیدار تو اس کا دن مثل شب کے ہے (د)

دونوں بیویوں کی رہائش گاہ میں برابری واجب ہے،

مسئلہ نمبر: مسکن (رہائش گاہ) میں جو برابری واجب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو جدا گھر دینا چاہئے، جبراً دونوں کو ایک گھر میں رکھنا جائز نہیں، البتہ اگر دونوں رضامند ہوں تو ان کے رضامند ہونے تک جائز ہے،

ایک شب میں دوسری کو شریک کرنا صحیح نہیں:

مسئلہ نمبر: جس شخص پر شب میں عدل واجب ہو ایک کی شب میں دوسری کو شریک کرنا درست نہیں، یعنی ایک کی شب میں دوسری کے پاس نہ جائے،

مسئلہ نمبر: اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ ایک کے پاس بعد مغرب جائے اور دوسری کے پاس بعد عشاء، بلکہ اس میں بھی برابری ہونا چاہئے، (ش)

مسئلہ نمبر: اسی طرح ایک شب میں دونوں جگہ تھوڑا تھوڑا رہنا درست نہیں (ل)

مسئلہ نمبر۱۲: لیکن ان تینوں اخیر کے مسئلوں میں یعنی ۹، ۱۰، ۱۱ میں اگر ازواج کی رضامندی ہو تو درست ہے،

مسئلہ نمبر۱۳: اور جس طرح رضامندی سے تھوڑی تھوڑی رات رہنا دونوں کے پاس درست ہے، اسی طرح اگر دونوں کی باری کا دورہ ختم کر کے ایسا کرے اور پھر جس طرح چاہے باری درست کر لے، یہ بھی درست ہے (ش)

اور ان اخیر کے مسائل میں صاحب نیل الاوطار نے یہ مذہب بھی لکھا ہے کہ شب کو بھی ایک کی باری میں دوسری کو عارضی طور پر بلا لینا، یا خود اس کے گھر چلا جانا اور اس سے بات چیت کرنا اور اس کے پاس بیٹھنا اور اس کو مس کرنا (چھونا) سب درست ہے، صرف شب بھر رہنا نا

ہمبستری دوسری کے ساتھ درست نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کے جمع ہونے سے استدلال کیا ہے، مگر یہاں احتمال اذن و اجازت میں شک، یا عدم وجوب قسم کا ہے،

دن کے وقت باری کا حکم | مسئلہ نمبر ۱۴: دن کے آنے جانے میں برابری واجب نہیں، بلکہ تھوڑی دیر کے لئے ہو آنا بھی کافی ہے،

مسئلہ نمبر ۱۵: یا کسی ضرورت سے ایک ہی جگہ جاتے تب بھی درست ہے،

مسئلہ نمبر ۱۶: البتہ اس روز جس کی باری نہ ہو اس سے دن کو صحبت درست نہیں، اور ظاہراً قواعد سے یہاں بھی رات تابع دن کی ہوگی، البتہ تصالح زوجین اور دونوں بیبیوں کی صلاح یا اصلاح زوج سے اس میں تبدیل درست ہوگی، اس کو بھی دوسرے علماء سے تحقیق کر لیا جاوے (ش)

باری کی مقدار اور تعیین کے چند مسائل | مسئلہ نمبر ۱۷: باری کی مقدار معین کرنا مرد کی رائے پر ہے لیکن وہ مقدار اتنی طویل نہ ہو کہ دوسری کو انتظار سے کلفت ہونے لگے، مثلاً ایک ایک سال اور یہ خلاصہ ہے بحث طویل کا (ش)

مسئلہ نمبر ۱۸: اور اگر بیماری کے سبب ایک کے گھر زیادہ مقیم رہ، تو بعد صحت کے اتنے ہی روز دوسری کے گھر رہنا چاہئے (ش)

مسئلہ نمبر ۱۹: اسی طرح اگر ایک بی بی بہت سخت بیمار ہوگئی تو اس ضرورت سے اس کے گھر مقیم رہنے میں مضائقہ نہیں رہا، اور ظاہر اطلاق قول در مختار والبحر سے ان ایام کی قضا بھی ضروری معلوم ہوتی ہے،

مسئلہ نمبر ۲۰: ایک منکوحہ کو اپنی باری دوسری کو ہبہ کر دینا درست ہے، پھر جب چاہے اس کو واپس لے سکتی ہے،

مسئلہ نمبر ۲۱: اگر کسی شخص کے مثلاً چار بیبیاں ہیں، الف، ب، ج، د، ان میں سے الف نے اپنی باری ج کو ہبہ کر دی، اور ان دونوں کی باری کے دن متصل نہ تھے، تو شوہر کو ان دونوں کا متصل کرنا درست نہیں، بلکہ وہی پہلی ترتیب رہے گی، اور واہب موہوب لہا جس کو باری ہبہ کی گئی ہے اس کے پاس دو شبوں میں فصل رہے گا (ش) لیکن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد ختم دورہ کے پھر ترتیب بدل سکتا ہے،

عدل قائم کرنے کی اہمیت | یہ اکیس مسائل ہیں مختلف کتب سے جن کے یہ رموز ہیں، (ع) عالمگیریہ (ق) قاضی خاں، (ش) شامی (ت) فتح الباری (د) در مختار (ل) اشد اللمعات، اگر ان مسائل کو

مستحضر کر کے ان کو دستور العمل بنا لے ، ان شاء اللہ اس باب میں کبھی خلاف عدل کا وقوع ہی نہ ہو مگر افسوس لوگوں نے بجائے عدل کے اس وقت عدول (ترک عدل) کو شیوہ (طریقہ) بنا رکھا ہے ، حتیٰ کہ اکثر عدول نے بھی فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (یعنی خواہش نفسانی کی پیروی نہ کرو اگر انصاف کرو (اور) تمہارا تقویٰ زیادہ قریب ہے (انصاف کے)

مضمون بالا العدل بین الزوجین کا ضمیمہ

ملقب بہ

خیر الانتہاء فی معاشرۃ النساء

مضمون مذکور جور بر زوج کا انسداد (شوہر کے ظلم کو روکنا) تھا ، جو تعدد زوجہ (کئی بیویوں) کے وقت میں ہوتا ہے ، کبھی یہ جور ان زوجات متعددہ (یہ ظلم متعدد بیویوں) کی طرف سے بھی ہوتا ہے جس کا سبب باہمی تنافس و تحاسد (آپس میں ایک دوسری پر برتری کا اظہار اور حسد) اور کبھی غیظ علی الزوج (خاوند پر غصہ) ہوتا ہے ، اور اس باہمی تنافس و تحاسد کے اثر کا بھی اکثر حصہ اسی زوج پر واقع ہوتا ہے ، تو ہر حال میں تحقیق مستحق بھی ٹھہرا ، اس ضمیمہ میں اس جور کا انسداد ہے ۔ اور ہر چند کہ قرآن مجید میں جو اصلاح معاشرت بین الزوجین (شوہر بیوی کے باہمی تعلقات کی اصلاح) کے متعلق مختلف تعلیمات وارد ہیں ، جن میں بعض میں خطاب عام ہے ، بعض میں خطاب خاص بقصد تعمیم حکم (باوجود کہ حکم عام ہونے کا قصد ہے) ، ان کا مجموعہ سب حالتوں کو شامل ہے یعنی خواہ زوجہ میں تعدد نہ ہو یا کہ تعدد ہو ، پھر جور زوج کی جانب سے ہو یا زوجہ کی جانب سے ہو ، مگر ظاہر ہے کہ تعدد کی حالت میں اُن کی اس لئے زیادہ حاجت ہوگی کہ اس حالت میں ایسے جور کا وقوع زیادہ ہوتا ہے ، کبھی بر زوج کی طرف سے (جس کا انسداد آیت وجوب عدل بین النساء (بیویوں کے درمیان عدل کے واجب کرنے والی آیت) سے فرمایا گیا ہے ، اور مضمون بالا اسی کی تفصیل تھی) اور کبھی زوجہ کی طرف سے جس کا بیان اب کیا جاتا ہے ، اور گو اس باب میں جن نصوص کا حوالہ ہے وہ صورت تعدد کے ساتھ خاص نہیں ، مگر چونکہ صورت تعدد میں ان کی سب سے زیادہ حاجت ہے جیسا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے اس لئے تعدد ہی کے ذیل میں وہ مذکور ہوتی ہیں ۔

وہ تعلیمات یہ ہیں :-

جن کے مجموعہ کا حاصل امور ذیل کا مجموعہ ہے، اور گو ان میں کوئی خاص ترتیب منصوص نہیں اور
نیز باعتبار حالات و خصوصیات خاصہ زوجین اپنے اپنے مخصوص حالات کے ان میں وقوعاً بھی کوئی خاص
ترتیب لازم و لابد نہیں، خاص ترتیب عام طور پر ضروری نہیں، لیکن اور حالات میں آیت کے
حقوق و آثار کے اعتبار سے آیت میں جو ترتیب مرعی ہے یعنی اس کی رعایت کی گئی ہے، اسی ترتیب
سے یہ فہرست کو ذکر کرتا ہوں۔

نمبر ۱: صبر زوجہ کی حماقت دیکھ کر بجائے غلظت کے اختیار کرے، لقولہ تعالیٰ:—
وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ، الخ۔

نمبر ۲: اگر پھر بھی باز نہ آئے یا مرد اس پر قادر نہ ہو تو اس کو نصیحت و فہمائش۔

نمبر ۳: پھر اس سے الگ دوسرے بستر پر سونا۔

نمبر ۴: فَاضْرِبُوْهُنَّ، یعنی ضرب خفیف جس سے زحمت پہنچانی نہیں۔

نمبر ۵: یہ بھی نافع نہ ہو تو دو شخص فیصلے کے لئے تجویز کرنا ایک مرد کی جانب سے ایک
عورت کی جانب سے، جو لوگوں کے اظہار سے کر دفع نزاع و جھگڑے کو ختم کر دیں، بمصداق قولہ تعالیٰ
وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ، اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بددماغی کا احتمال ہو۔

نمبر ۶: زوجہ سے کہہ دینا کہ اگر تم کو ہمارے نکاح میں رہنا منظور ہے تو فلاں فلاں شرطیں
منظور کرنی پڑیں گی یا اپنے سب حقوق معاف کر دینے ہوں گے، تاکہ اس کے بعد جتنے حقوق ہم ادا
کریں ان کو غنیمت سمجھو اور کوتاہی کے گمان کے وقت ہم پر شکایت نہ کرو، جیسا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب وحی الٰہی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی ازواج سے فرمایا تھا، بمصداق
عموم قولہ تعالیٰ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا، وفی قولہ: الذی هو اعظم افراد الصلح الذی ذکر
فیما قبلہ تاثیرا، یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ الخ، اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب
احتمال بددماغی کا ہو، (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی بیبیوں سے کہہ دیجئے)۔

نمبر ۷: اس پر بھی سیدھی نہ ہو تو رخصت، بمصداق عموم قولہ تعالیٰ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا
یُقِیْمَا الخ، اور اگر تم کو اس کا احتمال ہو کہ وہ دونوں ضابطہ خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔

یہ ہے فہرست جن کے مجموعہ میں یہ ترتیب آخری ہے، اور اتفاق سے اسی ترتیب سے
یہ آیات بھی لکھی گئی ہیں، اس دستور العمل سے جو درمیان الزوجات (عورتوں کی عزت سے ظلم کا بھی
پورا انسداد ہو جاتا ہے جیسا تجربہ سے مشاہدہ ہو سکتا ہے، اب اس مضمون کو ایک حکایت پر ختم کر کے ایک

مضمون دستورالعمل پر مشتمل ہے ختم کرتا ہوں، اور اس حکایت کے اس تجربہ سے تیقن ویقین ہونے میں قوت بڑھتی ہے۔

حکایت ایک صاحب قوم شیخ حاجی عبد الغنی ساکن محلہ پیرزادگان کا بیان ہے جو کہ دونوں زوجین میاں بیوی کے اجتماع سے مثل رشتی میں تھے، اور چونکہ تمام تدبیرات ختم کرچکے تھے اور وہ تدبیریں نافع بھی ہوتی تھیں، مگر نزاع قطع اور خلجان رفع (جھگڑا ختم اور رنج دور) نہ ہوتا تھا، آخر انھوں نے جز نمبر ۲ کے بوجہ اس کے کہ واجب نہیں اور بعض مواقع پر مناسب نہیں، اس ترتیب پر عمل شروع کیا، نمبر ۴ تک پہنچے تھے بفضلہ تعالیٰ تمام خرخشے (جھگڑے) ختم ہوگئے، اور تلخی عیش مبدل بحلاوت ہوگئی (زندگی کی تلخی خوشگواری میں بدل گئی) نہ صرف زوج کی بلکہ دونوں زوجہ کی بھی، اس جز کے امتثال (بجالانے) کی عمل صورت ان صاحب نے یہ اختیار کی کہ اپنی دونوں زوجہ سے ایک یادداشت کی صورت میں (کہ صلح کی عظیم النفع تدبیر ہے، اور غالباً اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کی گئی) چند امور کا عہد لیا، اور صاف کہہ دیا کہ ہمارے پاس رہنے کی یہ شرطیں ہیں، اب اختیار ہے جس شق (صورت) کو چاہے اختیار کیا جائے، چونکہ دونوں صالحہ اور سعیدہ تھیں، اس لئے انھوں نے نہایت خوشی سے سب شرطیں منظور کرلیں، اور سب کدورات و رنجشیں صاف ہوگئیں، چونکہ اس یادداشت کے مضمون کا نافع ہونا تجربہ سے ثابت ہوا، لہٰذا ان سے حاصل کرکے اس مقام پر نقل کرتا ہوں، کہ دوسرے اہل حقوق پریشان حال بھی اس سے منتفع ہوں (یعنی نفع حاصل کرسکیں) جس سے مجوز اور ناقل دونوں کو خیر ہو، (وہو ہذا)۔

نقل مضمون مذکورہ والصلح خیر

یادداشت تعدد مرد و اہل خانہ حاجی عبد الغنی:

ہم دونوں اہل خانہ حاجی عبد الغنی امور ذیل کا وعدہ کرتے ہیں باللہ تعالیٰ مدد فرمائے

تفصیل: ہم دونوں نے اپنے تمام حقوق واجب اور غیر واجب ہمیشہ کے لئے حاجی صاحب کو معاف کئے، ہم کسی حق کا مطالبہ نہیں کریں گے، وہ خود اپنی خوشی سے جتنا حق ادا کر دیں گے ہم احسان سمجھیں گے، البتہ ادب کے ساتھ ہم کو درخواست

---

[۱] اس میں اشارہ ہو کہ مضمون عنوانا ایک فرد ہے اس کلی منصوص کی ۱۲ منہ

کرنے کی اجازت ہے لیکن اس کو پورا کرنے کا ان کو اختیار ہے، اگر وہ پورا کریں گے نہ ہم اصرار کریں گے نہ ہم کو ناگواری ہوگی۔

نمبر۲: اس بنا پر ان کو اختیار ہوگا رات کو جس کے پاس چاہیں رہیں، اور خواہ کسی کے پاس بھی نہ رہیں، مردانہ میں رہیں، خواہ ایک کے پاس دوسری کے باری میں رہیں۔

نمبر۳: کھانا کھانے میں ان کو اختیار ہوگا جس وقت جس جگہ جی چاہے کھائیں، خواہ کسی کے پاس بھی نہ کھائیں، بازار وغیرہ میں انتظام کر لیں، ہم کو کوئی شکایت نہ ہوگی، خواہ ایک کے ہفتہ میں دوسری کے گھر جائیں، پھر خواہ گھر آکر کھائیں خواہ مردانہ میں منگائیں، خواہ ایک کے گھر سے کھانا منگا کر دوسری کے گھر میں کھائیں ہم کسی امر کے متعلق کوئی حرف زبان پر نہ لائیں گے۔

نمبر۴: علی ہذا دن میں یا شام میں گھر میں آنے کے متعلق ان کو اختیار ہے، خواہ وہ ایک جگہ آئیں خواہ دونوں جگہ، پھر خواہ ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھہریں اور ایک جگہ کم ٹھہریں، خواہ ایک جگہ بالکل نہ آئیں، خواہ دونوں جگہ نہ آئیں۔

نمبر۵: علی ہذا خرچ پیسے نیز دوسری اشیاء از قسم سوغات تحفے وغیرہ دینے میں خواہ دونوں جگہ برابر دیں یا کم و بیش، پھر خواہ مردانہ سے بھیجیں خواہ کسی اجنبی کے ہاتھ سے بھجوائیں، ہر طرح ان کو اختیار ہے ہم ہر طرح خوش رہیں گے۔

نمبر۶: ہم کسی چغلخور کی بات کو نہ سنیں گے بلکہ جب وہ کچھ بات کرے گا ہم منع کر دیں گے، اور جس قدر کان میں پڑ جائے گا اس کو سچ نہ سمجھیں گے، اور نہ کسی کے سامنے اس کا ذکر کریں گے، نہ حاجی صاحب سے نہ اور کسی سے۔

نمبر۷: ہم ہر امر میں جو کہ شریعت کے خلاف نہ ہو حاجی صاحب کی اطاعت کریں گے، وہ جو کچھ کہیں گے ہم فوراً بجا لا دیں گے، ان کی کسی بات کو رد نہ کریں گے نہ اس کو جھٹلائیں گے۔

نوٹ (۱): اگر ہم کبھی جان بوجھ کر یا بھول کر اس کے خلاف کریں گے اسی یادداشت سے ہم کو لاجواب کر دیا جائے۔

نوٹ (۲): شرعاً اس صلح سے رجوع کرنے کا جس طرح ہم دونوں زوجہ کو

نفقہ وغیرہ اسی طرح حاجی صاحب کو اختیار ہے کہ ہمارے زوجیت کے وقت خواہ وہ حقوق واجبہ کے مقید ہوں یا اپنی آزادی و سبکدوشی کا کوئی شرعی طریقہ اختیار کریں"

۱۹ ذوالحجہ ۱۳۳۳ھ (انتہی)

حقوق سے بری ہونے کا اہتمام کرنے کے باوجود بیویوں میں عدل کرنا چاہئے

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل اطلاع ہے جس کی شہادت یہ احقر بھی اپنے مشاہدے سے دیتا ہے کہ حاجی صاحب نے باوجود ہر قسم کے مطالبات سے برأت حاصل کر لینے کے اس کے بعد بھی کسی قسم کے حق میں خواہ وہ نفقہ واجب تھا یا غیر واجب مستحب یا کمی نہیں کی، اصل غرض اُن کی بیجا الزام و شکایات کا انسداد و کف لسان (خواہ مخواہ کے الزامات و شکایات کو روکنا اور زبان بند کرنا) تھا جو حاصل ہو گیا نہ کہ حقوق سے سبکدوشی، اور اس کف لسان کا اثر طبعاً بشرط سلامت یہ ہوتا ہے کہ صاحب معاملہ میں زیادہ رفق اور شفقت اور نرمی اور مہربانی پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ وہاں ایسا ہی ہوا، اور ایسی صورت میں لطف زندگی کیوں نہ ہو کہ زوجہ یہ سمجھے کہ میرا کوئی حق شوہر کے ذمہ نہیں، اور شوہر باوجود اس کے یوں سمجھے کہ میرے ذمہ اور حقوق بڑھ گئے ہیں پس ایسی حالت میں اگر شوہر کچھ حق ادا کرے تب بھی زوجہ غنیمت سمجھتی ہے چہ جائیکہ حقوق سے بھی زیادہ ادا کرے تو زوجہ کو کس قدر راحت اور فرحت ہو گی، اور دراصل اس صورت کی قرآن و حدیث میں ہے، قال اللہ تعالیٰ:-

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدہر ع۱ آیت ۹)

"ہم تم کو محض اللہ کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے بدلہ چاہیں اور نہ شکریہ"

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَنَعَ إِلَيْكُمْ مَعْرُوْفًا فَكَافِئُوْهُ فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا مَا تُكَافِئُوْهُ فَأَثْنُوْا عَلَيْهِ خَيْرًا

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے تمہارے ساتھ بھلائی کی پس تم اس کو اچھا بدلہ دو اور اگر بدلہ نہ دے سکو تو اس کی اچھی تعریف ہی کر دو"

سبحان اللہ کیا تعلیم ہے کہ محسن کو تو یہ سکھلایا کہ تم عوض یا شکریہ کی توقع مت رکھو اور محسن الیہ (جس پر احسان کیا جائے) کو یہ بتلایا کہ تم عوض اور شکریہ کو اپنے ذمہ سمجھو اور جیسا یہ ایک کلی تعلیم محسن و محسن الیہ (احسان کرنے والا اور جس پر احسان کیا گیا ہو) کو کی گئی ہے، اسی طرح خاص معاشرت زوجین کے باب میں یہ خصوصیت کے ساتھ وارد ہے قولہ تعالیٰ [illegible]

ثُمَّ قَالَ اِلٰی قَوْلِهٖ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَآ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ (عن تفسیر الحنفیۃ)

اس آیت میں ازواج مطہرات کو یہ عدم التزام حقوق (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ازواج پر حقوق لازم نہ ہونے کا حکم) سنا کر اس کا یہ اثر تصریحاً وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا، ذٰلِكَ اَدْنٰٓی، پس اس دستور العمل کی صحیح تعلیم یہ ہے کہ زوجہ تو اپنے کسی حق کی شکایت نہ کرے، اور زوج اس کے حقوق سے زیادہ اس کی دل جوئی کرے، پھر ان شاء اللہ غبار یا کدورت کا کبھی نام بھی نہ آئے گا، اور سب کی زندگی اس شعر کا مصداق ہو جائے گی ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

(بہشت وہ جگہ ہو جہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں اور نہ کسی کو کسی سے کام ہے۔)

غرض اگر یہ برداشت خصوصیت کے ساتھ عورتوں کا دستور العمل ہے اور مضمون بالا عدل کا مردوں کا دستور العمل ہے تو جانبین کو حیات طیبہ (پاکیزہ زندگی) نصیب ہو جائے۔

اصلاحِ انقلاب

متعلق رضاع

اس باب میں نادواقفی کے سبب متعدد کوتاہیاں اور مختلف غلطیاں کی جاتی ہیں:

دودھ شریک بہن بھائی ہونے کے لئے ایک ہی زمانہ ہونا ضروری نہیں: منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ دودھ شریک بہن بھائی جب ہی ہوتے ہیں جب کہ ایک زمانہ میں کسی عورت کا دودھ پئیں، اور اگر ایک کے دودھ چھڑانے کے بعد دوسرا دودھ پئے تو دودھ شریک بہن بھائی نہیں ہوتے، سو یہ بالکل غلط ہے، بلکہ خواہ دونوں کے دودھ پینے کا زمانہ ایک ہو یا مختلف ہو دونوں حالتوں کا ایک ہی حکم ہے، یعنی دونوں حالتوں میں دودھ شریک بھائی بہن ہو جائیں گے،

حرمت رضاعت دو سال عمر کے بعد کسی عورت کا دودھ پینے پر ثابت نہیں ہوتی: منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ حرمت رضاع کے ثبوت کے لئے کسی عمر کی قید نہیں سمجھتے، حتیٰ کہ اگر غلطی سے کسی عورت کا دودھ آنکھ میں جا لگے اور اس آنکے کی روٹی خاوند نے کھالی تو سمجھتے ہیں کہ حرمت رضاع ثابت ہو گئی، اور بی بی اس پر حرام ہو گئی، سو یہ بھی بالکل غلط ہے، بلکہ جو زمانہ بچے کے دودھ پینے کا ... شریعت نے مقرر کیا ہے، یعنی دو سال جمہور کے نزدیک اور ڈھائی سال امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک، اور اکثر حنفیہ نے بھی فتویٰ پہلے ہی قول پر دیا ہے، اس زمانہ کے اندر دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، پس صورت مذکورہ میں یہ بی بی اپنے شوہر پر حرام نہیں ہوئی، البتہ خود عورت کا دودھ پینا حد رضاعت سے گزرنے کے بعد بچے کے دودھ پینے کی صورت کے ایک حرام فعل ہے، مگر اس سے رشتہ ثابت نہیں ہوگا،

مدت رضاعت کے اندر دودھ پینے سے حرمت رضاع ثابت ہو جاتی ہے: منجملہ ان کے ایک غلطی اس غلطی کے مقابلہ میں

کی جاتی ہے کہ مدت رضاع کے اندر اگر اس مدت کی تکمیل سے قبل بچہ کا دودھ چھڑا دیا جائے اور پھر کبھی اتفاق سے یہ بچہ دودھ پی لے تو بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں بھی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ خود یہ دودھ پلانا بھی حرام ہے، سو دونوں باتیں غلط ہیں، بلکہ اس صورت میں حرمت رضاع بھی ثابت ہو جاوے گی، (فی الدر المختار ولو بعد الفطام) اور دودھ پلانا بھی حلال ہوگا۔

گائے، بھیڑ، بکری کا دودھ ایک ساتھ پینے سے حرمت رضاع ثابت نہیں ہوتی

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ حرمت رضاع کو عورت کے دودھ کے ساتھ خاص نہیں سمجھتے بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر میاں بی بی گائے وغیرہ کا دودھ بھی ایک دوسرے کا جھوٹا پی لے تو وہ بھائی بہن ہو جاتے ہیں، سو یہ بھی بالکل لغو ہے، اس سے کچھ نہیں ہوتا (فی الدر المختار من شدی آدمیۃ)

بچہ کے دودھ پی کر قے کر دینے سے حرمت رضاع زائل نہیں ہوتی

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر بچہ دودھ پی کر فوراً قے کر ڈالے تو حرمت رضاع بھی زائل ہو جاتی ہے، مجھ کو اس غلطی عوام کی پہلے اطلاع نہ تھی، مگر مجھ سے ایک واقعہ میں استفتاء کیا گیا (فتویٰ پوچھا گیا) تو میرے حرمت رضاع کا حکم بتلانے پر سائل نے یہ معارضہ کیا کہ صاحب اس بچہ نے اول تو پیا تھا بہت قلیل اور پھر وہ اُگل دیا تھا، تو گویا وہ پینا باطل ہو گیا، تو حکم بھی ثابت نہ ہوگا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ بعض کا یہ بھی خیال ہے، سو خوب سمجھ لیا جاوے کہ اس باب میں قلیل و کثیر (کم و زیادہ) کا ایک حکم ہے، اگر ایک قطرہ بھی حلق کے اندر چلا جاوے گا تو حکم رضاع ثابت ہو جاوے گا (فی الدر المختار و ان قل) اسی طرح اگر حلق میں جانے کے بعد قے بھی ہو جاوے تب بھی حکم رضاع بدستور باقی رہے گا (وقد مر ایضاً حیث مر التسلیۃ کالاولی من ہذا الباب)

حرمت رضاع جن جن صورتوں میں واجب ہوگی

اور خواہ منہ کے راستے سے جاوے یا ناک کے راستہ سے اور خواہ خالص دودھ جاوے یا کسی دوا یا پانی میں ملا ہوا جاوے اور ملنے کی صورت میں خواہ غالب ہو یا دوسری چیز کے ساتھ مساوی (برابر) ہو، سب کا ایک حکم ہے۔ (کذا فی الدر المختار، یہ تو غلطیاں تھیں)

بچوں کو دودھ پلانے سے متعلق عملی کوتاہیاں :

شوہر کی اجازت کے بغیر کسی کو دودھ نہیں پلانا چاہئے۔

اور اس باب میں عملی کوتاہیاں بھی ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ کہ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس بچہ پر رحم آیا اس کو دودھ پلا دیا، حالانکہ

بلا اذن شوہر کے کسی کو دودھ پلانا مکروہ ہے، البتہ اگر بچہ کے ہلاک ہوجانے کا اندیشہ ہو وہ حالت اس سے مستثنیٰ ہے، (کذا فی البحر عن الخانیہ، شامی، ج ۲، ص ۶۶۳)

رضاعی بہن کے پاس تخلیہ میں بیٹھنا جائز نہیں۔

منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ اکثر مرد و عورت رضاع کے رشتے سے باہم نسبی محارم (نسب کے اعتبار سے جن سے نکاح حرام ہے ان لوگوں) کی طرح خلا ملا رکھتے ہیں جس سے بڑے بڑے فساد واقع ہوگئے ہیں، فقہاء نے یہی رنگ دیکھ کر تصریح کی ہے کہ رضاعی بہن کے پاس تخلیہ (تنہائی) میں بیٹھنا ناجائز ہے، اسی طرح مصاہرت (دامادی) کے رشتہ میں گو وہ رشتہ حرمت ہی کا ہو جیسے جوان ساس یا سوتیلی ماں، ان سب مواقع میں حسب فتویٰ ہمارا نامحرموں کا سا برتاؤ کرنا چاہیے، یعنی پردہ وغیرہ کیا کریں،

رشتہ نکاح کے وقت دودھ پلانے کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔

منجملہ ان کے ایک کوتاہی یہ ہے کہ رضاع کے باب میں یہ احتیاط کوئی نہیں کرتا کہ دودھ پلانے والے سے تحقیق کرلیں کہ اس نے کس کس کو دودھ پلایا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایسی ہی لڑکی سے اس کا رشتہ کردیا جاتا ہے کہ اس نے بھی اس عورت کا دودھ پیا تھا، اسی واسطے فقہاء نے فرمایا ہے کہ عورتوں پر واجب ہے کہ بلا ضرورت ہر بچہ کو دودھ نہ پلا دیا کریں، اور جب پلائیں تو خوب یاد رکھیں اور خوب شہرت دے دیا کریں، بلکہ احتیاطاً لکھ بھی لیا کریں، (شامی عن الفتح، ج ۲، ص ۶۶۴)

ہر کس و ناکس کا دودھ بچے کو پلانا درست نہیں

منجملہ ان کے ایک کوتاہی جو اولاد کے آداب و حقوق کے متعلق ہے، حرمت سے متعلق نہیں ہے، کہ ہر کس و ناکس کا دودھ بچہ کو پلا دیا جاتا ہے جس سے اس کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے، مناسب ہے کہ صحیح المزاج، سلیم الطبع، عاقل، صالح عورت کا دودھ پلوایا کریں،

اپنے دودھ پلانے والی کا احترام اور ادب کرنا ضروری ہے،

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ اکثر لوگ دودھ پلانے والی کا اگر وہ چھوٹی قوم سے ہو کچھ حق نہیں سمجھتے، اور اس کا کچھ احترام نہیں کرتے حالانکہ حدیث قولی ہے جس میں غلام یا لونڈی اس کی خدمت میں پیش کرنے کی ترغیب ہے اس کا حق معلوم ہوتا ہے، اور حدیث فعلی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرضعہ (دودھ پلانے والی) یعنی حلیمہ سعدیہؓ کا ان کے آنے کے وقت اکرام (عزت و احترام) فرمایا، اس کا احترام ثابت ہوتا ہے،

نسبی ماں کا حق رضاعی ماں کے مقدم ہے

منجملہ ان کے ایک غلطی جو اس کے مقابل جانب میں ہو یہ ہے کہ بعضے آدمی اس کا اتنا بڑا حق سمجھتے ہیں کہ نسبی (حقیقی) ماں کا حق بھی اس کی

ماں ہونے کے سبب اتنا نہیں سمجھتے جتنا دودھ پلانے کے سبب سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود ماں بھی اپنے بچہ کو بعض مواقع پر یہ کہتی ہیں کہ میں تم کو دودھ نہ بخشوں گی اور خوب ڈراتی ہے۔ بلکہ بعض کو اس فکر میں مبتلا دیکھا گیا ہے کہ کیا اگر یہ ماں مرگئی اور ہم دودھ نہیں بخشوانے پائے، سو یہ اصلاً و فرعاً ہر طرح باطل ہے، اصلاً تو ظاہر ہے کہ ماں کا ہر حال میں حق منصوص ہے، اور فرعاً اس لئے کہ دودھ پینا بچے کے لئے کوئی گناہ نعوذ باللہ ایسا ہے جس کے ارتکاب کے بعد بخشوانے کی ضرورت ہو، اور اگر گناہ ہے تو بچہ اس وقت غیر مکلف (احکام شریعت کا شرعی اصطلاح میں پابند) تھا، ماں البتہ مکلف (احکام شریعت کی پابند) تھی۔ اس کو پلانا بھی گناہ ہوگا، وہ خود بھی گنہگار ہوں گی، حرام چیز بچہ کو پلائی، خود اس کو اولاد سے معاف کرانا چاہئے، غرض یہ لغویات ہے۔

فعل ناجائز کی کسی کی اولاد کو اجازت نہیں

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ اس دودھ پلانے کے سبب حضرت حلیمہؓ کا اتنا بڑا حق سمجھتے ہیں کہ اُن کی اولاد و نسل [illegible] کہ ان کے لئے ورثہ بار جو کہ فعل حرام ہے حلال سمجھتے ہیں، بہت ہی سخت عقیدہ ہے، جب خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے لئے کسی فعل ناجائز کی اجازت نہیں تو آپ کی مرضعہ (دودھ پلانے والی) کی اولاد کا تو ان کی نسبت بعید ہی تعلق ہے، پھر سب پیروں کا اُن کی اولاد میں ہونا یہ بھی جہل حکایت ہے۔

فرع قانونی تو جو اصل علم

فقہاء نے رضاع کی تفسیر میں آدمیت کی قید لگائی ہے اور اس کو عورت نہ بہیمیت و رجلیں (جانور اور آدمی) کے دودھ سے بچنے اکر لکھا ہے، مگر جنیہ سے اثباتاً یا نفیاً وہاں بات میں، تعرض (بحث) نہیں دیکھا گیا، کہ آیا وہ اس باب میں بہیمہ (جانور) کے مثل ہے، جیسے نکاح کے باب میں یہی ہے کہ جنیہ سے انسان کا نکاح جائز نہیں، یا مثل آدمی کے ہے، کہ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کسی جنیہ کا دودھ پئیں تو وہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہو جاویں گے، جب تک مسئلہ کی تحقیق نہ ہو احوط موقع اشتباہ و شک کے موقع پر زبان احتیاط پر عمل کرنے) میں عملاً یہی ہوگا کہ حرمت رضاع کا فتویٰ دیا جائے، جیسے اڑھائی سال پر گو فتویٰ نہیں مگر احتیاط وہاں بھی یہی ہے کہ باوجود ممانعت کے اگر اس مدت کے اندر رضاع واقع ہو تو حرمت پر عمل کریں۔

تنبیہ: رضاع کے مسائل نہایت دقیق (باریک) ہیں، ان میں بدون محقق مفتی کا عام (بیدار مغز، تحقیق سے کام لینے والے عالم) کے کسی نیم آموز (کم علم) کے قول کو معتبر نہ سمجھیں، اور سوال کے سمجھنے سمجھانے میں بھی بہت ہی احتیاط و ہوشیاری و بیداری سے کام لیں۔ فقط۔

———

ابوابُ الطلاق

وَمَا یَتَعَلَّقُ بِہٖ

طلاق سے متعلق کوتاہیوں کا بیان

ابواب احکام میں سے یہ باب بھی ایک وسیع باب ہے، اس لئے اس کی کوتاہیاں اور غلطیاں بھی اہتمام کے ساتھ ظاہر کرنے کے قابل ہیں،

مصلحت اور ضرورت کے موقع پر طلاق موجب عار نہیں

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ اس کے ایقاع یعنی طلاق دینے کے متعلق بہت افراط و تفریط ہو رہا ہے، چنانچہ بعضے لوگ تو طلاق دینے کو اس قدر عار و عیب سمجھتے ہیں کہ خواہ کیسی ہی مصلحت و ضرورت ہو اور خواہ باہم زوجین میں (میاں بیوی میں) کتنی ہی نااتفاقی ہو جس سے ایک یا دونوں حقوق زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہوں، اور خواہ زوجہ میں کسی درجہ کی بد دینی ہو جس کی اصلاح شوہر کی قدرت سے خارج ہو گئی ہو، چنانچہ یہی اسباب ہیں مشروعیت طلاق (طلاق کے مشروع ہونے) کے (چنانچہ عورت کے موذی ہونے یا بالکل تارک صلوٰۃ ہونے کی صورت میں فقہاء نے طلاق کو مستحب اور مرد کی طرف سے عورت کے حقوق ادا نہ ہو سکنے کی صورت میں واجب کہا ہے کمافی رد المحتار) مگر پھر بھی خلاف شان خاندانی ہونے کے خیال سے اس کو گوارا نہیں کرتے، اور عمر بھر اپنی زندگی یا زوجہ کی زندگی تلخ کرتے ہیں اور اس ناگواری کا سبب اس کا ابغض المباحات (جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ) ہونا سمجھا ہے، کیونکہ وہاں مصالح و ضرورت کے وقت وہ مباح مطلق ہے، بلا مبغوضیت کے (بالکل جائز، بغیر ناپسندیدگی کے) اور جب اس کا استحباب یا وجوب (مستحب یا واجب ہونا) بعض صورتوں میں ثابت ہے اور استحباب و وجوب کا مبغوضیت (مستحب اور واجب کا ناپسندیدگی) کے ساتھ جمع ہونا محال ہے (جمع ہونا ناممکن ہے) اور قرآن مجید میں نص ہے لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ، اور حدیث رزین میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا تھا، پھر ان کے عرض کرنے پر طلاق نہیں دی (کذا فی المشکوٰۃ) اسی طرح صحابہؓ

سے بکثرت منقول ہے (کذا فی رد المحتار) تو پھر علی الاطلاق اس کو مبغوض کیسے کہہ سکتے ہیں؟ بلکہ یہ مبغوضیت اسی صورت میں ہے جبکہ کوئی داعی معتدبہ (قابل اعتبار محرک) نہ ہو اس وقت بے شک مکروہ ہے، (ونقلہ فی الدر المختار عن الکمال) اور حلال ہونا مبغوضیت کے منافی نہیں کیونکہ حلال مکروہ کو بھی شامل ہے، تو حلال کی تفسیر یہ ہوگی۔

ما لیس فعلہ بلازم الشامل المباح والمندوب والواجب والمکروہ کما قال الشمنی ونقلہ فی رد المحتار عن البحر

(یعنی فعل جس کا کرنا ہی لازم نہ ہو اس میں مباح، مستحب، واجب اور مکروہ سب ہی شامل ہیں، جیسا شمنی نے کہا اور اسے رد المحتار نے بحر الرائق سے نقل کیا ہے)

طلاق کو صد درجہ معیوب سمجھنے کی عملی خرابیاں

اس درجہ میں معیوب سمجھنے پر مفاسد عظیمہ متفرع ہوتے ہیں (یعنی عملی زندگی میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں) کہ ایسے لوگ اگر کبھی جوش غضب میں مغلوب ہو کے بے تابی ہو کر طلاق دے گزرتے ہیں، تب بھی طوق عار (شرمندگی) سے بچنے کے لئے اس کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، اور خواہ شرعاً اس کا تدارک ممکن ہو یا نہ ہو مگر یہ اس کا قصد کرتے ہیں، چنانچہ اکثر باوجود تین طلاق واقع ہو جانے کے اس کو پھر اپنے گھر والی بنا کر رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ چھوڑنے میں ذلت و بدنامی ہے، اور افسوس ہے کہ بدکاری میں ذلت و بدنامی نہیں سمجھتے، حالانکہ اس میں طلاق سے زیادہ ذلت و بدنامی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت کی رسوائی و عقوبت (سزا) کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں کہ کس قدر ہوگی، پھر ان میں جو بد دین بے باک (نڈر) ہیں ان کو تو حرام و حلال کی کچھ پروا ہی نہیں، کھلم کھلا حرام کرتے ہیں پھر اگر عورت بھی ایسی ہی ہوئی تب تو خوشی خوشی حرام کا کارخانہ قائم رہتا ہے۔ اور اولاد حرام کی ہوتی چلی جاتی ہے، اور اگر عورت خدا ترس ہوئی اور اس نے کچھ عذر و انکار کیا تو اس پر ظلم کیا جاتا ہے اور دو برے گناہوں کا ارتکاب[2] ہوتا ہے، زنا بھی اور ظلم بھی، مگر عورت پر واجب ہے کہ جس قدر قدرت ہو اس سے بچے، اور جب تک جان کا اندیشہ نہ ہو اس سے موافقت نہ کرے، اور جو ذرا دین کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ اول تو اس تدارک کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچتے ہیں، خواہ چلیں یا نہ چلیں، مثلاً کسی مجتہد جدید (موجودہ زمانہ میں اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے) سے سن لیا کہ تین طلاقیں ایک دم سے دینے سے ایک ہی طلاق ہوتی ہے، جس میں رجعت[1] یا تجدید نکاح بلا حلالہ جائز ہے، بس اس قول کو لے لیا، اور کہتے ہیں کہ آخر

---

[1] یعنی ایک یا دو طلاق کے بعد شوہر کو حق حاصل ہو کہ عدت پوری ہونے سے پہلے طلاق سے رجوع کر سکتا ہے جس سے اس کی بیوی نکاح سے نہیں نکلتی اس میں عورت کی رضامندی ضروری نہیں ۱۲ مجیب [2] مرتکب ہونے کے

مگر اس عار و شرم کے سبب طلاق نہیں دیتے، پھر یا تو اس سے متمتع ہوتے رہتے ہیں، اور یا اس کو معلقہ کرکے گھر میں ڈالے رکھتے ہیں، یہ تو اہل افراط کی حالت ہے، بعضے لوگ اس کے مقابلہ میں یہ تفریط کرتے ہیں، کہ طلاق دینے سے ذرا نہیں رکتے، اُن کے لئے ادنیٰ معمولی بہانہ کافی ہوجاتا ہے، حالانکہ بلا سبب قوی اس کی اجازت نہیں، حدیث،

أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ
(رواہ ابوداؤد)

(یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے)

اس صورت میں ہے، اور ایسی ہی طلاق سے اس آیت میں منع فرمایا ہے،

فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا (النساء، آیت ۳۴)
أي لا تطلبوا الفراق كذا في الشامي۔

(پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کردیں تو اُن پر بہانہ مت ڈھونڈو، شامی نے اس کی تفسیر جدائی کا طریقہ اختیار کرنے سے کی ہے)

اور ایسی طلاق بلا وجہ میں اتنے ممنوعات (برائیوں) کا ارتکاب ہے، حماقت و سفاہت رائے و کفرانِ نعمتِ نکاح و ایذاء رسانی بزوجہ و بخاندانِ زوجہ و باولادِ زوجہ[عله] ذکرہ فی رد المحتار) اور زوجہ کا ذلیل اور بدنام کرنا علاوہ برآں (اس کے علاوہ) کیونکہ اس پر کوئی شبہ بدکاری کا کرے گا، کوئی بدخلقی و برے اخلاق کا کرے گا، اور دوسری جگہ اس کا نکاح مشکل ہوگا تو تمام عمر اس کی مصیبت میں گزرے گی، اس مقام پر مجھ کو ایک عبارت یاد آئی جو میرے ایک دوست نے میرے پاس اس مضمون کے متعلق لکھ کر بھیجی تھی، اس کو نقل کرتا ہوں:۔

في فتح القدير من المبيحة أن يلقى إليه عدم اشتهائها بحيث يعجز أو يتضرر بإكراهه نفسه على جماعها فهذا إذا وقع فإن كان قادرا على طول غيرها مع استبقائها ورضيت بإقامتها

(فتح القدیر میں ہے کہ طلاق کو مباح قرار دینے والی صورتوں میں سے ایک یہ بات ہے کہ خاوند کے دل میں بیوی سے متعلق عدم اشتہا ڈال دیا جائے اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو عورت کے ساتھ جماع کرنے پر مجبور کرنے کے باوجود عاجز ہو یا ایسا کرنے

عله یعنی بلا ضرورت طلاق دینے سے اتنے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے، سو مذکورہ حالت میں طلاق مکروہ ہوئی۔ (از حفیظ قریشی)

فی عصمۃ بلا وطیء او بلا قسم فیکرہ طلاقہ کما کان بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسودۃ فانہا لم یکن قادرا علی طولہ او لم توفق فی بلاھۃ بلا ترکہ حقہا فہو مباح لان مقلب القلوب رب العالمین ۃ

ہے آگے عذر پہنچے اگر یہ معاملہ جب واقع ہوا اگر اس وقت وہ دوسری عورت پر جماع کے لئے قادر ہو اور اگر وہ عورت بغیر وطی یا بغیر باری کے اس کے نکاح میں رہنے پر راضی ہو تو پھر اس عورت کو طلاق دینا مکروہ ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت سودہؓ کے درمیان ایسا تھا، اور اگر وہ اپنے حق کو چھوڑنے کے لئے راضی نہ ہو تو طلاق مباح ہے، اس لئے کہ دلوں کو پھیرنے والے رب العالمین ہیں۔

بلا ضرورت شرعیہ طلاق مانگنا سخت ممنوع ہے

اسی تفریط کے قبیل سے ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر شوہر سے طلاق مانگتی ہیں، اس باب میں حدیث میں سخت وعید آئی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عورت بدون کسی ضرورت شرعیہ کے اپنے شوہر سے طلاق کی درخواست کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے، روایت کیا اس کو احمد اور ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ و دارمی نے (کذا فی المشکوٰۃ)

کسی دوسری عورت کے لئے طلاق کی درخواست بھی ممنوع ہے

اور جس طرح اپنے لئے طلاق مانگنا ممنوع ہے اسی طرح دوسری عورت کے لئے طلاق کی درخواست کرنا، مثلاً کسی مرد نے اس سے نکاح کی درخواست کی جس کے نکاح میں ایک عورت ہے، اور یہ اس سے یوں کہے کہ پہلی بی بی کو طلاق دیدو تب نکاح کروں گی، اس سے بھی حدیث میں ممانعت آئی ہے، اور اپنی قسمت پر راضی رہنے کا حکم آیا ہے، اس حدیث کے الفاظ اس وقت یاد نہیں، ایسے الفاظ ہیں:

لا تسأل طلاق اختہا لتستکفئ ما فی انائہا،

(اپنی بہن کے لئے طلاق کا سوال مت کر اس غرض سے کہ تو اس کے برتن کی چیز بھی لے لے) الحدیث

تین طلاق ایک دم دینا برا ہے

ایک کوتاہی طلاق کے باب میں یہ شائع ہے کہ جب طلاق دیتے ہیں تین ہی دیتے ہیں، اس طرف نظر نہیں، سو ایسا کرنا اول تو گناہ ہے، کما فی الدر المختار۔

ویحرم لو بدعیا الی ان قال والبدعی ثلث متفرقۃ او ثنتان بمرۃ او مرتین فی طہر واحد

(اگر طلاق بدعت ہو تو حرام ہے، اور .... طلاق بدعی تین طلاقیں ہیں الگ الگ یا دو طلاقیں ایک ہی دفعہ

لا رجعة فيه او واحدة في طهر وطئت فيه او واحدة في حيض موطوءة في رد المحتار قوله ثلث متفرقة وكذا بكلمة واحدة بالاولى اھ

یا دو مرتبہ ایک طہر میں جس میں رجوع نہ کیا گیا یا ایک طلاق ایسے طہر میں جس میں وطی کی گئی ہو یا ایک طلاق ہے موطوءہ کو ایام حیض میں۔ رد المحتار میں ہے مصنف کا قول تین طلاق الگ الگ اور اس ایک لفظ سے تین طلاق دینا بدرجۂ اولی بدعت ہوگا)

تین طلاق ایک ساتھ دینے کے دنیوی مفاسد

اور علاوہ گناہ کے یہ دنیوی مصلحت کے بھی اس لئے خلاف ہے کہ بعض اوقات بعد طلاق کے آدمی نادم ہوتا ہے، تو اگر ایک طلاق دیا ہو تو اگر وہ رجعی ہے تب تو رجعت کر کے اس کا تدارک کر سکتا ہے، اور اگر بائنہ ہے تو گو رجعت نہیں ہو سکتی لیکن زوجہ کی رضامندی سے نکاح جدید تو ہو سکتا ہے، بہرحال تدارک تو آسانی سے ممکن ہے، ایک صورت میں محض ارادۂ زوج سے ایک صورت میں ارادۂ زوجین سے اور تین میں تو دونوں کے ارادہ سے بھی کوئی تدارک ممکن نہیں، جب تک تیسرا آدمی حلالہ کرنے والا نہ ہو، پھر اس حلالہ کا تدارک ہونا بھی مشکوک و مشتبہ ہے، کیونکہ اگر حلالہ کرنے والے سے یہ شرط ٹھیرائی جائے کہ صحبت کر کے اس کو طلاق دیدینا تب تو اس فعل سے حدیث میں لعنت آئی ہے محلل (حلالہ کرنے والے) پر بھی اور محلل لہ (جس کے لئے حلالہ کیا جائے) اس پر بھی، اور فقہاء نے اس کو مکروہ تحریمی کہا ہے وکذا فی الدر المختار، اور پھر شرط کے بعد بھی طلاق دینا اس کے اختیار میں ہے، زوجین کے اختیار سے خارج ہے، اور اگر یہ شرط ٹھیرائی تو اس صورت میں تدارک کا بعید تر ہونا اور بھی ظاہر ہے، سو تین طلاق میں یہ خرابی ہے۔

ایک طلاق بائن دینا بھی بدعت ہے

بلکہ بعض فقہاء نے واحدہ بائنہ (ایک طلاق بائن) کو بھی بدعی کہا ہے جو کہ حرام ہے، کما فی رد المحتار:

فالواحدة البائنة بدعية في ظاهر الرواية (ص ۱۵۵ ج ۲)

(یعنی ایک بائن طلاق بھی ظاہر روایت کے اعتبار سے بدعی طلاق ہے۔)

کیونکہ جو مصلحت تھی ترتیب عدد (تعداد طلاق کے زیادہ ہونے) میں کہ شوہر کو اگر ندامت ہو تو تدارک اس کے قبضہ میں ہو، یہ مصلحت واحدہ بائنہ میں بھی فوت ہوگئی، اس مصلحت کا اس عبارت میں ذکر ہے:

ومنها انه ثلثا لان النفس

اور اسی قبیل سے تین طلاق کی مشروعیت ہے کیونکہ

كذريته بما تظهر عدم الحاجة اليها ثم يحصل الندم فشرع ثلثا ليجرب نفسه وثانيا ثم (رد المحتار عن فتح القدير ص ۵۸۲ ج ۲)

نفس بھڑکتا ہے، اس کی ضرورت نہ ہونے کا اظہار کرتا ہے، پھر نادم ہوتا ہے، اس لئے شریعت نے تین طلاقیں مشروع کیں تاکہ اپنے نفس کو سوچنے سمجھنے کا اچھی طرح موقع مل جائے۔

حیض اور نفاس کی حالت میں طلاق دینا گناہ ہے

اسی طرح طلاق دینے کے وقت اس کا خیال نہیں رہتا کہ یہ اس وقت حائضہ حیض والی تو نہیں یا اگر غیر حائضہ ہے تو اس طہر میں اس سے ہمبستری تو نہیں ہوئی، حالانکہ حالت حیض میں یا ایسے طہر میں جس میں ہمبستری ہو گئی ہو طلاق دینا گناہ ہے، (کما مر عن الدر المختار) اور نفاس میں طلاق دینا ایسا ہی ہے جیسے حیض میں طلاق دینا (شامی، ج ۲ ص ۴۹۰)

غصہ یا ہنسی میں طلاق دینے سے طلاق ہو جاتی ہے

ایک غلطی طلاق کے باب میں بعض جہلاء میں یہ ہے کہ ہنسی میں یا غصہ میں بی بی کو طلاق کہہ کر پکارتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اس سے طلاق نہیں ہوئی، حالانکہ اس سے بھی طلاق واقع ہو جاتا ہے۔[1]

طلاق کی تعداد مقرر ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ مسئلہ سن لیا کہ اگر ایک طلاق دے کر رجوع کرلے تو نکاح بدستور قائم رہتا ہے، تو اس مسئلہ کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ خواہ کتنی ہی بار ایسی حرکت کرے ہمیشہ رجعت جائز ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے، طلاق کی حد تین ہی ہے، خواہ ایک بار یا دو بار یا تین بار میں، اور خواہ درمیان میں رجعت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، پس اگر کسی نے ایک طلاق رجعی دے کر رجعت کرلی، یہ رجعت درست ہے کیونکہ ایک طلاق کے بعد ہوئی، پھر اگر دوسری طلاق رجعی دے کر پھر رجعت کرلی یہ رجعت بھی درست ہے، کیونکہ یہ رجعت دو طلاق کے بعد ہوئی، اور اس کو دو طلاق کے بعد اس لئے کہا جائے گا کہ اس دوسری طلاق کے ساتھ اس پہلی طلاق کو بھی شمار کیا جائے گا اگرچہ رجعت ہو چکی تھی، سو رجعت سے طلاق

---

[1] مشکوۃ میں بروایت ترمذی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے ثلث جدهن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرجعة یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جو ارادہ کرنے سے بھی واقع ہو جاتی ہیں اور ہنسی دل لگی میں بھی وقوع پذیر ہو جاتی ہیں، اور وہ ہیں نکاح، طلاق اور رجعت (یعنی طلاق دے کر پھر رجوع کرلینا)

(بندہ احقر شفیع غفرلہ)

کا اثر جاتا رہا، مگر طلاق کی ذات موجود ہے، پھر اگر اس نے تیسری طلاق دی اب رجعت درست نہیں،
کیونکہ حسب تقریر مذکور یہ تین طلاق کے بعد رجعت ہوئی، اور تین طلاق کے بعد رجعت درست نہیں،
اسی طرح اگر ایک یا دو طلاق کے بعد رجعت نہ کی ہو اور عدت گزرنے سے وہ نکاح زائل (ختم) ہو گیا ہو
اور پھر دونوں نے راضی ہو کر باہم نکاح کر لیا ہو اور پھر اتفاق طلاق دینے کا ہو تو اس طلاق کے وقت
پھر سابق طلاقوں کو جمع کیا جائے گا، جب جمع ہو کر مجموعہ تین ہو جائے گا پھر رجعت جائز نہ رہے گی،
البتہ صرف ایک صورت ہے پہلی طلاق کے کالعدم ہو جانے کی، اور وہ صورت یہ ہے کہ اس شوہر
کے بعد عدت گزار کر اس عورت نے دوسرے شوہر سے نکاح کر لیا اور اس نے ہمبستری کے بعد طلاق
دیدی یا ہمبستری کے بعد مر گیا، اور پھر یہ شوہر اول کے نکاح میں آگئی تو اب البتہ پہلی طلاقوں کا کچھ
اعتبار نہ ہوگا یعنی یہ از سر نو تین طلاقوں کا مالک ہو جائے گا جس طرح اپنے نکاح اول میں تین
طلاق کا مالک تھا، مگر یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، اور امام محمد رحمہ اللہ نے اس میں خلاف
کیا ہے، اور دونوں کی ترجیح میں علماء نے اختلاف کیا ہے، (الدر المختار و رد المحتار ج ۲ ص ۸۴۳)

تنبیہ :- یہ دربارہ رجعت طلاق رجعی میں ہے، بائنہ میں نہیں، تفصیل اس کی
فقہ میں ہے، اور بقدر ضرورت بہشتی زیور میں بھی ہے، ملاحظہ کر لیا جائے، فقط

وسط ماہ شعبان ۱۳۳۶ھ

شوہر کی تنہائی میں طلاق کا مسئلہ | ایک عام غلطی باب طلاق میں یہ ہے کہ بعض اوقات منکوحہ دعویٰ کرتی
ہے کہ شوہر نے مجھ کو طلاق دیدی ہے، مگر کوئی گواہ پیش نہیں کر سکتی، تنہائی میں طلاق دینا بیان کرتی ہے،
اس موقع میں لوگ دو قسم کی غلطیاں کرتے ہیں، اکثر تو اس صورت میں طلاق واقع نہ ہونے کا حکم
کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر بدون گواہوں کے عورت کے قول کا اعتبار کر لیا جائے تو بس عورتیں تو
خوب آزاد ہو جائیں گی، ذرا شوہر سے اَن بَن ہوئی اور طلاق کا دعویٰ دھر دیا، اور بعضے عورت کی
بیکسی پر ترحم کر کے اور قرائن عادیہ سے کام لے کر کہ عورت کی مقابلہ شوہر کے کب جھوٹ بولنے کی
ہمت ہوتی ہے، نیز یہ کہ عورت شوہر سے جدا ہونے کو کب گوارا کرتی ہے، اگر وہ طلاق نہ دیتا تو بھلا
عورت کو ایسے دعوے کی کیا ضرورت تھی، طلاق واقع ہونے کا حکم کر دیتے ہیں، حالانکہ دونوں فریق کے
استدلالات لچر ہیں، فریق ثانی کا تو ظاہر ہے کہ اس کے خلاف کا کثرت سے مشاہدہ کیا جاتا ہے، بہت
عورتیں بیباک بھی ہوتی ہیں، اور جھوٹ بھی بولتی ہیں، اور شوہر سے نفرت رکھنے والیاں بھی بہت ہیں،
اور فریق اول کا اس لئے کہ کوئی اس کے مقابلہ میں یوں کہہ سکتا ہے کہ اگر عورت کی علی الاطلاق

تکذیب کر دی جاوے تو جن صورتوں میں شوہر قصداً تنہائی میں اس لئے طلاق دے کہ دعوے کے وقت انکار کر سکوں اور عمر بھر اس کو پریشان کر دوں تو عورتیں سخت قید میں اور ظلم میں گرفتار ہو جاویں گی۔ یہ تو معارضہ ہے، اور اس فریق کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ ہم یہ حکم دیں کہ طلاق واقع ہو گئی۔ سو اس حکم کے لئے بے شک گواہوں کی ضرورت ہے، بدون گواہوں کے ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا، لیکن اگر یہ حکم نہ دیا جائے کیونکہ غیب کی خبر تو اللہ تعالیٰ کو ہے، بلکہ عورت کو یہ مسئلہ بتلایا جاتا ہے کہ اگر واقعی اس نے تیرے سامنے طلاق دی ہے تو تجھ کو اس سے علیحدہ رہنا چاہئے جس صورت میں رجعت ناجائز ہو اس سے ہمبستر نہ ہونا چاہئے، تو اس حکم میں یہ واقع ہوگا، غرض حکم بالطلاق اور چیز ہے اور حکم بعون نفس بشرط طلاق اور چیز ہے۔

غصہ اور مذاق میں بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ ایسے ہی بطور ہزل (مذاق) کے منہ سے لفظ طلاق نکال دیتے ہیں، مگر ان کا قصد طلاق دینے کا نہیں ہوتا، تو بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ تکلم تو بالقصد (بات کرنا تو ارادہ کے ساتھ) ہوا ہے، گو اس کے ساتھ اس کے معنی کے واقع ہونے کا قصد نہیں ہوا بلکہ اس کے عدم وقوع (واقع نہ ہونے) کا قصد ہوا تو سو یہ شریعت میں معتبر نہیں، بعضے لوگ اس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ یوں سمجھے ہوئے ہیں کہ غصہ میں طلاق واقع نہیں ہوتی، یہ بھی غلط مسئلہ ہے، طلاق غصہ میں بھی واقع ہو جاتی ہے، اور طلاق تو اکثر غصہ میں ہی دی جاتی ہے۔

زبردستی سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

بعضے لوگ اس غلطی میں ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی زبردستی کسی سے طلاق دلوا دے تو طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بات بھی صحیح نہیں، اکراہ (زبردستی) میں بھی طلاق واقع ہوتی ہے، گو اکراہ کرنے والے پر مواخذہ ہو، جیسے کوئی زبردستی کسی کو کسی سے پٹوا دے تو کیا اس ضرب کا اثر نہ ہوگا یعنی چوٹ نہ لگے گی؟!

طلاق کا لفظ منہ سے نکالا، تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح تلفظ بالطلاق (طلاق کا لفظ زبان سے نکالنے) کا اثر وقوع طلاق (طلاق کا واقع ہونا) ہے وہ بھی واقع ہو جائے گی، اسی طرح اگر منہ سے لفظ طلاق قصداً نہ کہے، بلکہ ویسے ہی منہ سے بلا ارادہ نکل گیا، یا کوئی شخص الفاظ طلاق کے معنی نہ جانتا ہو کچھ اور مطلب سمجھ کر منہ سے کہہ دیا تو ان دونوں صورتوں میں قضاءً (دنیاوی فیصلے کے اعتبار سے) تو طلاق کا وقوع ہو گیا، یعنی عورت کو جائز نہیں کہ اس سے تعلق زوجیت کا

سکے بلکہ مرد کو بقدر قدرت روکے اور اگر روکنے پر قدرت نہ ہو یا ظلم اندیشہ جان کے تلف و ضائع ہونے کا ہو یا ظلم شدید کا ہو جس کا تحمل نہ ہو سکے تو پھر اس عورت پر گناہ نہ ہوگا لیکن اگر فرضاً عورت کو اس واقعہ کی اطلاع نہ ہو تو مرد پر یہ واجب نہیں کہ اس کو اطلاع کرے، بعضے یہ سمجھے کہ طلاق واقع نہیں ہوتی

بلا قصد رکھی طلاق واقع ہو جاتی ہے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ بے قصد طلاق دینے سے طلاق نہیں ہوتی یا بلا رضامندی عورت طلاق نہیں ہوتی، سو یہ دونوں باتیں بھی غلط ہیں، دونوں حالت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، گو بلا قصد دینا اور ناحق دینا مذموم ہے۔

نشہ کی حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ نشہ کی حالت میں مثل جنون کے غیر مکلف ہوتا ہے اس حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بھی غلط ہے، اس کا حکم جنون کا سا نہیں ہے، البتہ اگر کسی حلال چیز کے کھانے سے ضعف مزاج ... وطبیعت کی کمزوری کے سبب نشہ ہو گیا اس نشہ کا حکم مثل جنون کے ہے کہ اس حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہ ہوگی۔

کلمۂ کفر زبان سے نکل جانے پر تجدید نکاح ضروری ہے بعض لوگ صرف طلاق ہی کو موجب زوال نکاح (یعنی نکاح ختم کرنے والی) سمجھتے ہیں یعنی زوال نکاح کو صرف طلاق میں منحصر سمجھتے ہیں، چنانچہ اس بنا پر اگر کسی سے کلمۂ کفر صادر ہو جاتا ہے تو تجدید ایمان کی تو ضرورت سمجھی جاتی ہے مگر تجدید نکاح کی ضرورت نہیں سمجھتے، حالانکہ مرتد ہو جانا بھی سبب زوال نکاح ہے، بعد تجدید ایمان کے تجدید نکاح بھی واجب ہے

شوہر کو باپ یا بھائی کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی ایک غلطی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعض ایسے اسباب کو موجب حرمت سمجھتے ہیں جو واقع میں موجب حرمت و حلال ہونے کو ختم کرنے والے نہیں جیسے عورت اپنے شوہر کو باپ یا بھائی کہہ دے تو اس سے نہ طلاق ہو، نہ وہ اس پر حرام ہو، بلکہ ظہار بھی نہیں ہوتا، بلکہ اگر مرد بھی عورت کو یوں کہہ دے کہ تو میری ماں ہے یا بہن ہے تب بھی ایک لغو بات تو ہے لیکن اس کا اثر نکاح پر یا حلت پر کچھ بھی نہیں ہوا، البتہ بعض الفاظ سے ظہار ہو جاتا ہے تو وہ خاص خاص الفاظ ہیں جو وضع لئے حکم کے کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

ایلاء اور اس کا حکم ایک غلطی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعض اسباب طلاق کو اسباب طلاق نہیں سمجھتے، بیان اس کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں اپنی بی بی کے پاس نہیں جاؤں گا اور وہ مدت چار مہینے یا چار مہینے سے زائد ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار مہینے سے پہلے اس نے قسم

توڑ دی اور بیوی کے پاس چلا گیا تب تو نکاح باقی رہا اور صرف کفارہ قسم کا دینا پڑے گا اور اگر چار مہینے اپنی قسم پر رہا تو چار مہینے گزرنے پر اس عورت پر طلاق بائن واقع ہو گئی اس کو ایلاء کہتے ہیں اور اگر وہ مدت چار مہینے سے کم ہے تو اس میں طلاق تو کسی حال میں واقع نہیں ہوتی صرف تفصیل یہ ہے کہ اگر قسم پوری کر دی تو خیر اور اگر قسم توڑ دی تو صرف کفارہ[عہ] قسم کا دینا پڑے گا۔

فسخ نکاح بدون قاضی مسلم کے فیصلہ کے نہیں ہو سکتا۔
بعضے لوگ اس غلطی میں ہیں کہ انھوں نے یہ مسئلہ سنا کہ اگر بجز باپ دادا کے کوئی دوسرا ولی نابالغ عورت کا نکاح کر دے تو گو اس وقت نکاح تو ہو جاتا ہے مگر بالغ ہو کر اس کو فسخ کرنا جائز ہے۔ اور اس کو سن کر یہ سمجھے کہ صرف اس عورت کا فسخ کر دینا کافی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس مسئلہ میں اول تو متعدد شرائط ہیں، دوسرے ان شرائط کے بعد بھی فسخ بدون حکم قاضی یعنی حاکم مسلم کے نہیں ہو سکتا اور غیر مسلم عدالت کا فسخ یا تفریق کافی نہیں، جب تک ایسا نہ ہو نکاح صحیح اور مکمل ہے۔

شوہر کے باپ کو اپنی بہو کو طلاق دینے کا کوئی اختیار نہیں۔
بعضے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ نابالغ کی یا بالغ مجنون (پاگل) کی بیوی کو اس نابالغ یا مجنون کا باپ طلاق دے سکتا ہے، سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ بجز شوہر کے یا شوہر جس کو اختیار دے دے یعنی تفویض الطلاق کے اور کسی کو طلاق دینے کا اختیار نہیں۔

کسی کا خط بغیر اجازت کھولنے سے بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوتی۔
بعضے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کسی خط کے لفافہ پر مثلاً یہ لکھ دیتے ہیں کہ اگر کوئی یہ خط کھولے تو اس کی بیوی پر طلاق۔ اور نہ صرف لکھنے والے بلکہ اور بہت سے دیکھنے والے بھی یوں سمجھتے ہیں کہ جو کوئی کھولے گا اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جاوے گی۔ سو سمجھ لینا چاہئے کہ اسی قاعدہ مذکورہ مسئلہ متصلہ (جو مسئلہ اس سے پہلے مذکور ہے) کی بنا پر یہ سمجھنا بھی محض غلط ہے اس کے خلاف کرنے سے طلاق واقع نہ ہو گی اگر کسی کا خط خواہ ازواج بغیر اجازت دیکھنا یا اسی طرح کسی چیز میں تصرف بلا اجازت کرنا مستقل دلیل سے حرام ہے، مگر طلاق واقع ہونا اور بات ہے۔

تعلیق پر محض نیت کافی نہیں
ایک غلطی در باب فیصلہ باہمی زوجین متعلق طلاق و معافی مہر درمیان بیوی

عہ قسم توڑنے کا کفارہ تین مسلسل روزے یا دس محتاجوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلا دینا اور اگر اناج دینا چاہے تو ہر محتاج کو اتنا غلہ دیدے کہ دو سیر گیہوں یا چار سیر جو یا اس کی قیمت بھی دے سکتا ہے۔ نجیب

کے درمیان طلاق اور معافیٔ مہر کے بارے میں فیصلہ ہوسکے یہ ہوتی ہے کہ بنا بر مصالح (مصلحتوں کی بناء پر) یہ قرار داد (تجویز) ہوتی ہے کہ شوہر طلاق لکھ دے اور منکوحہ مہر کا معافی نامہ لکھ دے، اب اس کی ترتیب کے متعلق دو غلطیاں ہوتی ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مرد نے پہلے طلاق نامہ لکھ دیا اور طلاق واقع ہو گئی، مگر عورت کے حوالہ نہ کیا گیا ہو، اب عورت نے مہر معاف کرنے سے انکار کر دیا، تو مرد کا نقصان ہوا، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ عورت نے مہر کا معافی نامہ لکھ دیا اور مہر معاف ہو گیا، مگر مرد کو حوالہ نہ کیا گیا ہو، اب مرد طلاق دینے سے انکار کرتا ہے، تو اس میں عورت کا خسارہ ہوا، کیونکہ مہر کی معافی میں بھی اور طلاق میں بھی نیت تعلیق کی ہے، مگر تعلیق میں محض نیت کافی نہیں، لفظوں میں اس کی تصریح ضروری ہے، اس لئے اس کا ایسا طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دونوں کا مقصود حاصل ہو جائے اور کسی کو افسوس نہ ہو، وہ طریقہ یہ ہے کہ مرد جو طلاق نامہ لکھے تو اس طرح لکھے کہ اگر عورت مجھ کو مہر معاف کر دے تو میری طرف سے اس کو طلاق بائن ہو جائے، اس کے بعد عورت نے اگر معافی نامہ مہر کا نہ لکھا تو عورت پر طلاق واقع نہیں ہوئی اور مرد خسارہ سے بچا رہا، اور اگر معافی نامہ لکھ دیا تو طلاق ہو گئی، مگر ایسے وقت میں کہ مہر بھی معاف ہو گیا، غرض دونوں میں سے کسی کو دھوکا نہ ہوا،

طلاق کے بارے میں اہلِ علم کا ایک مغالطہ

ایک غلطی بعض اہلِ علم کو یہ ہو جاتی ہے کہ فقہا نے اِخْتَارِیْ (مجھے طلاق کا اختیار ہے) کو کنایاتِ طلاق (طلاق کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ) میں لکھا ہے، تو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ لفظ بہ نیت طلاق کہہ دیا تو طلاق بائن ہو جاتی ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، اس لفظ سے یا اس کے ہم معنی مثل اَمْرُکِ بِیَدِکِ وغیرہ (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے یا تیرے قبضہ میں ہے) سے وقوعِ طلاق کی یہ بھی شرط ہے کہ اس کہنے کے بعد عورت اپنی طلاق کو اختیار کر لے، اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مرد نے اس لفظ کے کہنے میں نیت طلاق کی کی تھی تو طلاق ہو گی ورنہ نہیں، اور اگر عورت خاموش رہی تو صرف مرد کے اِخْتَارِیْ کہنے سے اگرچہ اس میں نیت طلاق کی بھی کی ہو طلاق واقع نہ ہو گی، در مختار میں تصریح ہے:۔

ولا تقع به (ای بقوله اختاری) ولا بامرک بیدک مالم تطلق المرأة نفسها کما یأتی،

(یعنی خاوند نے بیوی سے کہا: مجھے اختیار ہے یا تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کہنے سے طلاق واقع نہیں ہو گی جب تک کہ عورت نے اپنے آپ کو مطلقہ نہ کیا ہو جیسا کہ آگے آرہا ہے)

رد المحتار میں ہے:۔

قولہ ما المتعلق ای معدنیۃ الزوج الطلاق لودلالۃ الحال لان ذلک کنایۃ تفویض لاکنایۃ ایقاع کمایأتی فی الباب الاٰتی، قلت ما الطف تعلیلہ بقولہ لان ذلک کنایۃ تفویض الخ،

جب تک عورت نے خود زوج کے ساتھ طلاق کو معلق نہ کیا ہو یا دلالت حال کے ساتھ کیونکہ یہ سپرد کرنا کا پر ز واقع کرنے کا کنایہ نہیں، جیسا آگے آتا ہے، میں کہتا ہوں کہ کس قدر طلاق کی وجہ بیان کرنے میں لطف پیدا کردی ہے،

غائبانہ طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک عورت سامنے نہ ہو طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بھی غلط ہے، غائبانہ طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے،

غلط طلاق صحیح مخرج سے ادا نہ ہو تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے

بعضے لکھے پڑھے لوگوں نے ایک جہالت کی کہ طلاق دینے والے کو یہ فتویٰ دیا کہ تو نے طلاق میں حرف طاء کو مخرج سے ادا نہیں کیا بلکہ بجائے اس کے حرف تاء فوقانیہ سے کہا، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی، سو فقہاء نے تصریحاً غلط حرف سے طلاق واقع ہو جانے کو لکھا ہے،

رنجش کی بناء پر بیوی کے ناجائز جگہ پر بیٹھنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

ایک غلطی اس باب میں یہ ہے کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر میاں بیوی میں بہت مدت تک رنجش کے سبب بے تعلقی رہی خصوص جب کہ وہ دوسری جگہ ناجائز طور پر بیٹھ رہی تو خود بخود طلاق ہو جاتی ہے، سو یہ بھی غلط ہے، گو اس فعل سے معصیت (گناہ) ہے، مگر طلاق واقع نہیں ہوتی، مرد کو اختیار ہے جب چاہے اس عورت کو زوجیت کے طور پر قبضہ کرے،

شوہر کے مرض الوفات میں طلاق پانے والی عورت کو میراث سے حصہ ملے گا

ایک غلطی باب طلاق میں بہت دقیق ہے جو ایک مسئلہ نہ جاننے سے واقع ہوتی ہے جو کہ بہت کم معلوم ہے، بخصوص اس کے بعض جزئیات سے، تو بعض طالب علم بھی بے خبر ہیں، اول وہ مسئلہ سمجھ لیا جائے پھر اس غلطی پر متنبہ کیا جائے گا، مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرض وفات میں اپنی مدخولہ بی بی (جس سے ہمبستری ہو چکی ہو) کو بدون اس کی رضامندی کے طلاق بائن دیدے، اور وہ شخص عدت گذرنے کے قبل مر جائے تو ظاہراً تو شبہ ہوتا ہے کہ جب طلاق بائن سے نکاح کا علاقہ قطع ہو گیا تو اس کو

ے طلاق بائن: ایسی ایک طلاق جس میں نکاح بالکل ٹوٹ جاتا ہو اور اب بغیر نکاح کئے اس مرد کے پاس رہنا جائز نہیں، اگر پھر اسی کے پاس رہنا چاہے اور مرد بھی اس کو رکھنے پر راضی ہو تو پھر سے نکاح کرنا پڑے گا، ایسی طلاق کو

شوہر سے میراث نہ ملتی، مگر حکم شرعی یہ ہے کہ اس صورت میں وہ عورت میراث پاوے گی، گویا شریعت نے اس کا انتظام کیا ہے کہ کوئی شخص ایسی حالت میں اپنی بی بی کو اس کے حصہ میراث سے محروم نہ کر سکے کیونکہ ایسی حالت میں اگر طلاق دی تو احتمال ہو سکتا تھا کہ شاید دوسرے وارثوں کے مقابلہ میں بی بی کو محروم کرنے کے واسطے طلاق بائن دی ہو، تاکہ وہ زوجہ نہ رہے، اور اس لئے زوجیت کی میراث نہ پاوے اس لئے شریعت نے عدت کو قائم مقام نکاح کے قرار دے کر اس عورت کو میراث دلائی ہے، اور ایسے طلاق دینے والے کو فار بالطلاق (طلاق دے کر میراث سے بھاگنے والا) کہتے ہیں، اور دوسری غلطی یہی ہے کہ لوگ اس عورت کے استحقاق میراث (میراث کے مستحق ہونے) کو نہیں جانتے، اور اس مسئلہ کی جس جزئی سے بعض طلبہ بھی بے خبر ہیں وہ جزئی ہے بدون مرض کے غلبہ احتمال ہلاک (ہلاکت کا غالب گمان) ہو جانے کی ہے، مثلاً شہر عام (پھیلی) طاعون کا ہو رہا ہے، مگر مطلقاً نہیں، بلکہ خود اس شخص کے محلہ میں اس قدر زور شور ہو کہ ہر وقت خود اس کے مبتلائے طاعون ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہو اسی طرح جس کے لئے سزائے موت کا حکم ہو چکا ہو، یا وہ لام پر گیا ہوا ہو اور غالب قرائن سے اندیشہ موت کا ہو سو چونکہ یہ حالتیں مرض کی نہیں، اس لئے ان حالتوں کا حکم بعض کو معلوم نہیں، باگرچہ بوجہ غلبۂ ہلاک ان میں اور حالت مرض موت میں مشترک ہے اس لئے ان کا حکم بھی مثل مرض موت ہی کے ہے حتیٰ کہ ایسے شخص کے وصایا بھی صرف ثلث (ایک تہائی) ہی میں جاری ہوں گے،

طلاق بائن اور طلاق رجعی میں شوہر سے پردہ کے احکام

ایک غلطی بعض آثار طلاق کے متعلق یہ ہوتی ہے کہ بعضے تو طلاق بائن میں بھی شوہر سے پردہ نہیں کراتے، حالانکہ اس وقت ضروری ہے، اور بعضے رجعی میں بھی پردہ کو ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ضروری نہیں، بلکہ اگر قرائن سے امید رجعت کی ہو تو زینت بھی کرنا جائز ہے بلکہ مستحسن ہے،

طلاق کے بعد عدت میں نفقہ دینا واجب ہے

اور ایک آثار کے متعلق غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ طلاق کے بعد عدت میں نفقہ نہیں دیتے، حالانکہ واجب ہے، اس کی کچھ تفصیل آگے بھی آتی ہے،

بقیہ احکام بعد الطلاق

عدت کے متعلق چند کوتاہیاں

منجملہ احکام بعد الطلاق کے ایک عدت ہے، لوگ اس میں طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں

چنانچہ ایک غلطی یہ ہے کہ اکثر عوام عدت مطلقاً تین مہینے سے اور بعضے چار مہینے دس دن سمجھتے ہیں حالانکہ عدت کی کئی قسمیں ہیں

عدت کی قسمیں حاملہ کی عدت وضع حمل ہے، خواہ مطلقہ ہو یا اس کا شوہر وفات پا گیا ہو، اور غیر حاملہ میں تفصیل ہے کہ اگر اس کا شوہر وفات پا گیا ہے تو اس کی عدت چار مہینے دس دن ہیں، اور اگر وہ مطلقہ ہے تو اگر اس کو حیض آتا ہے تو اس کی عدت تین حیض ہے اور اگر کم سنی کے سبب ہنوز (ابھی) حیض نہیں آتا یا بڑھاپے کے سبب حیض موقوف ہو گیا، تو ان دونوں کی عدت تین مہینے ہیں، ایسا علی الاطلاق سب صورتوں میں ایک ہی قسم کی عدت کا حکم کرنا یہ غلط ہے۔

عدت کے اندر نکاح جائز نہیں ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ بیوہ سے نکاح کرتے ہیں، اور انقضاء عدت (عدت پوری ہونے کا) بھی انتظار نہیں کرتے، اور عدت کے اندر نکاح کر لیتے ہیں، بعضے اپنے نزدیک بڑی احتیاط کرتے ہیں، کہ نکاح کو تو جائز سمجھتے ہیں مگر اس سے قربت نہیں کرتے، سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ عدت کے اندر بالکل نکاح جائز نہیں ہوتا۔

زنا سے حمل رہ جانے کی صورت میں نکاح فوراً جائز ہے۔ بعضے لوگ اس کے مقابلہ میں دوسرا غلو کرتے ہیں کہ اگر کسی غیر منکوحہ و غیر معتدہ یعنی ایسی عورت جس کا نکاح نہ ہوا ہو اور نہ وہ عدت میں ہو اگر زنا سے حمل رہ جائے تو اس کے لئے بھی وضع حمل کو عدت تجویز کرتے ہیں، سو یہ بھی غلط ہے، اس پر عدت نہیں، اس سے نکاح فوراً جائز ہے، البتہ صحبت اور اس کے مقدمات بوس و کنار وغیرہ جائز نہیں، جب تک کہ وضع حمل نہ ہو جائے۔

عدت میں پورے تیس دن کا مہینہ شمار کیا جائے۔ ایک غلطی عام یہ ہے کہ جن صورتوں میں مہینوں سے عدت ہے خواہ تین مہینے یا چار مہینے دس دن، اس میں اگر ایک یا دو مہینے انتیس کے ہوں تو اس کمی کے عوض دس دن عدت میں بڑھا دیتے ہیں، مثلاً ایک عورت کے شوہر کی وفات دوسری شوال کو ہوئی تو بیسویں صفر کو علی الاطلاق اس کی عدت کو ختم سمجھتے ہیں اگرچہ ذیقعدہ و ذی الحجہ و محرم و صفر میں سے دو یا تین مہینوں کا چاند انتیس کا ہوا ہو حالانکہ ہمارے ائمہ میں سے یہ کسی کا مذہب نہیں، صاحبین کے نزدیک درمیان کے مہینے چاند سے لیں گے، اور اول کا مہینہ انتیس کا ہو تو اس کی تکمیل اخیر میں دنوں سے کر لیں گے، تو اس صورت میں بھی بیسویں صفر کو اس کی عدت ختم نہ ہوگی، اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سب مہینے دنوں سے شمار کریں گے یعنی اس صورت میں ایک سو تیس دن گزرنے سے عدت ختم ہوگی، پس اگر درمیان میں تین مہینے انتیس

کے ہوتے تو بیسویں صفر کے بعد تین دن بڑھا دئے جائیں گے، اور تئیسویں صفر کو عدت ختم ہونے کا حکم کریں گے، خوب یاد رکھنا چاہئے۔

عدت کا شمار طلاق یا وفات کے وقت سے شروع ہوتا ہے

بعضے لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اگر کسی عورت کو طلاق ہو گئی یا اس کے شوہر کی وفات ہو گئی، اور اس کو ایک مہینہ بعد خبر ہوئی تو بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتداء عدت کی خبر پہنچنے کے وقت سے ہوگی، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ طلاق یا وفات ہی کے وقت سے عدت کا شمار ہوگا۔

نابالغ کا شوہر فوت ہونے کی صورت میں عدت کا حکم

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ نابالغ کا شوہر اگر مر جائے تو اس پر عدت نہیں، سو یہ بھی غلط ہے، ان لوگوں کو غلط ہو گیا ہے، یہ حکم طلاق میں ہے، کہ اگر منکوحہ سے ہمبستری یا خلوت صحیحہ نہ ہوئی ہو اور طلاق ہو جائے تو اس میں عدت لازم نہیں، تو طلاق کو موت پر قیاس کر کے جو حکم طلاق قبل الدخول (ہمبستری سے پہلے) کا تھا، وہ موت قبل الدخول کا سمجھ لیا، یہ قیاس غلط ہے، اور دونوں کا حکم جدا جدا ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ عدت طلاق میں اصالۃً مقصود برأۃ رحم (رحم کے خالی ہونے کو ثابت کرنے) کے لئے ہے، اور قبل الدخول میں احتمال شغل رحم (ہمبستری سے پہلے رحم کے بھرے ہونے کا) نہیں اس لئے وہاں عدت نہیں اور عدت موت میں اصالۃً قضاء حق نکاح (حق نکاح پورا کرنے) کے لئے ہے، اور اسی وجہ سے عدت اشہر (مہینوں) سے ہے، اس لئے یہاں عدت ہے۔

مدت عدت کے اندر نفقہ واجب ہے

ایک غلطی نفقہ کے متعلق ہے کہ اکثر لوگ طلاق بائن کے بعد مہر کو تو واجب الاداء سمجھتے ہیں، مگر مدت عدت کے اندر نفقہ (کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات) کو واجب نہیں سمجھتے، حالانکہ عدت کے اندر نفقہ بھی واجب ہے، البتہ عدت وفات کا نفقہ کسی کے ذمہ واجب نہیں ہے، اور اسی طرح خلع میں عورت اگر نفقہ عدت کو تصریحاً ساقط (ختم) کر دے تو اس میں بھی ساقط ہو جاتا ہے، وکذا فی الدر المختار۔

عدت کے اندر عورت کا بلا عذر گھر سے نکلنا جائز نہیں

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر عدت کے اندر گھر سے نکل آئے تو اس پر پھر از سر نو عدت واجب ہوگی، اور پہلی عدت ٹوٹ گئی، سو یہ بالکل غلط ہے، یہ تو ضرور ہے کہ بلا عذر گھر سے نکلنا معتدہ (عدت گزارنے والی) کو جائز نہیں، اسی واسطے معتدۃ الطلاق (طلاق کی عدت گزارنے والی) کو کسی وقت نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی، کیونکہ اس کا نفقہ زوج پر واجب ہے، اور خلع میں اگر زوج سے ساقط ہوا ہے تو عورت کے ساتھ

کرنے سے ہوا ہے، تو اس نے اپنے نفقہ کا باختیار خود التزام کیا ہے، اس لئے اس کا بھی وہی حکم ہے، اور معتدۃ الوفات (شوہر کی وفات کی عدت گذارنے والی عورت) کا نفقہ کسی پر ابتداء ہی سے واجب نہیں، اس لئے اس کو دن کو بضرورت انتظام معاش کے اور تھوڑے سے حصہ شب میں بھی نکلنا جائز ہے، لیکن زیادہ حصہ رات کا اپنے گھر میں گذارنا واجب ہے، پس فرق دونوں میں اسی ضرورت معاش و عدم ضرورت سے ہوا، سو اگر کوئی معتدۃ الوفات ہی معاش سے مستغنی ہو یعنی محتاج نہ ہو، تو اس کا نکلنا جائز نہ ہوگا، (در مختار مع الفتح)

عدت کی مدت گذرنے کے بعد کوئی پابندی نہیں

ایک غلطی یہ ہے کہ بعض خصوصاً عورتیں یوں سمجھتی ہیں کہ عدت گذرنے کے بعد عورت سے نکلنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس گھر سے دوسرے گھر جائے، اور اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے، سو یہ بالکل غلط ہے جب وہ عدت گذر گئی بس عورت عدت سے نکل گئی، گو اسی گھر میں رہے،

مطلقہ کو حقیر سمجھنا صحیح نہیں

ایک غلطی جس کو ایک رسم جہالت کہنا بجا ہے یہ ہے کہ مطلقہ کو مطلقہ (بالکل) حقیر و رذیل سمجھتے ہیں، اور گو زیادتی شوہر ہی کی ہو مگر بلا وجہ یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ اس میں کچھ تو عیب کیا ہوگا، تب تو اس کو طلاق ہوئی، اور بعض اس عیب کو بھی عفت (پاکدامنی) ہی کے متعلق سمجھ لیتے ہیں، اور اس بناء پر حتی الامکان اس سے نکاح نہیں کرتے، سو ظاہر بات ہے کہ جب واقعات دونوں طرح کے ہیں کہیں عورت کی زیادتی ہوتی ہے کہیں مرد کی، پھر یہ کیسے سمجھ لیا کہ عورت ہی خطاوار ہے، اور اگر خطاوار ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ وہ خطا عفت ہی کے متعلق ہے، ایسے قرائن پر کسی پر شبہ کرنا سخت گناہ اور حرام ہے،

بلا تحقیق محض وقوع طلاق سے شوہر یا بیوی پر کوئی حکم لگانا گناہ ہے

ایک غلطی اس کے مقابل ہیں کہ وہ بھی رسم جہالت ہی ہے یہ ہے کہ بعض لوگ طلاق دینے والے کو بلا دلیل ظالم قرار دے لیتے ہیں، اور اسی بناء پر پھر اس کو نکاح دشوار ہو جاتا ہے، سو یہ بھی پہلے کی طرح رجم بالغیب (اٹکل پچو) ہے، کہیں کہیں عورتیں سرکشی، زبان درازی و ایذا رسانی کرتی ہیں، تو اس صورت میں مرد بجز طلاق کے کیا کرے، حاصل یہ کہ محض وقوع طلاق سے بلا تحقیق نہ شوہر پر الزام لگا دے نہ عورت پر، بلکہ جن لوگوں کا اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کو تو اس سے تعرض ہی کی ضرورت نہیں، اور جن کا کچھ ضروری تعلق ہے وہ بھی بدون تحقیق کے کوئی حکم نہ لگائیں، کہ بدون دلیل شرعی کوئی حکم لگا دینا محض لغت ہے، نص ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل آیت ۳۶)

اور جس بات کی تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کرو، اور پھر فرمایا فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الہوی (ص آیت ۲۶) اور لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور آئندہ بھی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرنا۔

چھوٹے بچوں کی پرورش میں کوتاہیاں

یہاں تک اس تفسیر میں اکثر احکام متعلق عدت کے تھے، طلاق کے بعد علاوہ عدت کے حصانت یعنی چھوٹے بچوں کی پرورش کا مسئلہ پیش آتا ہے اسی طرح وفات شوہر کے بعد بھی۔ خلاصہ یہ کہ افتراق بین الزوجین یعنی میاں بیوی میں تفریق ہونے کے بعد کبھی نابالغ اولاد بھی ہوتی ہے بعض اوقات زوجین اور کبھی زوجہ اور ورثہ زوج میں ان بچوں کے متعلق جھگڑا پیش آتا ہے، اور اکثر تو یہ کشاکش اس صورت سے ہوتی ہے کہ فریقین میں سے ہر شخص ان بچوں پر اپنا دعویٰ استحقاق کا رکھتا ہے (یعنی ہر ایک مستحق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے) اور سب اپنے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اور کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے یعنی ہر ایک دوسرے پر ڈالتا ہے، اور دونوں صورت میں اکثر یہی ہے کہ جس کا زور چلا وہ غالب آ گیا۔ اور بچے پر قبضہ کر لیا خواہ حق ہو یا ناحق ہو یعنی اگر باپ یا باپ والے زور دار ہوئے تو دودھ پیتے ہی کی حالت میں یا اس کے ذرا بعد ماں سے چھین لیتے ہیں، اور اگر ماں والے زور دار ہوئے تو وہ عمر بھر بھی باپ کو قبضہ نہیں دیتے، سو یہ دونوں غلطیاں ہیں۔

چھوٹے بچوں کی پرورش کا کون زیادہ مستحق ہے!

اس کا قانون شرعی یہ ہے کہ اگر ماں کافرہ اور فاجرہ نہ ہو اور اس نے ہنوز کسی ایسے مرد سے نکاح نہ کیا ہو جو بچے کے ساتھ ذی رحم محرم (یعنی نسبی رشتہ والا) ہونے کا علاقہ (تعلق) نہ رکھتا ہو تو ماں اس بچے کو اپنے پاس رکھنے کے استحقاق میں سب سے مقدم ہے، اور اس استحقاق کی مدت یہ ہے کہ لڑکا سات برس کا ہو جائے اور لڑکی ایسی ہو جائے کہ مرد اس کی طرف رغبت ہونے لگے، اس کے بعد اس کو باپ کی طرف واپس کر دیا جاوے گا اور دادا بھی بجائے باپ کے ہے، (یعنی باپ کے حکم میں ہے) جبکہ باپ موجود نہ ہو، اگر باپ اور دادا نہ ہوں تو پھر عصبات جو کہ ذی رحم محرم ہوں، وہ زیادہ مستحق ہیں بشرطیکہ معتمد (قابل اعتماد) ہوں، اور جو ایسے عصبات نہ ہوں تو حاکم کسی اہل کے سپرد کر دے، اور لڑکی کو کسی امین دیندار عورت کے سپرد کرے اور لڑکا اگر بالغ ہو کر خود اپنی نگرانی کر سکے، پھر اس پر قبضہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اور اگر ماں کافرہ فاجرہ ہو تو اس کو کچھ حق نہیں، اسی طرح اگر کسی ایسے مرد سے نکاح کر لیا ہو جو بچہ کا ذی رحم محرم نہیں، اس کی تین صورتیں ہیں!

ایک یہ کہ نہ ذی رحم ہے ... نہ محرم ہے جیسے بالکل اجنبی شخص، دوسری یہ کہ ذی رحم تو ہے

محرم نہیں جیسے چچازاد بھائی رشتہ دار تو ہے مگر محرم نہیں، تیسرے یہ کہ محرم تو ہو مگر ذی رحم نہیں جیسے رضاعی باپ یا بھائی کہ ان سے نکاح تو حرام ہے اس لئے محرم تو ہے، مگر ان کی کچھ قرابت نہیں، غرض ان تینوں قسموں میں سے جس کسی سے عورت نے نکاح کر لیا تو ان سب صورتوں میں عورت کا یہ حق جاتا رہے گا۔

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ علی الاطلاق باپ کا قبضہ بھی غلط ہے، اور علی الاطلاق ماں کا قبضہ بھی، بلکہ دونوں کے قبضوں میں یہ تفصیل ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

ایک دوسرے پر ڈالنے کی صورت میں بچہ کو کون کس کے ذمہ ڈالے گا!

اب رہا اس کا عکس کہ ہر ایک دوسرے پر ڈالتا ہے، اس کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری عورت دودھ پلانے والی اور پرورش کرنے والی مل سکے خواہ بلا عوض یا بالعوض (بغیر معاوضہ کے یا معاوضہ کے ساتھ) اور باپ یا بچہ اتنے مال کا مالک ہو کہ اس عوض کو ادا کر سکے تب تو ماں پر جبر نہ کیا جائے گا، ورنہ جبر کیا جاوے گا۔

اس قانون سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ علی الاطلاق بچہ نہ عورت پر ڈالا جا سکتا ہے اور نہ باپ پر اور یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک بچہ ماں کی حضانت (یعنی پرورش) میں رہے گا، دونوں کا خرچ باپ کے ذمہ ہوگا۔ باقی تفاصیل کتب فقہ میں ہیں۔

طلاق یا موت کے بعد گھریلو سامان کے احکام

ایک معاملہ بعد الطلاق یا بعد الموت جس میں غلطیاں ہوتی ہیں اثاث البیت (گھریلو سامان) کے متعلق ہے، کہ ہر ایک زوجین میں سے یا ایک کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء اور دوسرا زندہ اس میں دعویٰ ملک کا کرتے ہیں، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ جو چیزیں عورتوں کے لائق ہیں جیسے زنانہ کپڑے وہ عورت کے ہیں، لیکن مرد اس کے خلاف پر شرعی گواہ قائم کر دے تو گواہوں پر حکم ہوگا، اور جو چیزیں مردوں کے لائق ہیں جیسے مردانہ کپڑے، یا ہتھیار وغیرہ وہ مرد کی ہیں، لیکن اگر عورت اس کے خلاف پر گواہ قائم کر دے تو گواہوں کے موافق حکم ہوگا، اور جو دونوں کے کام کی چیزیں ہیں وہ بھی مرد کو دی جاویں گی لیکن اگر عورت گواہوں سے اس کے خلاف ثابت کر دے تو پھر گواہوں پر فیصلہ ہوگا، یہ تو جب ہے کہ زوجین میں اختلاف ہو، اور اگر ایک مر گیا اور دوسرا زندہ ہے اور اس میت کے ورثہ میں اختلاف ہو تو اس صورت میں جو چیز صرف مردوں کے یا صرف عورتوں کے کام کی ہوں اس میں تو یہی تفصیل ہے، اور جو چیزیں دونوں کے کام کی ہوں اس میں اختلاف ہے، امام محمد رحمہ اللہ تو وہ چیزیں مردوں کو دلاتے ہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، اور گواہ ہونے کی حالت میں گواہوں پر فیصلہ ہوگا، یہ سب تفصیل برتنے کی چیزوں میں ہے، اور اگر سوداگری کا مال ہو تو اسباب (سامان) کا زنانہ ہونا دلیل نہ ہوگا عورت کے مالک

ہونے کی یہ سب (احکام و مسائل عالمگیریہ کے باب مسائل کی تسہیل ما یو عشر میں ہے) اور احقر کے نزدیک جہاں یہ عرف ہو کہ مرد اپنے مال جمع کرنے کی غرض سے زنانہ زیور بنا کر عورت کو عاریۃً پہنا دیتے ہوں تو وہاں یہ زیور بھی مثل دوسرے مال تجارت کے سمجھا جانے چاہیے جس کا حکم ابھی معلوم ہوا، مگر دوسرے علماء سے بھی احتیاطاً مراجعت کرلی جائے۔

زوجین میں جدائی کے نو ماہ بعد بچہ کی ولادت ہونے پر ثبوت نسب کے احکام

ایک غلطی جو معصیت کے شدید درجہ تک سبب ہے بعد مفارقت الزوجین (میاں بیوی کی جدائی) کی صورت میں یہ ہوتی ہے کہ اگر زمانۂ طلاق یا بیوگی سے نو مہینے کے اندر بچہ پیدا نہ ہوا بلکہ بعد میں ہوا تو عورت کو زنا کی تہمت لگاتے ہیں، حالانکہ شریعت میں جو قانون ثبوت نسب کا ہے یہ اس کے بالکل خلاف ہے، فقہاء نے اس کو بہت مفصل لکھا ہے، یہاں نمونہ کے طور پر ایک جزئیہ طلاق کا اور ایک وفات زوج کا لکھا جاتا ہے۔

پہلا جزئیہ: اگر کسی کو طلاق بائن ہو جاوے اور وقت طلاق سے دو برس کے اندر اس کے بچہ پیدا ہو تو وہ اسی شوہر کا سمجھا جائے گا۔

دوسرا جزئیہ: اگر کسی کا شوہر مر جائے، اور وقت وفات سے دو برس نہ گزرے ہوں کہ بچہ پیدا ہو تو اسی شوہر کا سمجھا جائے گا۔

اور یہ اس وقت ہے جب دونوں صورتوں میں معتدہ (عدت گزارنے والی) نے اس کے قبل عدت گزرنے کا اقرار نہ کیا ہو اور اگر عدت گزرنے کا اقرار کر چکی تھی پھر اس کے بچہ پیدا ہوا تو اس میں تفصیل ہے کہ اگر وقت اقرار سے چھ مہینے سے کم میں بچہ پیدا ہوا تو اس اقرار انقضائے عدت (عدت گزرنے) کو غلط سمجھا جائے گا اور نسب ثابت ہوگا، اور اگر وقت اقرار سے چھ مہینے گزر گئے تھے تو نسب ثابت نہ ہوگا۔ یہ سب مسائل ہدایہ میں ہیں، لیکن نسب ثابت نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس عورت کو یقیناً زانیہ کہا جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ قانوناً وہ بچہ مرد کے ذمہ لازم نہ ہوگا مثلاً اس کے مال میں وارث نہ ہوگا اور اس کے ذمہ اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا، باقی زانیہ نہ ہونے کی صورت بعض صورتوں میں یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا اقرار انقضائے عدت کا خود غلط ہو اور بعض صورتوں میں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی ظالم نے اس پر ظلم کیا ہو خواہ شوہر نے عدت طلاق میں یا کسی نے بعد وفات شوہر میں، باقی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر واقع میں بھی عورت کی کوئی شرارت ہو تب بھی اس قانون کے سبب وہ عنداللہ بری ہوگی، ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ پر قانون حاکم نہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم لوگوں کو

اس پر تہمت رکھنے کا کوئی حق نہیں، ہاں ان جانے اور اس کا فعل جانے، جیسا کرے گا عند اللہ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔ اب اس میں یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس قانون سے تو عورتوں کی جرأت بڑھ جائے گی، ایسی جرأت سے کہاں تک بچا جائے گا، آخر یہ بھی تو قانون ہے کہ جس کا شوہر پاس ہو اس کا بچہ ثابت النسب ہوگا تو اس سے شوہر کے پاس رہنے والیوں کی جرأت بڑھے گی کہ اگر بدکاری کرلیں ہم کو کون کچھ کہے گا، خاوند کے ماتھے جائے گی، اور اگر جرأت کا انسداد ضروری ہے تو کیا ظلم کا انسداد ضروری نہیں؟ اگر واقع میں وہ بری ہو اور اس قانون سے کام نہ لیا جائے تو اس پر جو بہتان کا ظلم ہوگا اس کا کیا علاج ہوگا؟

عدت شوہر کی روح نکلنے کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے۔

ایک اعتقادی غلطی عدت وفات کے متعلق جہلاء میں یہ ہے کہ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر مردہ شوہر کا جنازہ اٹھ جانے سے پہلے بیوی کو اس گھر سے دوسرے گھر میں لے جائیں تب تو جائز ہے، ورنہ پھر جائز نہیں، منشاء اس جہل کا یہ ہے کہ عدت کی ابتدا جنازہ لے جانے کے بعد سے سمجھتے ہیں، حالانکہ عدت شوہر کا دم نکلنے کے وقت یعنی روح نکلتے ہی شروع ہو جاتی ہے، اور جنازہ لے جانے کے قبل اور بعد دونوں حال میں ایک ہی حکم ہے کہ بلا عذر قوی (جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے) عورت کے اندر دوسرے گھر کی طرف منتقل ہونا حرام ہے، یہ مسئلہ استطراداً مسائل بعد الطلاق میں ذکر کر دیا گیا۔

عورت کی بدچلنی کے باعث طلاق ہو جانے سے بھی مہر ساقط نہیں ہوتا

ایک علمی غلطی مہر کے باب میں طلاق کے بعد یہ واقع ہوتی ہے کہ بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر عورت کے کسی قصور پر طلاق دی گئی ہو تو مہر ساقط ہو جاتا ہے، مثلاً عورت کی بدچلنی ثابت ہو گئی یا وہ نعوذ باللہ مرتد ہو گئی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر ہمبستری یا خلوت صحیحہ سے مؤکد ہو جاتا ہے، اس کے بعد وہ کسی طرح ساقط نہیں ہوتا، خواہ طلاق ہو یا نہ ہو، پھر خواہ طلاق کا سبب مرد کی زیادتی ہو یا عورت کی، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مہر پر خلع کرلے، اس صورت میں بیشک مہر ساقط ہو جاتا ہے۔

مہر کے متعلق ایک کوتاہی جس سے نکاح ہی منعقد نہیں ہوتا

ایک غلطی مہر کے متعلق ہے گو اس کا تعلق بعد الطلاق کے ساتھ نہیں ہوتا مگر یہاں استطراداً ذکر کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ بعضے دیندار تقلیل مہر کی ترغیب و فضائل سن کر ہر جگہ اس پر عمل کرتے ہیں، حالانکہ بعضے مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں، اور وہ موقع ایک مسئلہ ہے وہ یہ کہ اگر نابالغ لڑکی کا نکاح کرنے والا بجز اس کے باپ یا دادا کے کوئی اور ولی ہو، جیسے بھائی یا چچا تو اس صورت میں اس کا مہر اگر مہر مثل سے بہت کم ہو

تو حسب تصریح درمختار یہ نکاح ہی صحیح نہ ہوگا اور صاحب درمختار نے صدر الشریعت کے حکم صحت کو وہم کہا ہے، پس ایسے موقع پر یا تو مہر مثل مقرر کرے یا اس صغیرہ کو بالغ ہونے دے، پھر اس کی رضا سے مہر قلیل کیا جائے،

طلاق یا موت ہوجانے پر مہر مؤجل کا حکم

ایک اور مسئلے کے متعلق استطراداً ذکر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ مہر مؤجل میں اگر اجل مجہول بجہالت فاحشہ ہو تو حسب تصریح فقہاء وہ تاجیل صحیح نہ ہوگی، مہر معجل واجب ہوگا، لیکن اگر یہ اجل طلاق یا موت ہو گو جہالت فاحشہ ہے مگر اس کی صحت میں اختلاف ہے، بعض نے اس کو جائز کہا ہے، مگر احقر کو اس میں تردد ہے، علماء محققین سے مراجعت کی جائے۔ اور اگر اس قول کو کوئی شخص لیتا ہے تو اس کے ساتھ ایک اور قول بھی مفتی بہ کہا گیا ہے، وہ یہ کہ اگر مہر مؤجل ہو تو عورت کو اس اجل کے قبل انکار کرنا تسلیم النفس (خود کو مرد کے سپرد کرنے) سے جائز ہے، اور اگر ایک بار صحبت ہوجائے دوسری بار میں بھی یہ انکار جائز ہے اور تاجیل کے اس حکم میں گو اختلاف ہے، مگر درمختار میں اس کو مفتی بہ اور استحسان کہا ہے، سو اگر مؤجل بالطلاق و یا لموت میں مراد اس فتوی کو لے گا، تو عورت اس فتوے کو لے سکتی ہے،

عورت ایک بار مہر معاف کردے تو پھر وصول نہیں کرسکتی

ایک غلطی مہر کے متعلق کہ وہ بھی استطراداً مذکور ہوتی ہے یہ ہے کہ بعض عورتیں کسی وقت خوش ہو کر بلا کسی شرط یا قید کے مہر معاف کر دیتی ہیں، پھر دوسرے وقت ناخوش ہو کر کہہ دیتی ہیں کہ میں اپنی معافی کو واپس لیتی ہوں، سو اس صورت میں مہر معاف ہوجائے گا، اور اس کہنے سے وہ عود نہ کرے گا، البتہ اگر معافی میں کوئی شرط ہو اور مرد نے اس شرط کے خلاف کیا تب البتہ وہ معافی نہ رہے گی،

معافی مہر کو اگر شوہر قبول نہ کرے تو مہر معاف نہیں ہوگا

ایک غلطی یہ ہوتی ہے کہ عورت کے معاف کرنے کے وقت مرد اس کو قبول نہیں کرتا، اور جب دوسرے وقت عورت مطالبہ کرتی ہے تو اس پچھلی معافی کو یاد دلا کر اس سے تمسک کرتا (یعنی دلیل پکڑتا) ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ معافی کو اگر مخاطب رد کردے تو وہ معافی کالعدم ہوجاتی ہے، یہ آخر کی دو غلطیاں اسی وقت ایک پیش شدہ واقعے سے ذہن میں آگئیں،

ایک شبہ کا ازالہ

اب مضمون طلاق کے متعلق ایک مضمون بعنوان "رفع اشتباہ" لکھ کر اس باب کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ اوپر جو مبغوضیت طلاق کا مضمون ذکر کیا گیا ہے اس پر ایک شبہ وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ اہل تاریخ نے بالاتفاق نقل کیا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ

عورتوں کو کثرت سے طلاق دیتے تھے تو ایسے امام جلیل الشان ہو کر اس فعل مبغوض کا کیوں ارتکاب فرماتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مبغوضیت اس وقت ہے جب ضرورت نہ ہو اور ان کو ضرورت تھی، وہ ضرورت یہ تھی کہ ان کو طبعی طور پر جدید عورتوں کی رغبت تھی، اور جدید نہ رہنے کے وقت اُن سے بے رغبتی ہو جاتی تھی، اور چار سے زیادہ جمع نہ کر سکتے تھے تو بجز طلاق قدیمہ و نکاح جدیدہ کے کیا صورت ہو سکتی ہے؟ نیز مبغوضیت طلاق میں وحشت زوجہ (بیوی) کی پریشانی کو بھی دخل ہے، اور ان کے اس فعل سے منکوحات کو وحشت نہ ہوتی تھی، چنانچہ احقر نے کسی مقام پر کہ اس کی تعیین یاد نہیں رہی لکھا دیکھا ہے کہ عورتیں یہ خیال کرکے کہ "آپ کے بدن پر بچپن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بجا پیار کیا ہے تو بلا حائل ان کے بدن کو مس کرنے سے برکت نصیب ہوگی" باوجود ان کے کثرت طلاق کے پھر اُن کے نکاح سے انکار نہ کرتی تھیں، اور ان عورتوں کے ساتھ ان کے اولیاء بھی اس کو ناگوار نہ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اے اہل کوفہ حسنؓ سے عورتوں کو مت بیاہو کہ یہ کثرت سے طلاق دیتے ہیں، قبیلہ ہمدان میں سے ایک شخص بولا واللہ ہم ان سے ضرور نکاح کریں گے وہ جس کو پسند کریں رکھیں اور جس کو ناپسند کریں طلاق دے دیں" (اوردہ فی تاریخ الخلفاء عن ابن سعد)۔

اور میں نے احیاء العلوم میں دیکھا ہے کہ حضرت علیؓ اس جواب سے خوش ہوئے، اور قبیلہ ہمدان کے لئے اس ارشاد سے شفاعت کا وعدہ فرمایا:

لَوْ كُنْتُ بَوَّابًا عَلٰى بَابِ الْجَنَّةِ	"اگر میں جنت کے دروازہ کا دربان ہوتا
لَقُلْتُ لِهَمْدَانَ اُدْخُلُوْا بِسَلَامٍ	تو میں قبیلہ ہمدان کو کہوں کہ سلامتی کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ"

تَمَّ مَا يَتَعَلَّقُ بِاَبْوَابِ الطَّلَاقِ

نفقہ کے احکام

اس میں بھی متعدد و مختلف غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں، غلطی سے مراد علمی اختلال (یعنی علمی خرابی) اور کوتاہی سے مراد عملی اختلال (عملی خرابی) ہے، دونوں مختلف طور پر مذکور ہوتی ہیں۔

بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعض لوگ بیوی کا نفقہ اس وقت واجب سمجھتے ہیں کہ وہ نادار ہو، اور اگر وہ مالدار ہو تو اس صورت میں اس کا نفقہ واجب نہیں سمجھتے، سو یہ بالکل غلط ہے، بیوی کا نفقہ دونوں مذکورہ حالتوں میں واجب ہوتا ہے، صرف اتنی شرط ہے کہ بیوی کی طرف سے تسلیم نفس میں بلا عذر کوتاہی نہ ہو، اور اگر عذر ہے ایسا ہو جیسے مہر معجل کے لینے کے لئے اپنے نفس کو تسلیم نہ کرے، اس میں نفقہ واجب رہے گا۔

کم سن عورت کو اگر شوہر اپنے گھر رکھے تو اس کا نفقہ بھی واجب ہے

البتہ اگر بیوی سرکشی شوہر کے گھر سے چلی گئی اس صورت میں نفقہ واجب نہ رہے گا جب تک کہ واپس نہ آجائے، اسی طرح اگر بیوی بہت کمسن ہو کہ قابل ہمبستری کے نہ ہو لیکن اس قابل ہو کہ مرد کے پاس رہنے سے مرد کا اس سے جی بہلے یا معمولی خدمت کر سکے تو تسلیم نفس کے بعد اس کا نفقہ بھی واجب ہے، البتہ اگر اس قابل بھی نہ ہو جیسے بعض قوموں میں بہت ہی کم عمری میں شادی کر دیتے ہیں اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا، (کذا فی الدر المختار)

لیکن جو قابل تمتع کے نہ ہو محض انس اور خدمت کے لائق ہو تو خود شوہر اس کو اپنے گھر رکھنے پر مجبور نہیں ہے، اگر رکھے گا نفقہ دے گا، اگر نہ رکھے گا نہ دے گا (کذا فی الدر المختار)

جوان عورت کا نکاح کم سن لڑکے سے ہو تب بھی اس کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہے

اور بعض قوموں میں یہ بھی عادت ہے کہ جوان عورت کا کم عمر لڑکے سے عقد کر دیتے ہیں، اس عورت کا نفقہ زوج کے مال سے اگر وہ صاحب جائداد یا مالک نقد ہو واجب ہوگا کیونکہ مانع تمتع مرد کی طرف سے ہے، عورت کی طرف سے نہیں۔

شوہر کی اجازت کے بغیر میکے چلے جانے سے شوہر کے ذمہ نفقہ واجب نہیں

ایک غلطی بعض عورتوں کی جانب سے یہ ہے کہ شوہر سے مخالفت کر کے اپنے میکے جا بیٹھتی ہیں اور نفقہ کا مطالبہ کرتی ہیں، سو ابھی مذکور ہوا ہے کہ اس صورت میں نفقہ واجب نہ ہوگا۔

ذی وسعت مرد کے ذمہ ماما کا خرچ بھی واجب ہے

ایک کوتاہی بعض مردوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ باوجود فارغ البالی کے بی بی کے خرچ میں تنگی کرتے ہیں، اور ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے پکائے تو کافی ہو سکتا ہے، ورنہ ماما نوکرانی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ حالانکہ مرد اگر ذی وسعت ہو تو اس کے ذمہ خادمہ کا خرچ بھی واجب ہے۔

تنگدست شوہر ماما رکھنے پر مجبور نہیں

اور ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ باوجود شوہر کے تنگدست ہونے کے اس کو مجبور کرتی ہیں کہ ماما لاوے، حالانکہ شوہر کی تنگدستی کی صورت میں مرد اس پر مجبور نہیں ہے، بلکہ دیکھا جائے گا کہ عورت اپنے کام پر قادر ہے یا نہیں، اگر قادر ہے تو اپنا کھانا بھی پکائے اور شوہر کا بھی پکائے، اور اگر قادر نہیں خواہ کسی مرض کے سبب، خواہ امیر کبیر ہونے کے سبب، تو شوہر ماما لانے پر مجبور ہے اور عورت کھانا پکانے پر، بلکہ شوہر سے کہا جائے گا کہ تیار شدہ کھانا عورت کو لا کر دے، خواہ بازار سے یا کہیں اور پکوا کر (کذا فی الدر المختار)۔

تنگدستی کی حالت میں عورت کو تفریق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ جہاں ذرا نفقہ میں تنگی ہوئی انہوں نے تفریق کی درخواست شروع کی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ نفقہ کی تنگی کی حالت میں گو بعض ائمہ کے نزدیک قاضی کو تفریق جائز ہے لیکن اول تو یہاں شرعی قاضی نہیں، اور بدون قاضی شرعی کے کسی کے نزدیک بھی تفریق صحیح نہیں، دوسرے ہمارے مذہب حنفی میں خود قاضی کے ہوتے ہوئے بھی اس خاص وجہ سے تفریق جائز نہیں، بلکہ قاضی عورت کو حکم دے گا کہ قرض لے لے کر خرچ کرتی رہ اور وہ قرض بذمہ شوہر ہوگا۔

روشن خیال حضرات کی حقیقی ہمدردی کی نشاندہی

بعض روشن خیال ایسی صورتوں میں بزعم خود عنایت اور در حقیقت شریعت پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ تفریق کا جائز نہ ہونا عورت کے حقوق کا تلف کرنا ہے، کیونکہ ہمارے دیار میں شرعی قاضی تو ہے نہیں تو خود عورت کو ایسی مجبوری میں تفریق کے اختیارات ہونے چاہئیں، ورنہ اگر اس کو قرض بھی نہ ملے تو پھر کہاں سے کھائے؟

میں کہتا ہوں کہ آپ صاحبوں کو تو یہ آسان ہے کہ عورت کی ہمدردی میں شریعت پر اعتراض کر کے اپنا دین برباد کرنے لگے، اس سے زیادہ آسان تو یہ تھا کہ اس کی ہمدردی میں اپنا کچھ مال صرف کرتے اور ایسے ستم دیدہ مصیبت رسیدہ کی مدد کرتے اور یہ تو خیال کرنا چاہئے کہ آپ کی اس رائے میں عورت کی تو ہمدردی ہو گئی، لیکن کیا ایسا مجبور مرد قابل ہمدردی کے نہیں، کیا اس کی بے بسی کی

ہے کہ اس کی بی بی تو جو اس کے لئے بڑی قدر مایۂ انس و تسلی تھی اس سے جدا کر دیا جائے۔ اور جو طریقہ ہمدردی کا ہم نے بتلایا ہے اس میں دونوں کی امداد ہے اور ساس کی بھی عورت کی بھی، اور دونوں اپنے گھر پر آباد رہیں گے۔ انصاف کیجئے ہمدردی کہنے کے لائق کونسی صورت ہے؟

قہوہ، حقہ، اور موسمی پھل شوہر کے ذمہ واجب نہیں۔

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہے کہ شوہر کے مال کو بے دریغ اڑاتی ہیں اور سب فضول اخراجات اور تمام متنعمات کا خرچ بذمہ شوہر سمجھتی ہیں، خصوصاً پان چھالیہ یا بعض جائے و کافی میں اس قدر زیادتی کرتی ہیں کہ خود بھی کھاتی پیتی ہیں اور گنے جانے والوں کی تقسیم کرتی ہیں، اور یہ شوہر کے ذمہ واجب سمجھتی ہیں حالانکہ فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ قہوہ اور حقہ اور موسمی پھل بھی شوہر کے ذمہ نہیں، اگرچہ قہوہ اور حقہ کی عادت بھی ہو کہ اس کے چھوڑنے سے تکلیف ہو، تب بھی شوہر کے مال میں یہ صرف نہ ڈالا جائے۔

فمن علم مما ذکر انہ لا یلزمہ لہا القہوۃ والدخان وان تضررت بترکہما لان ذلک لیس من قبیل الدواء او من قبیل التفکہ لا یلزمہ کما علمت (رد المحتار ج۲ ص۶۴۹)	واضح ہو کہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ قہوہ اور حقہ اس کے ذمہ لازم نہیں، خواہ ان کے چھوڑنے سے نقصان پہنچے کیونکہ یہ دوا یا پھلوں کی قسم سے ہے، جو اس کے ذمہ لازم نہیں جیسا کہ تو نے سمجھ لیا ہے۔

شوہر ان مصارف میں سے جتنے کا متحمل ہو جائے اس کا احسان ہے، اور شوہر کی شان کے لائق بھی یہی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ وسعت دے تو بی بی کو اس کے لئے سرمایۂ راحت ہے راحت پہنچانے میں دریغ نہ کرے، مگر عورت کو بھی مناسب نہیں کہ اس راحت پہنچانے کا یہ صلہ دے کہ اس کو کلفت پہنچائے۔

مردوں کے رشوت لینے کی زیادہ تر وجہ عورتیں ہیں۔

واقعی ان عورتوں کی فضول خرچیوں کی بدولت بالخصوص پان اور لباس و آرائش اور رسوم و تقریبات میں مسلمان پنپنے نہیں پاتے، اور ان کے گھر کو جائداد کو، تجارت کو گھن سا لگ رہا ہے، کہ آہستہ آہستہ بالکل ختم ہو جاتا ہے، بلکہ ان اخراجات کی بدولت دنیا کے ساتھ دین تک برباد ہوتا ہے، ملازم مردوں کی رشوت کے زیادہ حصہ کی ذمہ دار یہی فضول خرچیاں ہیں، ورنہ اکثر گھروں میں دنیا کی بھی رونق ہے اور مردوں کا تقویٰ بھی محفوظ رہے۔

عورتیں چاہیں تو مرد کو متقی بنا سکتی ہیں۔

بلکہ اگر خود عورت صبر اختیار کرے تو مرد کو بمجبوری متقی بننا پڑے، بہت نظائر ایسے موجود ہیں کہ عورتوں نے مرد سے صاف کہہ دیا کہ اگر تم رشوت نہ چھوڑو گے تو ہم تمہاری کمائی کا کھانا نہیں کھائیں گے، ادھر مرد و عورت کا تعلق، ادھر اس

خلوص کی برکت مجموعہ کا اثر یہ ہوا کہ مردوں کو رشوت سے توبہ کرنا پڑی۔

بڑی کے جوڑوں کی موجودگی میں شوہر کے ذمہ نیا جوڑا بنانا واجب نہیں

ایک کوتاہی عورتوں کی طرف سے یہ ہے کہ بڑی کے جوڑے اتنا رکھا جاتا ہے ان کے صندوقوں میں ذخیرہ رہتا ہے، پھر بھی روز شوہر سے جوڑے بنوانے کی فرمائش کی جاتی ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ شوہر کے گھر کے جوڑے جب تک موجود ہیں اس وقت تک شوہر کے ذمہ نیا جوڑا بنانا واجب نہیں، اور یوں وہ بنا دے اس کا احسان ہے۔

خاوند کے مال کو ضائع کرنے کی قیامت کے روز باز پرس ہوگی

اسی طرح اکثر عورتوں کو بیکار چیزوں کی بے حد حرص ہے، اور وہ خاوند کو کہ خواہ ضرورت بھی نہ ہو لیکن پسند آنے کی وجہ سے، کہ فوراً ہی خرید لیتی ہیں اور ذخیرہ کرتی چلی جاتی ہیں، پھر لطف یہ کہ نہ وہ کام میں آتی ہیں نہ ان کی حفاظت کرتی ہیں، یونہی ضائع ہو جاتی ہیں، تو اس طرح سے خاوند کے مال کو اڑانا قیامت میں موجب باز پرس ہے، حدیث اَلْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا الخ میں اس کی تصریح ہے۔

عید، بقرعید اور شادیوں پر مستقل جوڑا بنانا شوہر کے ذمہ ضروری نہیں

مثلاً عید بقرعید کے لئے یا شادیوں میں شرکت کے لئے مستقل جوڑا بنانا شوہر کے ذمہ نہیں تو اس کے مال میں سے بلا اس کی رضا کے بنانا بھی عورت کے لئے جائز نہ ہوگا، یہ تو دنیوی مصارف ہیں، ان میں تو بلا رضائے شوہر اس کا مال صرف کرنا کہاں جائز ہوتا۔

شوہر کی اجازت کے بغیر دینی مصارف میں بھی چندہ دینا جائز نہیں

دینی مصارف میں بھی مثلاً کسی سائل کو دینا یا کسی مدرسہ وغیرہ کے چندہ میں دینا یا کسی عالم یا واعظ یا یتیم مسکین بیوہ محتاج کی خدمت کرنا بھی بلا رضائے شوہر اس کے مال میں سے جائز نہیں، نہ ایسا روپیہ خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے، حدیث میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا الطَّيِّبَ

(یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ صرف پاک چیز کو ہی قبول فرماتا ہے)

عورتوں کو اخراجات کے لئے مال دینے کے بارے میں مردوں کو ایک مشورہ

چونکہ ایسے مصارف دینیہ و دنیویہ کی اکثر حاجت واقع ہوتی ہے، اور اکثر عورتوں کے پاس جداگانہ مال نہیں ہوتا، اس لئے مردوں کو مناسب ہے کہ نفقہ واجبہ کے علاوہ حسب وسعت کچھ خرچ ایسے مواقع کے لئے جداگانہ بھی دے دیا کریں، پھر اس کا حساب نہ لیا کریں، تاکہ وہ اپنی مرضی کے موافق آزادی کے ساتھ

بے تکلف ایسے مصارف میں صرف کرسکیں۔

شوہر کے ذمہ عورت کا صدقۂ فطر قربانی اور اس کے لیے زیور کی زکوٰۃ واجب نہیں۔

نیز شوہر کے ذمہ عورت کے مملوکہ زیور کی زکوٰۃ یا اس کی طرف سے صدقۂ فطر یا قربانی واجب نہیں، سو اگر ایسی رقم ان کو مل جایا کرے گی تو ان واجبات کی ادائیگی میں ان کو سہولت ہوگی لیکن چونکہ شوہر پر یہ واجب تو ہے نہیں، اگر شوہر نے نہ دیا تو عورت اپنا زیور بیچ کر یہ سب حقوق اس سے ادا کرے، شوہر کے مال سے بلا اس کی رضا کے ان حقوق میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا، خوب سمجھ لینا چاہیے، عورتیں اس میں سخت بے احتیاطی کرتی ہیں، اور اس کے ناجائز ہونے کا ان کو وسوسہ تک بھی نہیں آتا، گویا شوہر کے مال کا اپنے کو بالکل مالک سمجھتی ہیں، سو یہ بنا ہی باطل ہے۔

شوہر اور بیوی کی ملک جدا جدا ہے

ان دونوں کی ملک جدا جدا ہے، یہ شوہر کے لئے بھی ظلم ہوگا اگر عورت کے مال میں بلا اس کی رضا کے تصرف کرے، اور عورت کے لئے بھی خیانت ہوگی اگر مرد کے مال میں بلا اس کی رضا کے تصرف کرے۔

رضا کا مفہوم و مطلب

اور رضا سے مراد سکوت کرنا یا ناراضی کا اظہار نہ کرنا یا پوچھنے پر رضا ظاہر کرنا نہیں، تجربہ سے ثابت ہے کہ اکثر اوقات باوجود گرانی اور کراہت کے لحاظ و شرم و مروت کے سبب بھی ایسا کیا جاتا ہے، رضا وہ ہے کہ قرائن قویہ غیر مشتبہ سے مالک کا طیب خاطر (جزم و یقینی طور پر دلی رضامندی) کے ساتھ معلوم ہوجاتے، قرآن و حدیث میں اسی مادہ کا استعمال شرط جواز مال میں کیا گیا ہے۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْـئًا مَّرِيْـئًا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے پس اگر وہ بیبیاں خوشدلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر کا کوئی جز، تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار و خوشگوار سمجھ کر۔

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ

اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، خبردار کسی مسلمان کا مال بغیر اس کی رضامندی کے حلال نہیں۔

چندہ دینے اور وراثت کی معافی میں رضامندی کی شرط

اور یہی حکم ہے چندوں اور میراث کے متعلق کہ لحاظ سے دے دینا یا معاف کر دینا کافی نہیں، طیب خاطر شرط ہے، اور میراث میں طیب خاطر سے معاف کرنا بھی کافی نہیں کیونکہ اعیان میں ابراء صحیح نہیں۔

بھائیوں کو میراث مہر کرنے کا سہل طریق

جیسا ہندوستان میں عام رسم ہے کہ بہنیں بھائیوں کو اپنا حصہ معاف کر دیتی ہیں بلکہ دوسرے وارثوں میں بھی ایسی صورت کی ضرورت ہے۔ سو اگر ترکہ میں جو چیزیں قابل تقسیم ہیں ان کو حصۂ تقسیم کر کے پھر جس وارث کا دل چاہے دوسرے وارث کو ہبہ مع القبض کر دے، اور اگر اس میں جھگڑا معلوم ہو تو سہل یہ ہے کہ دوسرے وارث کے ہاتھ اپنا حصہ بیچ کر دے، پھر زرِ ثمن (مقررہ قیمت) خواہ معاف کر دے اور یہ بہت سہل ہے، شرعاً تو اس طرح سے معاملہ صحیح ہو جاوے گا، پھر قانونی احکام جس طریق سے چاہے کر لے، یہ مسئلہ کتاب المیراث کا تھا یہاں استطراداً ذکر کر دیا گیا۔

مہر لے لینے سے نفقہ ساقط نہیں ہوتا

ایک غلطی نفقہ کے باب میں یہ ہے کہ بہت عورتوں کا گمان ہے اور مرد بھی اس غلطی میں عورتوں کے مبتلا رہنے کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اگر ہم مہر لے لیں گے تو پھر نفقہ میں ہمارا کچھ حق نہ رہے گا، اس وجہ سے خود مانگنا تو درکنار بعض خدا کی بندیاں تو مرد کے دینے پر بھی اس ڈر کے مارے نہیں لیتیں، یہ امر بالکل غلط اور باطل ہے، وہ جدا حق ہے یہ جدا حق ہے، ایک کے لینے سے دوسرا ساقط نہ ہوگا۔

شوہر پر بیوی کو رہنے کے لئے جداگانہ گھر یا کمرہ دینا واجب ہے

اور نفقہ ہی کا ایک جزو بیوی کو رہنے کے لئے گھر دینا ہے، اس کے متعلق ایک عام غلطی ہے، اکثر مرد مسئلہ میں جداگانہ گھر دینا اپنے ذمہ واجب نہیں سمجھتے بس اپنے عزیزوں میں عورت کو لا ڈالتے ہیں، سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر شامل رہنے پر عورت بخوشی راضی ہو تب تو خیر ورنہ اگر وہ سب سے جدا رہنا چاہے تو مرد پر اس کا انتظام واجب ہے، اور یہاں بھی راضی ہونے کے معنی وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے یعنی طیبِ خاطر سے راضی ہو، حتیٰ کہ اگر مرد کو قرائن ذریعہ سے معلوم ہو جاوے کہ وہ جدا رہنا چاہتی ہے، مگر زبان سے اس کی درخواست نہ کر سکے تب بھی مرد کو شامل رکھنا جائز نہیں، البتہ اتنی گنجائش ہے کہ اگر پورا گھر جدا نہ دے سکے تو بڑے گھر میں ایک کوٹھری یا کمرہ ایسا دیدے جو اس کی ضروریات کو کافی ہو سکے، اور اس میں اپنا مال و اسباب مقفل کر کے (تالا وغیرہ لگا کر) رکھ سکے، اور آزادی کے ساتھ اپنے میاں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ اٹھ سکے، بات چیت کر سکے، یہ واجب کے ادا کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

عورت کو اپنے عزیزوں سے جدا رکھنے ہی میں مصلحت ہے

اور آجکل کے طبائع اور واقعات کا مقتضا تو یہ ہے کہ اگر عورت شامل رہنے پر راضی بھی ہو اور جدا رہنے سے سب اعزہ و رشتہ دار ناخوش بھی ہوں تب بھی مصلحت یہی ہے کہ جدا ہی رکھے، اس میں ہزاروں مفاسد کا انسداد اور ہزاروں خرابیوں کی روک تھام ہے، اور گو اس میں چند روز کے لئے عزیزوں کی ناک بھوں چڑھے گی، مگر اس کی مصلحتیں

جب مشابہ ہوں گی سب خرچ ہوجائیں گے بخصوص جو چولہا تو ضرور ہی علیحدہ ہونا چاہئے زیادہ تر آگ اسی چولھے ہی سے بھڑکتی ہے، فقہاء نے یہاں تک فرمایا ہے کہ مرد کی اگر پہلی بی بی سے کچھ اولاد ہو دوسری بی بی کو اس کے ساتھ بھی شامل رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا، اور آجکل واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بالخصوص دوسری اولاد کے ساتھ شامل رہنا بڑے بڑے فسادوں کی جڑ ہے، کہ دوسرے عزیزوں کے ساتھ اتنا فساد نہیں ہوتا۔

بیوی پر اپنی ساس کی خدمت کرنا شرعاً حق نہیں ہے۔

بعضے آدمی اس کو بڑی سعادتمندی سمجھتے ہیں کہ بی بی کو اپنی ماں کا محکوم مغلوب بنا کر رکھیں، اور اس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہئے کہ بی بی پر شرعاً حق نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے، تم سعادتمند ہو خود خدمت کرو یا خدمت کے لئے نوکر لاؤ۔

حرمت مصاہرت میں طلاق سے اور ارتداد میں بلا طلاق نفقہ ساقط ہے۔

ایک غلطی نفقہ کے متعلق وہ ہے جو اس کے قبل شرح تقیہ احکام بعد الطلاق کے تحت میں مذکور ہو چکی ہے، کہ بعض لوگ طلاق بائن کے بعد نفقہ عدت کا واجب نہیں سمجھتے، سو اس کی تفصیل اسی مقام میں مذکور ہو چکی، پس اعادہ کی حاجت نہیں، صرف ایک جزئیہ جو کسی جگہ مذکور نہ تھا ذکر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ اگر افتراق بین الزوجین (میاں بیوی میں جدائی) کا سبب عورت کا کوئی فعل معصیت کا ہے تب اس کا نفقہ واجب نہیں، مثلاً عورت کی رضامندی سے حرمت مصاہرت ہو گئی، یا نعوذ باللہ عورت مرتد ہو گئی، اور اس سے تفریق واقع ہوئی، حرمت مصاہرت میں طلاق سے اور ارتداد میں بلا طلاق، ان صورتوں میں نفقہ ساقط ہے البتہ مہر ساقط نہ ہوگا جب خلوت صحیحہ سے مؤکد ہو چکا ہو ——

یہ سب کلام تھا بی بی کے نفقہ کے متعلق ——

نابالغ اولاد کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہے

اب سمجھئے کہ بی بی کی طرح نابالغ اولاد کا بھی نفقہ باپ پر واجب ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ بی بی تو اگر مالدار بھی ہو تب بھی شوہر پر اس کا نفقہ واجب ہے، اور اولاد کا اس وقت واجب ہے جب وہ مالدار نہ ہوں، ورنہ خود ان کے مال میں سے صرف کیا جائے گا، باپ کے مال میں واجب نہ ہوگا،

میراث کے مالک بچہ کا نفقہ باپ پر واجب نہیں۔

مثلاً ایک بچہ کی ماں مر گئی، اور اس نے زیور جائیداد وغیرہ چھوڑا جس میں اس بچہ کو بھی میراث پہنچی، سو جب تک یہ میراث کا حصہ باقی ہے اس وقت تک اس بچہ کا خرچ باپ کے ذمہ نہیں، اگر نقد نہ ہو باپ کو اجازت ہے کہ اس کو بیچ کر

اس کا عزیز رہت میں خرچ کرنا ہے، البتہ اگر فضولیات میں صرف کرے گا اپنے پاس سے بھرنا پڑے گا، اور یہ مسئلہ بہت مشکلوں کا حل کرنے والا اور بہت سی بے احتیاطیوں کا بند کرنے والا ہے، مثلاً بہت لوگ ایسے موقع پر بچوں کا حصہ تقسیم کر کے جدا نہیں کرتے، اور یوں سمجھتے ہیں کہ اس تقسیم سے ہمارا نقصان ہے، کہ خرچ ان بچوں کا ہمارے ذمہ ہے اور پھر اتنا مال اور الگ کر دو تو ہر طرح ہم ہی خسارہ میں رہے، اور اس لئے اس کو بار سمجھتے ہیں، سو اب اس مسئلہ سے یہ اشکال رفع ہو گیا کہ تھوڑا اس میں کوئی نقصان نہیں، جب تک اُن کا حصہ خرچ نہ ہو جائے تمہارے ذمہ ان کا نان نفقہ ہی واجب نہیں، البتہ اُن کا حساب رکھنے میں بہت احتیاط رکھنا چاہئے، سو یہ کوئی مشکل بات نہیں،

یہ تفصیل تو نابالغ ہونے تک ہے، اور بالغ ہونے کے بعد پھر نفقہ واجب نہیں رہتا، البتہ اگر یہ خود محتاج ہے اور لڑکی کی شادی نہیں ہوئی گو بالغ ہے، یا لڑکا کسی مرض وغیرہ کے سبب کمانے سے عاجز ہے گو بالغ ہے، تب اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا،

محتاج والدین کا نفقہ مالدار اولاد پر واجب ہے،

ایک غلطی یا کوتاہی کہتے یہ ہے کہ بجز بی بی اور اولاد کے اور کسی کا نفقہ اپنے ذمہ نہیں سمجھتے، حالانکہ ایک تو محتاج والدین کا نفقہ مالدار اولاد پر واجب ہے، اور دوسرے جتنے اقارب (قریبی رشتہ دار) اس کے ذی رحم محرم ہوں، اور وہ حاجت مند ہوں، اور کسب سے بھی عاجز ہوں ان سب کا بھی نفقہ واجب ہے، مگر صرف تنہا پر نہیں بلکہ والدین کا تو تمام اولاد پر، اور ان اقارب کا ایسے رشتہ داروں پر کہ اگر وہ ذی رحم محرم مر جائے تو ان رشتہ داروں کو ان کی میراث میں سے حصہ پہنچے، بقدر اس حصہ کے ہر شخص پر واجب ہوگا،

ذی رحم محرم کا نفقہ بھی حصہ میراث کی طرح تقسیم ہوگا،

مثلاً ایک آدمی کے تین بھائی ہیں ایک عینی ایک علاتی (باپ شریک) ایک اخیافی (ماں شریک)، تو اب دیکھنا چاہئے کہ اگر یہ شخص مر جائے تو ان تینوں میں میراث کس طرح بٹے؛ سو حکم یہ ہے کہ اخیافی کو تو ذی فرض ہونے کے سبب چھٹا حصہ ملے، اور عینی کو عصبہ ہونے کے سبب پانچ باقی مل جائیں اور علاتی کو کچھ بھی نہ ملے، پس اس شخص کا نفقہ بھی انہی دونوں پر واجب ہوگا، اس طرح سے اگر چھ روپے مہینہ تجویز کیا جائے، تو ایک روپیہ اخیافی بھائی پر اور پانچ روپیہ عینی بھائی پر، اور یہ نسبت میراث کی اُس وقت دیکھیں گے جب سب ذی رحم محرم ہوں، ورنہ ایک اگر ذی رحم محرم ہو دوسرا نہ ہو تو نفقہ صرف ذی رحم محرم پر ہوگا، اگرچہ اس شخص کے مرنے پر وارث وہ دوسرا غیر ذی رحم محرم ہو جاتے، مثلاً ایک شخص کا ایک چچا زاد بھائی ہے اور ایک ماموں، تو نفقہ صرف ماموں پر ہوگا، اور میراث چچا زاد بھائی کو ملے گی، یہ سب نفقات بجز علاوہ

قرابت و رشتہ داری کے تعلق کے سبب۔

کام سے عاجز ہو جنس انسان یا جانور ہو اس کا نفقہ سب پر واجب ہے

ایک فرد نفقہ واجبہ کی مطلق احتیاج کے سبب ہے اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں جو شخص بھی حاجتمند اور کسب سے عاجز ہو خواہ وہ قریب ہو یا اجنبی اور خواہ مسلم ہو یا کافر بلکہ خواہ آدمی ہو یا جانور سب کی خبرگیری سب پر واجب ہے۔ البتہ اگر جانور کسی کا مملوک ہو تو صرف اس کے مالک پر نفقہ کے لئے جبر کیا جائیگا، اور اگر پھر بھی کوتاہی کرے تو حاکم اس کی بیع پر مجبور کریگا (کذا فی الدر المختار) اور اگر وہ جانور کسی کا مملوک نہ ہو تو اگر وہ خود چل پھر کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے تو خیر اور اگر وہ اس سے معذور ہے تو سب پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، اور موذی جانور درندے، خونی درندے اس سے مستثنیٰ ہیں (حضرت نے بہ حکم دمہ جانوروں کے حقوق ایک مستقل رسالہ "ارشاد الہائم فی حقوق البہائم" ملاحظہ)

بے جان چیزوں پر نفقہ کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا

البتہ بے جان چیزوں پر نفقہ کرنا اگر وہ بدون نفقہ کے ضائع ہوتی ہوں جیسے گھر یا کھیتی وغیرہ پھر بھی اس نفقہ پر مجبور نہ کریں گے، گو مال کے ضائع کرنے کی کراہت اس شخص پر ہوگی مگر نفقہ پر مجبور نہ کریں گے، لیکن یہ چیز اگر مشترک ہو اور ایک شریک نفقہ اپنے حصہ کے خرچ کرنے کو تیار ہے تو دوسرے شریک کو بھی حاکم جبر کریگا کہ بقدر اپنے حصہ کے خرچ کرے، کیونکہ اس کو اپنے مال کے ضائع ہونے پر راضی ہونے کا حق ہے، مگر یہاں تو خرچ نہ کرنے سے دوسرے کا مال بھی ضائع ہوتا ہے جس کا اس کو حق نہیں اس لئے جبر کیا جائیگا۔

علماء، مشائخ اور مبلغین کا نفقہ تمام مسلمانوں پر واجب ہے

ایک فرد نفقہ واجبہ کی ایسی نامعلوم و پوشیدہ ہے کہ کسی کا ذہن بھی اس کی طرف منتقل نہ ہوا ہوگا، اور عوام کا تو کیا ہوتا خواص کا بھی نہ ہوا ہوگا، اور اس فرد کے بتلانے سے پہلے ایک مقدمہ معروض ہے، پھر اس فرد کو بتلایا جائیگا۔

اور وہ مقدمہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ نفقہ احتباس کی جزا بھی ہوتا ہے، یعنی جو شخص کسی کی مصلحت یا خدمت کے لئے محبوس و مقید ہو اور اس احتباس کے سبب وہ اپنی معیشت کا انتظام نہ کرسکتا ہو تو اس شخص کا نفقہ اس پر واجب ہوگا جس کی مصلحت و منفعت کیلئے محبوس ہو،

چنانچہ اس کی مشہور مثال جو فقہ نے ذکر کی ہے رزق قاضی ہے، یعنی قاضی مسلمین چونکہ عامہ مسلمین کی منفعت کے لئے خدمت قضا میں محبوس و مشغول ہے، اس لئے اس کا گذارہ جسکو رزق و قوت کہتے ہیں عامہ مسلمین پر واجب ہے، جس کی شکل یہ ہے کہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے، کہ حقیقت اس کی مجمع اموال مسلمین ہے، اور اس لئے اس میں دیئے جانے کی حقیقت یہی ہے کہ عامہ مسلمین سے دلوایا جاتا ہے۔

اسی کی مثال ہے گواہوں کی خوراک، اس کا ماحصل بھی یہی ہے کیونکہ وہ ایک خاص وقت تک وہ مُنْکرُ الشَّهَادَة رجس شخص کے لئے گواہی دی جا رہی اس) کے کام میں مشغول ہے اس لئے اس کو اس سے خوراک دلوائی جاتی ہے حکام وقت نے بھی شریعت کے اس مسئلہ کو برقرار رکھا ہے اور یہ مثال خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی وارد کی گئی ہے کہ اس فرد مقصود کے متعلق بعض اعتراض کرنے والوں پر حجت و دلیل ہو، اور فقہا نے زوجہ کے نفقہ کو بھی جزاء احتباس ہی کہا ہے۔

جب یہ مقدمہ مجملہ بیان ہو چکا تو اب اس فرد خاص کو بتلایا جاتا ہے۔ وہ علماء و طلباء و مشائخ کی جماعت ہے جس کی حقیقت یہی ہے کہ یہ حضرات قوم کی دینی مصلحت میں محبوس ہیں چنانچہ علم دین کی تحصیل و تعلیم کا دینی خدمت ہونا ظاہر ہے۔ باقی اس مصلحت کا قوم کی طرف راجع ہونا وہ اس طرح ہے کہ علوم دینیہ میں تبحر مجموعہ مسلمین پر فرض کفایہ ہے یعنی قوم میں اتنے جامع علوم افراد کے موجود رہنے کا انتظام رکھنا ضروری ہے جس سے عام مسلمین کی دینی حاجتیں تبلیغ احکام و جواب استفتاء وغیرہ پوری ہو سکیں۔ اگر ایسا انتظام نہ کیا جائے گا تو تمام قوم عاصی و آثم گنہگار ہوگی۔

علماء و طلباء کا نفقہ سب مسلمانوں پر واجب ہونے کی وجہ

اس مسئلہ کی علماء نے تصریح بھی کی ہے اور عقل سے بھی سمجھ میں آتا ہے اور اس کی حسی نظیر طبیب کامل کی سی ہے کہ ہر شخص کو طبیب کی حاجت پیش آتی ہے لیکن اگر ہر شخص طبیب کامل بنے تو امر معاش بالکل مختل و درہم برہم ہو جائے اور اگر کوئی بھی نہ بنے تو حاجت طبیہ کسی کی بھی پوری نہ ہو اس لئے صورت مجوزۂ عقل و نقل کی تجویز کردہ صورت یہ ہے کہ قوم میں سے چند افراد ایسے کامل ہوں جو تمام قوم کی حوائج و ضروریات کو کافی ہو سکیں اور یہ صورت ایسی ضروری ہے کہ اگر کوئی خود کوئی تکمیل کی طرف توجہ نہ کرے تو قوم کو متفق ہو کر اور مصائب برداشت کر کے اس کا اہتمام ضروری ہے کہ چند آدمیوں کو اس طرف متوجہ کریں اور ان کے خورد و نوش دکھانے پینے) کے ذمہ دار ہوں، اور جب وہ طبیب ہو جائیں تو ان کے گذارہ کے ذمہ دار ہو کر ان کو شہر میں رکھیں، اور وقتاً فوقتاً اپنے علاج کی حاجتیں ان کے سامنے پیش کریں۔ بس اسی طرح مطب روحانی کے اہتمام کو کہ عبارت ہو دینی حاجتوں کے انتظام سے اس مطب جسمانی پر قیاس کر لیا جائے اور یوں اگر کوئی اس مطب روحانی ہی کو فضول سمجھے وہ ہمارے نزدیک قوم سے خارج ہے۔ وہ ہمارا مخاطب ہی نہیں، خطاب مسلمانوں کو ہے۔ جس طرح کوئی وحشی جنگلی مطب جسمانی ہی کو فضول بتلائے تو وہ مطب جسمانی کی مثال اس پر حجت نہیں۔

غرض اس تقریر سے اس مصلحت کا قوم کی طرف راجع ہونا ظاہر ہو گیا۔ جب یہ مصلحت عام قوم

کی ہے تو مثال طبیب کی طرح ان صاحبوں کے نفقات جو کہ اس مصلحت کی تکمیل میں مشغول ہیں یعنی دین کے علماء و طلباء مجموعہ قوم کے ذمہ واجب ہوں گے۔

مذکورہ صاحبان کے نفقہ کے لئے مہتمم مدرسہ کو چندہ دینا

پھر جس وقت تک بیت المال منتظم تھا بیت المال سے وصول ہو جاتا عامہ مسلمین سے وصول ہو جانے کی صورت نہ تھی چنانچہ فقہاء نے قضاۃ و علماء و مفتیین و امثالہم کی کفایت کا بیت المال میں سے ہونا تصریحاً لکھا ہے، اور جب سے بیت المال منتظم نہیں رہا اب اس کی صورت صرف یہی ہے کہ سب مسلمان متفق و مجتمع ہو کر تھوڑا تھوڑا حسب استطاعت ان حضرات کی خدمت بقدر کفایت کریں، خواہ مدرسہ کی شکل میں جس میں ضوابط و قواعد مقرر ہوتے ہیں، اور ان صاحبوں کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر ہوتے ہیں، اور یہ سہل اور اقرب الی الضبط (آسان اور انتظامی لحاظ سے بہتر) اور خواہ توکل کی صورت میں جس میں کوئی مقدار معین نہیں، جو کسی کو توفیق ہوئی بلا واسطہ کسی مہتمم وغیرہ کے خود ان کی نذر کر دے، اور یہ اقرب الی الخلوص (اخلاص کے قریب) ہے۔

اور یہ مسئلہ قرآنی منصوص بھی ہے، قال اللہ تعالیٰ:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ۔ (البقرہ آیت ۲۷۳)

اصل میں حق ان حاجتمندوں کا بھی ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں، اس لئے کہ وہ زمین میں محنت مشقت نہیں کر سکتے۔

اس آیت میں اگر ان امور پر نظر کی جاوے کہ لام استحقاق کا ہے، لفظ فقراء احتیاج کو بتلا رہا ہے، اُحْصِرُوْا احتباس پر دلالت کر رہا ہے، اور فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کی تفسیر طالب علم کے ساتھ منقول ہے، اور لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا عدم تفرغ الاسباب المعاش (اسباب معاش کی فرصت نہ ہونے) کی طرف اشارہ کر رہا ہے، تو تقریر مذکور کی صریح دلیل ہے۔

پس علماء و طلباء سے جو سوال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جو علم دین میں مشغول ہیں آخر انھوں نے معاش کا کیا انتظام کیا ہے، تو عجیب بات ہے کہ سوال کا حق تو ان کو تھا بالعکس (الٹا) وہ ان سے پوچھنے لگے۔

اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ جب اس کا انتظام قوم پر واجب ہے تو اگر ان کی خدمت میں کوتاہی کریں گے تو قیامت میں ان سے باز پرس ہوگی، اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تعلیم دین پر جو تنخواہ لی جاتی ہے اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کے قول جواز اخذ الاجرت علی الطاعات

دینیہ پر معاوضہ حاصل کرنے کے جائز ہونے پر فتویٰ دینے کی حاجت نہیں، اس کو اجرت ہی کیا کیا جائے یا کفایت جزاء الحبس (پابندی کے بدلے کے لئے کفالت) کہا جائے، تو خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر اس کا جواز ثابت رہے گا۔

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ یہ سب موقوف اس پر ہے کہ یہ لوگ اپنی معاش کے لئے فارغ نہیں ہیں جو ہم یہ نہیں مانتے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تجربہ سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ معاش میں مشغول ہوں تو ان خدمات دینیہ کا ایسا حق ادا نہیں کر سکتے جیسا کہ بالکل اس کے لئے فارغ ہوں اس کو ادا کر سکتے ہیں، اور صحابہ میں خلافت (تجربہ شدہ معاملہ میں بحث) نہیں ہو سکتی جن تعالیٰ نے جن کی نسبت لا یستطیعون فرمایا ہے وہ اپاہج نہ تھے، بلکہ غایت درجہ مشغول فی سبیل اللہ تھے۔

علماء کی دینی خدمات معلوم کرنے کا معیار

البتہ اس تقریر سے وہ علماء مستثنیٰ ہو سکتے ہیں جن کی نیت محض دینی خدمت ہے، طلب اموال نہیں ہے، اور اس کا معیار یہ ہے کہ اگر ایک جگہ تنخواہ میں توسط کے ساتھ گذر ہو رہا ہے اور دوسری جگہ سے زیادہ تنخواہ کا پیام آئے اور دوسری جگہ جانے میں کوئی دینی مصلحت زیادہ نہ ہو تو یہ شخص وہاں جانے سے انکار کر دے، بس یہ معیار ہے ورنہ بے شک وہ اجیر اور مزدور ہے، اور ایسے شخص کی تنخواہ کا تعین اس کو رزق کفایت ہونے سے نہ نکالے گا، بلکہ تعین کی مصلحت قطع تنازع اور جھگڑے کو ختم کرنا سمجھا جائے گا جس سے وہ اجرت نہ ہوگی۔

باب النفقات الروحانیۃ

نفقاتِ روحانیہ کا مفہوم :- نفقاتِ روحانیہ سے مراد دینی تعلیم و تربیت ہے، اوپر اہل و عیال کے حقوق متعلقہ انفاقِ رزقِ حسی (یعنی مادی رزق) کے بیان کیے گئے تھے، ایک قسم انفاق اور رزق کی معنوی بھی ہے، یعنی دینی تعلیم و تربیت کے متعلق جو اہل و عیال کے حقوق ہیں،

چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے :-

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔ (البقرۃ، آیت ۳)	(اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)،
كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ ۔ (البقرۃ: آیت ۲۵)	(جب کبھی دیے جائیں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا دار)

کی تفسیر البذل من النعم الظاهرة والباطنة کے ساتھ مع اس کی توجیہ علم لایقال به (ولا ینفق منه) کے اور مرزوق کی تفسیر الطاعات والمعارف التی یستلزمها اصحاب الفطرة والعقول السلیمة کے ساتھ کرنا (کما فی الروح) دلیل ہے اس کی کہ رزق عام ہے معنوی کو بھی اور انفاق عام ہے رزق معنوی کو بھی، تو ایک نوع کے نفقات و ارزاق کے بعد دوسری نوع کے نفقات و ارزاق کے احکام کا بیان کیا جانا اولیٰ و احریٰ ہے (بہتر اور مناسب ترین ہے)، اس لئے اب دینی تعلیم و تربیت کے متعلق جو اہل و عیال کے حقوق ہیں وہ مذکور ہوتے ہیں:-

بیوی اور اولاد کی روحانی تربیت جسمانی پرورش سے زیادہ ضروری ہے جاننا چاہیے کہ جس طرح نفقاتِ حسیہ (مادی اخراجات) سے بیوی اور اولاد و دیگر متعلقین کی جسمی تربیت ضروری ہے، جس کا اوپر بیان کیا گیا ہے، اسی طرح علوم و طرقِ اصلاح (علوم اور اصلاح کے طریقوں) سے ان کی روحی تربیت اس سے زیادہ ضروری ہے، اس میں بھی الانواع انواع (قسم قسم) کی کوتاہیاں اختیار کی جاتی ہیں،

دین کی بات بتلانا اور امر منکر پر روکنا اولاد و بیوی کے حقوق میں داخل ہے۔

چنانچہ سب سے اول اور اعظم کوتاہی تو یہ ہے کہ بہت لوگ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے یعنی اپنے گھر والوں کو نہ کبھی دین کی بات جتلاتے ہیں، نہ کسی امر منکر پر کہ بڑے کام ہیں ان پر روک ٹوک کرتے ہیں، بس ان کا حق اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ ان کو ضروریات کے لائق خرچ دیدیا اور سبکدوش ہو گئے حالانکہ قرآن مجید میں نص صریح ہے:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا

(اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ)۔

اور سنت میں حدیث ہے:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔

(تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور قیامت کے روز تم میں سے ہر ایک سے اس کے محکوموں کے بارے میں سوال ہوگا)۔

اس کے وجوب کو صاف بتلا رہے ہیں، نیز اس میں متعدد مرفوع حدیثیں ہیں:-

اخفهم في الله ولا ترفع عنهم عصاك۔ ورجل كانت عنده أمة يطأها فأدّبها فأحسن تأديبها وعلّمها فأحسن تعليمها۔ متفق عليه عن أبي موسى، كتاب الإيمان۔

(یعنی ان کو اللہ سے ڈراؤ اور ان سے تنبیہ ترک نہ کرو) یعنی ایک شخص جس کے پاس باندی ہے وہ اس سے وطی بھی کرتا ہے اور اسے اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے)۔

ومن عال ثلث بنات أو مثلهن من الأخوات فأدّبهن رواه في شرح السنة عن ابن عباسؓ۔

(جس نے تین بیٹیوں یا اسی طرح تین بہنوں کی پرورش کی اور انہیں ادب سکھایا)۔

لأن يؤدب الرجل ولده خير من أن يتصدق بصاع۔ ترمذی عن جابر بن سمرةؓ۔

(یعنی آدمی اپنے لڑکے کو ادب سکھائے، اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع صدقہ کرے)۔

ما نحل والد ولده من نحل أفضل من أدب حسن۔ ترمذی عن ایوب بن موسیٰ۔

(یعنی والد نے اپنی اولاد کو اچھے ادب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں دی)۔

مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعٍ وَإِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا فَاضْرِبُوْهُمْ

بچے لوگوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جائیں اور جب وہ دس برس کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو مارو نماز نہ پڑھنے پر۔

یہ سب نصوص دلالت کرتی ہیں تعلیم و تربیت دونوں کی مطلوبیت پر۔

لڑکیوں کو دینی تعلیم دلانا ضروری ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ لڑکوں کی تعلیم کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر بیٹیوں کی اور لڑکیوں کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ تعلیمِ نسواں کو مضر سمجھتے ہیں، جیسا کہ اس کے مقابلہ میں بعض لوگ نسواں (عورتوں) کے لئے تعلیمِ جدید[1] کو یا تعلیمِ قدیم کو بطرزِ جدید بھی ضروری سمجھتے ہیں، سو اس کی کافی بحث تعلیمِ نسواں کی تحقیق میں اسی رسالہ میں گزر چکی ہے[2]، ضرور ملاحظہ فرمائی جاوے، اس سے ان کوتاہیوں کا اور ان کے تدارک کا اچھی طرح علم ہو جاوے گا۔

تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی اہم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تعلیم کو تو سب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں مگر تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی اہم ہے، تعلیمِ درسی سے تو من کل الوجوہ (ہر اعتبار سے) اور مطلق تعلیم سے من وجہٍ (بعض وجوہ سے)، تعلیمِ درسی سے تو اس لئے کہ وہ فرضِ عین نہیں، بہت صحابہ علومِ درسیہ سے خالی تھے مگر ان پر کبھی اس کو لازم نہیں کیا گیا، اور تربیت یعنی تہذیبِ نفس ہر شخص پر فرضِ عین ہے، اور مطلق تعلیم سے اس لئے کہ مقصود تعلیم سے تربیت ہی ہوتی ہے، کیونکہ تعلیم علم دیتی ہے، اور تربیت عمل کراتی اور علم سے مقصود عمل ہی ہے، اور مقصود کا اہم ہونا ظاہر ہے، اور اس سے اعمالِ جوارح (انسانی اعضاء سے متعلق اعمالِ صالحہ) کا عقائد سے اہم ہونے کا اشکال لازم نہیں آتا، کیونکہ عقائد تو خود علوم مقصود بالذات ہیں، اور گفتگو ان علوم میں ہے جو عمل کے لئے مقصود ہیں، اور من وجہٍ (ایک طرح) اس لئے کہا گیا کہ بعض حیثیتوں سے یہ علوم افضل ہیں اعمال سے کہ علم اصل اور مدار ہے اور عمل اس کی

---

[1] جس کا مہلک ہونا ظاہر ہے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن ✱ اسی علم کو کہتے ہیں اربابِ نظر موت

[2] ملاحظہ ہو اصلاحِ معاشرہ متعلقہ بہ تعلیمِ نسواں اس عبارت تک "یہی فیصلہ ہے عقلاء کے اختلاف کا" اصلاحِ انقلابِ امت جلد اول ص ، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی [illegible]۔

فرع اور اس پر مبنی۔ بہرحال تربیت یا تعلیم سے اہم ہے یا سب کے برابر ہم بھی ہی، مگر اس سے قطع نظر کرنے کی اور ضروری نہ سمجھنے کی تو کسی حال میں گنجائش نہیں۔

تربیت آجکل کی تہذیب کا نام نہیں۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تربیت کو بمعنی تہذیب سمجھتے ہیں مگر اس کی حقیقت تہذیب عرفی سمجھتے ہیں، چنانچہ اسی کا اہتمام بھی کرتے ہیں گو وہ شریعت مقدسہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ میں نے ایک معزز تعلیم یافتہ کا جو کہ طبیب بھی تھے بچشم خود یہ واقعہ دیکھا کہ ان کی گود میں ایک بچہ تھا، ایک صاحب ان سے ملنے آئے تو انہوں نے اس بچے کو حکم دیا کہ ان کو سلام کرو، یہاں تک تو نہایت خوبی کی بات تھی، اس بچے نے کہا السلام علیکم، تو حکیم صاحب کیا فرماتے ہیں کہ یوں نہیں کہتے اس طرح کہو آداب عرض، وہ ملاقاتی صاحب بڑے آدمی تھے بہت بگڑے، اور کہا افسوس، بچہ تو سنت کے موافق عمل کرے اور آپ اس کو بدعت کی تعلیم دیں۔ تو وجہ اس کی یہی ہے کہ تہذیب شرعی ان کی نظر میں کوئی چیز نہیں حالانکہ مسلمان کو جس تہذیب کا امر ہے وہ تہذیب شرعی ہے۔

آجکل کی تہذیب کو تعذیب کہنا بجا ہے

بلکہ دونوں تہذیبوں کی حقیقت اور ان کے آثار میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب عرفی جو کہ تہذیب شرعی کے منافی ہو اس قابل ہی نہیں کہ اس کو تہذیب کہا جاسکے، بلکہ احقر تو اس کو تعذیب (عذاب) کہا کرتا ہے کیونکہ حقیقت اس کی تکلف ہے، اور تکلف سے جو کلفتیں ہوتی ہیں وہ ظاہر ہیں، بلکہ تکلف کو تکلف کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس میں کلفتوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے، امراء کی مجالس میں اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔

حقیقی تہذیب، تہذیب شرعی کا نام ہے۔

حقیقی تہذیب، تہذیب شرعی ہی ہے، چنانچہ متبعین سنت جو اس تہذیب کے عامل ہیں وہ جس راحت میں ہیں اس کا مشاہدہ محققین علماء و مشائخ کی مجالس میں کر لیا جائے، اور آخری بات یہ ہے کہ اگر تہذیب غیر شرعی میں کلفت بھی نہ ہو اور تہذیب شرعی میں راحت بھی نہ ہو تب بھی جب مسلمان کے لئے ایک منہی عنہ (ممنوع) ہے اور دوسری مامور بہ (جس کا حکم دیا گیا ہے) تو مسلمان پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک کا ترک دوسرے کا فعل لازم ہوگا، جیسے اگر نماز کے لئے اٹھنے میں مشقت ہو اور گرم بستر میں لیٹے رہنے سے راحت ہو، مگر اس مشقت کو اس راحت پر ترجیح ہوگی، پھر اس کا بھی مشاہدہ بلکہ آنکھوں سے ہر عامل کرے گا کہ یہ مشقت اور یہ راحت چند روزہ ہی ہے پھر تو ایسا ذوق صحیح عطا ہوگا کہ موافقت شرع کے بغیر کسی چیز میں حتیٰ کہ لذیذ نعمتوں میں بھی لطف نہ ملے گا۔ مولانا رومی کی نصیحت ہے: چند روزے جہد کن باقی بخند۔ یعنی چند روز کوشش کرکے بقیہ ایام ہنستا رہ یعنی عیش کر۔

غرض تربیت جس کو تہذیب شرعی کا نام ہے اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

تہذیب شرعی کے اہتمام میں عملی کوتاہیاں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ ضرورت بھی اس تہذیب شرعی کی سمجھتے ہیں اور اس کا قصد بھی کرتے ہیں، مگر اس کی حقیقت نہیں سمجھتے، اس لئے اس میں علماً و عملاً افراط و تفریط کرتے ہیں، اور اس اخیر کوتاہی میں دیندار بکثرت مبتلا ہیں، ان میں بعضے اہل علم بھی بلکہ بعض اہل طریقت بھی ہیں کہ بہت سے شعبے ان کے ذہن میں بھی نہیں آتے، اور اس وجہ سے خود ان سے ایسی حرکات صادر ہوتی ہیں جو سراسر عقل اور دین کے خلاف ہوتی ہیں اور ان بزرگوں کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا، جب خود یہ حالت ہو تو دوسروں کی تو کیا اصلاح کریں گے؟ اور وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کو تہذیب حقیقی کی حقیقت نہیں معلوم ہوئی، اور باوجود اس کے کہ ان میں سے بعض نے ریاضات بھی پوری کرلی ہیں اور بعضے خدمت تدریس پر بھی مامور ہیں، اور شب و روز قرآن و حدیث زبان پر جاری ہیں، پھر بھی یہ بے خبری ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن و حدیث میں اس کی تعلیم نہیں، بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان صاحبوں کو اس طرف التفات نہیں، قرآن مجید میں

أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۔ | (نماز کی پابندی کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو)

کو دیکھتے ہیں مگر

لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۔ (المدثر آیت ۶) | (اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ دوسرے وقت زیادہ معاوضہ چاہو)

کو نہیں دیکھتے،

لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلٰى أَهْلِهَا ۔ (النور آیت ۲۷) | (تم اپنے خاص رہنے کے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جب تک (ان سے) اجازت حاصل نہ کر لو اور اجازت لینے کے قبل ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کر لو)

کے عموم پر نظر نہیں کرتے، مجھ کو خود ایک ذی علم کے ساتھ اس باب میں مکافات (گفتگو) کا اتفاق ہوا، جو شب کے وقت میرے مردانہ مکان کے پھاٹک پر پہنچے، وقت ایسا تھا کہ سب سو گئے تھے اور وہاں کوئی آشنا سا بھی نہ تھا، آواز دی، ملازم جاگا، اور پوچھا، پھاٹک کھولنے کا حکم دیا کہ ہم ٹھہریں گے، اس کو بوجہ بے وقت ہو جانے کے اور ان کو نہ پہچاننے کے بے اطمینانی ہوئی اس لئے

اس نے ادب کے ساتھ کچھ عذر بھی کیا، مگر جب تاکیدی حکم ملا تو اس نے مروت کے سبب پھاٹک کھول دیا، اور وہ دیوان خانہ میں آکر مقیم ہو گئے، صبح کو مجھ کو واقعہ معلوم ہوا، میں نے اُن سے یہ آیت پڑھ کر بلا اذن (بغیر اجازت) ٹھیرنے کی وجہ پوچھی، انھوں نے فرمایا یہ آیت خاص زنانخانہ کے متعلق ہے، میں نے اس تخصیص کی دلیل پوچھی، جواب ندارد۔

اسی طرح ان آیتوں پر اُن کی نظر نہیں پڑتی،

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا (النساء، آیت ۴)	ترجمہ: اگر وہ بیبیاں خوشدلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا کوئی جزو تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار خوشگوار سمجھ کر۔
وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ، (البقرۃ، آیت ۲۳۷)	اور تمہارا معاف کرنا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

کہ حق تعالیٰ نے مہر کی معافی کی صحت کے لئے طیب نفس کی شرط لگائی، اور پھر اقرب الی التقویٰ عالی ہمتی کو فرمایا کہ بجائے ان سے معاف کرانے کے اُن کے حق سے زائد ان کو دیدو،

لوگوں کو مجبور کر کے چندہ وصول کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ اس لغزش پڑنے کا ثمرہ یہ ہو کہ ایسے لوگوں سے جن کے ساتھ بیوی کی جیسی بے تکلفی بھی نہیں یہ لوگ مسجد یا مدارس کے لئے خطاب خاص کر کے چندہ کا سوال کرتے ہیں، اور بوجہ بے تکلفی نہ ہونے کے وہ لوگ اُن کی وجاہت دنیویہ یا دینیہ سے مرعوب اور مغلوب ہو کر آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر نہیں کر سکتے، اور کراہت کے ساتھ اس سوال کو پورا کرتے ہیں، موٹی بات یہ ہے کہ بی بی جس سے نہایت درجہ بے تکلفی ہے اور جہاں غالب طیب خاطر ہے جب اس سے معافی قبول کرنے میں طیب خاطر کو شرط قرار دیا گیا ہے جو تکلف کے موقع پر جہاں ایسا تعلق بھی نہیں اس طیب خاطر کا اہتمام بلیغ کیوں نہ شرط ہوگا، چنانچہ ایک حدیث میں اس کی نہایت درجہ کی تصریح فرمائی ہے

أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ،	ترجمہ: خبردار کسی مسلمان کا مال بدون اس کی طیب خاطر کے حلال نہیں (۳)

جو عالی ہمتی و عالی حوصلگی وغیرہ بقاء عزت دین کا مقتضا تو یہ تھا کہ اس باب میں بالکل ہی یکسوئی اختیار کرتے اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنت پر رہتے جیسے قالوا لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا، یعنی تم سے اس پر مال کا سوال نہیں کرتا، نظر نہ ہونے نے اس عالی آفت میں مبتلا کیا،

اباحت تصرف میں کوتاہ نظری اباحت تصرف مال کی مثال کے متعلق کوتاہ نظری کے شعبوں میں سے ایک اور واقعہ ہے کہ میرے یہاں ایک مولانا مہمان آئے، گھر سے ان کے لئے کھانا آیا تو آپ نے ایک دوست ہم وطن کو اصرار کر کے کھانے میں شریک کر لیا، میرے ملازم نے کہا کہ بلا اجازت مالک کے یہ تصرف جائز نہیں معلوم ہوتا، فرمانے لگے ہم تحقیق کر لیں گے، مگر ان کے نزدیک یہ امر اتنا مہتم بالشان ہی نہ تھا جو تحقیق کو ضروری سمجھتے، چنانچہ تحقیق نہیں فرمایا، اسی طرح کئی روز گذر گئے، آخر میں نے ہی ایک روز ان سے تذکرہ کیا تو فرماتے ہیں میں نے یہ سمجھا کہ یہ سب میرے ہی لئے ہے، اور تھا زیادہ، میں نے دوست کو شریک کر لیا، مجھ کو نہایت حیرت ہے، آپ کے پاس اس کی کیا دلیل تھی کہ یہ تملیکاً آیا ہے؟ بلکہ ظاہر تو یہی تھا کہ اباحۃً آیا ہے، اور وہ اباحت مقید ہے تصرف خاص کے ساتھ کہ وہ آپ کا نوش فرمانا ہے، اور زیادہ اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ مہمان کو کمی نہ ہو، اور شاید وہ دوبارہ مانگتا ہو اس شرم سے تو آپ نے یہ دوسرا تصرف کس بناء پر کیا؟

ترتیب اخلاق کی نظر سے قرآن و حدیث نہ دیکھنے والے علماء کی چند کوتاہیاں غرض ان باتوں کی پرواہ ہی نہیں، سب کی وجہ یہی ہے کہ ترتیب اخلاق کی نظر سے قرآن و حدیث کو نہیں دیکھا۔ اسی طرح بعض اہل علم و اہل مشیخت میں ایک بلائے عام شائع ہے، یعنی دو ایک کو اپنے ساتھ دعوت میں دو چار کو اور اگر بڑے محتاط ہوئے، تو بڑے مجمع کو اگر غیر محتاط ہوئے، لے جاتے ہیں، اور پہلے ہی سے سمجھ لیتے ہیں کہ صاحب دعوت کی اجازت ہو ہی گی، حالانکہ بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے کہ صاحب دعوت کو گراں گزرتا ہے، مگر ان کو کچھ بحث نہیں، ان میں بعضے اجازت کی ضرورت بھی سمجھتے ہیں مگر خود اجازت کی حقیقت نہیں سمجھتے، اجازت لینا وہ ہے جہاں اجازت دینے والا آزادی سے انکار بھی کر سکے، جس طرح حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر دعوت میں ایک زائد شخص کی اجازت لی، مگر اس کے ساتھ ہی یہ حالت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثار خادموں کو اس قدر بے تکلف کر رکھا تھا کہ جب ان کی رائے نہ ہوتی تو صاف انکار بھی کر دیتے، چنانچہ ایک فارسی کا شوربا پکانا اور آپ کی دعوت کرنا اور آپ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے پوچھنا اور اس کا انکار کر دینا، اور آپ کا برا نہ ماننا اور اسی طرح حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے مغیثؓ کی سفارش فرمانا اور اس کا انکار کر دینا حدیثوں میں مصرح ہے، کیا آج کسی مرید کی ہمت ہے کہ وہ اس طرح پیر کی اجازت لینے پر انکار کر سکے، یا کسی پیر کی ہمت ہے کہ مرید کے ایسے انکار کو بشاشت کے ساتھ قبول کر لے، حضرت قیامت قائم ہو جائے، تو ایسی اجازت کا نہ لینا معتبر نہ دینا معتبر، سو ان صاحبوں کو اجازت کی حقیقت سے ہی

آگاہی نہیں، غرض یہ وہ جماعت ہے کہ ضرورت تو تہذیب شرعی کی سمجھتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں، یہ مختصر نمونہ ہے تعلیم و تربیت کے متعلق کوتاہیوں کا، اور ضرورت دونوں امر کی عام ہوگئی۔

تعلیم و تربیت کا اثر ابتداء ہی میں مستحکم ہو سکتا ہے۔

اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ ابتداء ہی سے جو تعلیم و تربیت ہو اسی کا جو اثر ہوتا ہے کہ علوم و اعمال مثل امور نظریہ و طبعیہ کے ہو جاتے ہیں، وہ بات بعد میں نہیں ہوتی۔ اور یہ کام ماں باپ اور مربی بچوں کا ہے، اور وہ عموماً اس میں کوتاہی کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب عقلیں اور بداخلاقیاں طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں، پھر بعد میں جو شخص اس کا اہتمام کرنا چاہے، مثلاً عورت کے لئے شوہر اور مردوں کے لئے استاد و پیر ان کو سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے، اور بعض ناگواری درجۂ منافرت تک پہنچ جاتی ہے، رو دیگر مصلحین سے تو یہ منافرت صرف مباعدت (دوری) کی صورت پیدا کر لیتی ہے،

عورتوں کی اصلاح کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے!!

مگر زوجین کا تعلق ایسا ہے کہ ہر وقت کا سابقہ رہتا ہے، اور مرد اپنی مصلحتوں سے قطع تعلق کو پسند نہیں کرتا، اور نہ عورت کی ہٹ ملتون کی برداشت کرتا ہے تو یہاں ہمیشہ کے لئے منازعت و مناقشت (لڑائی جھگڑے) کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے، جس کے نتائج جانبین کے حق میں برے برے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور دونوں کی زندگی تلخ سے تلخ تر ہو جاتی ہے، اور ان سب کا سبب اکثر وہی ابتداء میں اصلاح کی طرف توجہ نہ کرنا ہے، لیکن اگر ایسا اتفاق ہو گیا تو یہی نہیں کہ ان لوگوں کو مہمل چھوڑ دیا جائے بلکہ جب قدرت ہو تب بھی اس کی سعی کرنا ضروری ہے؛

تہذیب شرعی پر عمل درآمد کا طریقہ

اور قدرت دو قسم کی ہے، اول دینی اور قہری، سو ارادی تو پیر او راستاد کی ہے، اور قہری حاکم کی ہے خواہ بحکومت عامہ ہو جیسے سلطان و نائب سلطان، خواہ بحکومت خاصہ جیسے عورت کے لئے شوہر یا غلام کے لئے آقا، سو مردوں کے لئے تو تہذیب شرعی کے لئے حکومت قہریہ کے اسباب بہت کم مجتمع ہوتے ہیں، کیونکہ سلاطین کو تو اس طرف توجہ ہی نہیں، اور غلام کسی کے ہیں نہیں، اب رہ گئی حکومت ارادیہ سو اس کے اثر سے نکل جانا ہر وقت ان کے اختیار میں ہے، اس لئے مردوں کی اصلاح کے اسباب بے شک ضعیف ہیں، البتہ عورتوں کے لئے عادۃً شوہر کا ہونا لازم ہے، اور گو کبھی اس کی مدت قصیر (کم) بھی ہوتی ہے مگر اکثر طویل ہی ہوتی ہے، سو عورتوں کی اصلاح کا طریق بہت سہل ہے،

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ماں باپ یا پرورش کنندہ کے ذمہ بچوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہوئی

اور شوہر کے ذمہ بیبیوں کی اصلاح، اسی مضمون کو بیان کرنا مقصود ہے، باقی جس کو جس پر قدرت ہو اور جس قسم کی ہو وہ اسی پر قیاس کر لی جائے۔ ممکن ہے کہ استطراداً اس کے بھی کچھ مضامین مذکور ہو جائیں پس سنئے:

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مختصر اور ضروری قواعد

تعلیم و تربیت کے مختصر اور ضروری قواعد مختصر طور پر لکھے جاتے ہیں۔

(۱) جب گھر میں بیبی کو نکاح کر کے لائے اوّل اس کو اپنے سے بے تکلف کرے، اس کے بعد عقائد ضروریہ میں سے اس کا امتحان لے، یعنی بہشتی زیور کے اوّل حصہ میں جو عقائد ضروریہ لکھے ہیں ان کو سنا کر اور سمجھا کر اس سے پوچھے کہ کیا تیرا یہی عقیدہ ہے، جس کا وہ اقرار کرے اس اقرار پر اکتفا کرے، اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی زبان سے پوری تقریر کر سکے، بعض عوام اس پر قادر نہیں ہوتے تو ایسے لوگوں کو اس کی تکلیف نہ دی جائے اور جس میں وہ تردد و شک ظاہر کرے اس کو خوب سمجھا کر بتلا دے کہ یہ عقیدہ ضروری ہے، اسی کے موافق اپنا اعتقاد رکھے۔

(۲) اس کی پوری نماز سن لے یعنی جو کچھ نماز میں پڑھا جاتا ہے وہ بھی اور رکعات کی تعداد فرض اور واجب اور سنتوں کے، اور ہر ایک کی جس طرح نیت کی جاتی ہے، اور رکوع و سجود و قعود کی ہیئت سب پوچھ لے، اور پڑھوا کر دیکھ لے، جہاں کوئی غلطی ہو اس کو درست کر دے، اور درست کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ بس ایک دفعہ زبان سے کہہ دیا، ممکن ہے کہ وہ بھول (بھول) جائے، اور ممکن ہے کہ بہت سی غلطیوں پر ایک دم سے متنبہ کیا، وہ سب کو ضبط نہ کر سکی۔ اس لئے ایک ایک غلطی کی اصلاح کر کے اس پر بار بار عمل کرا کر دیکھ لے، اس طرح سے تمام نماز کو درست کر دے۔

(۳) اس کو پردہ کے سب احکام و مسائل بتلا دے کہ کس کس سے پردہ کرنا ضروری ہے، اور کون کون محرم ہیں، اور اس کی بہت تاکید کر دے، یہ سب مسائل بہشتی زیور میں ملیں گے، ان کو دیکھ دیکھ کر بتلا دے۔

(۴) اس کو اہل حقوق کے حقوق خصوص جن سے ہر وقت سابقہ و واسطہ پڑے گا بتلا دے، رسالہ حقوق الاسلام میں یہ حقوق مذکور ہیں، خواہ اس کو پڑھ کر سنا دے یا سمجھا دے۔

(۵) رسوم جاہلیت کی قباحت اس کے دل میں بٹھلا دے، اور ان سے ایسی نفرت دلا دے کہ وہ ان کے پاس نہ پھٹکے، اصلاح الرسوم اس کے لئے کافی ہے، نیز اس کے دیگر اعمال و اخلاق و عادات کی اصلاح کی بھی کوشش جاری رکھے، جس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ کتب ذیل اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے سنا دے۔

بہشتی زیور تمام، فروع الایمان، جزاء الاعمال، تسہیل قصد السبیل، تعلیم الدین، اصلاح الرسوم، تبلیغ دین، آداب المعاشرت، احقر کے مواعظ[1] جو کہ تخمیناً سو کی تعداد سے کچھ کم و بیش چھپ چکے ہیں، یہ رسالہ اصلاح انقلاب ...... جتنا چھپ جاوے، ترجمہ روح الریاحین اگر چھپ جاوے۔ اور جو کوئی حرکت ان کتابوں کے خلاف ہو نرمی سے مطلع کرے۔ اور بار بار مطلع کرنے سے اکتاوے نہیں، ان شاء اللہ ضرور اثر اور نفع ہوگا،

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الذاریات آیت ۵۵)	(اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا ایمان والوں کو (بھی) نفع دے گا)

(۶) خرچ کرنے کے آداب اس کو سمجھا دے کہ فضولیات میں خرچ نہ کرے،

(۷) زیور اور زینت کی زیادہ .... اہتمام کرنے سے اس کو نفرت دلاتے،

(۸) تھوڑا سا ذکر و شغل اس کو قصد السبیل سے بتا دے، اگر کوئی شیخ متبع سنت محقق میسر ہو اس کی برکات و کمالات اس کے سامنے بیان کر کے جب اس کو اعتقاد ہو جاوے اس کو بیعت کرا دے کہ اس کو اتباع کی سہولت میں دخل عظیم ہے،

(۹) اگر تھوڑا وقت فرصت کا نکال کر کچھ لکھ پڑھ لے اس قدر کہ کتب مذکورہ کو پڑھ کر سمجھ سکے تو زیادہ بہتر ہے، اس سے اس کی نظر دین پر وسیع ہو جاتی ہے، اور جس قدر نظر وسیع ہوگی اسی قدر اصلاح میں ترقی کی امید ہے،

بچوں کی تربیت کا طریقہ

(۱۰) پھر خدا تعالیٰ جب اولاد دے اور وہ سیانی ہونے لگے تو سب سے اول اس کو کلمۂ توحید سکھلا دے، پھر اس کو ضروری آداب کی تعلیم کرے،

(۱۱) جب سامنے آوے سلام کرے،

(۱۲) کسی کے پاس کوئی چیز دیکھے تو حرص نہ کرے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی وسعت و حیثیت کے موافق اس کی مرغوب (پسندیدہ) چیزیں خود منگا کر اس کو کھلاتا پلاتا رہے، اور جب وہ ضد کرے ہرگز اس کی ضد پوری نہ کرے، تا کہ ضد کرنے کی عادت چھوٹ جاوے،

(۱۳) اس کو یہ عادت ڈالے کہ کوئی چیز تنہا نہ کھاوے، بلکہ دوسرے بچوں کو تقسیم کر کے کھاوے اور اس کے لئے یہ رعایت رکھنا ضروری ہے کہ جو چیز اس کو دے خواہ نقد یا غیر نقد اس کی ملک نہ کرے

---

[1] حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز کے مواعظ کا مطالعہ اصلاح نفس کے لئے تریاق کا حکم رکھتا ہے ان کی تعداد ۴۰۰ کے قریب ہے ۱۲

کیونکہ ملک ہو جانے کے بعد نابالغ کو تبرع کرنا جائز نہیں، بلکہ اباحت کے طور پر بھی نہ دے کہ دوسروں کو دینا اور ان سے دوسروں کو لینا جائز ہو۔

(۱۴) جھوٹ بولنے سے اس کو نفرت دلاتے۔

(۱۵) پردہ اور حیا کی اس کو تعلیم کرے۔

(۱۶) اس کو یہ عادت ڈالے کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا اقرار کر لیا کرے، اور اگر وہ غلطی متعدی ہو تو صاحبِ حق سے معاف کرا لیا کرے۔ اس کی عادت ڈالنا بہت ضروری ہے کہ اس میں اس کے دین کی سلامتی اور دنیا میں موجبِ عزت و راحت ہے، اور اس میں اپنی پچ کرنا تکبر اور ہمیشہ کے لئے موجبِ نفرت و ذلت ہے۔

(۱۷) اس کو بھی عادت ڈالے کہ سخن پروری کبھی نہ کرے، حق واضح ہو جانے کے بعد گو اپنے سے کم درجہ کا آدمی اس پر مطلع کرے فوراً اس کا اتباع کرے، اور ہر امر میں اس کو تواضع اور خاکساری کی عادت ڈالے۔

(۱۸) لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک جگہ نہ کھیلنے دے، اگر وہ نامحرم ہیں تو تمتع کے مفاسد کا اس میں احتمال ہے، اور اگر وہ محرم ہیں تو لڑکیوں میں قلتِ حیا پیدا ہونے کا اور لڑکوں میں نفس پر عقل کا احتمال ہے۔

(۱۹) اس کی عادت ڈالے کہ وہ چھپ کر کوئی کام نہ کریں، چھپ کر بچہ اسی کام کو کرے گا جس کو برا سمجھے گا، تو گویا ابتداء ہی سے وہ برا کام کرنے کا خوگر و عادی ہو جائے گا۔

(۲۰) خود بھی بچوں کے سامنے کوئی نامناسب کام یا بے حیائی کا کام نہ کرے، گو بچہ اتنا چھوٹا ہو کہ بول بھی نہ سکتا ہو کیونکہ اس فعل کا عکس اس کے دماغ میں مرتسم و منقوش یعنی نقش ہو جاتا ہے، پھر اس کا اثر بڑے ہو جانے کے بعد ظاہر ہوگا۔

(۲۱) غبی اور دل تنگی کی علامت اس میں نہ پیدا ہونے دے کہ اس سے مادہ بے باکی کا پیدا ہوگا، کیونکہ محض بے عقل کی سمجھ کو تمیز نہیں ہوگی۔

(۲۲) اس کا اہتمام رکھیں کہ سیانے بچوں میں دوستی نہ پیدا ہونے پائے کہ اس کے مفاسد بے شمار ہیں، اور اگر ان کو باہم کھیلنے میں کوئی مصلحت ہو تو اس کھیل کے وقت خود حاضر رہیں، بعد میں اختلاط و میل جول نہ ہونے دے۔

(۲۳) سیانے لڑکوں کو علمائے محققین اور مشائخ محققین کی مجالس میں اپنے ساتھ لے جایا کریں۔

کہ ان حضرات کی صحبت و توجہ موجب برکات و تقویت علی الدین و الطاعات ہے۔

(۲۴) جب بچہ سیانا ہو جائے اس کو نماز کی سورتیں اور دعائیں زبانی یاد کرائے اور نماز پڑھنا اور لڑکی ہو تو اس کو پردہ میں بٹھلائے۔

(۲۵) اور جب پڑھنے کا تحمل ہو تو اس کو کسی ایسے مکتب میں جس کا معلم شفیق اور دیندار ہو پڑھنے بٹھلائے اور لڑکی ہو تو زنانہ مکتب میں بٹھلائے مگر آجکل جو زنانہ اسکول ایجاد ہوتے ہیں ان کی آب و ہوا اچھی نہیں ان سے بچائے۔

(۲۶) سب سے اول قرآن شریف پڑھوائے اگر دماغ متحمل ہو تو حفظ کرانا افضل ہے ورنہ ناظرہ ہی سہی مگر صحیح خواں (صحیح پڑھانے والے) سے پڑھوائے۔

(۲۷) اگر قرآن حفظ کرائے تو بعد ختم قرآن اور اگر ناظرہ پڑھوائے تو بعد نصف قرآن ایک سبق ان کتابوں کا شروع کرائے جو تبصرہ میں مذکور ہوئیں۔

(۲۸) اور خواہ ان سبقوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت نکال کر یا ان کتابوں کے بعد بقدر ضرورت کچھ حساب اور املاء و انشاء کی مشق بھی ضرور کرا دی جائے کہ ان چیزوں سے دنیا میں بھی مدد پہنچتی ہے لڑکیوں کے لئے لکھنے نہ لکھنے کے مناسب یا نامناسب کی تحقیق اسی رسالہ کے بحث تعلیم نسواں میں گزر چکی ہے۔

(۲۹) ان کتابوں کے بعد اگر اللہ تعالیٰ فراغ دے تو عربی کی تعلیم بھی کرا دے کہ اس زمانے میں اس کی بڑی سخت ضرورت ہے، ورنہ کوئی حلال اور طیب حرفہ کسب معاش کے لئے سکھلا دے کہ پریشانی سے ہمیشہ محفوظ رہے، بلکہ اگر علوم عربیہ کے ساتھ کوئی پیشہ مناسب حال طلبہ سکھلا دیا جائے تو علم دین کو ذریعہ معاش بنانے سے وہ بچ سکتے ہیں۔

(۳۰) اہل و عیال کی اصلاح و تادیب میں مضامین ذیل سے بہت اعانت ملے گی، ضرور مطالعہ کرکے اس کے موافق عمل کریں۔

رسالہ ہذا کی سرخی طریق اصلاح انقلاب طالبان احکام کے دستور العمل کے ختم تک۔

رسالہ ہذا کی سرخی سوم رابع انقلاب امر پنجم کے ختم تک۔

حصہ دہم بہشتی زیور اول سے ہنر اور پیشے کے بیان تک۔

رسالہ القاسم جلد دوم میں مضمون تربیۃ الاطفال جو اب تک حسب بیان مہتمم رسالہ ان پرچوں میں شائع ہوا ہے جلد اول کے سب باستثناء ۱۰، جلد دوم کے نمبر ۱، ۵، ۶، ۹، جلد سوم کے نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۰، جلد چہارم

کتاب نمبر ۳ یہاں تک مضمون لکھنے کے بعد یاد آیا کہ بہشتی زیور کے چھٹے حصہ میں بذیل سرخی "اولاد کی پرورش کرنے کا طریقہ" اس کے متعلق کچھ ضروری دستور العمل ہے، دیکھنے سے اس مقام پر اس کا بعینہ نقل کر دینا مناسب معلوم ہوا گو اس میں بعض مضامین کا تکرار بھی ہے، مگر اس کے مہتم بالشان ہونے کے سبب تکرار کو گوارا کر کے اس میں تصرف گوارا نہیں کیا گیا، وہو ہذا۔

اولاد کے پرورش کرنے کا طریقہ جاننا چاہئے کہ یہ امر بہت ہی خیال رکھنے کے قابل ہے، کیونکہ بچپن میں جو عادت بھلی یا بری پختہ ہو جاتی ہے وہ عمر بھر نہیں جاتی اس لئے بچپن سے جوان ہونے تک ان باتوں کا ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) نیک بخت دیندار عورت کا دودھ پلائیں، دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

(۲) عورتوں کی عادت ہے کہ بچے کو کہیں سپاہی سے ڈراتی ہیں کہیں اور ڈراؤنی چیزوں سے یہ بری بات ہے، اس سے بچہ کا دل بودا کمزور ہو جاتا ہے۔

(۳) اس کے دودھ پلانے کے لئے اور کھلانے کے لئے وقت مقرر رکھو کہ وہ تندرست رہے۔

(۴) اس کو صاف ستھرا رکھو کہ اس سے تندرستی رہتی ہے۔

(۵) اس کا بہت سا بناؤ سنگار مت کرو۔

(۶) اگر لڑکا ہو اس کے سر پر بال مت بڑھاؤ۔

(۷) اگر لڑکی ہے اس کو جب تک پردہ میں بیٹھنے کے لائق نہ ہو جائے زیور مت پہناؤ، اس سے ایک تو ان کی جان کا خطرہ ہے، دوسرے بچپن ہی سے زیور کا شوق دل میں پیدا ہونا اچھا نہیں۔

(۸) بچوں کے ہاتھ سے غریبوں کو کھانا کپڑا پیسہ اور ایسی چیزیں دلوایا کرو، اسی طرح کھانے پینے کی چیزیں ان کے بھائی بہنوں کو یا اور بچوں کو تقسیم کرایا کرو تاکہ ان کو سخاوت کی عادت ہو مگر یہ یاد رکھو کہ تم اپنی چیزیں اس کے ہاتھ دلوایا کرو خود جو چیز خرچ ہے اسی کی ہو اس کا دینا کسی کو درست نہیں۔

(۹) زیادہ کھانے والوں کی برائی اس کے سامنے کیا کرو مگر کسی کا نام لے کر نہیں، بلکہ اس طرح کہ جو کوئی بہت کھاتا ہے لوگ اس کو حبشی کہتے ہیں، اس کو بیل جانتے ہیں۔

(۱۰) اگر لڑکا ہو سفید کپڑے کی رغبت اس کے دل میں پیدا کرو، اور رنگین اور تکلف کے لباس سے اس کو نفرت دلاؤ کہ ایسے کپڑے لڑکیاں پہنتی ہیں، تم ماشاء اللہ مرد ہو، ہمیشہ اس کے سامنے ایسی باتیں کیا کرو۔

(۱۱) اگر لڑکی ہو جب بھی زیادہ مانگ چوٹی بہت بناؤ کے کپڑوں کی اس کی عادت مت ڈالو

(۱۲) اس کی سب ضدیں پوری مت کرو کہ اس سے مزاج بگڑ جاتا ہے،

(۱۳) چلا کر بولنے سے روکو خاص کر اگر لڑکی ہو تو چلانے پر خوب ڈانٹو، ورنہ بڑی ہو کر وہی عادت ہو جائے گی،

(۱۴) جن بچوں کی عادتیں خراب ہیں یا پڑھنے لکھنے سے بھاگتے ہیں یا تکلف کے کپڑے یا کھانے کے عادی ہیں اُن کے پاس بیٹھنے سے، اُن کے پاس کھیلنے سے اُن کو بچاؤ،

(۱۵) ان باتوں سے اُن کو نفرت دلاتی رہو، غصہ، جھوٹ بولنا، کسی کو دیکھ کر جلنا، یا حرص کرنا، چوری، چغلی، اپنی بات کی پچ کرنا، خواہ مخواہ اس کو بنانا، بے فائدہ بہت باتیں کرنا، بے بات ہنسنا، یا زیادہ ہنسنا، دھوکہ دینا، بھلی بری بات کا نہ سوچنا، اور جب ان باتوں میں کوئی بات ہو جائے فوراً اس کو روکو، اس پر متنبہ کرو،

(۱۶) اگر کوئی چیز توڑ پھوڑ دے یا کسی کو مار بیٹھے، مناسب سزا دو تاکہ پھر ایسا نہ کرے، ایسی باتوں میں پیار دلاڈ ہمیشہ بچوں کو کھو دیتا ہے،

(۱۷) بہت سویرے مت سونے دو،

(۱۸) سویرے جاگنے کی عادت ڈالو،

(۱۹) جب سات برس کی عمر ہو جائے نماز کی عادت ڈالو،

(۲۰) جب مکتب میں جانے کے قابل ہو جائے اول قرآن مجید پڑھواؤ،

(۲۱) مکتب میں جانے میں کبھی رعایت مت کرو،

(۲۲) جہاں تک ہو سکے دیندار استاد سے پڑھواؤ،

(۲۳) کسی کسی وقت اُن کو نیک لوگوں کی حکایتیں سنایا کرو،

(۲۴) ان کو ایسی کتابیں مت دو جن میں عاشقی معشوقی کی باتیں یا شریعت کے خلاف مضمون یا اور بیہودہ قصے یا غزلیں وغیرہ ہوں،

(۲۵) ایسی کتابیں پڑھواؤ جس میں دین کی باتیں اور دنیا کی ضروری کارروائی آجائے،

(۲۶) مکتب سے آنے کے بعد کسی قدر دل بہلانے کے لئے اس کو کھیلنے کی اجازت دو تاکہ اس کی طبیعت کُند نہ ہو جائے، لیکن کھیل ایسا ہو جس میں کوئی گناہ نہ ہو، چوٹ لگنے کا اندیشہ نہ ہو،

(۲۷) آتشبازی یا باجہ یا فضول چیزیں مول لینے کے لئے پیسے مت دو،

(۲۸) کھیل تماشے دکھلانے کی عادت مت ڈالو۔

(۲۹) اولاد کو ضرور کوئی ایسا ہنر سکھلا دو جس سے ضرورت اور مصیبت کے وقت چار پیسے حاصل کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا گذارہ کر سکے۔

(۳۰) لڑکیوں کو اتنا لکھنا سکھلا دو کہ ضروری خط اور گھر کا حساب کتاب لکھ سکیں۔

(۳۱) بچوں کو عادت ڈالو کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کیا کریں، اپاہج اور سست نہ ہو جائیں، ان کو کہو کہ رات کا بچھونا اپنے ہاتھ سے بچھائیں، صبح کو سویرے اٹھ کر تہہ کر کے احتیاط سے رکھ دیں، کپڑوں کی گٹھری اپنے انتظام میں رکھیں، ادھڑا ہوا خود سی لیا کریں، کپڑے خواہ میلے ہوں خواہ اجلے ہوں ایسی جگہ رکھیں جہاں کیڑے کا چوہے کا اندیشہ نہ ہو، دھوبن کو خود گن کر دیں اور لکھ لیں اور گن کر پڑتال کر کے لیں۔

(۳۲) لڑکیوں کو تاکید کرو کہ جو زیور تمہارے بدن پر ہے رات کو سونے سے پہلے اور صبح کو جب اٹھو دیکھ بھال لیا کرو۔

(۳۳) لڑکیوں سے کہو کہ جو کام کھانے پکانے، سینے پرونے، کپڑے رنگنے، چیز بننے کا گھر میں ہوا کرے اس میں غور کر کے دیکھا کرو کہ کیونکر ہو رہا ہے۔

(۳۴) جب بچے سے کوئی بات خوبی کی ظاہر ہو اس پر خوب شاباش دو پیار کرو، بلکہ اس کو کچھ انعام دو تاکہ اس کا دل بڑھے، اور جب اس کی بری بات دیکھو اول تنہائی میں اس کو سمجھاؤ اور کہو بری بات ہے، دیکھنے والے دل میں کیا کہتے ہوں گے، اور جس جس کو خبر ہوگی وہ دل میں کیا کہے گا، خبردار پھر مت کرنا، نیک بخت لڑکے ایسا نہیں کیا کرتے، اور اگر پھر وہی کام کرے مناسب سزا دو۔

(۳۵) ماں کو چاہئے کہ بچے کو باپ سے ڈراتی رہے۔

(۳۶) بچے کو کوئی کام چھپا کر مت کرنے دو کھیل ہو یا کھانا اور کوئی شغل ہو، جو کام چھپا کر کرے گا سمجھ جاؤ کہ وہ اس کو برا سمجھتا ہے، سو اگر وہ برا ہے تو اسے چھڑاؤ اور اگر اچھا ہے جیسے کھانا پینا تو اس سے کہو سب کے سامنے کھائے پیئے۔

(۳۷) کوئی کام محنت کا اس کے ذمہ مقرر کر دو جس سے صحت اور ہمت رہے سستی نہ آنے پائے، مثلاً لڑکوں کے لئے ڈنڈ مگدر کرنا، ایک آدھ میل چلنا، اور لڑکیوں کے لئے چکی یا چرخہ چلانا ضرور کرو، اس میں یہ بھی فائدہ ہے کہ ان کاموں کو عیب نہ سمجھیں گی۔

(۳۸) چلنے میں تاکید کرو کہ بہت جلدی نہ چلے، نگاہ اوپر اٹھا کر نہ چلے۔
(۳۹) اس کو عاجزی اختیار کرنے کی عادت ڈالو، زبان سے، چال سے، برتاؤ سے، شیخی نہ بگھارنے پاوے یہاں تک کہ اپنے ہم عمر بچوں میں بیٹھ کر اپنے کپڑے یا مکان یا خاندان یا کتاب و قلم دوات، تختی تک کی تعریف نہ کرنے پاوے۔
(۴۰) کبھی کبھی اس کو دو چار پیسے دے دیا کرو کہ اپنی مرضی کے موافق خرچ کیا کرے، مگر اس کو یہ عادت ڈالو کہ کوئی چیز گھر سے چھپا کر نہ خریدے۔
(۴۱) اس کو کھانے کا طریقہ اور محفل میں اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ سکھاؤ، تھوڑا تھوڑا ہم لکھ دیتے ہیں۔

کھانے کا طریقہ (۱) داہنے ہاتھ سے کھاؤ (۲) شروع میں بسم اللہ کہو (۳) اپنے سامنے سے کھاؤ (۴) اوروں سے پہلے مت کھاؤ (۵) کھانے کو گھور کر مت دیکھو (۶) کھانے والوں کی طرف مت دیکھو (۷) بہت جلدی جلدی مت کھاؤ (۸) خوب چبا کر کھاؤ (۹) جب تک لقمہ نگل نہ لو دوسرا لقمہ منہ میں مت رکھو (۱۰) شوربا وغیرہ کپڑے پر نہ ٹپکنے پاوے (۱۱) انگلیاں ضرورت سے زیادہ سننے نہ پائیں۔

محفل میں اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ (۱) جس سے ملو اسے سلام کرو (۲) نرمی سے بولو (۳) محفل میں تھوکو نہیں (۴) وہاں ناک صاف مت کرو، اگر ایسی ضرورت ہو وہاں سے الگ چلے جاؤ (۵) وہاں اگر جمائی یا چھینک آئے منہ پر ہاتھ رکھو (۶) آواز پست کرو (۷) کسی کی طرف پشت مت کرو نہ کسی کی طرف پاؤں مت کرو (۹) تھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر مت بیٹھو (۱۰) انگلیاں مت چٹخاؤ (۱۱) بلا ضرورت بار بار کسی کی طرف مت دیکھو (۱۲) ادب سے بیٹھے رہو (۱۳) بہت مت بولو (۱۴) بات بات میں قسم مت کھاؤ (۱۵) جہاں تک ممکن ہو خود کلام مت کرو (۱۶) جب دوسرا شخص بات کرے خوب توجہ سے سنو کہ اس کا دل نہ بجھے، البتہ اگر گناہ کی بات ہو مت سنو، یا تو منع کر دو یا وہاں سے اٹھ جاؤ (۱۷) جب تک کوئی شخص بات پوری نہ کر لے بیچ میں مت بولو (۱۸) جب کوئی آئے اور محفل میں جگہ نہ ہو تو ذرا اپنی جگہ سے کھسک جاؤ، مل کر بیٹھ جاؤ کہ جگہ ہو جائے (۱۹) جب کسی سے ملو یا رخصت ہونے لگو السلام علیکم کہو اور جواب میں وعلیکم السلام کہو اور طرح طرح کے الفاظ مت کہو۔

ختم ہوا مضمون بہشتی زیور کا۔

امید ہے کہ اہل و عیال کی تعلیم و تربیت کے متعلق مضمون مذکور کافی ہو جائے گا۔ اسی طرح اور بھی جس جس پر قدرت ہو جیسے شاگرد و مرید و نوکر و رعیت وغیرہم سب کی تعلیم و تربیت میں یہی طریقہ مشترک ہے:

انتہت عبارت رسالہ بہشتی زیور

وبتمامہ

تمت احکام الحقوق الروحانیة

اصلاحِ انقلاب متعلق لقطہ

لقطہ کا مفہوم اور اس کی تعریف اوپر کے باب میں اپنے مال کے خرچ کرنے کے احکام تھے۔ اس میں دوسرے کے مال کے بعض امور کے احکام ہیں، کیونکہ لقطہ ایسی پڑی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جس کا مالک معلوم نہ ہو، اس میں بھی مختلف و متعدد کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

جس چیز کے ضائع ہونے کا گمان غالب ہو اس کا اٹھا لینا واجب ہے چنانچہ ایک کوتاہی اس میں یہ ہے کہ بعضے لوگ ایسی چیز کو بالکل اٹھاتے ہی نہیں اور سمجھتے ہیں کہ نہ اٹھانا ہی افضل ہے، حالانکہ جہاں گمان غالب ہو کہ نہ اٹھانے سے وہ چیز ضائع ہو جائے گی وہاں اٹھا لینا واجب ہے۔ اگر نہ اٹھائے گا گنہگار ہوگا (درمختار) اور یہی حکم ہے پڑے ہوئے بچے کا (درمختار)

اور اگر اٹھا کر پھر وہیں کی وہیں رکھ دیا تو گناہ تو ہے ہی، مگر بعض کے نزدیک اس کے ذمے ضمان بھی لازم ہے۔ (ردالمختار)

اپنے کام کی غرض سے کسی چیز کو اٹھا لینا گناہ ہے ایک کوتاہی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعضے لوگ اس نیت سے اٹھا لیتے ہیں کہ اس کو اپنے کام میں لائیں گے۔ تو اس نیت سے اٹھانا گناہ ہے، اور اس اٹھانے سے وہ ضامن بھی ہو جائے گا، جب تک مالک کے پاس نہ پہنچا دے (ردالمحتار عن نور العین عن التاتارخانیہ)

اٹھائی ہوئی چیز کی تشہیر واجب ہے ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے اٹھاتے تو اسی نیت سے ہیں کہ ہم مالک کو پہنچا دیں گے، مگر مالک کو نہ ڈھونڈتے ہیں نہ تلاش کرتے ہیں، گھر میں رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ کوئی ڈھونڈھتا ہوا آئے گا، نہ کوئی مشقت کریں، سو ایسا کرنا جائز نہیں بلکہ اس کی تشہیر واجب ہے یعنی جس جگہ وہ ملی ہے وہاں بھی اعلان کرے اور مواقع اجتماع پر بھی جیسے بازاروں اور مساجد کے دروازوں پر اور جہاں جہاں احتمال مالک کے ملنے کا ہو، اور مدت اس تشہیر کی یہ ہے کہ گمان غالب یہ ہو جائے کہ اب مالک نے اس کی تلاش چھوڑ دی ہوگی

یا اس چیز کے بگڑنے کا اندیشہ ہونے لگے، جیسے پھل وغیرہ (درمختار)

چیز اٹھانے کے بعد دو اختیار پھر اس کے بعد اس کو دو اختیار ہیں ایک یہ کہ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھے اور بعد دو تشہیر کہ اس کو خیرات کر دے، پھر اگر خود مسکین ہے، تو اپنے نفس پر بھی خیرات کر سکتا ہے، اور مسکین نہیں ہے تو مساکین پر تصدق کر دے، اور یہ بھی اختیار ہے خواہ بعینہٖ تصدق کر دے، خواہ فروخت کر کے دام تصدق (صدقہ) کر دے، اور اگر اس کو یا اس کے داموں کو محفوظ رکھا تو وصیت کر جانا واجب ہے (ردالمحتار)

مسئلہ: اگر کسی وجہ سے خود تشہیر نہ کر سکے تو دوسرے شخص کو بشرطیکہ امانتدار ہو تشہیر کے لئے دے سکتا ہے (ردالمحتار)

نامعلوم اہل حقوق کے حقوق کی ادائیگی کا طریقہ **مسئلہ:** جس کے ذمہ کچھ حقوق العباد ہوں اور اہل حقوق معلوم نہیں یا معلوم ہیں مگر مر گئے، اور ان کے وارث بھی نہیں تو ایسے حقوق بمنزلہ لقطہ کے ہیں کہ مالک کے ملنے کے وقت خیرات کر دینا چاہئے، اور یہ خیرات ایسے حقوق کی اور اسی طرح لقطہ کی مالک کی نیت سے ہونا چاہئے،

صدقہ کرنے کے بعد مالک آنے کا حکم **مسئلہ:** اگر بعد تصدق کے مالک آ گیا تو اس کو اختیار ہے خواہ اس تصدق کو جائز رکھے اور خواہ اس سے ضمان لے، اور ثواب اس لاقط یا محتاج کو ملے گا، (ردالمحتار)

بروز قیامت ظلم کا دعوی مورث اور حق کا دعوی وارث کرے گا **مسئلہ:** اگر کسی کا قرض یا کوئی حق اس کے ذمہ کا ہے اور اس نے نہ دیا اور نہ اس کے ورثاء کو تو قیامت میں اس پر دعوی کون کرے گا؟ اس میں قول مختار یہ ہے کہ ظلم کا دعوی تو مورث کرے گا کہ اس کا حق نہ دیا تھا، اور حق کا دعوی وارث کرے گا، کیونکہ وہ مال میت سے اس کے وارث کی طرف منتقل ہو گیا، اور اگر وارث کو دیدیا تو وارث کا دعوی تو جاتا رہا مورث کا رہے گا، اس کے لئے دعاء و استغفار کیا جائے (ردالمحتار)

مسافر کا ترکہ بحکم لقطہ کے ہے **مسئلہ:** تمہارے گھر کوئی مسافر مر گیا اور اس کے ورثاء معلوم نہیں تو اس کا ترکہ حکم لقطہ ہے (درمختار)

دفینہ کا حکم لقطہ کا ہو گا **مسئلہ:** تم نے کوئی گھر خریدا اور اس میں کچھ دفینہ (دفن شدہ مال) نکلا تو وہ بحکم لقطہ ہے، (ردالمحتار)

اصلاحِ انقلاب
متعلق گم شدہ انسان

(مفقود انسان تھا جس کا اس کے اہل کو پتہ نہیں، یہ انسان ہے جس کا اس کے اہل کو پتہ نہیں) اس میں بھی کچھ غلطیاں کی جاتی ہیں:

مفقود اپنے نفس کے حق میں زندہ ہے اور اس کے سمجھنے سے پہلے ایک قاعدہ کلیہ سمجھ لینا چاہیے، اس سے ان غلطیوں کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

مفقود اپنے غیر کے حق میں مردہ ہے وہ قاعدہ یہ ہے کہ مفقود چونکہ وقت مفقود ہونے کے زندہ تھا اور اب تک اس کی موت کی کوئی دلیل نہیں، تو اس کا ظاہر حال یہ ہے کہ وہ زندہ ہے، اور ظاہر حال جس کو استصحاب بھی کہتے ہیں حجت دافعہ ہے حجت مثبتہ نہیں، پس یہ حیات ظاہری اس کا حق تو دوسرے کے مال میں ثابت نہ کرے گی، لیکن اس کے مال میں دوسرے کا حق ثابت نہ ہونے دے گی یعنی اگر اس کے زمانۂ فقدان و گمشدگی میں اس کا کوئی مورث مثلاً اس کا باپ مرا اور اس کے دو بیٹے تھے ایک یہی مفقود، دوسرا موجود، تو اس کے ترکہ میں اس مفقود کا یقینی حق نہیں ہوگا، بلکہ احتمالِ حیات کے سبب اس کا حصہ بطور امانت کے رکھیں گے، اگر آ گیا تو لے لے گا، اور اگر نہ آیا یہاں تک کہ انتظار کی مدت شرعیہ کے بعد جس کی مقدار آگے آتی ہے اس کی موت کا حکم کیا گیا تو وہ امانت رکھا ہوا حصہ اسی موجود کا سمجھا جائے گا، اگر وہ زندہ ہوا تو وہ لے گا ورنہ اس کے شرعی ورثہ لیں گے یوں نہ سمجھا جائے گا کہ وہ اس مفقود کا حق ہے، تاکہ اس کے مال سے مع متروکہ بھی اس کے ورثہ کو دیا جائے، اور یہی مطلب ہے حجت مثبتہ نہ ہونے کا، اور یہی مطلب ہے حجت دافعہ ہونے کا، اور یہی مطلب ہے فقہاء کے اس قول کا کہ وہ اپنے نفس کے حق میں زندہ ہے۔

مفقود کے بارے میں چند کوتاہیوں کا بیان

اس قاعدہ کلیہ کے بعد اب ان غلطیوں کو سمجھنا چاہیے۔

مفقود کا حصہ وراثت رکھنا چاہیے

سو ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ اس کے مفقود ہونے کے زمانہ میں جو اس کا مورث مرجاتا ہے اس کے ترکہ میں سے اس مفقود کا حصہ کوئی شخص نہیں رکھتا، ورثاء حاضرین باہم تقسیم کرلیتے ہیں، حالانکہ گو اس کا استحقاق یقینی نہیں مگر محتمل تو ہے، اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ صحیح سالم آگیا، اگر اس کو اپنے استحقاق کا علم ہوا اور اس کے وصول کی قوت بھی ہوئی تب تو نزاع و جھگڑا ہوگا اور اگر علم نہ ہوا یا قدرت نہ ہوئی تو دوسرے ورثہ حق العباد کے وبال میں مبتلا ہوں گے۔

مفقود کے مال اور اس کے حصہ امانت کا حکم یکساں نہیں

اور ایک غلطی یہ ہوسکتی ہے (گو دیکھی نہیں گئی) کہ اگر اس کا حصہ امانت کے طور پر محفوظ رکھا جائے تو جس وقت اس کی موت کا حکم شرعاً کیا جائے گا اور خود اس کا ترکہ اس کے ورثہ موجودین وقت الحکم بالموت میں تقسیم کیا جائے گا، تو ممکن ہے کہ اس حصہ امانت کو بھی اس کی ملک سمجھ کر اس کو بھی اس کے ترکہ کے ساتھ تقسیم کردیا جائے، حالانکہ اوپر کے قاعدے سے ثابت ہوچکا ہے کہ اس صورت میں وہ حصہ امانت کا ان ورثہ کا حق ہے جن کے حصہ میں سے یہ امانت نکال کر رکھی گئی تھی، خلاصہ یہ کہ اس امانت کا حکم اور خود جو اس مفقود کا مال بلاواسطہ ہو ان دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے۔

مفقود کے مال کو دوسرے کے مال پر قیاس کرنا صحیح نہیں

ایک غلطی اس دوسرے حصہ سے (کہ اگر وہ نہ آیا تو وہ امانت ان ورثہ کا حق ہے جن کا حق کم کرکے یہ امانت رکھی گئی ہے) یہ ہوسکتی ہے کہ اس کو وقت فقدان (گم ہونے کے وقت) سے میت سمجھ کر جب اس کا ترکہ تقسیم کرنے لگیں تو انہی ورثہ کو دینے لگیں جو اس کے فقدان کے وقت تھے، حالانکہ وہ اپنے مال کے اعتبار سے زندہ ہے، حاصل یہ کہ بعض غلطی کا منشاء مفقود کے مال کو دوسرے کے مال پر قیاس کرنا ہے اور بعض کا منشاء دوسرے کے مال کو مفقود کے مال پر قیاس کرنا ہے، یہ دونوں قیاس باطل ہیں، ان دونوں کا حکم جدا جدا ہے، جیسا کہ مفصل بیان کیا گیا۔

مفقود کے متعلق امام مالکؒ کے فتویٰ پر عمل کے لئے قضاء قاضی شرط ہے۔

ایک غلطی عام یہ ہو رہی ہے کہ علماء سے یہ سن لیا کہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک انتظار مفقود کی مدت چار سال ہے اور یہ بھی سن لیا کہ ضرورت میں دوسرے مذہب پر عمل درست ہے،

اس کو مطلق سمجھ کر بلا کسی قید کے اس پر عمل شروع کر دیا، چار سال کے بعد اس کی بی بی کا نکاح بھی کرانے لگے، مفقود کی بھی ضرورت نہ سمجھی، اگر قدرت ہوئی اس کا ترکہ بھی تقسیم کر لیا، پھر ضرورت کو بھی نہیں دیکھا اور بعد تحقیق ضرورت کے اس پر عمل کی شرط بھی نہ دیکھی حالانکہ امام مالکؒ کے نزدیک چار سال جوازِ نکاح کی مدت نہیں، بلکہ ان کے حکم بالموت کی مدت ہے، پھر اس کے بعد عدت وفات ہوگی۔

اور شافعیؒ کا مذہب قدیم اس کو قرار دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قول جدید اس کے خلاف ہے، اور مفتی بہ قول جدید ہوتا ہے، پھر یہ قول ان دونوں حضرات کا صرف نکاح کے بارے میں ہے، میراث میں ان کا مذہب ہمارے ہی مذہب کے مثل ہے،

اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تفصیل ہے کہ اگر ایسی حالت میں غائب ہوا ہے کہ غالب حال اس کا ہلاک ہے، جیسے صفِ قتال یا کشتی شکستہ میں تھا، تب تو چار سال کی مدت ہے ورنہ ان کا مذہب بھی ہمارے ہی مذہب کے مثل ہے،

یہ سب اقوال شامیؒ نے نقل کئے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ کا مذہب اس میں ایسا قوی ہے کہ دوسرے ائمہ بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کو اختیار کئے ہیں،

اسی طرح جس عورت کے پاس نفقہ موجود ہو وہاں ضرورت بھی متحقق نہیں، یا کسی دیندار معتبر گھرانے میں نوکری کر سکے وہاں بھی ضرورت نہیں، اسی طرح جہاں مالکی یا شافعی حاکم مل سکے وہاں بھی حنفی کو اس قول پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں، اور جہاں ضرورت بھی ہو تب بھی اس پر عمل کرنے کی اکثر علماء کے نزدیک ایک شرط یہ بھی ہے، وہ یہ کہ اس عمل کے لئے صرف فتویٰ کافی نہیں، قضاء قاضی ہونا چاہئے، چنانچہ درمختار میں واقعات مفتیین سے اس کی نسبت قنیہ کی طرف کی ہے، اور گو اس میں دوسرا قول بھی ہے جو شرح الائمہ کی طرف نسبت کیا گیا ہے مگر نجم الائمہ قاضی عبدالرحیم نے اشتراط کو ترجیح دی ہے، اور واقعات کی عبارت سے امام صاحبؒ کا اس میں نص ہونا ثابت کیا ہے،

مفقود کی مدت انتظار طویل کا اصل مقصد احتیاط ہے

اور احقر کہتا ہے کہ قواعد سے بھی ایسے امور مجتہد فیہا میں قضاء قاضی کے اشتراط سے اسی اشتراط ہی کو ترجیح ہوتی ہے، اور احقر اس کے خلاف پر فتویٰ دینے کو صحیح نہیں سمجھتا، خصوص جبکہ اصل فروج دختر نکاح ایں حرمت ہے اور یہ لزوم قضاء قاضی کسی خاص قول کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس باب میں حنفیہ کے نزدیک جو مدت انتظار ہے جس میں سب سے زیادہ احتیاط ہے اس میں بھی قضاء قاضی شرط ہے یعنی

تک نہ پہونچے کہ میرے نزدیک اب وہ مرگیا ہے، اس لئے میں اس کی موت کا حکم کرتا ہوں (لانطلاقہ مانی الدر المختار انما یحکم بموتہ بقضاء ولانہ امر محتمل فما لم ینضم الیہ القضاء لا یکون حجۃ) اور وہ مدت احتیاطی اس لئے ہے کہ بہت طویل ہے۔ اصل معتبر تو اس کا ہے باقی اس کے عنوانات میں اقوال مختلف ہیں،

(۱) موت اقران فی بلدہ (۲) موت اقران فی جمیع البلاد (۳) نوّے سال وقت ولادت سے نہ کہ وقت فقدان سے (۴) ستّر سال (۵) ایک سو بیس سال (۶) ساٹھ سال (۷) ستّر سال۔ (۸) تفویض الی رائی الامام (امام کی رائے کے سپرد کردینا) اور شامی نے اس قول اخیر میں یہ شرح نقل کی ہے،

لابد من مضی مدۃ طویلۃ حتی یغلب علی الظن موتہ لا بمجرد فقدہ عند ملاقاۃ العدو او عند الهجر ونحوہ،	ترجمہ: طویل مدت کا گذرنا ضروری ہے کہ اس کی موت واقع ہونے پر گمان غالب ہو، دشمن سے ملاقات یا مطلق سفر وغیرہ کی صورت میں صرف گمشدگی کافی نہیں!!

ہندوستان میں سلطنت کی طرف سے کسی ایسے قاضی کے تقرر کا انتظام نہیں ہے اس لئے اس شرط کی تحقیق یہاں دشوار ہے، پس اس صورت میں مفقود کے احکام میں بجز صبر کے کوئی علاج نہیں، البتہ اگر کوئی مسلمان حاکم جس کو سلطنت کی طرف سے ایسے اختیارات دیئے گئے ہیں کسی عالم سے فتویٰ لے کر مفقود کی موت کا حکم کردے تو وہ حکم صحیح ہوجائے گا، اس لئے کہ قاضی مسلم کا تقرر سلطنت غیر مسلم کی طرف سے بھی صحیح ہے، صرح بہ الفقہاء ریاستوں میں جو قضاۃ مسلمان مقرر ہیں ان سے حکم حاصل کرلیا جائے، مگر اس میں یہ شبہ ہے کہ اس قاضی کی حدود شرع سے باہر جو شخص ہو اس پر بھی اس کا حکم نافذ ہوگا یا نہیں اس کی تحقیق علماء سے کرلی جائے۔

احکام مفقود سے متعلق چند شبہات اور انکے جوابات

یہ تھیں ضروری تنبیہات احکام مفقود کے متعلق اب بعض اور شبہات کے جواب لکھتا ہوں جو ان احکام کے متعلق بطور معارضہ پیش کئے جاتے ہیں،

زیادہ عمر مانع نکاح نہیں ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اتنی مدت انتظار کے بعد کہ نوّے برس یا اس سے زیادہ ہو، جب موت کا حکم کیا گیا تو اس حکم سے کیا فائدہ ہوا؟ اتنی عمر کی عورت تو نکاح کے

قابل ہی نہیں رہتی۔

جواب اس کا یہ ہے کہ معترض مسئلہ ہی نہیں سمجھا۔ اس مدت کی ابتداء مفقود ہونے کے حکم سے نہیں ہے تاکہ عورت کا اتنا سن رسیدہ ہونا لازم آئے، بلکہ اس کی ابتداء مفقود کے یوم ولادت سے ہے یعنی وہ نوّے برس کا ہو جائے، مثلاً، اور مرد کے سن رسیدہ ہونے سے عورت کا سن رسیدہ ہونا لازم نہیں آتا، مثلاً کسی اسّی برس کے بڈھے نے دس برس کی لڑکی سے نکاح کیا اور مفقود ہو گیا، تو جب یہ نوّے سال کا ہوگا عورت بیس برس کی ہوگی، دوسرا دوسرے حکم بالموت کا ثمرہ محض حرمت نکاح نہ ہی تو نہیں ہے بلکہ مال کی تقسیم بھی تو ہے اور اس میں یہ استبعاد نہیں، تیسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ ایسی عمر کی عورت نکاح کے قابل نہیں ہو، بلکہ اگر اقتضاء نفسانی کی نفی بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی نکاح میں اور مصالح بھی تو ہیں، مثلاً کوئی مسن (عمر رسیدہ) بیوہ عورت حج کو جاتی ہے اور محرم کوئی موجود نہیں، اس نے اس لئے کسی سے نکاح کر لیا کہ اس کے ساتھ سفر جائز ہو اور مرد نے اعانت فی الدین (دین میں مدد) سمجھ کر قبول کر لیا، تو دیکھئے اتنی عمر مانع نکاح نہ ہوئی۔

قانون مفقود کے سخت ہونے کا شبہ صحیح نہیں۔

ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ قانون بڑا سخت ہے، اگر عورت کو نان نفقہ کی حاجت ہو یا اس پر نفس کا غلبہ ہو تو وہ کیا کرے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ اشکال اسی صورت کے ساتھ خاص نہیں، اگر کسی عورت کا شوہر موجود ہو، مگر بے توجہی کرے نہ نان نفقہ دیتا ہے نہ اس کا حق تحصین (بیوی ہونے کا حق) ادا کرتا ہو تو اس صورت میں عورت کیا کرے؟ اگر کہا جائے کہ دعوے کرے، ہم بھی یہی کہیں گے کہ یہاں بھی دعویٰ کرے، اگر حاکم کی رائے میں ضرورت متحقق ہوگی وہ شافعیؒ و مالکؒ کے مذہب پر حکم بالموت جاری کر دے گا، اگر کہا جائے کہ ایسا حاکم کہاں ہے، ہم کہیں گے اگر ہماری مفروضہ صورت میں بھی ایسا حاکم نہ ملے یا ملے مگر یہ حکم نہ کرے تو عورت کیا کرے گی، اگر کہا جائے کہ صبر کرے، ہم کہیں گے یہاں بھی صبر کرے، یا اگر بے توجہ نہ ہو مگر نادار یا اپاہج ہو کہ نہ بالفعل کسی مال کا مالک ہو نہ کسب پر قادر ہو، اور نہ عورت پر قادر ہو تو اس کی عورت کیا کرے؟ اگر کہا جائے کہ عنین اور اس کی زوجہ میں قاضی تفریق کر دے گا .... تو ہم کہیں گے کہ اگر ایک بار قادر ہو چکا ہو اور اس وجہ سے اب تفریق ممکن نہ ہو (چنانچہ مسئلہ فقہیہ باب عنین میں یہی ہے) تو عورت کیا کرے، اسی طرح اگر زوجِ مفقود کی ڈگری کرنے کے کھلنے میں شبہ فتنہ کے سبب کسی کو اعتراض ہو تو صورت مفروضہ میں بھی ایسا احتمال ہو سکتا ہے، غرض کچھ بلا اسی میں منحصر نہیں، دوسری صورتوں میں بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ

اور کثرت ہوتا بھی ہے لہٰذا بجز صبر و تحمل شان کے کوئی چارہ نہیں۔

مفقود کے بارے میں ایک ضروری مسئلہ

اب ایک ضروری فرع لکھ کر اس بحث کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ اگر بعد حکم بالموت کے اس کی بی بی نے نکاح کر لیا اور اس کا مال ورثہ میں تقسیم کر دیا گیا اور وہ پھر صحیح سالم آ گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ سو وہ حکم یہ ہے کہ اس کی بی بی کا نکاح ثانی فاسد ہو جائے گا اور عدت گزرنے کے بعد وہ بی بی اس کو مل جائے گی، البتہ اگر کچھ اولاد ہو گئی ہو تو وہ دوسرے شوہر کو ملے گی۔ کذا فی رد المحتار و عبارتہ یہ۔

ان زوجتہ لہ والاولاد للثانی	(یعنی بیوی اس کی ہوگی اور اولاد دوسرے کی ہوگی)

اور مال میں یہ تفصیل ہے کہ جو وارثوں کے ہاتھ میں خرچ ہو چکا وہ گیا گزرا، اور جو خرچ نہیں ہوا وہ اس مفقود کو دلایا جائے گا، کذا فی رد المحتار و عبارتہ

فی الباقی فی ید ورثتہ لہ ولا یطالب بما ذہب۔	(یعنی جو اس کے ورثہ کے ہاتھ میں باقی موجود ہے اس کو مل جائے گا اور جو ختم ہو چکا اس کا مطالبہ نہیں ہو سکتا)

مرنے کے بعد جو شخص حالت زندہ ہو جاوے کا حکم

اور یہی حکم ہے مال میں اس شخص کا جو مرنے کے بعد زندہ ہو جاتے البتہ اس کی بی بی اب اس کو نہ ملے گی کیونکہ موت سے خود اسی کا نکاح یقیناً باطل ہو گیا تھا، اور مفقود کا یقیناً باطل نہ ہوا تھا، ظناً باطل ہوا تھا، وہ ظن کا ذب دکھائی چھوڑا ثابت ہوا، فقط۔

اصلاح انقلاب

متعلق بہ تعزیر و تعییر و تکفیر

تعزیر و تعییر اور تکفیر کا مفہوم

تفسیر ان الفاظ کی یہ ہے :-

تعزیر: وہ سزا ہے جو تادیب کے لئے دی جاتی ہے ، اور حد کے درجہ سے کم ہو اور اس کے طرق (طریقے) مختلف ہیں ، ملامت کرنا ، ڈانٹنا ، مارنا ہاتھ یا لکڑی وغیرہ سے ، کان کھینچنا ، سخت الفاظ کہنا ، محبوس کر دینا (رد المحتار) مالی سزا دینا ، جس کا طریقہ بعد میں آتا ہے ،

تعییر: کسی کا عیب نکالنا ، اس میں غیبت و بہتان بھی داخل ہو گیا ،

تکفیر: کسی کو کافر کہنا ۔

اوپر کے قریب ابواب میں غیر کے مال میں تصرف کرنے کی بحث تھی ، ان تینوں امور میں غیر کی آبرو میں تصرف کرنے کا بیان ہے ۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ ان تینوں امر سے دوسرے کی آبروریزی ہوتی ہے ، گو بعض میں تصرف فی النفس و تصرف فی المال ہے ، اور چونکہ آبروریزی ان سبھوں میں امر مشترک ہے ، اور اس ما بہ الاشتراک کی وحدت سے یہ تینوں امر گویا امر واحد ہیں ، اس لئے ان تینوں کے متعلق مضامین مخلوط طور پر بیان ہوں گے ، جیسے تینوں کے عنوان کو جمع کر دیا گیا ، (یعنی ترتیب کا قصد نہ ہوگا)

حقوق العباد کی ایک کوتاہی کی جس کی غلطی

پس ان کے متعلق ایک کوتاہی جو بوجہ علمی غلطی ہونے کے سب سے اشد ہے کہ ان میں حق العباد ہونے کا احتمال ہی کسی کو نہیں ہوتا ، الا ما شاء اللہ ، اور اس وجہ سے ان کو بالکل خفیف و سرسری سمجھا جاتا ہے ، سو یہ جو کہ سخت غلطی ہے اور سخت ہونا اس کا اس لئے ہے کہ یہ اعتقادی غلطی ہے ، حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صریح ہے :-

اَلَا اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا	خبردار! تمہاری جانیں، مال اور تمہاری عزتیں باہمی ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارے آج کے دن کی تمہارے اس خطہ اور اس شہر کی حرمت ہے۔

حقوق العباد کی تین قسمیں | جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں:
(۱) کسی کی جان یا بدن کو ضرر پہنچانا (۲) کسی کے مال کو ضرر پہنچانا (۳) کسی کی آبرو کو ضرر پہنچانا یعنی بدون کسی استحقاق کے، اس وقت اکثر لوگوں نے حق العبد کو صرف قسم دوم ہی میں منحصر سمجھ رکھا ہے اور اگر کسی کی نظر بڑھی ہے تو قسم اول کو بھی اس میں داخل کر لیتے ہیں، باقی قسم ثالث تک تو اکثر خواص کا ذہن بھی نہیں جاتا۔

تعزیر کے متعلق اساتذہ کی ایک عظیم کوتاہی | ایک کوتاہی تعزیر کے متعلق یہ ہے کہ جفا کاروں کے نزدیک اس کی کوئی حد ہی نہیں، جب تک اپنے غصہ کو تسکین نہ ہو جائے سزا دیتے ہی چلے جاتے ہیں، اور اس میں اہل حکومت عموماً مبتلا ہیں، الا ماشاء اللہ، خواہ دنیا کی حکومت ہو جیسے اہل عدالت والی پولیس، یا شوہر یا باپ یا خواہ دین کی حکومت ہو جیسے استاد کہ یہ حضرات گو ان سب سے اس باب میں بڑھے ہوئے ہیں، عدالت اور پولیس کو تو یہ بھی ڈر ہے کہ کبھی مظلوم حکام بالا سے استغاثہ (فریاد) نہ کر بیٹھے۔ شوہر کو محبت ہوتی ہے، باپ کو شفقت بھی ہوتی ہے، یہ اسباب ظلم کے مقتضی (کم کرنے والے) ہو جاتے ہیں، اور ان حضرات کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ محبت و شفقت، اگر کچھ خوف ہو سکتا تھا تو والدین سے ہوتا، مگر والدین خواہ حسن اعتقاد سے خواہ اپنی مطلب برآری کی خوشامد میں کوئی تک نہیں ہلاتے، اور بعضے اپنا عقیدہ میں شاگرد کے گوشت پوست کا استاد کو مالک سمجھتے ہیں، تو ان سے کب احتمال ہے کہ ان حضرات کو ظلم سے روک سکیں گے، اس لئے یہ سب سے بڑھ کر آزاد ہیں، بہرحال باوجود کچھ کچھ تفاوت کے اتنا امر سب میں مشترک ہے کہ ان کے یہاں تعزیر (سزا دینے) کی کوئی حد نہیں، حالانکہ ضرب فاحش (سخت مارنے) سے فقہاء نے مطلقاً منع فرمایا ہے، اور جس ضرب سے جلد پر نشان پڑ جائے اس کو بھی ضرب فاحش میں داخل کیا ہے، اور جس سے ہڈی ٹوٹ جائے یا کھال پھٹ جائے وہ تو بدرجہ اولیٰ (رد المحتار علی الدر المختار، ص ۲۹۳ ج ۳) بلکہ ضرب فاحش سے خود استاد کو تعزیر دی جائے گی (در مختار)

مالی جرمانہ ہمارے مذہب میں درست نہیں

ایک کوتاہی اور ہے بعض برادریوں میں بھی شائع ہے وہ یہ ہے کہ خطاؤں پر جرمانہ کرتے ہیں، پھر بعضے تو کسی کسی موقع پر کھانا پکا کر سارا برادری جمع ہو کر کھا پی لیتے ہیں، اور بعضے اپنے زعم میں اس کو ثواب کے کاموں میں صرف کرتے ہیں جیسے وہ مسجد یا انجمن ہو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تعزیر بالمال (مالی جرمانہ) ہے جو کہ ہمارے مذہب میں درست نہیں، اور بعض روایات میں جو وارد ہے وہ منسوخ ہے، اور بعض جو اس کے قائل ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ چند روز تک اس مال کو اپنے پاس رکھے، جب وہ شخص توبہ کرلے وہ مال اس کو لوٹا دیا جائے، نہ خود رکھے نہ بیت المال میں داخل کرے، (کذا فی الدر المختار وردالمختار ص ۲۷۵ ج ۳)

اور مجوزین (جائز کہنے والوں میں) کے نزدیک بھی جو اس کے غرائط ہیں ان فاعلین (کرنے والوں) کو ان کی خبر نہ ان کی رعایت، تو اختلافی جواز بھی متحقق نہیں اور جب یہ جائز نہیں تو وہ رقم حلال نہ ہوگی تو اس کا کھانا بھی ناجائز اور نیک کاموں میں صرف کرنا اور بھی زیادہ ناجائز، حدیث میں ہے،

اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا الطَّيِّبَ	(اللہ تعالیٰ پاک ہیں سوائے پاک چیز کے کسی کو قبول نہیں کرتے،)

اور ابھی رد المحتار سے بیت المال میں داخل کرنے کا عدم جواز مذکور ہو چکا ہے،

اور یہی حکم ہے ان رقوم کا جو دباؤ ڈال کر یا شرما کر چندہ کے نام سے جمع کی جاتی ہیں یا خاص لوگ یا ان میں وہ ذی دباؤ والوں سے اپنے کمیٹیوں کے یا مسجد وغیرہ کے لئے لیتے ہیں، کیونکہ جو طیب خاطر ہونا ان سب میں امر مشترک ہے، اور اسی سے اس کا حکم بھی معلوم ہو گیا جو بعض جگہ کمیٹی یا جماعت معاہدہ سے اس پر متفق ہو جاتی ہے کہ جو شخص نماز نہ پڑھے اس پر اس قدر جرمانہ ہو یہ بھی جائز نہیں، اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہاں تو طیب خاطر سے معاہدہ ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ معاہدہ کے وقت طیب خاطر ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ رقم کے مطالبہ کے وقت بھی طیب خاطر ہو اور جہاں معاہدہ بھی نہ ہو بلکہ دو چار ذی اثر شخصیتوں نے متفق ہو کر اس جرمانہ کو بے تامل جبر یا عام کر دیا یہ تو بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا،

صاحب معصیت اپنے نفس پر خود جرمانہ کرے تو گناہ نہیں

اور بعض احادیث میں جو بعض معاصی کا کفارہ تصدق بدینار یا نصف دینار یا مطلق تصدق وارد ہوا ہے، اور بعض مشائخ ان ہی احادیث سے اس طریقہ پر مریدین کی تربیت بھی فرماتے ہیں تو ان احادیث یا اس طرق تربیت کا محمل یہ ہو

کو صاحبِ معصیت خود اپنے نفس کی علاج کرے نہ کہ کوئی دوسرا اس سے جبراً وصول کرے۔ یہ امرِ اول کے متعلق ضروری بیان تھا۔

بے تحقیقی مسائل بتانے پر عمل صحیح نہیں

اور امرِ ثانی کے متعلق ایک کوتاہی جو بہت ہی عام ہے، حتیٰ کہ علماء و مشائخ وقت تک بھی باستثناء من شاء اللہ اس سے محفوظ نہیں، یہ ہے کہ جس کی نسبت جو کچھ بھی سن لیا اگر آثار و قرائن نئے ہوئے بھی نہیں ہوتے محض قرائن پر بلکہ قرائن بھی کیسے جو ضعیف الدلالت بھی نہیں محض غیر دال پر اعتماد کر کے زبان سے ہانک دیا یا خود ہی تفسیر و حدیث میں ان کے متعلق احکام پڑھتے ہیں، وعظ میں دوسروں کو سناتے ہیں۔ مگر جب عمل کا موقع ہوا ایسے بھول جاتے ہیں گویا ان کے متعلق کبھی حکمِ شرعی کان میں پڑا ہی نہیں، بس بلفظِ دیگر گویا قرآن و حدیث صرف درس و وعظ کے لئے ہے عمل کے لئے نہیں یا اگر عمل کے لئے بھی ہے تو صرف عوام کے لئے اور خواص اس سے بری ہیں، یہ تو بعینہٖ علماء یہود کا طرز ہے اللّٰھم احفظنا۔ بہرحال کوئی خاص ہو یا عام احکام تو سب ہی کے لئے عام ہیں۔ اور حدیث:

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔	(آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے کہ ہر بات بلا تحقیق کہہ دے جو کچھ کسی سے سنی ہو)

اور حدیث:

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث	(بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی زیادہ جھوٹی بات ہے)

اس باب میں نصِ صریح ہیں۔ نیز ان احادیث کا مدلول شب و روز مشاہدہ میں بھی آتا ہے کہ سنی ہوئی حکایت اور اس سے بڑھ کر قرائن پر بنائی ہوئی روایات اس کثرت سے غلط نکلتی ہیں کہ گویا قریب سب ہی غلط ہوتی ہیں، اور اگر اتفاقاً شاذ و نادر کوئی صحیح بھی ہوتی ہے تو اس میں جھوٹ کی آمیزش (ملاوٹ) اس نسبت سے ہوتی ہے جو نمک اور آٹے میں نسبت ہے، یعنی نمک کے برابر سچ ہوتا ہے اور آٹے کے برابر جھوٹ۔

پھر اس بے بنیاد اور لغو اور مہمل حکایت پر کسی سے عداوت، کسی پر بدگمانی، کسی کی نسبت بدزبانی بے تکلف جائز رکھی جاتی ہے اور عجیب بات ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کی نسبت کوئی دوسرا شخص ایسی ہی بیہودہ بنیاد پر کچھ کہتا ہو اور خود اس شخص کو اس مقولہ کا باطل ہونا معلوم ہوتا ہے اور اس مقولہ سے ناگواری بھی محسوس کرتا ہے اور اس وقت خود بھی اسی قاعدۂ شرعیہ سے تمسک کرتا ہے اور اس قائل کو اس قاعدہ کی مخالفت پر جاہل سمجھتا ہے، مگر خود کسی کی

نسبت کچھ کہنے بیٹھتا ہے اس وقت یہ سب اصول صحیحہ کالعدم ہو جاتے ہیں، تو گویا معنی اس کے یہ ہوئے کہ لو یہ لوگ تو ہمارے معاملہ میں ان اصول کے مقید ہیں، مگر ہم دوسروں کے معاملہ میں ان اصول سے آزاد ہیں۔ سبحان اللہ کیا انصاف ہے، موٹی سی بات ہے کہ یہ اصول قابل تمسک ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو تم بھی اس پر عمل کرو اور اگر نہیں تو دوسروں سے بھی عمل کے منتظر و متوقع نہ رہو، یہ زبردستی کا فرق کیسا کہ تم دوسروں کے لئے تو عمل ضروری نہ کرو اور دوسرے تمہارے لئے عمل کریں، اس فرق کا منشا، اگر جہل و تعنت و کبر نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر یہ ہے تو کیا ان اخلاق کی اصلاح واجب نہیں، اور بالخصوص کسی مرد و عورت کی عفت و پاک دامنی کے متعلق معاملات میں تو بے احتیاطی حد سے گذری ہوئی ہے، جس کی نسبت نصوص سے سب سے زیادہ احتیاط کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

کسی بچہ کو ولد الزنا کہنے کا حکم احتیاط

حتیٰ کہ فقہاء نے انہی نصوص کی بناء پر تصریح فرمائی ہے کہ اگر ایک مشرقی کا نکاح ایک مغربیہ سے توکیلاً (وکیل کے ذریعہ) نکاح ہوا کسی نے دونوں کو مجتمع نہیں دیکھا، اور پھر ولادت ہوئی تو باوجود اس کے بھی اس عورت کو زانیہ کہنا یا اس بچہ کو ولد الزنا کہنا جائز نہیں، بلکہ اس بچے کو اسی مشرقی مرد کا کہیں گے۔

(بہشتی زیور میں یہی مسئلہ تو لکھ دیا تھا جس پر معترضوں نے بیحد شور و غل مچایا، اور اس کے قبل تمام کتب فقہ میں (جن میں بہت کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے) موجود ہے، مگر کسی کو اس طرف التفات نہیں ہوا، پس بہشتی زیور میں اس کا آجانا غضب ہو گیا، رسالہ رفع الارتیاب[1] اور رسالہ حکایات الشکایات، شکایت اول کے ذیل میں ان سب شبہات کا جواب نقلی و عقلی موجود ہے۔)

واقعی بات یہ ہے کہ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے باب میں وحی قطعی نازل نہ ہوئی ہوتی تو لوگوں کی اس بے احتیاطی پر نظر کرتے ہوئے قوی شبہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بہت سے مسلمان بھی ان پر بدگمانی کئے ہوئے نہ رہتے، مگر ہم لوگوں کی قسمت اچھی تھی جو اس باب میں وحی نازل فرمائی گئی مگر عجیب بات ہے کہ باوجود اس حکم کے عام ہونے کے دوسرے موقع پر جہاں تصریح نہیں دی...... نہ تو اس حکم پر عمل نہیں ہوتا، حالانکہ اس حکم کے ضمن میں جو اصول بیان فرمائے گئے ہیں وہ کسی کے ساتھ مخصوص نہیں، گو یہ فرق ضرور ہے کہ محل نص کی براءت و نزاہت قطعی ہے، کیونکہ

---

[1] یہ دونوں رسائل حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ کے تالیف فرمودہ ہیں، جو آجکل نایاب ہیں، کاش کبھی ناشر کو ان کی اشاعت کی توفیق ہو جائے، آمین۔ (محمد تقی عثمانی غفرلہ)

وہ صرف ان اصول ہی پر مبنی نہیں، اگر یہ اصول نہ بھی ہوتے جب بھی برأت کا اعتقاد قطعاً فرض تھا اور خلاف کا احتمال بھی واقع نہیں تھا،

کسی پر زنا کا حکم لگانے کے لئے کشف، الہام، خواب کا اعتبار حجت نہیں

اور غیر منصوص کی برأت ظنی ہے، کیونکہ وہ ان اصول پر مبنی ہے جن کا حاصل دلیل شرعی نہ ہو اس کے ساتھ تکلم اور اس میں سوءِ ظن جائز نہیں، گو واقع میں اس کے خلاف کا احتمال ہو، کما قال تعالیٰ :-

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ۝

(النور، آیت ۱۵)

(یعنی جب کہ تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات تھی ۔)

مگر اس فرق میں اس سے احتیاطی کی اجازت کہاں ہوئی، کفِ لسان و حسنِ ظن تو دونوں امر مشترک ہے،

اور میں نے جو ان اصول وارده فی تبرئة الصدیقة کا حاصل بیان کیا ہے اس میں ایک طالبِ علم کے شبہ کا بھی جواب ہو گیا،

لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۝

(النور، آیت ۱۳)

(یعنی یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے جس حالت میں یہ لوگ گواہ نہیں لائے تو بس اللہ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں ۔)

یعنی اس دعوے پر جب چار گواہ نہ لائے تو وہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا علم خلافِ واقع ہونا محال (نا ممکن) ہے، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹا وہی ہوگا جو واقع میں جھوٹا ہو، تو اس مقدمہ کے بعد معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اگر کوئی کسی کو زانی کہے اور اس پر چار گواہ قائم نہ کرے تو وہ شخص واقع میں جھوٹا ہے، اور جب کسی کو زانی کہنے والا واقع میں جھوٹا ہوا تو یہ شخص جس کو زانی کہا گیا ہے واقع میں زانی نہیں تو لازم یہ آیا کہ جہاں چار گواہ نہ ہوں وہاں واقع میں کوئی زانی نہیں ہوتا، اور یہ مشاہدہ سے باطل ہے، کیونکہ ہزاروں لوگ واقع میں زانی ہوتے ہیں اور ان کے زنا پر ایک بھی گواہ نہیں ہوا چہ جائیکہ چار، تو پھر آیت کا مضمون کیسے صحیح ہوا؟ یہ اشکال

تحریر میں نے جو حاصل بیان کیا ہے اس سے یہ اشکال جاتا رہا۔

تقریر اس کی یہ ہے کہ عند اللہ کے معنی فی علم اللہ و فی الواقع نہیں بلکہ فی حکم اللہ و قانونہ یعنی گو گواہ نہ لانے کی صورت میں واقع میں اس مدعیٰ علیہ کے زانی ہونے کا احتمال ہو مگر قانون الٰہی میں اس مدعی کو کاذب کہا جائے گا، یعنی اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے گا جو کاذب کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی اس کو اس تہمت لگانے کی سزا دی جائے گی، اور اس کے دعوے کی بنا پر کسی کو اس مدعیٰ علیہ پر بدگمانی یا اس کے ساتھ بدزبانی جائز نہ ہوگی۔

اسی طرح ایسی ہی ضعیف یا باطل بناؤں پر کسی کو چور سمجھنا اور کسی طرح کا شبہ کرنا جائز نہیں، اور سب کا قاعدہ مشترکہ یہی ہے کہ جس امر کے اثبات کا شرع میں جو طریق ہے جب تک اس طریق سے وہ امر ثابت نہ ہو اس کا کسی کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں، اور اپنے محل میں ثابت ہو چکا ہے۔ ان طرق اثبات میں شریعت نے الہام یا خواب یا کشف کو معتبر و حجت قرار نہیں دیا، تو ان کی بنا پر کسی کو چور یا مجرم سمجھنا حرام اور سخت معصیت ہے۔

> مسمریزم، حاضرات، لوٹا گھمانا وغیرہ سب مہمل اور خرافات ہیں۔

اور جب ان ذرائع کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں جو کہ بعض امور غیر لازمہ میں کسی درجہ میں معتبر بھی ہیں بشرط عدم تخالف شرع تو جو ذرائع شریعت کے نزدیک کوئی درجہ بھی نہیں رکھتے ان پر حکم لگانا تو کس درجہ سخت گناہ ہوگا جیسے حاضرات کرنا، چور کا نام نکالنے کے لئے لوٹا گھمانا، یا آجکل جو عمل مسمریزم کا شائع ہوا ہے یہ تو بالکل مہمل اور خرافات ہی ہیں جن میں اکثر جگہ تو عامل کا دھوکہ ہی ہے، اور بعض جگہ عامل دھوکہ باز تو نہیں ہوتا، مگر وہ خود دھوکہ میں ہوتا ہے، اس کو ان اعمال کی حقیقت معلوم نہیں۔

سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سب تصرفات قوت خیالیہ کے ہیں، تو جیسے کوئی شخص کسی واقعہ میں فکر و خیال کو صرف کرکے کوئی رائے قائم کرلے بس اس سے زیادہ ان اعمال کی حقیقت نہیں، اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ بعض اعمال میں آیات قرآنیہ پڑھی جاتی ہیں، بات یہ ہے کہ ان آیات کی تلاوت محض حیلہ ہے توجہ خیالیہ کے یکسو کرلینے کا، ورنہ اصل فعل قوت خیالیہ کا ہے، گو آیات بھی پڑھی جائیں، جب بھی وہ تصرفات ظاہر ہوتے ہیں، اور اگر صرف آیات پڑھی جائیں اور خیال کو دوسری طرف متصرف کردیا جائے تو ہرگز یہ تصرفات ظاہر نہ ہوں۔

> قرآن مجید، دیوان حافظ، مثنوی سے فال نکالنے کا حکم۔

اور یہی حکم ہے قرآن مجید کا، دیوان حافظ یا مثنوی سے فال لے کر کسی پر حکم لگا دینے کا، جیسے ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی بادشاہ کی

بیگم کا بڑا قیمتی ہار گم ہو گیا تھا اس نے کنیزک سے بوقت شب چراغ منگا کر اس کی روشنی میں دیوان حافظ سے فال لی تو یہ مصرعہ نکلا۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

(یعنی کتنا دلیر چور ہے کہ اپنی ہتھیلی پر چراغ رکھتا ہے)

بس اس نے اس کنیز کو پکڑ لیا اور تلاشی لینے سے وہ ہار اس کے پاس نکلا۔ اگر ایسی حکایات ثابت بھی ہوں تو اتفاقی بات ہے، نہ اس عمل اور اس واقعہ میں کوئی وجہ تعلق، نہ کسی دلیل سے اس کی دلالت اس پر ثابت، تو حجت معتبر کیسے ہوگا؟

سحر یا جنات، نجومی یا پنڈت کے واسطے سے کسی چیز پر یقین کر لینا قریب کفر ہے

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی سحر یا کسی جن کے واسطے یا کسی نجومی یا پنڈت کے واسطے سے کسی خبر کا یقین کر لینا خصوصاً جبکہ اس خبر سے کسی بری کو متہم کر دیا جائے ایسا طریقہ حرام ہے کہ قریب کفر کے ہے، اور اس سے دعوکا نہ ہو کہ فلاں دفعہ اس کے مطابق نکلا، یوں تو آدمی کچھ بھی نہ کہے، یوں ہی بکنا شروع کر دے، کوئی نہ کوئی بات ٹھیک ہو ہی جاتی ہے، اسی طرح ان خرافات میں اگر ایک دفعہ کوئی بات سچ نکلتی ہے تو سو دفعہ جھوٹ نکلتی ہے، تو معتقدین اس ایک کا تو ذکر کرتے ہیں اور سو بار کا ذکر نہیں کرتے، اور اگر کوئی یاد دلاتا ہے تو اتفاقی ہونے سے جواب دیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ جس طرح جھوٹ ہونے کو اتفاقی کہہ دیتے ہیں سچ ہونے کو اتفاقی کیوں نہیں کہہ دیتے، یہ سب تسویلات شیطانیہ و شیطانی حیلہ بازیاں ہیں۔

مسلمان کے لئے شریعت ہی علم و عمل کا مدار ہے

اور اگر تجربہ و مشاہدہ میں نزاع قطعی نہیں کرتے ہو تو ان کو جانے دو آخر شریعت مسلمان کے لئے اصل مدار علم و عمل کا ہے یا نہیں؟ جب ہے تو دیکھ لو جب شریعت نے ان کی دلالت کو حجت نہیں کہا تم کیسے کہتے ہو؟ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی جنتری ہے اگر ۲۹ کا چاند ثابت ہو خواہ وہ اپنے قاعدہ میں صحیح ہی ہو مگر شریعت نے اس کو حجت قرار نہیں دیا، کوئی بیٹا اپنے باپ کے نافع معاملہ میں گواہی دے گو وہ بیٹا کتنا ہی پارسا متقی اور سچا ہو، مگر اس گواہی میں اس کے قول کو حجت قرار نہیں دیا گیا، مگر اسی اجلاس پر اگر دوسرے شخص کے معاملہ میں وہ شہادت دے فوراً قبول کر لی جائے گی،

تار کے ذریعہ گواہی قبول نہیں

یا اہل سلطنت نے باوجود یکہ تار کو بعض امور میں حجت ٹھہرایا ہے، لیکن اگر کوئی شخص عدالت میں اپنی شہادت تار کے ذریعہ بھیج دے گو پورا یقین ہو کہ اسی شخص کا ہے مگر

مگر قبول نہ کیا جائے گا۔

قانون شریعت کی حکمتوں کا اظہار ضروری نہیں

آخر شریعت ایک قانون ہے، کیا اس کو حق نہیں کہ جن دفعات کو اپنے حکموں کے لئے قرین حکمت سمجھے تجویز کرلے، باقی یہ اس کے ذمہ نہیں کہ ان حکمتوں کا بیان بھی سب کے سامنے ظاہر کرے، گو بعض خاص عباد کو بعض حکمتوں کی اطلاع بھی ہوجاتی ہے، مگر ان کے ذمہ بھی ضروری نہیں کہ ان کا اظہار کیا کریں، کیونکہ اصل مقصود کہ عمل ہے ان حکمتوں کے ظہور پر موقوف نہیں، اور ایسوں ہی پر ان کا انکشاف بھی ہوتا ہے جو نفس عمل میں اطلاع حکمت کا انتظار نہیں کرتے، اور یہ مشرب رکھتے ہیں ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو　　نینگیختن علت از کار تو

کفر کا فتویٰ دینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے

ارتداد کے متعلق بھی ضروری بیان ہوچکا، اب ارتداد حقیقی کے متعلق عرض ہے کہ اس میں بھی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ذرا تدبر سے کام نہیں لیتے، قائل کے قول کو کوئی محمل صحیح نہیں سوچتے، بس مفتی صاحب وجہ یافت ہوگئی فوراً کفر کا فتویٰ لگا دیا، بلکہ بعض اوقات محمل صحیح سمجھ میں بھی آجاتا ہے پھر بھی اس کو ذہن سے دفع کرکے اپنا حظ نکالتے ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ بیچارہ قائل وجہ کفر کا خود انکار کر رہا ہے اور محمل صحیح کی تصریح کر رہا ہے، مگر جب بھی اس کو معافی نہیں دی جاتی، تکفیر ہی کی سزا اس کے لئے بحال رہتی ہے، حالانکہ حدیث میں تصریح ہے: لا تکفروہ بذنب ولا تخرجوہ من الاسلام! اور فقہاء نے فرمایا ہے کہ جیسا فی رد المحتار عن الخلاصۃ:

اذا کان فی المسئلۃ وجوہ توجب التکفیر ووجہ واحد یمنعہ فعلی المفتی ان یمیل الی الوجہ الذی یمنع التکفیر تحسینا للظن بالمسلم	(جب کسی مسئلہ میں بہت سی وجوہ ہوں جو کفر ثابت کرتی ہیں اور ایک وجہ کفر کی نفی کی ہو تو مفتی پر واجب ہوجاتا ہے کہ اس وجہ کی طرف میلان اختیار کرے جو کفر کی نفی کرتی ہے مسلمان کے ساتھ حسن ظن اختیار

---

[1] اس موضوع پر حضرت مفتی اعظم سیدی و مرشدی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی قدس سرہ العزیز نے "وصول الافکار الی اصول الاکفار" کے نام سے جامع مکمل اور مدلل رسالہ لکھا ہے جو قابل دید ہے، اس کے علاوہ حضرت موصوف قدس سرہ کا دوسرا رسالہ "ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں" بھی قابل ملاحظہ ہے جو ادارۃ المعارف کراچی نمبر ۱۴ سے مل سکتا ہے۔ (احقر قریشی)

زاد في البزازية الا اذا صرح بارادة موجب الكفر فلا ينفعه التاويل والذي تحرر انه لا يفتى بكفر مسلم امكن حمل كلامه على محمل حسن او كان في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة من البحر (ج ۵ ص ۱۳۴)

کرتے ہوئے بزازیہ میں یہ عبارت زیادہ کی ہوئی کہ مگر جب اس شخص نے اپنے ارادے کی صراحت کر دی جو کفر ثابت ہی کر دیتا ہے تو اس وقت اسے دلیل نفع نہ دے گی، اور جو شخص اس بات سے بچا کہ کسی مسلمان کے کفر کا فتویٰ نہیں دے گا اس کے کلام کا بھی محمل پر خیال کرنا ممکن ہے یا اس کے کفر میں اختلاف ہے اگرچہ ضعیف روایت کے اعتبار سے ہے جیسا کہ بحر الرائق ج ۵ ص ۱۳۴ پر ہے؟

بلا تحقیق کفر کے فتووں کا انجام

اور ان مکفرین کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ عوام سے گزر کر خواص یعنی علماء تک کو اپنی تکفیر کا نشانہ بناتے ہیں اور ان سے گزر کر اخص الخواص یعنی عارفین تک بھی پہنچتے ہیں اور بسا اوقات شرعی اقوال کی بناء پر تکفیر کرتے ہیں وہ ایسے دقیق ہوتے ہیں کہ ان مکفرین کا طائر ذہن بھی وہاں نہیں پہنچتا یا دقیق نہیں ہوتے مگر ناشی ایسے احوال سے ہوتے ہیں جن کی ہوا تک بھی ان مجوسانی الفاظ و رسوم کو نہیں لگی تو ان کی تکفیر کرنا بالکل اس آیت کا مصداق ہوتا ہے۔

قال تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۔

(یونس، آیت ۳۹)

بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس کے (سمجھنے) و فہم ہونے کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لائے اور ہنوز ان کو اس قرآن کی تکذیب کا آخری نتیجہ نہیں ملا۔

وقال تعالیٰ:

وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ۔

(الاحقاف، آیت ۱۱)

اور جب ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو یہی کہیں گے کہ یہ قدیم جھوٹ ہے۔

ونعم ما قیل ؎

وكم من عائب قولاً صحيحاً ۔ وآفته من الفهم السقيم

اور کتنے لوگ ہیں جو درست بات کا عیب نکالنے والے ہیں، اور ان کی مصیبت سمجھ کی بیہودگی سے ہے۔

کیا یہ غضب اور ستم نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں ایسوں کی تکفیر ہوتی جن کی برکت سے علوم اسلامیہ کا احیاء ہوا، اور جن کے فیض سے برکات دینیہ کا القاء ہوا۔

کفر کا فتویٰ دینے کے لئے بعض شرائط

اور اگر کسی بزرگ کا کلام ماؤل نہ ہو سکے، تو اس کی تکفیر سے یہ سہل واسلم ہے کہ اس کلام ہی کی نسبت کا انکار کر دیا جائے اور غلبۂ حال کی تاویل کے رد کرنے کے لئے بعض متقشفین عذر کو ان چند عذروں میں منحصر سمجھتے ہیں جن کو اصولیین نے بوجہ کثرت وقوع ذکر کر دیا ہے، اور اس تخصیص ذکری کو تخصیص واقعی سمجھ کر دوسرے عذروں کی نفی ہی کر دی، حالانکہ ان میں عذر منحصر نہ ہونا خود فقہاء ہی کے کلام میں مصرح ہے۔

فی العالمگیریہ احکام المرتدین من اصابہ برسام او اطعم شیئا فذھب عقلہ فھذی فارتد لم یکن ذلک ارتدادا وکذا لو کان معتوھا او موسوسا او مغلوبا علی عقلہ بوجہ من الوجوہ فھو علی ھذا کذا فی التتمۃ اسم الواقعات۔

(عالمگیری احکام المرتدین میں ہے جسے سرسام کی بیماری ہو گئی یا اس نے کسی چیز کو کھا لیا جس کے بعد اس کی عقل چلی گئی پھر اس نے کچھ بکا اس کی وجہ سے وہ مرتد ہوا یہ اس کا ارتداد نہیں ہوگا، اور اسی طرح اگر کوئی شخص کم عقل (پاگل) ہے یا کسی وجہ سے مغلوب العقل یا وسوسہ والا ہے تو وہ بھی اسی حکم میں ہے جیسا کہ سراج وہاج میں ہے۔)

اس عبارت میں بوجہ من الوجوہ قابل نظر ہے:-

وفی مدارج السالکین لابن القیم ج ۱ ص ۱۴۲، تحت حدیث قصۃ القائل انا عبدک وانت ربی: وفی الحدیث من قواعد العلم ان اللفظ الذی یجری علی لسان العبد خطأ من فرح شدید او غیظ شدید ونحوہ لا یؤاخذ بہ ولہذا لم یکن

(ابن قیم کی مدارج السالکین ج ۱ ص ۱۴۲ "انا عبدک وانت ربی" کے قائل کے قصہ میں مرقوم ہے کہ قواعد علم سے یہ بات ہے کہ بندہ کی زبان پر جو لفظ سخت غصہ کی وجہ سے یا غیر معمولی خوشی یا اور کسی وجہ سے خطاً نکل جائے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا، اسی واسطے وہ شخص کافر نہیں ہوگا جس نے انت عبدی وانا ربک کہا تھا)

باقی

كافراً بقوله أنت عبدي وأنا ربك ومعلوم أن تأثير الغضب في عدم القصد يصل إلى هذا الحال أو أعظم منها۔

کہہ دیا، اور معلوم ہے کہ غصہ کی تاثیر ہے اس حالت تک یا اس سے بڑھ کر پہنچتی ہے عدم قصد میں۔

اس عبارت میں لفظ "تحرّز" قابلِ غور ہے، اور اس دوسری عبارت کے نقل کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ بعض جامدین علی الظاہر غیر متبعین للفقہاء پر بھی کہ وہ امر تکفیر میں اور بھی شدید ہیں، حجت ہو کہ ان کے معتبر مسلم کا فتویٰ ہے، اور ہم نے جو امر تکفیر میں احتیاط کرنے کو کہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کوئی صریح کفر کا کام کرے یا صریح کفر کی بات کرے، جس میں تاویل نہ ہو سکے یا ہو سکے مگر خود وہ فاعل یا قائل اس کا انکار کرے تب بھی اس کی تکفیر نہ کی جائے۔

ہر امر میں حدودِ شرعیہ کا پاس واجب ہے

چنانچہ ایک کوتاہی اس اول کوتاہی کے مقابل اس باب میں یہ بھی ہے کہ علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات میں تکفیر کر دیتے ہیں، ان معترضین کے نزدیک وہ بات ذرا سی ہوتی ہے، ان صاحبوں کو یہ آیت پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ۔

(التوبۃ، آیت ۶۵، ۶۶)

اور اگر آپ اُن سے پوچھیں تو کہہ دیں گے ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے تھے، آپ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے، تم اب یہ بیہودہ عذر مت کرو، تم اپنے کو مومن کہہ کر کفر کرنے لگے ہو۔

اور اوپر یہ عبارت گزر چکی ہے: إلا إذا صرح بإرادة الكفر فلا ينفعه التأويل۔

ہر امر میں حدودِ شرعیہ کی رعایت ضروری ہے

خلاصہ یہ کہ ہر امر میں حدودِ شرعیہ کا پاس واجب ہے، نہ اُن کا تنازع ہو اور نہ ان سے تجاوز ہو۔

ثبوت کفر کے بعد تجدید ایمان کے ساتھ تجدید نکاح اور اعادۂ حج بھی واجب ہے

ایک سبب بے احتیاطی اس باب میں یہ ہوتی ہے کہ ثبوت کفر کے بعد اسلام کی تو تجدید کر لی جاتی ہے، نہ نکاح کی تجدید ہوتی ہے حالانکہ یہ بھی ضروری ہے اور نہ حج کا اعادہ ہوتا ہے حالانکہ کفر سے حج سابق بھی باطل ہو جاتا ہے، تو بعد تجدید ایمان اگر شرائط وجوب حج کے پائے جائیں تو حج پھر کرنا چاہیے۔

وھذا آخر ما اردنا ایرادہ فی ھذہ الفصول

حصہ دوم تمام شد

یکم شعبان ۱۳۳۳ھ

ناشر

ادارۃ المعارف کراچی